حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

ملفوظات حکیم الامت

جلد ۲۷-۲۸

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

بسم اللہ الرحمن الرحیم

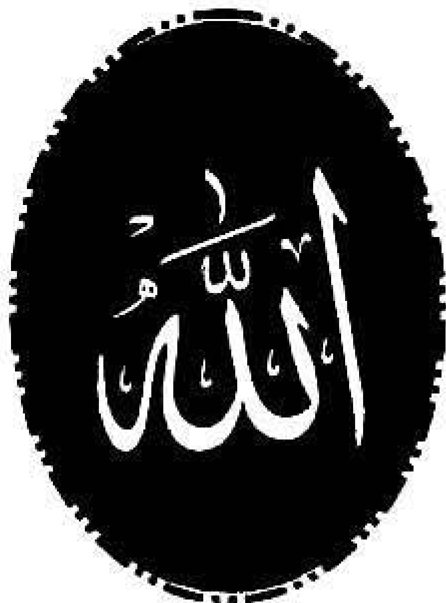
ایک ضروری گزارش!

معزز قارئینِ کرام! اس کتاب کو عام قاری کے مطالعہ، اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی اور ثوابِ دارین کے خاطر پاکستان ورچوئل لائبریری پر شائع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری یہ کاوش پسند آئی ہے یا آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے کوئی راہنمائی ملی ہے تو برائے مہربانی میرے اور میرے والدین کی بخشش کے لئے اللہ رب العزت سے دُعا ضرور کیجئے گا۔ شکریہ

طالبِ دُعا سعید خان

ایڈمن پاکستان ورچوئل لائبریری







ملفوظاتِ حکیم الامت

27-28

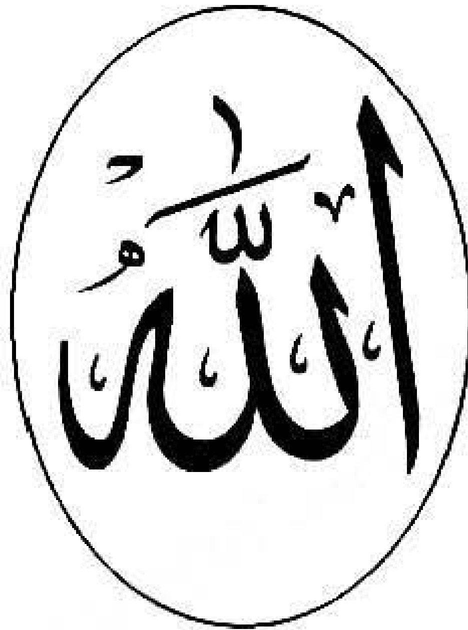
ترتیب و تزئین کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب .... ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۸-۲۷

تاریخ اشاعت .... ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

ناشر .... اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان

طباعت .... سلامت اقبال پریس ملتان



ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان

ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور

مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور

مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور

مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

دارالاشاعت اردو بازار کراچی

بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

بسلسلہ

ملفوظاتِ حکیم الامت

27-28

حکیم الامت مجدد الملت حضرۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی مجالس اور اسفار نشست و برخاست میں بیان فرمودہ انبیاء کرام علیہم السلام اولیاء عظام رحمہم اللہ کے تذکروں' عاشقان الٰہی ذوالاحترام کی حکایات و روایات' دین برحق مذہب اسلام کے احکام و مسائل جن کا ہر فقرہ حقائق و معانی کے عطر سے معطر' ہر لفظ صبغۃ اللہ سے رنگا ہوا' ہر کلمہ شرابِ عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا' ہر جملہ اصلاح نفس و اخلاق' نکات تصوف اور مختلف علمی و عملی، عقلی، نقلی، معلومات و تجربات کے بیش بہا خزائن کا دفینہ ہے۔

جن کا مطالعہ آپ کی پُر بہار مجالس کا نقشہ آج بھی پیش کر دیتا ہے۔

الرفیق فی سواء الطریق (اوّل - دوم)

حاشیہ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان 540513-519240.ý

Email:taleefat@mul.wol.net.pk

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمہید رسالہ

بعد الحمد والصلوٰۃ منجملہ رسالہ[1] الامداد کے مسلسل مضامین کے ایک مضمون خاص وہ ہے جس کو رسالہ مذکورہ کی تمہید میں میری اس مجمل عبارت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ''ایک جز و تصوف کے عام مضامین ہیں جو میرے مواعظ سے منتخب ہوا کریں گے۔ جن کا نام احقر ہی نے الرفیق[2] فی سواء الطریق رکھا ہے'' اور خود اس مضمون ملقب بہ الرفیق کی تمہید میں انتخاب کنندہ کی اس مفصل عبارت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ''حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدفیوضہم کے مواعظ متفرقہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ میں بہت سے مضامین سلوک واخلاق کے متعلق منتشر[3] طور سے ایسے ہوتے ہیں کہ مواعظ کے مطالعہ کرنے والوں کے اذہان بھی وہاں تک نہیں پہنچتے کہ ان مضامین سے اصلی مقصود کیا ہے۔ اس لئے احقر نے حسب ارشاد حضرت مولانا مدفیوضہم ان مضامین متفرقہ کو انتخاب کر کے مستقل عنوانات سے ان کو معنون کر دیا ہے کہ اس صورت سے مقصود اصلی معلوم ہونے کے علاوہ ان کی نافعیت مضاعف[4] ہو گئی اور نیز مطالعہ کرنے والوں کو بوجہ اختصار و تفنن[5] دلچسپی بھی زیادہ ہو گئی''۔ چنانچہ اس وقت تک رسالہ مذکور میں یہ مضمون مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ جس سے ناظرین کو بے حد نفع ہوا۔ حتیٰ کہ ایک بار بعض مصالح سے چاہا گیا کہ بجائے اس مضمون کے مستقل مواعظ کی اشاعت کا سلسلہ جاری کر دیا جائے۔ اور ناظرین سے اس بارہ میں مشورہ دریافت کیا گیا تو کسی نے

---

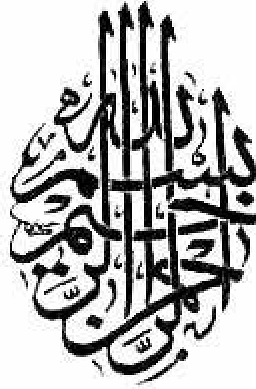
[1] جو ۳۵-۳۶ھ میں خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون سے جاری تھا۔ [2] سیدھے راستہ کے سفر کا ساتھی یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے راستہ کا۔ [3] پھیلے ہوئے۔ [4] ان کا فائدہ کئی گناہ ہو گیا۔ [5] نئے نئے مضمون آنے سے۔

اس میں موافقت نہیں کی اور اس سلسلہ کے انسداد[1] یا تبدیل کو گوارا نہیں کیا۔ اس انتخاب کی ابتداء مواعظ دعوات عبدیت حصہ پنجم سے متنازلاً[2] ہوتے ہوئے اس سے اور چہارم وسوم سے فراغت کرتے ہوئے اس وقت تک حصہ دوم کے آغاز تک اس کی نوبت پہنچی ہے۔ شروع حصہ کا انتخاب مولوی عبداللہ صاحب نے کیا ہے۔ اور آخر میں مولوی شبیر علی نے جنہوں نے عنوانات بالالتزام مجھ کو بھی دکھلائے ہیں۔ تھوڑا زمانہ ہوا کہ اتفاق سے مجمع الاخلاق والا وصاف جناب حاجی محمد یوسف صاحب کمپنی مرچنٹ اسٹریٹ نمبر ۴۸ رنگون کا یہاں گزر ہوا تو انہوں نے مضمون مذکور کی نافعیت[3] کی بنا پر ایڈیٹر الامداد سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اگر اس کو متفرق پرچوں سے مجتمع کر کے مستقلاً بصورت کتاب شائع کر دیا جاوے اور آئندہ بھی جب مقدار معتد بہ[4] ہو جاوے۔ اسی طرح اشاعت ہوتی رہے تو تسہیل[5] وتکمیل نفع سے اقرب ہے۔ اور عالی ہمتی سے اس کے مصارف بھی برداشت کرنے کو فرمایا۔ ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے ذکر کیا میں نے بھی پسند کیا اور مناسب معلوم ہوا کہ رسالہ الامداد کے شروع سے تین سال تک کے مضمون مذکور کے مجموعہ کو کہ اتفاق سے دعوات عبدیت حصہ سوم کا انتخاب بھی اسی پر ختم ہوا ہے۔ ایک حصہ بنا دیا جائے۔ پھر دعوات حصہ دوم اور اس کے مابعد سے کہ رجب ۱۳۳۶ھ کے پرچہ سے اس کی ابتداء ہے۔ جب معتد بہ[6] ذخیرہ مضمون مذکور کا جمع ہو جاوے۔ اس کو حصہ ۲ دوم قرار دیا جاوے۔ وعلیٰ ہذا[7] الی ماشاء اللہ تعالیٰ اور نام اس سلسلہ کا جیسا اب تک الرفیق تھا۔ اب بھی وہی قرار دے کر لقب بنا بر رعایت لفظی[8] ومعنوی کیل یوسفی اچھا معلوم ہوتا ہے اس خطبہ کے بعد مقاصد شروع ہوتے ہیں۔

کتبہ اشرف علی التھانوی عفی عنہ
آغاز شوال المکرم ۱۳۳۶ھ

---

[1] بند کرنے [2] اوپر سے نیچے اترتے ہوئے۔ ۵۔۴۔۳۔۲۔۱ [3] قابل یعنی کافی فائدہ مند۔ [4] شمار [5] فائدہ کو پورا اور سہل کرنے کے زیادہ قریب ہے۔ [6] شمار کے قابل یعنی کافی [7] اور اسی طرح تیسرا چوتھا۔ پانچواں حصہ جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہیں۔ [8] حضرت یوسف علیہ السلام زمانہ قحط میں حاجت مندوں کو کیل (ایک آلہ غلہ ناپنے کا) بھر بھر کر غلہ غذا کے لئے تقسیم فرماتے تھے۔ اسی طرح اس یوسف ثانی نے طالبین دین کو روحانی غذا علوم نافعہ کی اس وقت تقسیم کی ہے یہ ہے رعایت لفظی ومعنوی ۱۲



حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا

فقر صادق کی علامت

فقر صادق کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو اور دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً وعملاً اختیار کر کے دکھلا دیا۔ قولاً تو یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی۔ اللھم اجعل[1] رزق ال محمد قوتاً اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں اور جن کے لئے آپ فرط محبت سے سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے اور جن کے لئے آپؐ نے یہ فرمایا کہ سیدۃ[2] نساء اھل الجنۃ فاطمۃ نیز حضرت علیؓ نے جب نکاح ثانی کا قصد فرمایا تو آپؐ نے یہ فرمایا کہ یؤذینی[3] ما آذاھا[4] اتنی پیاری بیٹی نے جب ایک مرتبہ چکی چلانے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جانے کی شکایت[5] کی۔ جس کو آج کل اس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو بوجہ مصلحت صحت یہ رائے دی کہ نئی لڑکیوں سے

۱؎ اے اللہ اولاد محمد کا رزق بقدر کفایت مقرر فرما۔ مسلم ۲؎ اہل جنت کی عورتوں کی سردار فاطمہؓ ہیں۔ مسلم

۳؎ تکلیف دیتی ہے مجھے وہ چیز جو فاطمہؓ کو تکلیف دیتی ہے۔ ۱۲ ۴؎ بخاری کی حدیث ہے فرمایا تھا کہ میں حلال کو حرام نہیں کرتا لیکن جو چیز فاطمہؓ کو تکلیف دے گی مجھے بھی طبعی طور سے تکلیف دے گی۔ اور تکلیف کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب کی بیٹی سے نکاح کا قصد تھا تو خدا اور رسولؐ کے دشمن کی بیٹی کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کو پھر حضورؐ کو طبعی تکلیف ہوتی اور نبی کو تکلیف دینا خدا کو تکلیف دینا ہے۔ خطرناک ہے۔ لہٰذا یہ بات صرف حضورؐ کے ساتھ خاص تھی۔

۵؎ یہ حدیث ابن ماجہ میں ہے۔

چکی پسواؤ۔ کیونکہ اکثر امارت کے لئے بیماری لازم ہوگئی ہے۔ وہ امیر بھی کیا ہوا جس کے پاس صحت جیسی خدا کی نعمت نہ ہو۔ اور وجہ اس کی یہی آرام طلبی ہے۔ اس لئے میں نے جو کہا کہ تم ایسا کیا کرو تو ان میں سے بعض کہنے لگیں کہ خدا نہ کرے تم ایسی فال کیوں نکالتے ہو۔ اور یہاں تک ہم لوگوں کی شان بڑھ گئی ہے کہ اکثر عورتوں نے چرخہ کاتنا تک چھوڑ دیا۔

حکایت: ہمارے وطن میں ایک عورت کا قصہ ہے کہ وہ چرخہ کات رہی تھیں اور اس زمانہ میں ان کی ساس مرگئی تھیں تو کوئی عورت جوان کے یہاں تعزیت کے لئے آئی تو آہٹ پاتے ہی چرخہ کو اٹھا اور اندھے باولوں کی طرح کوٹھڑی میں پھینک آ گے سے کواڑ بند کر دیئے۔ تا کہ مہمان[1] کو معلوم نہ ہو۔ غرض حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی غلام لونڈی لے آؤ۔ تا کہ کچھ مدد دے۔ چنانچہ حضرت فاطمہؓ حضورؐ کے پاس گئیں اپنی راحت کے لئے یا شوہر کے امتثال[2] امر کے لئے جس وقت حضورؐ کے گھر پہنچیں تو حضورؐ تشریف فرما نہ تھے۔ یہ حضرت عائشہؓ سے کہہ کر چلی آئیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ سے معلوم ہوا۔ آپؐ حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت فاطمہؓ لیٹی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر اٹھنے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لیٹی رہو۔ غرض اس وقت پھر حضورؐ سے عرض کیا گیا آپؐ نے فرمایا کہ اگر کہو تو غلام لونڈی دے دوں اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں۔ یہ سن کر فاطمہؓ نے پھر یہ نہیں پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے۔ بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی ہی چیز دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سوتے وقت **سبحان[1] اللہ** تینتیس بار اور **الحمد[2] للہ** تینتیس بار اور **اللہ اکبر[3]** چونتیس بار پڑھ لیا کرو۔ بس یہ غلام لونڈی سے بھی بہتر ہے۔ اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی قبول کر لیا تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی آپؐ نے اس کو تجویز کر کے دکھلا دیا۔ نیز ارشاد فرمایا کہ ہماری اولاد کے لئے زکوٰۃ حلال نہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ایسے قوانین مقرر ہوتے کہ سب روپیہ ان ہی کو ملتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ تو دلچسپی اس کو کہتے ہیں۔

---

[1] اللہ تعالیٰ ہر برائی سے پاک ہے [2] سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ [3] اللہ تعالیٰ ہر چیز سے ہر طرح بڑے ہیں۔

درویش متقی کے اندر تواضع اور رعب دونوں جمع ہوتے ہیں

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے برسرِ منبر فرمایا کہ اسمعوا[1] و اطیعوا سامعین میں سے ایک شخص نے کہا لانسمع[2] ولا نطیع. حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا کہ غنیمت کے چادریں جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو تو ایک ایک ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے تقسیم میں عدل نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا بھائی تو نے اعتراض میں بہت جلدی کی۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس آج کرتا نہیں تھا۔ تو میں نے اپنے چادرے کو تو ازار کی جگہ باندھا اور ابن عمر سے ان کا چادرہ مستعار لے کر اس کو کرتہ کی جگہ اوڑھا[3] ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ آج بڑوں کا دوہرا حصہ ہونا تو گویا لازمی امر ہے۔ البتہ اگر مالک ہی دوہرا حصہ دے تو مضائقہ نہیں غرض تواضع کی کیفیت[4] تو یہ تھی اور باوجود اس نرمی کے رعب کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ آپ بہت سے صحابہؓ کے ساتھ جا رہے تھے اتفاقاً پشت کی طرف جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی سب گھٹنوں کے بل گر پڑے۔

ہر کہ ترسید[5] از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

یعنی جو خدا تعالیٰ سے ڈرے گا اس سے سب ڈریں گے۔ اور اگر کسی کے رعب میں کمی ہے تو تقویٰ کی کمی کی وجہ سے ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے ہاں وحشت اور نفرت نہیں ہوتی۔ اور اجتناب[6] و عدمِ اختلاط کے ساتھ جو ہیبت ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے لوگ بھیڑیئے سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس مجلس میں بھیڑیا آ جائے تو بھی سب کھڑے ہو جائیں۔

---

۱ تم سنو (حکم خلیفہ کو) اور اطاعت کرو ۱۲۔ ۲ ہم نہیں سنتے اور نہ اطاعت کریں گے۔ ۳ یہ واقعہ حدیث میں ہے۔ ۴ کہ سارے مسلمانوں کے بادشاہ اور مجمع عام میں ایک شخص ان کے حکم کو ٹھکراتا ہے صاف انکار کر کے توہین کرتا ہے۔ مگر اس کو سزا تو درکنار ناگواری بھی ظاہر نہ کی وجہ پوچھی اور جواب تسلی بخش اور نرمی سے دیا۔ ۵ جو خدا تعالیٰ سے ڈرا اور اس نے تقویٰ اختیار کیا تو اس سے تمام جن اور انسان اور جو کوئی دیکھے ڈرتا ہے۔ ۶ الگ الگ رہنا، میل جول نہ رکھنا۔

اصل درویشی صحبت نیک ہے

ابتدا ہی سے اپنی اولاد کو کسی بزرگ کی صحبت میں وقتاً فوقتاً[1] رکھیے اور خود بھی رہیے اس کی صحبت میں خدا تعالیٰ نے اصلاح کا اثر رکھا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں

قال[2] را بگذار و مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

صحبت نیکاں اگر یک ساعتست — بہتر از صد سالہ زہد و طاعتست

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا — گو نشیند در حضور اولیاء

مگر صحبت کا ہم لوگوں میں بالکل ہی اہتمام نہیں۔ میں نے ایک موقع پر اس کو ایک مستقل تقریر میں بیان کیا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ جہاں اور تمام ضروریات اپنی اولاد کے لئے تجویز کی جاتی ہیں چند روز کے لئے اس کا بھی انتظام کر لیجئے کہ اس کو کسی بزرگ کے سپرد کر دیجئے اور کم سے کم ایک سال تک ان کے پاس ضرور رکھیے اگر کہیے کہ اس میں تو ان کی دنیوی تعلیم کا بڑا نقصان ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ اس کی یہ صورت کیجئے کہ ہر چھٹی میں چند روز رکھا کیجئے۔ اس طرح چند مرتبہ میں یہ مدت پوری ہو جائے گی۔

اصل نافع[3] فی الدین قلب سلیم ہے

نافع فی الدین واقع میں کوئی دوسری چیز ہے اور وہ قلب سلیم ہے یعنی اگر قلب سلیم ہے تو روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں مضر نہیں۔ اور اگر قلب سلیم نہیں ہے تو روپیہ کا نہ ہونا تو کم مضر ہوتا ہے اور روپیہ کا ہونا زیادہ مضر ہو جاتا ہے۔ روپیہ اور قلب سلیم کی مثال بالکل تلوار اور ہاتھ کی سی ہے کہ تلوار کاٹتی ہے لیکن اسی وقت جب کہ ہاتھ بھی ہو اور اس میں قوت بھی ہو اور

---

[1] کچھ وقت کے لئے پھر کچھ وقت کے لئے [2] باتیں بنانی چھوڑ دو۔ دل کی حالت والے مرد بنو۔ کسی کامل انسان یعنی صحیح پیر کے سامنے پامال ہو اور مٹ جاؤ۔ بزرگوں کی صحبت اگر ایک گھنٹہ بھی ہو وہ سو سال کی عبادت اور سو سالہ دنیا کی بے رغبتی سے بہتر ہے۔ یعنی اس سے محبت و عظمت جو تمام عبادتوں کے کرنے اور گناہوں سے بچنے کا ذریعہ مل جاتی ہے اور سو سالہ عبادت سے بھی بدوں پیر کے دل کا یہ حال نہیں ہوتا۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے حضور میں حاضری اور ساتھ رہنا چاہتا ہے اس سے کہہ دو کہ اولیاء الٰہی کی مجلس میں آ بیٹھے کیونکہ علم الٰہی شوق و عمل اور محبت و عظمت کا وہ فیض ہوتا ہے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کی حضوری میں ہے۔ [3] دین میں فائدہ دینے والا تندرست دل ہے جس کو خدا سے لگن ہو بھول اور غفلت نہ ہو۔

اگر ہاتھ نہیں یا ہاتھ تو ہے لیکن اس میں قوت نہیں تو نری تلوار کیا کام دے سکتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات خود اپنے ہی زخم لگ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر قلب سلیم نہ ہو تو نرا روپیہ کیا کام دے سکتا ہے۔ اصل چیز قلب سلیم ہے۔ اگر ایسے شخص کے پاس مال[۲] ہے تو وہ بیشک حدیث نعم[۱] المال الصالح عند الرجل الصالح کا مصداق ہے۔ مولانا[۲] علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

مال[۳] را گر بہر دیں باشی حمول   نعم مال صالح گفت آں رسولؐ

اور فرماتے ہیں۔

آب[۴] در کشتی ہلاک کشتی ست   آب زیر کشتی آں را پشتی ست

یعنی اگر کشتی کے اندر پانی بھر جائے تو اس کے ہلاک کا سبب ہوتا ہے اور اگر کشتی کے نیچے رہے تو اس کے لئے معین ہوتا ہے اسی طرح اگر مال قلب کے اندر گھس[۵] گیا تو وہ قلب کے لئے مہلک ہے اور اگر قلب سے باہر[۶] رہے تو وہ معین ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے کہ[۸] جب[۷] صاحب قلب سلیم کے پاس روپیہ ہو۔ غرض ایسے شخص کے لئے روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہی ہوئے۔

دنیاداروں کی پریشانی اور درویشوں کی دولت اطمینان کا راز

[۹] راز اس کا یہی ہے کہ واقعات تو اختیار میں ہوتے نہیں اور ہوس زیادہ ہوتی ہے اس واسطے ہمیشہ مصیبت میں گزرتی ہے۔ برخلاف اس شخص کے کہ جس کے پاس دین ہو کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور محبت میں یہ حالت ہوتی ہے کہ

ہر چہ[۱۰] آں خسرو کند شیریں بود

حکایت: حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ ان کو کسی نے ایک آئینہ[۱۱] چینی نہایت بیش

۱؎ نیک آدمی کے پاس اچھا مال عمدہ چیز ہے۔ اور یہ حدیث میں ہے۔ ۲؎ مولانا رومی مثنوی میں۔ ۳؎ اگر تم مال کو دین کے واسطے برداشت کر رہے ہو تو حضورؐ نے اس کے لئے فرمایا ہے کہ یہ بہترین نیک مال ہے۔ ۴؎ ترجمہ آگے ہے۔ ۵؎ کہ دل اس میں ہر وقت لگا ہوا ہو۔ ۶؎ کہ دل میں محبت نہیں ہاں ضرورت کی چیز ہے۔ ۷؎ جو تندرست دل خدا سے لگن والا رکھتا ہو اگر دل ایسا نہ ہوگا تو مال اس میں گھسا ہوا ہوگا۔ ۸؎ ورنہ وہی پہلی بات ہے کہ مفلسی کم مضر اور امیری بہت مضر ہوگی کہ مفلسی میں تقدیر کا شکوہ یا گستاخی ہے اور امیری میں غرور ظلم توہین مسلم بلکہ توہین دین و اہل دین بلکہ خدائی تک کے دعویٰ کا خطرہ ہے۔ سوائے اس کے جس کو اللہ بچائے۔ ۹؎ کہ اب یہ ہو وہ ہو اور ہوتا نہیں کہ ہونا اختیار میں نہیں۔ ۱۰؎ وہ بادشاہ جو کچھ بھی کرتا ہے میٹھا اور مزے دار ہوتا ہے۔ ۱۱؎ چین کا بنا ہوا منہ دیکھنے کا شیشہ بڑی قیمت کا۔

قیمت لا کر دیا آپ نے خادم کے سپرد کر دیا کہ جب ہم مانگا کریں ہم کو دے دیا کرو۔ ایک روز اتفاق سے خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا خادم ڈرا اور حاضر ہو کر عرض کیا۔

از قضا[1] آئینہ چینی شکست

آپ نے بے ساختہ نہایت خوش ہو کر فرمایا کہ

ع خوب[2] شد اسباب خود بینی شکست

اور مال تو کیا چیز ہے اولاد کے مرجانے پر بھی یہ حضرات پریشان نہیں ہوتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ طبعی رنج ہو سو یہ کوئی مذموم[3] نہیں[4]۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی ہوا ہے غرض دین کے ساتھ اگر دنیا بھی ہوگی تو وہ دنیا بھی مزہ دار ہوگی۔ بلکہ اگر نرا دین ہوا اور دنیا نہ ہو تب بھی ان کی زندگی نہایت مزہ دار ہے اس لئے کہ وعدہ ہے۔ مَنْ[5] عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ان حضرات کو ہیچ(۱) ندارد میں بھی پورا لطف آتا ہے۔

حکایت: حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کی حکایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ گھر پر موجود نہ تھے کہ آپ کے مرشد تشریف لائے۔ اتفاق سے اس روز گھر میں فاقہ تھا۔ اہل خانہ نے دیکھا کہ حضرت تشریف لائے ہیں آپ کے لئے کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ آخر خادمہ کو محلے میں بھیجا کہ اگر قرض مل جائے تو کچھ لے آئے۔ خادمہ دو، تین جگہ جا کر واپس چلی آئی اور کچھ نہ ملا۔ متعدد مرتبہ کی آمد و رفت سے حضرت کو شبہ ہوا اور آپ نے حالت دریافت فرمائی معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا اور آپ نے ایک روپیہ نکال کر دیا کہ اس کا اناج لاؤ چنانچہ اناج آیا آپ نے ایک تعویذ لکھ کر اس میں رکھ دیا اور فرمایا کہ اس اناج کو مع تعویذ کے کسی برتن میں رکھ دو۔ اور اسی میں سے خرچ کیا کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس اناج میں خوب برکت ہوئی۔ چند روز کے بعد جو شاہ ابوالمعالی صاحبؒ آئے تو کئی وقت تک کھانے کو برابر ملا۔ آپ نے ایک روز تعجب سے پوچھا کہ کئی روز سے فاقہ نہیں ہوا۔

---

[1] قضا آنے سے چین والا شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔ [2] اچھا ہوا خود کو دیکھنے کا ذریعہ ٹوٹ گیا یعنی خدا پر نظر کی جگہ خود کو دیکھنا اپنے کسی کمال پر نظر کرنا برا ہے آئینہ میں صورت دیکھنا بھی ایک قسم کا خود کو دیکھنا تھا اور آئینہ اس کا ذریعہ تھا۔ اچھا ہوا ختم ہو گیا۔ [3] برا۔ [4] طبعی رنج اختیار میں نہیں گرفت میں بھی نہیں ۱۲ [5] جو مرد یا عورت نیک عمل کرے اور وہ مومن ہو تو ہم اس کو اچھی زندگی سے زندہ رکھیں گے۔ (۱) کچھ نہ رکھیں

معلوم ہوا کہ اس طرح سے حضرت ایک تعویذ دے گئے تھے اب اس موقع پر ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے ادب کا اور آپ کی خداداد سمجھ کا کہ ادب[1] توکل کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور ادب پیر کو بھی ملحوظ رکھا۔ فرمایا کہ اس اناج کو ہمارے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا۔ آپ نے اس میں سے تعویذ کو نکال کر تو اپنے سر پر باندھا اور فرمایا کہ حضرت کا تعویذ تو میرے سر پر رہنا چاہیے اور اناج کی بابت حکم دیا کہ سب فقرا میں تقسیم کر دیا جائے چنانچہ سب تقسیم کر دیا گیا اور اسی وقت سے پھر فاقہ شروع ہو گیا۔

ان حضرات کا فاقہ اختیاری فاقہ تھا۔ کیوں کہ اس کو سنت سمجھتے تھے۔ حضرت[2] شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ پر تین تین دن فاقہ کے گزر جاتے تھے۔ اور جب بیوی بہت پریشان ہو کر عرض کرتیں کہ حضرت اب تو تاب نہیں رہی۔ فرماتے تھوڑا صبر اور کرو جنت میں ہمارے لئے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں لیکن بیوی بھی ایسی نیک بخت ملی تھیں کہ وہ نہایت خوشی سے اس پر صبر کرتیں۔ صاحبو! ان حالات پر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیے اور اگر تعجب ہے تو یہ ایسا ہی تعجب ہے جیسے کوئی عنین[3] تعجب کرنے لگے کہ صحبت میں بھی لطف ہوتا ہے کیونکہ اگر ذرا سا بھی ادراک ہو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت کا کیا عالم ہوتا ہے۔ محبت میں تو مطلقاً[4] یہ عالم ہوتا ہے کہ

چو در[5] چشم شاہد نیاید زرت　　زرد خاک یکساں نماید برت

دیکھو اگر محبوب کو ایک ہزار روپیہ دو اور وہ لات مار دے تو تمہارے دل میں بھی ان روپیوں کی قدر نہیں رہتی۔ اور محبت مجازی میں جب یہ حالت ہے تو حقیقی کا کیا پوچھنا اسی کو فرماتے ہیں۔

---

[1] یہاں دو بے ادبیاں جمع تھیں۔ اگر تعویذ کو رکھتے ہیں تو اس کی برکت و کرامت رہتی ہے کہ غلہ ختم نہیں ہوتا اور کسی ضرورت ہی نہیں ہوتی تو توکل یعنی خدا تعالیٰ پر بھروسہ کا وہ اعلیٰ رتبہ جو کم درجہ والے کو تو جائز بھی نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر کے توکل کیا جائے تاکہ بھروسہ کامل و خالص ہو یہ ادب چھوٹتا ہے کہ اسباب جمع ہوئے اور اگر تعویذ کو غلہ سے نکال کر کہیں دفن کرتے ہیں تو پیر اور ان کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری و ترک ادب ہوتا ہے۔ حضرت نے دونوں بے ادبیوں سے بچ کر دونوں ادب اس طرح برقرار رکھے۔ [2] گنگوہی۔ [3] نامرد۔ [4] ہر محبت میں کوئی سی ہو۔ [5] جب تمہارا روپیہ محبوب کی نظر میں نہ آئے تو روپیہ اور مٹی تم پر دونوں یکساں نظر آئیں گے۔

ترا[1] عشق ہمچو خودے زاب وگل ربابد ہمہ صبر و آرام دل

عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بحر معنی غریق

دیکھئے اگر کوئی محبوب اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دے اور اس درمیان میں کھانے کا وقت آ جائے اور محبوب کہے کہ اگر بھوک لگی ہو تو جا کر[2] کھانا کھا لو کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ عاشق اس وقت اٹھنے اور کھانا کھانے کو گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں تو جب محبت کی یہ حالت ہوتی ہے تو شیخ کے فاقہ پر کیا تعجب ہے۔ وہ حضرت حق محبوب حقیقی سے معیت[3] رکھتے ہیں۔ مولاناؒ کہتے ہیں۔

گفت[4] معشوقے بعاشق کے فتا تو بغربت دیدہ بس شہر ہا

پس کدامی شہر ازانہا خوشتر است گفت آں شہرے کہ دادے دلبرست

آگے مولاناؒ فرماتے ہیں:

ہر کجا[5] دلبر بود خرم نشیں فوق گر دون ست نے تعرز میں

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

تو اگر محبوب کنوئیں کے اندر ہو وہ بھی جنت ہے تو جب محبوب مجازی کی معیت کی یہ حالت ہوتی ہے تو محبوب حقیقی کی معیت اگر میسر ہو جائے تو کیا حالت ہوگی۔

ہم کو اصلاح[6] اخلاق کی کچھ فکر نہیں ہے

اکثر دین دار لوگوں کو اس کی فکر ہوتی ہے کہ داڑھی بھی ہو اور ٹخنے سے اوپر پائجامہ بھی ہو۔ لباس سارا شریعت کے موافق ہو لیکن اخلاق کو دیکھئے تو اس قدر خراب کہ گویا کبھی

---

۱ تم کو ایک اپنے جیسے پانی مٹی سے بنے ہوئے کا عشق بھی صبر اور دل کے چین کو دور کر سکتا ہے تو کیوں تم تعجب کرتے ہو اللہ کے راستے کے چلنے والوں سے جو حقیقت کے سمندر میں غرق ہوں ۱۲۔ ۲ تقریبات اور دلچسپ کام میں یہی ہوتا ہے۔ ۳ ساتھ ۴ ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا اے جوان تو نے تو سفر میں بہت سے شہر دیکھے ہیں۔ تو ان میں سے کونسا شہر بہترین ہے۔ عاشق نے جواب دیا وہی شہر کہ جس میں محبوب ہو۔ ۵ جہاں محبوب ہو وہیں خوش خوش بیٹھو یہ جگہ تو آسمان سے بھی اوپر والی ہے زمین کی تہہ نہیں ہے۔ جہاں کہیں چاند جیسا یوسف چہرہ والا ہو وہ جگہ خود جنت ہے گو وہ کنوئیں کی گہرائی ہو۔ ۶ اخلاق خلق کی جمع ہے۔ دل کی کیفیت کا نام ہے جس سے اچھے برے کام ہوتے ہیں برے کاموں والی کیفیتوں کو کم اور اچھے کاموں کی کیفیتوں کو اجاگر کرنا ان کی اصلاح ہے ۱۲

شریعت[1] کی ہوا بھی نہیں لگی۔ جس سے وہ حالت ہوتی ہے کہ

از بروں[2] چوں گور کافر پر حلل　　　　وا ندروں قہر خدائے عزو جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　　وزدرو نت ننگ میدارد یزید

بہت لوگ ہماری پارسایانہ صورت کو دیکھ کر دھوکہ میں آ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کے خاص مقبولین میں ہیں۔ حالانکہ ہم میں جز[3] اخلاق کا جو کہ شعب دین سے ایک عظیم الشان شعبہ ہے نشان تک نہیں ہوتا۔ ہماری ساری حرکتیں تکلف[4] پر مبنی اور سارے افعال بناوٹ سے ناشی[(1)] ہوتے ہیں۔

ظاہر[5] کی درستی بھی بہت ضروری ہے

یادرکھو کہ ظاہر کی درستی بھی بیکار نہیں ہے اس کا بھی باطن پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ جب ساحران فرعون کے مقابلہ کے لئے تشریف لے گئے تو مقابلہ کے بعد ساحر تو سب مسلمان ہو گئے تھے لیکن فرعون نہیں ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ نے خدا تعالیٰ سے سبب پوچھا ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ساحران فرعون اس وقت تمہارا سا لباس پہن کر آئے تھے۔ ہماری رحمت نے گوارا نہ کیا کہ تمہارے ہم لباس دوزخ میں جائیں اس لئے ہم نے ان کو ایمان کی توفیق دے دی اور فرعون محروم رہا۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ ظاہر کی درستی بھی اچھی چیز ہے۔ مگر محض اس کی درستی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ باطن کو بھی درست و آراستہ بنانے کی فکر ہونا چاہیے۔

۱ے کیونکہ شریعت تو ان تمام اعمال کا نام ہے جو ظاہری اعضاء سے انجام پائیں یا دل سے دل کی صفائی نہ ہوگی تو پوری شریعت پر عمل کہاں ہوا۔ ۲ے باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح کہ حلوں اور زینتوں والی ہے۔ اندر خدائے عزوجل کا غضب نازل ہو رہا ہے۔ باہر سے حضرت بایزید بسطامی جیسے ولی اللہ کو طعنہ دیتے یعنی شرماتے ہو اور تمہاری اندر کی کیفیت سے یزید بھی عار محسوس کرتا ہے۔ ۳ے اخلاق اور دلی کیفیتوں کے جو دین کے شعبوں میں عالیشان شعبہ ہیں کسی ذرا سے جز کا ۴ے ظاہر کے بناؤ ۵ے زبان، پیر، ہاتھ اور جسم کے عمل و لباس وضع و قطع کو ظاہر اور دل کی کیفیات کو باطن کہتے ہیں۔ (۱) پیدا

مشائخ کو چاہیے کہ وہ غیبت[1] نہ سنیں

جو لوگ مقتداء[2] ہیں وہ اس کی زیادہ فکر کریں کیونکہ غیر مقتدا کو تو غیبت کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور یہ لوگ چونکہ مرجع الخلائق[3] ہوتے ہیں اس لئے ان کو غیبت سننے کی بھی بہت نوبت آتی ہے۔ سینکڑوں آدمی ان کے پاس آتے ہیں۔ اور ہر شخص ان کے پاس یہی تحفہ لاتا ہے اور یہ اس تحفہ کو قبول[4] کرتے ہیں۔ ہاں جو عاقل ہوتے ہیں وہ ایسے لوگوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔

حکایت: حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا ہے حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت[5] کہا لیکن تم اس سے زیادہ بے حیا ہو کہ میرے منہ پر کہتے ہو۔

حکایت: حضرت میر درد دہلویؒ کو سماع سننے سے کچھ رغبت تھی ان کی نسبت حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے آ کر کسی نے کہا کہ حضرت میر درد سماع سنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا بھائی کوئی کانوں[6] کا بیمار ہے۔ مرزا صاحب کے اس مقولہ سے اکثر جاہلوں نے یہ سمجھا کہ مرزا صاحب حسن پرست تھے حالانکہ یہ الزام بالکل غلط اور بہتان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب بوجہ لطافت مزاج کے بدصورت آدمی کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ اور مرزا صاحب کے بچپن کے واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی مرزا صاحب کی نسبت یہ مشہور بات ہے کہ شیر خوارگی کے زمانہ میں آپ کسی بدصورت عورت کی گود میں نہ جاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت آپ کو خوبصورتی، بدصورتی کا ادراک بھی نہ تھا، لیکن لطافت طبع کے باعث آپ کو بدصورت آدمی سے اسی وقت تکلیف ہوتی تھی اور اس کا اثر بڑے ہو کر بھی تھا۔ غرض اس قسم

---

[1] کسی کے متعلق ایسی بات کہا جو سن کر اس کو ناگوار ہو غیبت ہے چاہے وہ بات واقعی ہی ہو۔ اندھا کانا کہنا بھی غیبت ہے۔ [2] جس کی پیروی لوگ کرتے ہیں۔ [3] مخلوق کے رجوع کرنے کی جگہ [4] اس کو روکتے نہیں۔ [5] پیٹھ پیچھے [6] دو جواب ہوئے ایک تو یہ کہ وہ معذور ہیں۔ طبعی گنجلک کو دور کرنے کے لئے یہ دوا کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ایک قسم کے معذور کو دوسرے معذور پر اعتراض کرنے کا حق نہیں اور جو معذور بھی نہ ہو اور کسی گناہ میں مبتلا ہو اس کو کیا حق ہے۔

کے حضرات ایسے لوگوں کا منہ اسی وقت بند کردیتے ہیں اور جو لوگ احتیاط نہیں کرتے وہ ان آنے والوں کی بدولت اکثر گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیے۔

ہر کہ عیب[۱] دگراں پیش تو آورد و شمرد　　　بیگماں عیب تو پیش دگراں خاہد برد

اس لئے میں نے کہا کہ مقتدا لوگ باستثناء[۲] محتاطین و متقین کے زیادہ اس آفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

فساق[۳] فجار کی اصلاح کا طریقہ اور ان کی عیب جوئی سے ممانعت

اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اگر واقعی ان لوگوں کی اصلاح کرنی منظور ہے تو اول ان سے میل جول پیدا کرے جب خوب بے تکلفی ہو جائے تو وقتاً فوقتاً نرمی سے ان کو سمجھایا جائے اور خدا تعالیٰ سے ان کے لئے دعا کی جائے اور جو تدبیریں مفید ثابت ہوں ان کو عمل میں لایا جائے۔ غرض وہ برتاؤ کیا جائے جو کہ اپنی اولاد سے کیا جاتا ہے کہ اگر ان کی شکایت کسی دوسرے سے کی جائے گی تو اپنے دوستوں سے کی جائے گی جو کہ اس کی اصلاح کر سکیں۔ یا بزرگوں سے کی جائے گی کہ وہ اس کے لئے دعا کریں۔ علی ہذا جن سے درستی کی امید ہوگی انہی سے کہا جائے گا اور جہاں یہ بات نہ ہوگی وہاں زبان پر بھی اپنی اولاد کے عیوب کو نہ لایا جائے گا۔ یہ مثال بحمد اللہ ایسی عمدہ ہے کہ اس کے پیش نظر رکھنے کے بعد اصلاح کے تمام آداب معلوم ہو جائیں گے۔ یعنی جس مسلمان کی اصلاح کرنی چاہو یہ غور کرلو کہ اگر یہ حالت ہماری اولاد کی ہوتی تو ہم کیا برتاؤ اس کے ساتھ کرتے بس جو برتاؤ اس کے ساتھ طبیعت تجویز کرے وہی برتاؤ اس غیر کے ساتھ بھی کرو اور میں اس حدیث[۴] کے المسلم[۵] مراۃ المسلم یہی معنی بیان کرتا ہوں۔ یعنی جس طرح آئینہ کا خاصہ ہے کہ وہ تمہارے عیوب چہرے کو تم سے چھپاتا نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہیں کرتا اسی طرح مسلمان کو

---

[۱] جو شخص دوسروں کے عیب تمہارے سامنے لاتا اور گناتا ہے۔ یقیناً وہ تمہارے عیب دوسروں کے سامنے بھی لے جائے گا۔ [۲] احتیاط اور گہرے کمال والوں کے سوا۔ [۳] جو گناہ کبیرہ کو کھلم کھلا کرے فاجر جو چھپ کر کرے فاسق ہے۔ جمع فساق و فجار۔ [۴] جامع صغیر [۵] مسلمان مسلمان کے لئے آئینہ ہے۔

بھی ہونا چاہیے۔ کہ کسی مسلمان کے عیوب کو اس سے چھپائے نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہ کرے۔ نیز یہ کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ رکھنا چاہیے بلکہ آئینہ کی طرح بالکل صاف باطن رہنا[1] چاہیے۔ حاصل یہ ہے کہ جب کسی عیوب پر مطلع ہو تو اس کو اطلاع کر دو۔ اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو خدا تعالیٰ سے دعا کرو۔ غرض دوسرے کی عیب جوئی و عیب گوئی ان مصالح سے تو جائز ہے۔

عیب گوئی کے جواز کا موقعہ

وہ موقعہ یہ ہے کہ مظلوم شخص ظالم کی عیب گوئی کرے کیونکہ مظلوم کو ظالم پر غصہ ہوتا ہے اور وہ غصہ حق ہوتا ہے۔ پس شریعت نے مظلوم کو اجازت دے دی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو نکال لے۔ سبحان اللہ شریعت اسلام کی تعلیم بھی عجیب پاکیزہ تعلیم ہے کہ کسی ایک قابل رعایت پہلو کو بھی نہیں چھوڑا مجھے تو اسلام کی تعلیم دیکھ دیکھ کر یہ شعر یاد آیا کرتا ہے۔

زفرق[2] تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا ایں جاست

دیکھئے مظلوم چونکہ اپنے جائز غصہ کو نکالتا ہے اور یہ طبعی امر ہے کہ اس کے ضبط سے کلفت ہوتی ہے تو اس کو اجازت دے دی گئی نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جب اس مظلوم کی غیبت سے لوگوں کو ظالم کے ظلم کی حالت معلوم ہوگی تو وہ اپنے بچانے کی فکر کر لیں گے بلکہ بعض بزرگوں نے تو ایک مضمر[3] مصلحت سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مظلوم کو چاہیے کہ اگر اس کو باطنی قرائن سے معلوم ہو جائے کہ میرے صبر کرنے سے ظالم پر ضرور قہر نازل ہوگا (کیونکہ بعض شخص کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہوتا ہے) تو اپنی زبان سے کچھ تھوڑا ضرور ظالم کو کہہ لیا کرے کیونکہ اس کی خاموشی سے اندیشہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا غضب دنیا میں ہی ظالم پر ٹوٹے اور بعض بزرگوں کے کلام سے جو نہ کہنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہ اس بناء پر کہ صبر ایک عمل نیک ہے اس کے کرنے سے مظلوم کو زیادہ ثواب ملے گا۔ لیکن جنہوں نے کچھ کہنے کی اجازت دی اور اس کو افضل بتلایا انہوں نے یہ خیال کیا کہ مسلمان[4]

---

[1] کہ ظاہر کرنے کے بعد اس کو دل میں نہ رکھیں۔ [2] سر سے پیر تک یعنی شروع سے آخر تک جس جگہ کو دیکھتا ہوں۔ محبوبی اداؤں کے دامن کو کھینچ لیتی ہے کہ جگہ یہیں ہے۔ [3] چھپی ہوئی [4] ظالم کو کہ وہ مسلمان تو ہے۔

بندہ کو دوزخ کا عذاب نہ ہو اور وہ خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہے۔ شاید کسی طالب علم کو یہ شبہ ہو کہ خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہنے کی یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ مظلوم معاف کر دے تو سمجھنا چاہیے کہ بعض لوگوں کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ معاف[1] بھی کر دیں تو خدا تعالیٰ اپنا حق کہ ان کے بندے کو ستایا تھا معاف نہیں فرماتے۔

حکایت: ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے ان کو کچھ بیہودہ کہا ان بزرگ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ اس کے ایک دھول مار دو ذرا متامل[2] ہوا فوراً وہ شخص زمین پر گرا اور مر گیا۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ تم نے دیر کی اور اس کا نتیجہ دیکھ لیا اور فرمایا کہ جب اس نے مجھے برا بھلا کہا تو میں نے دیکھا کہ قہر خداوندی اس پر نازل ہونا چاہتا ہے۔ اس لئے میں نے چاہا تھا کہ میں خود ہی اس کو کچھ کہہ لوں تاکہ قہر خداوندی اس پر نہ پڑے لیکن تم نے دیر کی آخر یہ شخص ہلاک ہو گیا اور یہی راز ہے کہ جب حضور ﷺ کے دہن مبارک میں کڑوی دوا ڈالی گئی اور آپؐ کے منع فرمانے پر لوگوں نے نہیں مانا تو حضور ﷺ نے ہوش آ جانے کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں نے میرے منہ میں دوا ڈالی ہے ان سب کے منہ میں دوا ڈالی جائے۔ سوائے عباسؓ کے کہ وہ شریک رائے نہ تھے۔ تاکہ مکافات[3] ہو جائے اور یہ لوگ قہر خداوندی میں مبتلا نہ ہوں۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اکثر لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دیتے تھے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی اکثر حرکات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور میری تکلیف کی وجہ سے لوگ وبال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور میں نے ہر چند خدا تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ میری وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے لیکن میری یہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ حافظؒ فرماتے ہیں۔

بس[4] تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　　　با دردکشان ہر کہ درافتاد برافتاد

---

[1] ان کے معاف کرنے سے ان کا حق تو معاف ہو سکتا ہے اور اللہ کا حق کہ ان کے ولی کو ستایا باقی ہے۔ [2] سوچ والا [3] بدلہ [4] ہم نے اس بدلہ کے گھر میں بہت تجربہ کیا ہے کہ شراب عشق الٰہی کی تلچھٹ پینے والوں سے جس نے مخالفت کی وہی گر گیا۔

اور ؎

ہیچ[1] قومے را خدا رسوا نہ کرد   تا دل صاحب دلے نامد بدرد

تو چونکہ بعض کے معاف کرنے سے بھی پورا معاف نہیں ہوتا اس لئے وہاں کچھ کہہ لینا ہی مصلحت ہے۔ غرض مظلوم کو اظہار ظلم کی بدوں کسی مصلحت کے بھی اجازت ہے اور اگر وبال کے ٹل جانے یا ہلکا ہو جانے کی نیت ہو تو وہ مستحسن ہے لیکن غیر مظلوم کو مصالح[2] سابقہ کے بغیر اجازت نہ ہوگی۔

جس علم کی فضیلت آئی ہے
وہ کون علم ہے اور اس کے کیا آثار ہیں؟

جس علم کی فضیلت آئی ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ قلیل[3] دراصل قول بود جانتا ہو بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ[4] اور اس نور کے ہوتے ہوئے قلب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

موحد[5] چہ بر پائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا۔

حکایت: ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کے لئے اترے' اتفاق سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کوئی اس وقت قریب نہ تھا۔ آپؐ نے اپنی تلوار درخت میں لٹکا دی اور درخت کے نیچے سو گئے۔ اسی وقت آپؐ کے ایک دشمن کو خبر ہوئی کہ حضورؐ اس وقت تن تنہا

---

[1] کسی قوم کو خدا تعالیٰ نے رسوا و ذلیل نہیں کیا جب تک کسی اہل دل بزرگ کا دل تکلیف نہ پا گیا ہو۔ [2] اصلاح کر سکنے والوں سے یا بزرگوں سے دعا کے لئے۔ [3] صرفی نحوی قواعد یا اور تعلیم۔ [4] اور ہم نے ان کو نور دیا کہ چلتے پھرتے ہیں اس کے ساتھ لوگوں میں ۱۲۔ [5] توحید والا وہ ہے کہ چاہے اس کے پاؤں پر سونا ڈال دو چاہے تیز فولاد کی تلوار اس کے سر پر رکھ دو اس کو کسی سے خوف اور امید نہیں ہوتی سوائے خدا کے بس توحید کی بنیاد یہی ہے۔

فلاں درخت کے نیچے سو رہے ہیں۔اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا آ کر دیکھا تو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا سو رہے تھے اور تلوار درخت میں لٹک رہی تھی اس نے اول دبے پاؤں آ کر تلوار پر قبضہ کیا اس کے بعد اس کو نہایت آہستگی سے نیام سے نکالا اور آپؐ کے پاس آ کر کھڑے ہو گیا۔جب بالکل تیار ہو گیا تو آپ کو بیدار کیا اور پوچھا **من یعصمک منی** اس وقت آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔آپؐ نے اس کی ہیئت دیکھ کر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں فرمائی اور اس کے سوال کے جواب میں نہایت اطمینان سے فرمایا کہ اللہ یعنی مجھے اللہ بچائے گا۔بھلا کوئی ایسا کر تو دکھلا دے۔بدون خدا کے تعلق کے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔تو علم اس کا نام ہے ورنہ نرے الفاظ تو شیطان بھی خوب جانتا ہے۔اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ وہ لرزنے لگا اور تلوار چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔آپؐ نے فوراً لپک کر تلوار اٹھالی اور فرمایا کہ اب تجھ کو مجھ سے کون بچائے گا۔وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کو دیکھ کر نہایت گھبرایا اور کہنے لگا کہ مجھے آپ ہی بچائیں گے۔آخر آپؐ نے اس پر کرم فرمایا اور اس کی گستاخی کو معاف فرما کر اس کو چھوڑ دیا۔تو یہ ہے علم اور اس کا اثر جس کو کہتے ہیں کہ

موحد[1] چہ بر پائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اور راز اس کا یہ ہے کہ علم کامل سے معرفت کامل ہوتی ہے وہ جانتا ہے **عسیٰ[2] ان تکرھوا شیئاً و ھو خیر لکم** اس لئے گھبراتا نہیں اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے لئے علاج اور کفارۂ[3] سیئات ہو رہا ہے نیز اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں ان کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لئے مناسب سمجھیں اس میں ہمیں رکھیں۔چنانچہ اسی کو مصیبت کے موقع پر فرماتے ہیں۔و بشر[4] الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون دوسرے اس خیال کے تازہ ہونے سے خدا تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کی بدولت سخت سے سخت مصیبت بھی ہلکی ہو جاتی ہے

---

[1] ترجمہ ایک صفحہ پہلے گزر چکا [2] قریب ہے کہ جس چیز کو تم برا سمجھو وہ بہتر ہو تمہارے لئے۔
[3] گناہوں کا کفارہ اور ذریعہ معافی ۱۲ [4] اور خوشخبری سنا دیجئے ایسے صبر کرنے والوں کو جو کہ مصیبت کے وقت کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسی کے پاس جانے والے ہیں ۱۲۔

از[1] محبت تلخہا شیریں شود

دیکھئے جن لوگوں کو امردوں[2] یا بازاری عورتوں سے تعلق ہو جاتا ہے وہ انکے پیچھے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر وہ جوتیاں بھی مارے تو ان میں لطف آتا ہے اور فخر کرتا ہے۔

حکایت: مشہور ہے کہ ایک شخص بیوی پر توجہ نہ کرتا تھا اور کسی بازاری عورت سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ بیوی کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہ بازاری مجھ سے زیادہ حسین ہو لیکن تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ بالکل کالی بھجنگ ہے۔ سخت تعجب ہوا اور اب وہ اس فکر میں لگی کہ آخر اس میلان کا سبب کیا ہے۔ چھان بین سے معلوم ہوا کہ جب یہ شخص اس کے پاس جاتا ہے تو دور ہی سے دیکھ کر اس کو برا بھلا کہنا شروع کرتی ہے اور خوب جوتیوں سے خبر لیتی ہے کہنے لگی کہ یہ کیا مشکل کام ہے۔ آج سے میں بھی یہی وطیرہ اختیار کروں گی۔ چنانچہ جب شوہر آیا تو اس نے دروازے ہی سے اس کی خبر لینی شروع کی۔ اور خوب جوتیوں سے پیٹا کہنے لگا بس اب میں کہیں نہ جاؤں گا۔ آج تک تجھ میں یہی کسر تھی سو اب وہ پوری ہو گئی۔ اس حکایت سے معلوم ہوا کہ محبت میں اگر محبوب کی طرف سے کوئی مصیبت بھی آئے تو وہ موجب فرح[3] ہوا کرتی ہے حالانکہ یہ محبت مجازی کیا ہوتی ہے اس محبت کی حقیقت یہ ہے کہ

عشق[4] ہائے گز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

البتہ خدا تعالیٰ سے محبت ہو تو وہ قابل اعتبار ہوتی ہے فرماتے ہیں کہ

عشق[5] بامردہ نہ باشد پائیدار عشق راباحی و باقیوم دار

تیسرے اس معرفت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے اور کوئی محبّ محبوب کو تکلیف نہیں دیا کرتا۔ لہٰذا ہم پر جو ظاہراً تکلیف آئی ہے یہ ایسی ہی ہے جیسے کہ ماں باپ کسی بچہ کے دنبل میں جس نے اس کو بے حد تکلیف دے رکھی ہو یا آئندہ تکلیف

---

[1] محبت کی وجہ سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی ہو جاتی ہیں۔ [2] بے داڑھی کے لڑکوں سے ۱۲ [3] خوشی کا سبب
[4] یہ جو عشق عشق رنگ روپ کے ہوتے ہیں عشق ہی نہیں ہیں۔ انجام کار عار ثابت ہوتے ہیں۔
[5] مرجانے والوں کے ساتھ پائیدار نہیں ہو سکتا۔ عشق تو اس ذات سے رکھو جو زندہ ہے ہمیشہ رہنے والی ہے۔

پہنچانے کا اندیشہ ہو نشتر لگواتے ہیں کہ وہ ظاہرا تو تکلیف ہوتی ہے لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہوتا ہے۔ اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ

طفل[1] می لرزو زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شاد کام

کہ بچہ تو ڈرتا ہے لرزتا ہے اور ماں خوش ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ نشتر لگانے والے کو انعام دیتے ہیں۔ سو اگر کوئی اجنبی تعجب کرنے لگے اور کہے کہ یہ انعام کس بات کا دیا ہے اس شخص نے تو تکلیف پہنچائی ہے اس کو سزا دینی چاہیے تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق یہ تکلیف نہیں یہ عین راحت ہے کیونکہ یہی تکلیف[2] ہے جس کی بدولت لڑکے کی زندگی کی امید ہو گئی ہے ورنہ یہ دنبل بڑھتا اور اس کا زہریلا مادہ تمام جسم میں سرایت کر جاتا اور لڑکا ہلاک ہو جاتا تو جب ماں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کی تکلیف دینا بوجہ ذریعہ راحت ہونے کے ناگوار نہیں ہے تو خدا تعالیٰ کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے۔ پھر اگر وہ فقر و فاقہ ڈال دیں یا کسی اور مصیبت میں گرفتار کر دیں تو اس کو نشتر کے قائم مقام کیوں نہیں سمجھا جاتا۔

بدبینی[3] اور خود بینی سے تحرز

اکثر لوگوں کو دیکھا ہو گا کہ لوگوں کو قمار اور زنا میں مبتلا دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ اسی سبب سے تو قحط ٹوٹ رہا ہے مگر کبھی کسی کو نہ دیکھا ہو گا کہ اس نے اپنے اعمال کو اس کا سبب بتلایا ہو حالانکہ زیادہ ضرورت[4] اس کی ہے۔

حکایت: حضرت ذوالنون بصریؒ سے لوگوں نے قحط کی شکایت کی فرمایا کہ قحط دور ہونے کی سوائے اس کے اور کوئی ترکیب نہیں ہے کہ مجھ کو شہر سے نکال دو کیوں کہ میرے گناہوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں اور یہی نہیں کہ محض زبان سے کہنے پر بس کیا ہو بلکہ آپ اس شہر کو چھوڑ کر چلے بھی گئے۔

حکایت: ایک بزرگ کہتے تھے کہ جب ریل میں بیٹھتا ہوں تو خدا تعالیٰ سے دعا کرتا

---

[1] بچہ تو شگاف دینے والے کے نشتر سے لرزتا کانپتا ہے مگر مہربان ماں اس تکلیف سے خوش بخوش ہے۔
[2] شگاف کی۔ [3] دوسروں کی برائی کو دیکھنے اور اپنی بھلائی کے دیکھنے سے بچاؤ۔
[4] کہ اپنی برائی اور گناہ دیکھے جو یقینی معلوم ہیں نہ کہ دوسرے کے جو یقینی نہیں۔

ہوں کہ اے اللہ میرے گناہوں کے سبب یہ سب لوگ ہلاک نہ ہو جائیں۔ یہی امراض ہیں جن کا علاج بزرگوں نے کیا ہے کہتے ہیں۔

یکے[1] آنکہ برغیر بدبیں مباش — دوم آنکہ برخویش خود بیں مباش

یہاں رات دن ہمارا سبق ہے کہ ہم ایسے اور ہم ویسے' اور دوسرا ایسا اور ویسا۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ اے عزیز تیری ایسی مثال ہے کہ تیرے بدن پر سانپ بچھو لپٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے شخص کے بدن پر ایک مکھی بیٹھی ہے تو اس کو مکھی بیٹھنے پر ملامت کر رہا ہے لیکن اپنے سانپ اور بچھو کی خبر نہیں لیتا جو کوئی دم میں تجھے فنا کئے ڈالتے ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔ اور دوسرے کی آنکھ کے تنکے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اول تو یہ دونوں مستقل عیب ہیں کیونکہ اپنے عیبوں کو نہ دیکھنا یہ بھی گناہ اور دوسرے کے عیوب کو بے ضرورت دیکھنا یہ بھی گناہ اور بے ضرورت کے معنی ہیں کہ اس میں کوئی ضرورت[2] شرعی نہ ہو۔

فضولیات اور لایعنی[3] کا ترک ضروری ہے

ایسے افعال جو شرعاً ضروری[4] اور مفید نہ ہوں عبث اور لایعنی کہلاتے ہیں۔ حدیث شریف میں ان کے ترک کا امر ہے اور بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا ہے۔

حکایت: ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کسی شخص کے مکان پر گئے اور دروازے پر جا کر آواز دی گھر میں سے جواب آیا کہ وہ نہیں ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں گئے ہیں جواب آیا کہ معلوم نہیں لکھا ہے کہ اپنے اس سوال پر کہ کہاں گئے ہیں تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے ایک لایعنی سوال کیوں کیا۔

حکایت: مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند کے والد مولانا فرید الدین

---

[1] ایک تو یہ کہ دوسرے کے عیب دیکھنے والے نہ ہو جاؤ۔ دوسرے یہ کہ اپنے لئے بھلائی دیکھنے والے نہ بن جاؤ۔
[2] اصلاح وانتظام اس کے ذمہ نہ ہو [3] بے فائدہ [4] ضروری جن کے نہ ہونے سے ضرر دنیا یا آخرت کا ہو فرض واجب وغیرہ اور مفید وہ جن کے ہونے سے فائدہ ہو نہ ہونے سے ضرر نہ ہو۔

صاحبؒ کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت ہی کم بولتے تھے اور بلا کسی شدید ضرورت کے نگاہ کبھی اوپر نہ اٹھاتے تھے۔حتیٰ کہ اگر ان سے کوئی بات پوچھتا تو زبان سے جواب دے دیتے لیکن منہ نہ اٹھاتے تھے۔صرف اس لئے کہ بلاضرورت کیوں نگاہ کو صرف کیا جائے نیز قرآن شریف میں حکم بھی ہے۔

قل[1] للمؤمنين يغضوا من ابصارهم و يحفظوا فروجهم اور دوسری جگہ ارشاد ہے:
الذين[2] يمشون على الارض هونا يعني غاضين ابصارهم اہل لطائف نے لکھا ہے کہ شیطان نے بنی آدم کو بہکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں:

ثم[3] لأتينهم من بين ايديهم و من خلفهم و عن ايمانهم و عن شمائلهم اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا۔یعنی فوق[4] اور تحت اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں محفوظ ہیں۔لیکن اوپر سے مراد دہلی کے چاندنی چوک[5] کا کوٹھا نہیں ہے بلکہ آسمان مراد ہے۔ لیکن ہر وقت اوپر دیکھنا بہت دشوار تھا۔اس لئے سب سے اسلم سمت تحت ہے باقی چار سمتیں قدام[6]، خلف یمین، شمال ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اسی سبب سے بعض اکابر نے یہاں تک کیا ہے کہ شہر چھوڑ کر جنگل میں بود و باش اختیار کر لی۔

حکایت: شیخ سعدیؒ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے۔

بزرگے[7] دیدم اندر کوہسارے	نشستہ از جہاں در کنج غارے
چرا[8] گفتم بشہر اندر نیائی	کہ بارے بند از دل برکشائی
بگفت[9] آں جا پری دیاں نغزند	چوگل بسیار شد پیلاں بلغزند

---

[1] کہہ دیجئے ایمانداروں سے کہ نیچے رکھیں اپنی آنکھوں کو اور حفاظت کریں اپنی شرمگاہوں کی۔۱۲
[2] جو لوگ نرم چال سے چلتے ہیں مطلب یہ کہ نیچی آنکھیں کر کے [3] پھر آؤں گا میں ان کے پاس آگے سے اور پیچھے سے اور داہنے سے اور بائیں سے ۱۲۔ [4] اوپر اور نیچے ۱۲۔ [5] جہاں بازاری عورتیں بناؤ سنگار کر کے بیٹھتی ہیں ۱۲ [6] آگے، پیچھے، داہنے، بائیں۔ [7] میں نے ایک بزرگ کو ایک پہاڑ میں دیکھا سارے جہان سے الگ ہو کر ایک غار میں بیٹھے تھے۔ [8] میں نے پوچھا آپ شہر کے اندر کیوں نہیں آتے کسی وقت تو دل پر سے بندش کو کھول دیتے۔ [9] بولے وہاں تو حسین اور پری چہرہ لوگ ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہو جاتا ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں۔

اسی حالت کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

زاہد[۱] نہ داشت تاب جمال پری رخاں   کنجے گرفت و ترس خدارا بہانہ ساخت

بہر حال ایسا ہوتا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان چاروں سمتوں کی جانب دیکھنا بہت کم کر دیا جائے اور اوپر کے دیکھنے میں گرنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا پس تجربہ عقل و نقل سب سے معلوم ہو گیا کہ حفاظت اور امن کی سمت سمت تحت[۲] ہے۔

بعض احمقوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تمام وقت فضولیات ہی میں برباد کرتے ہیں۔ مثلاً اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جناب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ کوئی اس عقلمند سے پوچھے کہ تجھ کو حضرت معاویہؓ کے معاملہ کی کیا پڑی تو اپنا معاملہ[۳] درست کر۔

حکایت: مولانا محمد نعیم صاحبؒ لکھنوی فرنگی محلی کے پاس ایک رنگریز آیا کہنے لگا حضرت معاویہؓ کے معاملہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میاں تم جا کر کپڑے رنگو۔ جب تمہارے پاس حضرت معاویہؓ کا مقدمہ آئے گا تو لینے سے انکار کر دینا اور کہہ دینا کہ میں نے اس کی تحقیق نہیں کی تھی۔ مگر مجھے کسی نے بتلائی بھی نہیں۔

حکایت: ایک اور صاحب ایک مولوی صاحب کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کی بابت دریافت کرتے ہوئے آئے کہ وہ ایماندار تھے یا نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ تم کو نماز کے فرائض معلوم ہیں یا نہیں۔ کہنے لگا کہ نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ غضب کی بات ہے کہ نماز جس کا سوال سب سے اول قیامت میں ہوگا۔ اس کے وہ فرائض جن سے دن میں پانچ مرتبہ کام پڑتا ہے۔ اور جن کے معلوم نہ ہونے سے احتمال ہے کہ وہ فوت ہو جائیں تو نماز ہی نہ ہو ان کی تم کو خبر نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کا ایمان جس کی بابت یقیناً ہم سے نہ قیامت میں سوال ہوگا نہ دنیا کا کوئی کام اس علم پر

---

[۱] زاہد پری چہرہ حسینوں کے جمال کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ ایک کونہ اختیار کیا اور خدا کے خوف کو بہانہ بنا لیا۔
[۲] نیچے کی جانب ۱۲ [۳] جو خدا اور رسول کے ساتھ ہے کتنے فرائض و واجبات ادا کئے کتنے چھوڑے۔ کتنے حرام و گناہ سے بچے۔ کتنے سے نہیں۔

موقوف اس کی تحقیق کی جاتی ہے۔ صاحبو! اگر کوئی برا ہے تو تم کو کیا غرض اور اچھا ہے تو تم کو کیا مطلب تمہیں اپنی اچھائی برائی کی فکر ہونی چاہیے۔

حکایت: حضرت رابعہ بصریؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کبھی شیطان کو بھی برا نہ کہتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ جتنی دیر اس فضول کام میں صرف کی جائے اتنی دیر تک اگر محبوب کے ذکر میں مشغول رہیں تو کس قدر فائدہ ہے۔ شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ

چہ[1] خوش گفت بہلول فرخند خوئے   چو بگذشت بر عارف جنگ جوئے

گر ایں[2] مدعی دوست بشناختے   بہ پیکار دشمن نہ پرداختے!

دیکھو اگر کسی کا محبوب بغل میں بیٹھا باتیں کر رہا ہو اور اس حالت میں ایک شخص آ کر اس عاشق کو ماں کی سڑی ہوئی گالی دے تو عاشق کی طبیعت اس کو گوارا کرے گی کہ محبوب کو چھوڑ کر انتقام لینے کے درپے ہو جائے۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو کہا جاوے گا کہ اس کا عشق نہایت خام اور ناتمام ہے۔ اسی طرح سمجھ دار لوگ ایسے موقع پر سمجھ جاتے ہیں کہ شیطان جو ہمارا خاص دشمن ہے وہ اس شخص کو بہکا کر لایا ہے کہ اس کو دوسری طرف مشغول کر کے بہکائے اس لئے وہ پروا بھی نہیں کرتے اور محبوب کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جتنی اس میں کمی ہوتی ہے اسی قدر[3] ان میں بھی کمی ہوتی ہے۔

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ بزرگوں کی شان اور ان کے حالات کس طرح مختلف ہوتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں ان کے پاس جاؤ معلوم ہو جائے گا کہ بزرگوں کے حالات میں کیا فرق ہوتا ہے چنانچہ وہ شخص گیا اور جا کر دیکھا کہ کوئی بے ادب آیا اور ان بزرگوں میں سے اول ایک کے ایک چپت رسید کی۔ انہوں نے اٹھ کر اتنے ہی زور سے ایک چپت اس کے بھی ماردی اور پھر بیٹھ کر ذکر

---

[1] عمدہ اخلاق والے حضرت بہلول نے کیا اچھا کہا ہے جب کہ ایک معرفت والے بزرگ پر جو جھگڑ رہے تھے گزرے۔۱۲ [2] اگر یہ دعویدار معرفت واقعی خدا کو پہچان لیتا تو دشمن سے لڑائی کرنے میں مشغول ہی نہ ہوتا۔۱۲
[3] یعنی جتنی کمی محبوب کی طرف توجہ اور غیر سے بے پروائی میں ہوگی اتنی ہی کمی ان کے درجہ میں ہوگی۔

میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دوسرے بزرگ کی طرف متوجہ ہوا اور ایک چپت ان کے بھی ماردی۔ وہ بولے بھی نہیں اور اپنے کام میں لگے رہے اس کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوا اور ایک چپت ان کے ماری۔ انہوں نے اٹھ کر فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو دبانا اور پیار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں بہت چوٹ لگی ہوگی۔ یہاں سے یہ تماشہ دیکھ کر ان بزرگ کے پاس گیا اور تمام ماجرا بیان کیا۔ کہنے لگے کہ بس اتنا ہی فرق ان تینوں کی حالت اور شان میں بھی ہے۔ تو دیکھ لیجیے کہ جو غیر صابر[1] تھے اور انتقام لئے بغیر نہ رہ سکے وہ بھی لایعنی کے مرتکب نہیں ہوئے یعنی مارنے والے سے یہ سوال تک بھی نہیں کیا کہ تو نے ایسی حرکت کیوں کی بلکہ جزآء[2] سیئة سیئة بمثلها پر عمل کر کے ایک چپت خود بھی اس کو ماردی پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

عیب[3] گوئی اور عیب جوئی کے مفاسد

ایک خرابی اور مضرت عیب جوئی اور عیب گوئی میں یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ جس شخص کی برائی کیجا رہی ہے اس کو خبر نہ ہو اور خبر ہونے کے بعد بہت دشوار ہے کہ وہ تم کو برا نہ کہے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کہنے کی تم کو خبر نہ ہو اور اس تمام الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں عداوتیں بڑھیں اور دشمنیاں قائم ہوں اور پھر یہ عداوتیں بعض اوقات پشتہا پشت تک چلتی ہیں اور بنا ان کی محض ذراسی بات کہ اس نے ہم کو یوں کہہ دیا تھا حالانکہ اگر کہہ بھی دیا تو کیا عزت میں فرق آ گیا۔

حکایت: ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے چند مرید ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک شخص نے دیکھ کر کہا کہ یہ شخص بڑا ٹھگ ہے ایک مرید کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس شخص کو مارنے کو چلا پیر صاحب نے روکا اور گھر پر لے گئے اور بہت سے لفافے جو ان کے نام آئے ہوئے تھے اس کے سامنے ڈال دیئے ان لفافوں میں بڑے بڑے القاب

---

[1] نہ صبر کرنے والے کہ بغیر بدلہ لیے نہ رہ سکے بشرطیکہ یہ ان کا بدلہ اس کشف کے ساتھ نہ ہو کہ اس پر وبال آتا دیکھ کر بچانے کے لئے بدلہ لے لیا ہو۔ [2] برائی کا بدلہ اسی کے برابر ہے ۱۲۔ [3] دوسروں کے عیب کھول دینے اور ان کی تفتیش کرنے کی خرابیاں ۱۲

وآداب لکھے ہوئے تھے۔ کسی میں قبلہ کونین و کعبہ دارین کسی میں رہنمائے جہاں وغیرہ وغیرہ اور فرمایا کہ بھائی نہ تو اس قدر برا ہوں جتنا اس شخص نے کہا اور نہ اس قدر اچھا ہوں جتنا ان لوگوں نے لکھا پس اگر خلاف واقع کہنے کی وجہ سے اس شخص پر غصہ آیا تو ان لوگوں پر بھی تو غصہ آنا چاہیے۔ اور ان کا منہ بھی تو بند کرنا چاہیے جو کہ جنید عصر اور فرید وقت کہتے ہیں۔

حکایت: مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کو ایک شخص نے آکر برا بھلا کہنا شروع کیا۔ مولانا چونکہ بڑے مرتبہ کے شخص تھے طالب علموں کو سخت غصہ آیا اور اس کے مارنے کو اٹھے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی سب باتیں تو جھوٹ نہیں کہتا کچھ تو سچ بھی ہیں تم اسی کو دیکھو۔

حکایت: اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کو ایک شخص نے برا کہا تو آپ نے اس کو ہدیہ بھیجا اور امام صاحبؒ کی نسبت لکھا ہے کہ آپ کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اگر کسی کی غیبت کروں تو اپنی ماں کی غیبت کرنا زیادہ مصلحت ہے تاکہ میری نیکیاں میری ماں ہی کے پاس رہیں۔ غیروں کے پاس تو نہ جائیں حضرت امام سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ بڑے عقلمند ہیں کہ ہم لوگوں کی نیکیاں تو وہ لے لیتے ہیں (یعنی چونکہ ہم ان کی بابت کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں) اور وہ اپنی نیکیاں کسی کو نہیں دیتے (یعنی چونکہ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے) صاحبو! غور کرو کہ ایک یہ اسلاف[1] ہیں جن کے وہ حالات تھے ایک ہم اخلاف[2] ہیں کہ جن کے یہ حالات ہیں خوب کہا ہے

شنیدم[3] کہ مردان راہ خدا — دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا[4] کے میسر شود ایں مقام — کہ بادوستانت خلافست و جنگ

اہل اللہ سے پرخاش[5] کا نتیجہ

حکایت: دہلی کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ایک مرتبہ حریر[6] پہننے کی طرف میلان ہوا۔ بعض تنخواہ دار مولویوں نے اس کے حلت کا فتویٰ دے دیا۔ اور بہت سے وجوہ[7]

---

[1] پہلے لوگ گزرے ہوئے بزرگ [2] پیچھے آنے والے [3] سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کے جوانمرد لوگوں نے کبھی دشمنوں کا بھی دل نہیں دکھایا۔ [4] تم کو یہ مرتبہ کہاں میسر ہوسکتا ہے کیونکہ تمہاری تو دوستوں سے بھی مخالفت اور لڑائی ہے۔ [5] مخالفت۔ [6] ریشم۔ [7] جائز ہونے کی وجہیں ۱۲

حلت کے لکھ دیئے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر ملا جیونؒ بھی دستخط کر دیں تو میں پہن لوں گا۔ ملا جی کے پاس استفتا گیا آپ نے کہلا بھیجا کہ میں دہلی آ کر جواب دوں گا اور جامع مسجد میں جواب دوں گا۔ چنانچہ آپ دہلی تشریف لائے اور جامع مسجد میں ممبر پر جا کر بعد نقل سوال وجواب کے استحلال[1] معصیت کی بناء پر زجر کے لئے فرمایا کہ ''مفتی[2] و مستفتی ہر دو کافرند'' بادشاہ یہ سن کر نہایت غضبناک ہوا اور اس نے قتل کا حکم دیا۔ بادشاہ کے ایک فرزند کو جو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے ملا جی کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے قتل کی تدابیر ہو رہی ہیں۔ ملا جی نے جو سنا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں نے کیا ایسا قصور کیا ہے اور فرمایا کہ وضو کے لئے پانی لاؤ کہ میں بھی ہتھیار باندھ لوں کیونکہ الوضوء[3] سلاح المومن حقیقت میں ان حضرات کو تنہا نہ سمجھنا چاہیے۔ حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

بس[4] تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد بر افتاد

حدیث[5] شریف میں ہے۔ من عادی لی ولیاً فقد اٰذنته بالحرب شہزادہ نے جو آپ کے جلال کی حالت دیکھی تو دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کیا غضب کرتے ہیں۔ ملا جی آپ کے مقابلہ کے لئے وضو کر رہے ہیں اور سلاح وضو درست کر رہے ہیں۔ سج رہے ہیں۔ بادشاہ یہ سن کر تھرا گیا اور کہا کہ اب کیا کروں میں تو حکم دے چکا ہوں۔ شہزادے نے کہا کہ سب کے سامنے میرے ہاتھ ایک خلعت بھیج دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تب ملا جی کا غصہ فرو ہوا۔

تربیت اخلاق سے پہلے مقتدا بن جانے کے مفاسد

بعض لوگ جن کی تربیت نہیں ہوتی اور مقتدا ہو جاتے ہیں انکے اخلاق نہایت خراب ہوتے

---

[1] گناہ کو حلال قرار دینے کی وجہ سے [2] فتویٰ دینے لینے والے دونوں کافر ہیں۔ غالباً ریشم کے حرام ہونے کی حدیثوں کو متواتر قرار دے کر فرمایا کیونکہ حرام قطعی کا انکار کفر ہوتا ہے۔ یا توہین حکم قرار دے کر [3] وضو مومن کا ہتھیار ہے۔ [4] ہم نے اس بدلہ کے گھر میں بہت تجربہ کیا ہے۔ کہ تلچھٹ پینے والوں سے جو الجھتا ہے گر ہی پڑتا ہے ۱۲ [5] جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی کرے گا میں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں ۱۲

ہیں اور وجہ اسکی یہی ہے کہ وہ چھوٹا ہونے کے قبل بڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

اے[1] بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی — تا راہ بیں نباشی تو کہ راہبر شوی

در[2] مکتب حقائق و پیش ادیب عشق — ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

تو پسر[3] بننے سے پہلے پدر[4] بن جانا بہت سی خرابیوں کا باعث ہے اس لئے سخت ضرورت ہے کہ اول چھوٹا بن کر اخلاق کی درستی کی جائے کہ اس سے اعمال کی بھی درستی ہو جائے گی۔ اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے فراغ دیا ہے وہ تو کم از کم چھ ماہ تک کسی بزرگ کی خدمت میں رہیں لیکن اس طرح کہ اپنا تمام کچا چٹھا ان کے سامنے پیش کر دیں اور پھر جس طرح وہ کہیں اس طرح عمل کریں اگر وہ ذکر و شغل تجویز کریں تو ذکر و شغل میں مشغول ہو جائیں اور اگر وہ اس سے منع کر کے کسی دوسرے کام میں لگا دیں اس میں لگ جائیں اور ان کے ساتھ محبت بڑھائیں اور ان کی حالت کو دیکھتے رہیں کہ کسی چیز کے لینے کے وقت یہ کیا برتاؤ کرتے ہیں اور دینے کے وقت کس طرح پیش آتے ہیں اس کا اثر یہ ہوگا کہ تخلق بہ[5] اخلاق اللہ ہو جائے گا اور پھر اس کی ذات سے سراسر نفع ہی پہنچے گا۔ اور جن لوگوں کو فراغ نہیں ہے وہ یہ کریں کہ وقتاً فوقتاً جب ان کو دو چار یوم کی مہلت ہوا کرے اس وقت کسی بزرگ کے پاس رہ آیا کریں اور اپنی اولاد کے لئے یہ کرو کہ روز مرہ جیسا ہر کام کے لئے نظام[6] الاوقات ہے ایسا ہی اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر دو کہ فلاں مسجد میں فلاں بزرگ کے پاس کچھ دیر جا کر بیٹھا کریں۔

خدا تعالیٰ سے محبت کاملہ کی ضرورت اور اس کی تحصیل کا طریقہ

اپنے قلوب کو ٹٹولو کہ خدا تعالیٰ سے محبت کاملہ ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو اس کی تحصیل کی

۱؎ اے ناواقف کچھ کام تو کر کہ تو واقف بن جائے جب تک تو خود راہ دیکھنے والا نہ ہوگا راہبر کب بن سکے گا
۲؎ حقیقتوں کے مکتب اور عشق کے استاد کے پاس اے بیٹے کچھ کام کرتا کہ ایک دن باپ بن جائے۔ ۳؎ بیٹا
۴؎ باپ ۵؎ اللہ تعالیٰ کی عادتوں کے موافق عادت بنانا جس کا حدیث میں حکم ہے۔ ۶؎ وقت مقرر کر کے ہر کام کا انتظام ۱۲

تدبیر کرو اور تدبیر بھی میں بتلاتا ہوں لیکن یہ نہ سمجھ لیجیو کہ محبت امر غیر اختیاری ہے۔ اس کا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے پھر اس کی تدبیر کیا ہو تو کیوں کہ یہ گمان غلط ہے۔ محبت گو خود غیر اختیاری ہو مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں جن پر ترتب[1] محبت کا عادۃً ضروری ہے اور ایسے امور میں خدا تعالیٰ نے ہر امر کی تدبیر بتلائی ہے۔ سو وہ تدبیر یہ ہے کہ تم چند باتوں کا التزام[2] کر لو۔ ایک تو یہ کہ تھوڑی دیر خلوت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر لیا کرو۔ اگر چہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو۔ لیکن اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔ دوسرے یہ کیا کرو کہ کسی وقت تنہائی میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو اور پھر اپنے برتاؤ پر غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کیا معاملہ کر رہے ہیں اور ہمارے اس معاملے کے باوجود بھی خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح پیش آ رہے ہیں۔ تیسرے یہ کرو کہ جو لوگ محبان خدا ہیں ان سے علاقہ پیدا کر لو اگر ان کے پاس آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی جاری رکھو لیکن اس خیال کا رکھنا ضروری ہے کہ اہل اللہ کے پاس اپنے دنیا کے جھگڑے نہ لے جاؤ۔ نہ دنیا پوری ہونے کی نیت سے ان سے ملو بلکہ خدا کا راستہ ان سے دریافت کرو۔ اپنے باطنی امراض[3] کا ان سے علاج کراؤ اور ان سے دعا کراؤ۔ چوتھے یہ کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری پوری اطاعت کرو۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے۔

اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے۔ پانچویں یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ وہ اپنی محبت عطا فرماویں۔ یہ پانچ جزو کا نسخہ ہے اس کو استعمال کر کے دیکھئے ان شاء اللہ تعالیٰ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ سے کامل محبت ہو جائے گی اور تمام امراض باطنی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

خشوع[4] کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے

خشوع کہ عمل قلب ہے ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ساری اطاعت کا راس[5] ہے۔ مگر ہم لوگ اس کی ذرا فکر اور اہتمام نہیں کرتے اور ہماری اس حالت فقدان خشوع کی

---

[1] محبت الٰہی کا مرتب وواقع ہو جانا عادت کے موافق ۱۲۔ [2] اپنے اوپر لازم کر لینا ۱۲۔
[3] دل، روح اور اخلاق کی بیماریاں اور خرابیاں۔ ۱۲ [4] دل کی عاجزی اور لرز لرز جانا۔ [5] سر یعنی جوہر

شکایت نہایت صاف لفظوں میں قرآن شریف میں بھی فرماتے ہیں۔

الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللّٰہ

ترجمہ: کیا وقت نہیں آیا مسلمانوں کے لئے اس بات کا کہ ان کے دل عاجزی کریں اللہ کی یاد کے وقت۔

یعنی کیا مسلمانوں کے لئے ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب خشوع کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ شکایت اس امر کے ترک پر ہوتی ہے جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری عمل ہے اور اس کا مقابل قساوت[1] ہے چنانچہ ارشاد ہے:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ

ترجمہ: بھلا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے کھول دیا اسلام کے لئے پس وہ اپنے پروردگار کی جانب سے روشنی پر ہے (کہیں سخت دل کی برابر ہوسکتا ہے) تو افسوس ان کو جن کے دل سخت ہیں یاد الٰہی سے۔

اور آگے فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا بہتر کلام ایک کتاب کہ جس کی بعض باتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ دوہرائی ہوئی کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اس کے سننے سے ان لوگوں کی کھال پر جو ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے پھر نرم ہوجاتی ہیں ان کی کھالیں اور دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں۔

تو اس آیت میں قساوت کا مقابلہ لین[2] کو فرمایا ہے اور لین وہی خشوع ہے تو معلوم ہوا کہ خشوع کا مقابل قساوت ہے اور قساوت کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔

ان ابعد شیٔ من اللّٰہ القلب القاسی

ترجمہ: سب چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور سخت دلی ہے۔

تو خشوع کی تائید کرنا جیسا کہ سابق کی آیات میں ہے اور قساوت کی مذمت کرنا جس

---

[1] دل کا سخت ہوجانا اور اکڑا رہنا۔ [2] نرم ہوجانا۔

کا حاصل خشوع کے ترک پر مذمت کرنا ہے۔ جیسا مابعد کی آیت میں ہے اس سے زیادہ اس کے ضروری اور واجب ہونے کے لئے کیا چاہیے۔ پس ہر عالم اور طالب علم کے لئے لازم ہے کہ وہ قلب میں خشوع پیدا کرے اور اس کے ظاہری آثار یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے۔ بات چیت میں معاملات میں سختی نہ کرے۔ غیظ و غضب میں مغلوب نہ ہو۔ انتقام کی فکر میں نہ رہے۔ علی ہذا اور ان کو آثار اس لئے کہا کہ جب قلب میں خشوع کی صفت ہوگی تو جوارح[1] پر اس کا اثر ضرور پڑے گا۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ:

حکایت: حضورؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور داڑھی سے کھیل رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو یہ ایسا ہرگز نہ کرتا۔ اب اس کی ضرورت اور آثار معلوم ہو جانے کے بعد دیکھ لیجئے کہ آیا ہمارے قلب میں خشوع ہے یا نہیں۔ اور ہم **ان تخشع[2] قلوبهم** کے مضمون میں داخل ہیں یا نہیں اور ہمارے قلوب میں ترفع[3] اور شیخی تو نہیں پائی جاتی۔ پس اگر ہمارے قلوب میں خشوع ہے تو کیا وجہ کہ اس کے آثار نہیں پائے جاتے۔ اس کی کیا وجہ کہ ہم کو اپنا کام خود کرنے سے یا کسی مسلمان کا کام کرنے سے عار آتی ہے۔ صاحبو! حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی مخدوم نہیں ہے۔ پھر دیکھ لیجئے کہ حضورؐ کی کیا حالت تھی۔ فرماتے[4] ہیں۔ **انی اکل کما یاکل العبد** کہ میں کھانا اس طرح کھاتا ہوں کہ جیسے کوئی غلام کھاتا ہے۔ جس میں تجبر[5] اور تکبر کا نام نہیں ہوتا۔ حدیثوں[6] سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکڑو بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ چلنے پھرنے[7] کی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی آگے نہ چلتے تھے بلکہ کچھ اصحابہ آگے ہوتے تھے اور کچھ برابر میں ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے اور یہ کسی کا آگے اور کسی کا پیچھے چلنا بھی کسی خاص نظم اور ترتیب سے نہ تھا۔ جیسے آج کل بادشاہوں اور بڑے لوگوں کی عادت ہے کہ جب چلتے ہیں تو باقاعدہ کچھ لوگ ان کی عزت اور شان بڑھانے کو

---

[1] ظاہری اعضا ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، منہ، زبان [2] یہ کہ ان کے دل عاجزی کریں۔ [3] اپنے کو اونچا سمجھنا۔ [4] مشکوۃ شرح السنہ [5] جابرانہ شان اور بڑائی۔ [6] ترمذی شمائل [7] ترمذی شمائل

ان کے آگے پرا جمائے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ان کے پیچھے ہوتے ہیں سو یہ نہ تھا بلکہ جس طرح بے تکلف احباب ملے جلے چلتے ہیں کہ کبھی کوئی آگے ہو گیا اور کبھی کوئی آگے ہو گیا۔ اس طرح چلتے تھے۔ لباس کی یہ شان تھی کہ ایک[1] کپڑے میں کئی کئی پیوند لگا کر پہنتے تھے۔ آرام کرنے کی یہ[2] حالت تھی کہ ٹاٹ کے اوپر آرام کرتے تھے۔ معاشرت کی یہ حالت[3] تھی کہ اپنا کاروبار خود کرتے تھے۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں جا کر خرید لاتے تھے۔ غرض سب افعال جو حضورؐ کے منقول ہیں تو کس لئے کیا اس لئے کہ ہم سنیں اور پرواہ بھی نہ کریں۔ صاحبو! جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول متبوع ہے اسی طرح آپ کا فعل بھی متبوع ہے جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔ ارشاد ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمہارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتداء کافی ہے۔

تو یہ افعال بھی سب اتباع ہی کے لئے ہیں کہ ہماری بھی وہی وضع ہو وہی چال ڈھال ہو وہی معاشرت ہو۔

حکایت: ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانا کھاتے دیکھا تو کانپ اٹھا کہ حضورؐ تواضع کی کس حیثیت سے بیٹھے ہیں۔

حکایت: ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی باہر کا ایلچی ڈر گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے مت ڈرو۔ میں ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو کہ سوکھا گوشت کھاتی تھی۔ حضورؐ کے ان حالات کو دیکھیے اور پھر اپنے کو۔ تو معلوم ہوگا۔

ببیں[4] تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

حدیث[5] شریف میں وارد ہے۔ **البذاذة من الایمان** کہ سادگی ایمان کا ایک شعبہ ہے سو دیکھ لیجئے کہ ہم میں بذاذت اور سادگی پائی جاتی ہے یا نہیں میرے خیال میں جہاں تک غور کیا جائے گا ہم میں سادگی کا پتہ بھی نہ ملے گا۔ اور نہایت افسوس اس امر کا ہے کہ اس وقت خود اکثر اہل علم میں عورتوں کی سی زینت آ گئی ہے۔ صاحبو! یہ ہمارے لئے دین کے

---

[1] ترمذی شمائل [2] ترمذی شمائل [3] ترمذی ۱۲ [4] دیکھو تو راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے۔
[5] ابن ماجہ

اعتبار سے بھی اور دنیا میں بھی سخت نقص ہے۔ اس سے بجائے عزت بڑھنے کے اور ذلت بڑھتی ہے۔ ہمارا کمال تو یہ ہے کہ

اے[1] دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

دررہ[2] منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

خشوع کے حاصل کرنے کا طریقہ

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم میں صفت خشوع موجود ہے تب تو ہم کو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت موجود نہیں ہے تو خود اس کی تحصیل کے لئے ایسا کرنا یعنی اس کے آثار کا اختیار[3] کرنا ضروری ہے کیونکہ تحصیل خشوع کی علت کے اجزاء میں سے ایک جزوی[4] ہے، اور دوسرا جزو یہ ہے کہ اہلِ خشوع کی صحبت اختیار کی جائے تیسرا جزو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت کو دل میں جگہ دی جائے۔ اور خشیت پیدا کرنے کے لئے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی وقت مناسب تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی حالت عصیاں اور پھر خدا تعالیٰ کے نعم[5] اور نیز اس کے عذاب آخرت اور قیامت کے[6] اہوال پل صراط، میزان، دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا کرے اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کو معمول کر لیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد فائدہ ہو کیونکہ اس کو خشیت کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خشیت سے خشوع ہوگا۔ نیز دوسرے طور پر بھی اس کو حصول آثار خشوع میں دخل ہے وہ یہ کہ سب سے پہلا اثر جو اس سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے دل بالکل اٹھ جاتا ہے اور جب دنیا سے دل اٹھ جاتا ہے تو تکلف اور زینت اور اسی طرح دل بستگی کے سب آثار جاتے رہتے[7] ہیں اور اس قسم کی تمام باتوں سے نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس شخص کے پیش نظر ہر وقت سفر آخرت رہے گا اور دنیا میں اپنے تئیں مسافر سمجھے گا۔ اور ظاہر ہے کہ مسافر کو سفر

---

[1] اے دل بہتر تو یہ ہے کہ تو گلابی شراب سے مست ہو جاؤ بغیر سونے اور خزانے کے ہی قارون کی سو عزتوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ [2] لیلیٰ کے گھر کے راستہ میں کہ جان پر بہت کچھ خطرے ہیں۔ پہلے قدم ہی کی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں بن جاؤ۔ [3] عاجزی کے مناسب لباس و وضع بنا لیا۔ [4] عاجزی کی وضع۔ [5] نعمتوں [6] ہولناک باتیں۔ [7] یعنی یہ تکلفات کی تکلیفات اور بناوٹ دکھاوا نہ رہیں گے ۱۲

میں دل بستگی نہیں ہوا کرتی اس کو منزل کا خیال ہر وقت سوہان روح رہتا ہے۔ چوتھا جزو علت خشوع کا یہ ہے (اور یہ بعد فراغ کتب درسیہ آپ کے ذمہ واجب العمل ہے) کہ اگر آپ نے ظاہری علوم کی تحصیل میں دس سال ختم کئے ہیں تو باطن کی درستی میں فی سال ایک ماہ ہی خرچ کر دیجئے یعنی کم از کم دس مہینے ہی کسی کامل کی خدمت میں صرف کیجئے۔ اور اس کے ارشاد کے مطابق چلیے۔ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے دولت خشوع عطا فرماتے ہیں۔ اور علم کا اثر قلب کے اندر پیوست ہو جاتا ہے۔ خوب کہا ہے۔

علم[1] چوں برتن زنی مارے بود　　علم چوں بردل زنی یارے بود

اصلاح باطن کی ضرورت اور اس کا طریقہ

اصلاح ظاہر کے ساتھ اصلاح باطن کی بھی ضرورت ہے اور اس کی تدبیر مولانا روم کہ جو اس فن کے کامل ہیں اس طرح بتلاتے ہیں۔

قال[2] را بگذار و مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

صحبت[3] نیکاں اگر یک ساعت است　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

یک[4] زمانے صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

نفس[5] نتواں کشت الا ظل پیر　　دامن آں نفس کش را سخت گیر

گر[6] ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر و پس بیا

اور فرمایا ہے

در[7] ارادت باش ثابت اے فرید　　تا بیابی گنج عرفاں را کلید

---

[1] علم کو جب بدن بدن تک رکھو گے تو ایک سانپ ہوگا اور دل میں پہنچا دو گے تو مددگار بن جائے گا۔
[2] باتیں بنانا چھوڑ و حالات کے مرد بنو۔ کسی کامل مرد خدا کے سامنے مٹ جاؤ۔ [3] نیکوں کی صحبت اگر تم کو ایک گھنٹہ بھی ہے تو سو سال کی عبادت اور دنیا کی بے رغبتی سے بہتر ہے کہ اس سے وہ لگن لگے گی جو ان سے نہ لگ سکے گی۔ [4] اولیاء اللہ کے ساتھ کچھ زمانہ تک صحبت سو سال کی بے ریا کی عبادت سے بہتر ہے۔ [5] نفس کو بغیر پیر کے سایہ کے مار ڈال نہیں سکتے۔ اس لئے نفس کو مارنے والے کے دامن کو مضبوط پکڑ لو۔ [6] اے دل اگر تو اس راستہ کی طلب رکھتا ہے تو رہبر کا دامن پکڑ لے اور پیچھے پیچھے آ جا۔
[7] اے فرید! تو مریدی میں ثابت قدم رہ تا کہ معرفت کے خزانہ کی چابی حاصل کر لے۔

شاید کسی کو ناز ہو کہ ہمارے پاس تو کتابیں ہیں ان کو دیکھ کر ہم سب کچھ حاصل کر لیں گے اس لئے آگے فرماتے ہیں۔

بے[1] رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اس شعر کو سن کر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے تو متعدد حضرات کی نسبت سنا ہے کہ وہ بغیر مرید ہوئے اس راہ میں کامیاب ہو گئے۔ اس لئے اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

یار[2] باید راہ را تنہا مرد　　بے قلاؤز اندرین صحرا مرد

ہر[3] کہ تنہا نادر ایں راہ رابرید　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

یعنی اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو وہ بھی محض ظاہراً ہوا ہے ورنہ واقع میں وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور امداد ہی سے مقصود تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کو اس کی مدد کی خبر بھی نہ ہو۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے بچے کی پرورش کہ بدوں ماں باپ کی مدد اور اعانت کے وہ پرورش نہیں پا سکتا لیکن اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی تو اگر وہ بچہ بڑا ہو کر کہنے لگے کہ میں بغیر کسی کی مدد کے اتنا بڑا اقوی الجثہ ہو گیا ہوں تو جس طرح اس کا یہ قول غلط اور قابل مضحکہ ہے اسی طرح اس راہ کے قطع کرنے والے کا بھی قول بالکل غلط ہوگا۔ بات یہ ہے کہ بعض مرتبہ ظاہراً ایک شخص کو کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا لیکن واقع میں بہت سے حضرات بامر خداوندی اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور وہ اس کو غلطیوں میں پھنسنے سے بچاتے ہیں اور قطع راہ میں مدد فرماتے ہیں۔ بہر حال اس جزو[4] کی بھی سخت ضرورت ہے لیکن اس پر اسی وقت عمل کرنا مناسب ہے کہ جب کتب درسیہ سے فارغ ہو چکے اور اساتذہ ادھر متوجہ ہونے کی اجازت دے دیں اور اگر اساتذہ ختم درسیات کے بعد بھی چندے درسیات ہی میں مشغول رہنے کا حکم فرمائیں تو ان کے ارشاد پر عمل کرے اور جب تک کافی مناسبت نہ ہو جاوے اس وقت تک درسیات ہی میں مشغول رہے اور جب کافی مناسبت ہو جائے تو چند روز کسی کے پاس

---

[1] بغیر ساتھی یعنی پیر کے جو عشق کی راہ میں چلا اس کی عمر گزر گئی اور عشق کی خبر بھی نہ ہوئی۔ [2] مددگار یعنی پیر چاہیے اس راہ کے لئے تنہا مت چلو بغیر واقف راہبر کے اس جنگل میں نہ جاؤ۔ [3] جس کسی نے شاذ و نادر تنہا ہی یہ راستہ قطع کر لیا ہے تو وہ بھی مردان خدا کی روحوں کی قوت کی مدد سے ہی منزل پر پہنچا ہے۔ [4] پیر سے متعلق ہونے کی

رہ کر اصلاح باطن کر لے اور پھر درس و تدریس کا شغل بھی جاری کر دے۔ یہ ہے تدبیر خشوع کے پیدا ہونے کی۔

خلاف شرع مجاہدہ اور مخالفت نفس کوئی چیز نہیں ہے

خدا تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز تقویٰ ہے یعنی جن[1] باتوں سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں ان کو ترک کر دینا باقی یہ مخترع[2] رسوم سو یہ کوئی چیز نہیں کیوں کہ محض نفس کی مخالفت کرنے سے خدا تعالیٰ کی رضامندی حاصل نہیں ہو سکتی اور یہ ایسا مرض ہے کہ آج کل کے صوفی بھی اکثر اس میں مبتلا ہیں۔ یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس قدر نفس کی زیادہ مخالفت ہوگی۔ خدا تعالیٰ زیادہ راضی ہوں گے اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر گوشت کھانا حرام کر لیتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کے خزانہ میں ان کے اس فعل سے بڑی توفیر[3] ہو گئی۔ اسی طرح بعضے لوگ سرد پانی نہیں پیتے۔ بعضے چار پائی پر نہیں سوتے اور بعضے لوگ جن کو دولت اسلام نصیب نہیں وہ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اپنے اعضاء تک سکھا دیتے ہیں چنانچہ ایسے جوگی سنے گئے ہیں کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سکھا دیا میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چاروں طرف آگ جلا رکھی ہے اور اس کے بیچ میں خود بیٹھا ہے گویا یہیں دکھلا رہا ہے کہ میں دوزخی ہوں۔ یہ سب جہل کی باتیں ہیں حدیث میں وارد ہے۔

ان لنفسک علیک حقاً و ان لعینک علیک حقاً

ترجمہ: تجھ پر تیرے نفس کا بھی حق ہے اور تیری آنکھ کا بھی (تو اتنی مشقت مت اٹھا) اتنی مشقت نہ اٹھاؤ کہ پھر بالکل کام ہی سے جاتے رہو۔ پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص تکلیف اپنی طرف سے اختراع[4] کر کے برداشت کرنا تقویٰ نہیں ہے لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں۔ اس لئے کہ اول تو وہ حضرات حدا باحت[5] سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ پھر وہ بھی اس کو بطور علاج کے کرتے تھے۔ عبادت اور ذریعہ قرب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مجاہدے کی ایسی مثال ہے

---

[1] گناہوں کو [2] گھڑی ہوئی [3] زیادتی۔۱۲ [4] ایجاد کرنا گھڑ لینا
[5] جواز کی حد سے آگے نہ جاتے تھے۔

کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگے یا کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑ دے کہ وہ اس دوا پینے اور ترک[1] اطعمہ کو عبادت نہیں سمجھتا۔ بلکہ ذریعہ حصول صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو وہ یقیناً گناہ گار[2] ہوگا۔ اس واسطے کہ اس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے تو اگر اس طرح سے کوئی گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا تو بلاشبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں بہر حال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔

حکایت: حضرت ابوالدرداءؓ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے۔ حضرت سلمانؓ نے ان کو روکا آخر مقدمہ جناب نبوی میں گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمانؓ سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا **انّ[3] لنفسک علیک حقاً الخ**

حکایت: مجھے ایک جاہل فقیر کی حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ ایک عالم کے صاحبزادے گھر سے خفا ہو کر چلے گئے۔ ایک مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں پہاڑ پر ایک فقیر رہتا ہے ان کو چونکہ دین سے مناسبت خاندانی تھی اس لئے ان کو اس فقیر سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک شخص ہے جس نے ایک آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ناک کا ایک سونت نجاست بھری بتی سے بند کر رکھا ہے انہوں نے اس حرکت کا سبب پوچھا تو اس فقیر نے کہا کہ ناک میں گو کی بتی تو اس لئے دی ہے کہ یہاں پھولوں کے درخت بہت ہیں ہر وقت خوشبو سے دماغ معطر رہتا ہے اور اس سے نفس پھولتا ہے تو میں نے نفس کا علاج کرنے کے لئے ایک طرف ناک میں نجاست کی بتی دے رکھی ہے تا کہ اس کی تکلیف سے نفس محظوظ[4] نہ ہونے پائے اور آنکھ پر پٹی اس واسطے باندھ رکھی ہے کہ کام تو ایک آنکھ سے بھی چل جاتا ہے پھر بلاضرورت دوسری آنکھ کو کیوں خرچ کیا جائے۔ یہ سن کر اس مسافر

---

[1] کھانے کی چیزوں کو چھوڑنا [2] بے اصل کو ثواب سمجھنا بدعت ہے [3] تجھ پر تیرے نفس کا بھی حق ہے اور تیری آنکھ کا بھی۔ [4] مزہ والا

نے کہا کہ فقیر صاحب میں خود تو عالم نہیں ہوں لیکن عالموں کی صحبت میں رہا ہوں۔ ان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بناء پر کہتا ہوں کہ نہ تو آپ کا وضو ہوتا ہے اور نہ نماز ہوتی ہے کیوں کہ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے وہ جگہ ہمیشہ خشک رہتی ہوگی اور یہ مانع[1] وضو ہے۔ للہذا آج تک کی سب نمازیں آپ کی برباد ہوئیں چونکہ وہ فقیر باعتبار نیت کے طالب حق تھا۔ صرف جہل سے مبتلا ہو گیا تھا اس کو سن کر بہت رویا اور توبہ کی واقعی جہل بھی بری چیز ہے۔

حکایت: ہمارے تھانہ بھون کا واقعہ ہے کہ یہاں ایک فقیر رہتا تھا بالکل جاہل اور محلے کے اکثر لوگ اس کے معتقد تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے نانا صاحب بھی چونکہ صلحائے فقراء سے ان کو خاص تعلق تھا۔ وہ بھی معتقد تھے۔ محلّہ بھر میں صرف ایک شخص تھا کہ وہ اس فقیر کا معتقد نہ تھا اور یہی کہتا تھا کہ جاہل آدمی کی کیا فقیری۔ اس حرکت پر تمام اہل محلہ اس کو ملامت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس شخص کو یہ شرارت سوجھی کہ اخیر شب میں تہجد کے وقت کسی ذریعہ سے اس فقیر کے مکان کی چھت پر جا بیٹھا۔ اور جب وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو نہایت دھیمی اور سریلی آواز میں ان کا نام لے کر پکارا اس نے اپنا نام سن کر پوچھا کہ کون پکارتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں ہوں اخی جبرئیل[2]۔ جبرئیل کا نام سن کر وہ نہایت غور سے متوجہ ہوا۔

الحائک[3] اذا صلی یومین انتظر الوحی

ترجمہ: جلاہا دو دن نماز پڑھ کر (اپنی کم عقلی کی وجہ سے) وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

اور کہا کیا ارشاد ہے اس نے جواب دیا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے تجھے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اب تو بہت بوڑھا ہو گیا ہم کو تیری کبڑی کمر دیکھ کر شرم آتی ہے اس لئے ہم نے اب تجھ سے نماز کو معاف کر دیا۔ یہ کہہ کر آپ وہاں سے چلے آئے۔ اس فقیر نے جو اخی جبرئیل کی زبان سے پروانہ معافی سنا تو پھر کیا تھا وضو کا لوٹا رکھا اور سو گئے۔ اب تہجد بھی غائب صبح بھی۔ ظہر بھی معتقدین نے جو دیکھا کہ بڑے میاں کئی وقت سے مسجد میں نہیں

---

[1] وضو صحیح ہونے کو روکنے والا اور جب وضو نہ ہوگا نماز بھی نہ ہوگی اور نجاست کی بتی الگ [2] عام لوگوں میں یونہی بولا جاتا ہے ورنہ اس لفظ کے معنی تو یہ ہوئے میرا بھائی جبرئیل کہنے والا معمولی آدمی تھا جیسا سنا کہہ دیا۔

[3] یہ مثل مشہور ہے مگر سب ایسے نہیں۔

آ ئے تو بعضوں کو فکر ہوئی ادھر ادھر تذکرہ شروع ہوا آخر گھر پہنچے تو دیکھا کہ اندر سے زنجیر بند ہے۔ بہتیری آوازیں دیں تو جواب ندارد آخر بڑی مشکل سے دروازہ کھولا بڑے میاں سے نماز میں نہ آنے کا سبب پوچھا تو اول تو مارے نخوت[1] کے آپ نے کچھ جواب ہی نہیں دیا لیکن جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ میرے پاس ابھی جبرئیل آئے تھے وہ فرما گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے نماز معاف کر دی۔ یہ سن کر وہ شخص جو غیر معتقد تھا اور جس نے یہ حرکت کی تھی بہت ہنسا لوگوں کو اس کے ہنسنے سے شبہ ہوا کہ اسی نے یہ حرکت کی ہے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ دیکھ لیجئے۔ آپ ان کو فقیر اور بزرگ بتلاتے ہیں۔ حقیقت میں جاہل کی فقیر کیا۔ اور جب وہ فقیر نہیں ہوسکتا تو پیر اور مقتدا تو بدرجہ اولیٰ نہیں ہوسکتا۔

حکایت: ایک اور جاہل فقیر یہیں تھانہ بھون میں تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے تفسیر فرمائی تھی[2] وَالضُّحٰی ۔ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۔ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) ہے۔ صاحبو! سب جہل کے کرشمے ہیں' اور یہ نامعقول پیٹ اس قسم کی کرتوتیں کراتا ہے۔ زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کی تمیز ہی نہیں رہی کہ یہ واقع میں فقیر ہے یا مکار ہے۔ اور بعض بعض مقامات کی تو یہ حالت ہے کہ وہاں فساق[3] فجار تک کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

حکایت: چنانچہ ایک مشہور شہر کی نسبت ایک ثقہ سے سنا ہے کہ ایک ایسے ہی نامعقول پیر کے پاس ان کا مرید بیٹھا ہے اور اس کی بیوی بھی بیٹھی ہے اور حضرت پیر صاحب اس کا منہ چوم رہے ہیں اور مرید صاحب اس پر خوش ہیں اور بیوی سے ہنس ہنس کر فرما رہے ہیں کہ اب تمہارا منہ بڑے رتبہ کا ہے اب ہماری کیا مجال کہ ہم اس میں تصرف کریں۔ میرے ایک خاندانی اس شہر کی نسبت کہتے تھے کہ وہاں کے فقیر تو دوزخی ہیں اور امیر جنتی کیوں کہ امراء تو فقراء سے ان کو اہل اللہ سمجھ کر تعلق رکھتے ہیں اور فقراء ان سے دنیا حاصل کرنے کے لئے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیروں کو بھی جنتی کہنا مشکل ہے کیونکہ جو شخص اتنا

---

[1] غرور۔۱۲ [2] قسم ہے دوپہر کی اور قسم ہے رات کی جب کہ تاریک ہو جائے۔ [3] کبیرہ گناہوں میں مبتلا خفیہ اور کھلم کھلا۔ حالانکہ کھلی بات ہے جو نافرمانی اور مخالفت کرتا ہے وہ خدا کا دوست اور ولی کیسے ہوسکتا ہے ارشاد ہے۔ اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (اللہ تعالیٰ کے ولی تو متقی ہی ہوتے ہیں)

جاہل ہو کہ اس کو فاسق اور صالح میں تمیز نہ ہو سکے وہ کیا جنتی ہونے کے کام کرے گا۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ پیر کے فعلوں سے کیا کام اس کی تعلیم سے کام تو میں کہتا ہوں کہ شیطان کے مرید کیوں نہیں ہو جاتے اس لئے کہ اس سے بڑا عالم اور واقف تو کوئی فقیر بھی نہ ملے گا۔ یہ تو عالموں سے بھی بڑا عالم ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ عالموں کو بھی علوم میں بہکا لیتا ہے اور کسی خاص امر میں وہ ہی بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ اس امر میں مہارت رکھتا ہو۔ غرض جاہل کی پیری کچھ بھی نہیں ہے۔

سر[1] انجام جاہل جہنم بود — کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

چنانچہ وہ پہاڑ کا رہنے والا اگرچہ فقیر تھا۔ لیکن بوجہ جہل کے اس نے یہ خرافات کی کہ آنکھ پر پٹی باندھ لی کہ نفس کو شاق ہوگا اور اسی کو طاعت سمجھا۔ صاحبو! اگر نفس پر مشقت ہی ڈالنا ذریعہ قرب ہوتا تو لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ[2] نہ فرمایا جاتا کیونکہ یہ تو بہت بڑی تکلیف ہے۔ اس سے بہت زیادہ قرب ہونا چاہیے تھا۔ غرض قرب ہوتا ہے صرف دین کا کام اس کے طریقہ کے ساتھ کرنے سے[3]۔

بزرگان دین کی تواضع[4] کی حالت اور ہمارے دعوے تقدس[5] کی حقیقت

حضرت سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانیؒ جن کی شان یہ تھی کہ قدمی[6] علیٰ رقاب کل اولیاء اللہ ان کا مقولہ ہے ان کی وہ حالت تھی جو شیخ نے گلستان میں نقل کی ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے۔

من[7] نگویم کہ طاعتم بپذیر — قلم عفو برگناہم کش

یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعات کو قبول فرما لیجئے۔ اس لئے کہ میرے پاس طاعت ہی کہاں ہے۔ صرف یہ التجا ہے کہ میرے گناہوں کو بخش دیجیے اور آپ کے اس قول میں قدمی علی رقاب کل اولیاء اللہ اگرچہ اختلاف ہے کہ تمام اولیاء اللہ مراد ہیں

---

[1] جاہل کا انجام دوزخ ہوتا ہے کیونکہ جاہل نیک انجام والا کم ہوتا ہے۔ [2] اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔
[3] حضورؐ سے زیادہ قرب رکھنے اور بتانے والا کون ہو سکتا ہے۔ پھر حضورؐ دین اور طریقے کیوں بتاتے اور کرتے۔
[4] عاجزی [5] پاک بازی [6] میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردنوں پر ہے۔ [7] ترجمہ آگے ہے ۱۲

یا اس زمانہ کے اولیاء اللہ لیکن دوسری شق میں بھی کچھ کم فضیلت ثابت نہیں ہوتی تو جب یہ حضرات اپنے کو ایسا[1] کہیں تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم اپنے کو جنیدؒ وقت سمجھیں اور اگر جنیدؒ ہی سمجھیں تب بھی اپنے کو گنہگار سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ جنیدؒ تو اپنے کو بہت بڑا گنہگار سمجھتے تھے۔ مگر ہمارا تقویٰ کچھ ایسا لوہے جڑا ہے کہ فسق و فجور سے بھی نہیں جاتا کچھ بھی کریں مگر پھر بزرگ کے بزرگ ہمارے تقویٰ کی وہی حالت ہے کہ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہ تھا۔

حکایت: بی بی تمیزہ کا ایک قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ یہ ایک عورت فاحشہ تھی۔ کسی بزرگ نے اس کو نصیحت کی اور نماز پڑھنے کی تاکید کی اور وضو بھی کرا دیا اس نے نماز شروع کر دی ایک مدت کے بعد جوان بزرگ کا وہاں گزر ہوا تو بی بی تمیزہ بھی ملیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بی بی نماز بھی پڑھا کرتی ہو کہنے لگی جی ہاں پڑھتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وضو بھی کرتی ہو کہنے لگی کہ آپ نے اس روز کرا نہیں دیا تھا۔ صاحب مثنویؒ نے اس قصہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کا تقویٰ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا۔ کہ نہ وہ زنا سے ٹوٹتا ہے نہ اور کسی فعل سے اسی طرح ہم لوگ اپنے ایسے معتقد ہیں کہ کوئی عیب ہی نہیں نظر آتا۔ البتہ دوسرے پر طعن کرنے میں خوب پختہ ہیں۔

دنیا کے رنج وکلفت
یا عیش ونعمت کا ناقابل التفات ہونا

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے حالت خواب میں یہ دیکھا کہ مجھے خوب پیٹا جا رہا ہے اور مجھے چاروں طرف سے سانپ بچھو ڈس رہے ہیں لیکن بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ تخت شاہی پر آرام کرتا ہے کوئی مورچھل جھل رہا ہے کوئی عطر لا رہا ہے کوئی پان لا رہا ہے۔

چاروں طرف لوگ دست بستہ کھڑے ہیں تو کیا اس کے دل پر اس خواب کا کوئی اثر باقی رہے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ اگر وہ خواب از خود یاد بھی آ جاوے گا تو طبیعت اس کو بہلا دے گی اور اس کے برعکس ایک شخص نے خواب دیکھا کہ میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوں اور

---

[1] کہ صرف گناہ ہی بخش دیجئے طاعت تو ہے نہیں۔

تمام لوگ میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں۔ لوگ اپنی حاجتیں میرے سامنے پیش کرتے ہیں اور میں ان کو پورا کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ ایک شخص سر پر جوتیاں مار رہا ہے اور بہت سے سانپ بدن کو لپٹے ہوئے ہیں اور ایک کتا منہ میں موت رہا ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بیداری کی اس مصیبت کے بعد بھی خواب کی کسی قسم کی مسرت اس کے دل پر رہ سکتی ہے۔ کبھی نہیں۔ پس دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ خواب کی مثال بیداری کے مقابلہ میں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

حال[1] دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانہ گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ
باز[2] گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے بہ بست گفت یا غولیست یا دیولیست یا دیوانہ

تو واقعی دنیا کی مثال خواب ہی کی سی ہے کہ دنیا میں عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا۔

حکایت: دنیا کی حالت پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے تو مہمل سی لیکن منطبق خوب ہے۔ ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ سوتے میں روزانہ پیشاب کر لیا کرتا تھا اور اس کی بیوی اس کو دھوتی تھی۔ ایک روز بیوی نے کہا کہ کمبخت میں تو پیشاب دھوتے دھوتے بھی پریشان ہوگئی۔ آخر تجھ پر یہ کیا شامت سوار ہوتی ہے۔ کہنے لگا کہ میں روزانہ خواب میں دیکھتا ہوں کہ شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ چل تجھے سیر کرالاؤں جب میں چلنے پر آمادہ ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ پہلے پیشاب تو کر لو میں سمجھتا ہوں کہ پیشاب خانہ میں پیشاب کر رہا ہوں۔ حالانکہ وہ بستر ہوتا ہے۔ بیوی نے یہ خواب سن کر کہا کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ شیطان تو جنات کا بادشاہ ہے اس سے کہنا کہ ہم کو کہیں سے کچھ روپیہ لا دے۔ چنانچہ شوہر نے کہنے کا وعدہ کیا رات کو جب سویا تو شیطان پھر خواب میں آیا۔ اس نے شیطان سے کہا کہ یار ہم خالی خولی نہیں چلتے کہیں سے کچھ روپیہ دلواؤ۔ شیطان نے کہا یہ کیا مشکل ہے تم میرے ساتھ چلو۔ جس قدر روپیہ کہو گے ملے گا۔ اس نے ایک بادشاہ کے خزانہ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور

---

[1] میں نے ایک عقلمند شخص سے دنیا کے حال کو پوچھا تو کہنے لگے یا ایک خواب ہے یا ایک ہوا یا ایک کہانی ۱۲۔
[2] میں نے پوچھا اس کا بھی حال بتایئے جو اس میں دل لگائے بولے وہ کوئی بھوت ہے یا دیو یا پاگل ۱۲

ایک گٹھڑی میں بہت سارو پیہ بھر کر اس کے کندھے پر رکھ دیا اس میں اس قدر بوجھ تھا کہ مارے بوجھ کے اس کا پاخانہ نکل پڑا۔ جب صبح ہوئی تو بستر پر پاخانہ دھرا ہوا ہے۔ پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے کہنے لگا کہ شیطان نے روپیوں کے اس قدر توڑے میرے کندھے پر رکھ دیئے کہ بوجھ کے مارے پاخانہ خطا ہو گیا۔ وہ کہنے لگی میاں تم پیشاب ہی کر لیا کرو۔ ہمیں روپیوں کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لئے ہگا تو نہ کرو۔ تو یہ حکایت ہے تو مہمل سی۔ لیکن اگر غور کیجئے تو یہ ہماری حالت پر بالکل منطبق ہے کہ ہم بھی مثل اس شخص کے اس وقت خواب میں ہیں لیکن جس وقت آنکھ کھلے گی جس کو موت کہتے ہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ وہ سب خیال تھا اور بس اور اس وقت ہم اپنے گناہوں کی نجاست میں لت پت ہوں گے۔ نہ روپیہ پیسہ ہمارے پاس ہوگا نہ کوئی یار و مددگار رہوگا۔ بالکل جریدہ[1] و تنہا ہوں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ

اور تم آئے ہمارے پاس ایک ایک جیسے ہم نے بنائے تھے پہلی بار اور چھوڑ دیا جو ہم نے اسباب دیا تھا پیٹھ کے پیچھے۔

اور اگر بالفرض روپیہ ہوتا بھی تو تب بھی کچھ کام نہ آتا چنانچہ دوسری آیت میں فرماتے ہیں۔

لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی قیامت کے دن اگر دنیا ساری ان کو مل جائے اور اتنا اور بھی تا کہ قیامت کے دن کے عذاب کے فدیہ میں دینا چاہیں تو ان سے قبول نہ کی جائے گی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

تو یہاں چند روز عیش کر کے اگر یہ انجام ہوا تو وہ عیش بھی کلفت ہے اور اگر یہاں چند روز تکلیف اٹھا کر ابدالآباد[2] کی نعمت حاصل ہو گئی تو یہ کلفت بھی راحت ہے۔

حکایت: حضرت سیدنا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ پر جب متصل کئی کئی دن تک فاقہ ہوتا تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو صبر نہیں ہو سکتا آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے جنت میں کھانے تیار ہو رہے ہیں۔ ذرا اور صبر کرو ان شاء اللہ اب بہت جلد اس نعمت سے مالا مال

---

[1] اکیلے ۱۲ [2] ہمیشہ ہمیشہ کی۔ جیسے طالب علمی کی کلفت افسری کے لئے کھیت باغ کی پھل کیلئے راحت ہے۔

ہوئے۔ اللہ اکبر بیوی بھی ایسی شاکر صابر کہ جنت کے ادھار پر رضامند ہو کر خاموش ہو جاتیں۔

ایک اور بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کو ایک بادشاہ نے لکھا کہ آپ پر بہت تنگی ہے بہتر ہو کہ آپ میرے پاس چلے آئیں۔ آپ نے جواب میں ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

خورد[1] دن تو مرغ مسمن و مے	بہتر ازو نانک جوین ما
پوشش[2] تو اطلس و دیبا حریر	بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما
نیک[3] ہمیں ست کہ بس می گذرو	راحت تو محنت و دشین ما
باش[4] کہ تاطبل قیامت زنند	آن تو نیک آید و یا این ما

دنیا کی راحت و مصیبت کا آخرت میں کالعدم ہونا

واقعی وہاں جا کر نہ یہاں کا عیش رہے گا اور نہ مصیبت۔ اور آخرت میں تو گذشتہ چیزیں کیا یاد رہتیں۔ دنیا ہی میں دیکھ لیجئے کہ عمر گذشتہ[5] بیش از خواب نہیں ہے۔ زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے کہ جیسے برف کا ٹکڑا کہ پگھلنا شروع ہوا تو ختم ہی ہو کر رہا۔ اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ جب قیامت کے روز اہل مصیبت کو بڑے بڑے درجے عنایت ہوں گے۔ تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں مقراض[6] سے کاٹی گئی ہوتیں۔ لیکن آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو اس حالت پر نظر کر کے دیکھا جائے تو بے تامل یہ کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی نہ ملتا تب بھی کچھ حرج نہ تھا۔ لہٰذا اعتراض محض لغو ہے کہ یہ تو جنت کا وعدہ ہے۔ صاحبو! کیا جنت تھوڑی چیز ہے ابھی چونکہ دیکھا نہیں اس واسطے جنت کی کچھ قدر نہیں ہے جب دیکھو گے تو حقیقت کھلے گی۔ اور جنہوں نے ان چیزوں کو دل کی آنکھوں سے آج دیکھ لیا ہے ان کی وہی حالت ہے جو دیکھنے والے کی ہوتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ یہ تو جب ہوگا تب ہو گا۔ اس وقت تو مصیبت میں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ

---

[1] تمہارا گھی والا مرغ اور شراب کھا پی لینا۔ ان سے ہماری تھوڑی سی جو کی روٹی بہتر ہے۔ [2] تمہارا لباس (اطلس ریشم مخمل ہے) رفو کی ہوئی ہماری اون کی گدڑی ہے۔ [3] ٹھیک ہے بس یہ جو گزری چلی جاتی ہے تمہاری راحت اور ہماری کل کی محنت۔ [4] ٹھہریئے کہ جب تک قیامت کا ڈھول بجے تمہاری وہ باتیں عمدہ قرار پاتی ہیں یا ہماری یہ۔ [5] گزری ہوئی عمر خواب سے زیادہ نہیں ۱۲۔ [6] قینچی ۱۲۔

سے تعلق رکھنے والا کبھی مصیبت[1] میں نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ جس چیز کا نام آپ نے مصیبت رکھا ہے وہ مصیبت ہی نہیں ہے تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس طرح آرام کی ایک صورت اور ایک حقیقت ہوتی ہے اسی طرح مصیبت کی بھی ایک صورت اور ایک حقیقت ہوتی ہے۔ دیکھو اگر ایک شخص کا محبوب مدت کا بچھڑا ہوا اچانک مل جاوے اور اس عاشق کو بہت زور سے اپنی بغل میں دبائے حتیٰ کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں اگر چہ یہ نہایت تکلیف میں ہے لیکن قلب کی یہ حالت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اور دبائے تو اچھا ہے اور اگر محبوب کہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں تو جواب میں کہے گا کہ

اسیرت[2] نہ خواہد رہائی زبند　　　شکارت نہ جوید خلاص از کمند

اور اگر وہ کہے کہ اگر تم کو دبانے میں تکلیف ہو تو تم کو چھوڑ کر تمہارے اس رقیب کو اسی طرح دباؤں تو کہے گا کہ

نہ شود[3] نصیب دشمن کہ شود ہلاکت تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور کہے گا کہ

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے　　　یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

حتیٰ کہ اگر اس کا دم بھی نکل جائے تو اس کے لئے عین راحت ہے حالانکہ بظاہر نہایت ہی تکلیف میں ہے کہ اگر کسی اجنبی کو جس کو علاقہ محبت نہ معلوم ہو اس کی خبر ہو تو بہت ہی رحم کھائے اور محبوب سے سفارش کرے لیکن عاشق کو یہ رحم اور سفارش بے رحمی اور عداوت نظر آئے گی کیونکہ جانتا ہے کہ اس سفارش کا اثر یہ ہے کہ محبوب چھوڑ کر ابھی علیحدہ ہوا جاتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو گیا ہے وہ آپ کی اس خیر خواہی کو کہ ہائے یہ اللہ والے بڑے مصیبت میں ہیں ان کو اس سے نکلنے کی تدبیر بتلائیں نہایت ناگوار سمجھتے ہیں۔

حکایت: میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک بزرگ

---

[1] اگر مصیبت بھی ہوتی تو کیا چند پیسوں کے واسطے تو برسوں اسکولوں، کالجوں اور پھر حصول ملازمت کے چکر اور ملازمت و کاروبار وغیرہ کی مصیبتیں عقلاً ضروری ہیں اور جنت جیسی نعمت کے لئے کچھ بھی ضروری نہ ہو۔۱۲

[2] تیرا قیدی تو قید سے رہائی ہی نہیں چاہتا نہ تیرا شکار پھندے سے نکلنا چاہتا ہے۔

[3] دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو ہم دوستوں کے سر سلامت رہیں تاکہ تو ان پر خنجر آزمائے۔۱۲

چلے جا رہے تھے راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ زمین پر پڑا ہے اور تمام بدن زخمی ہو رہا ہے۔ غور کر کے دیکھا تو انوار اس شخص کو گھیرے ہوئے ہیں اور اہل اللہ میں سے ہیں۔ ان کو بہت رحم آیا اور قریب جا کر ادب سے زخموں کی مکھیاں جھلنے لگے کچھ دیر کے بعد ان کو افاقہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کون شخص ہے کہ میرے اور میرے محبوب کے درمیان حائل ہو رہا ہے اور فرمایا کہ میری وہ حالت ہے کہ

خوشا[1] وقتے و خرم روزگارے | کہ یارے برخورواز وصل یارے

تو محبت کا علاقہ ایسی چیز ہے کہ ناگوار بھی گوارا ہوتا ہے۔ ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص کی محبت کے جرم میں اس کو چابک کی سزا دی جا رہی تھی۔ ننانوے چابکوں میں تو آہ نہیں کی لیکن اس کے بعد جو ایک چابک لگا ہے تو اس میں بہت زور سے آہ کی لوگوں نے سبب پوچھا کہنے لگا کہ ننانوے چابک تک تو محبوب بھی میرے سامنے کھڑا تھا مجھے[2] یہ حظ تھا کہ محبوب میری حالت کو دیکھ رہا ہے اس میں تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اور اخیر کے چابک میں وہ جا چکا تھا اس لئے اس کی تکلیف محسوس ہوئی۔ حق سبحانہ وتعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔ وَاصْبِرْ[3] لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس[4] خیال میں بھی یہ خاصیت ہے کہ کلفت مبدل[5] بہ راحت ہو جاتی ہے اور عشاق نے بھی اس کی تمنا کی ہے۔

بجرم[6] عشق تو ام میکشند غوغا نیست | تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

یہ جو برسر[7] بام بلا رہا ہے محض اسی حظ وراحت کے لئے تو جب محبت میں یہ خاصہ ہے تو جن کو آپ تکلیف میں سمجھتے ہیں اور ان کے اس حالت کے برداشت پر تعجب کرتے ہیں اگر ان کو بھی اس تکلیف میں راحت ہوتی ہو تو کیا عجب ہے۔

حکایت: حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نماز میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے

---

[1] کتنا اچھا ہے وہ وقت اور کتنا خوب ہے وہ زمانہ کہ ایک دوست دوسرے کی ملاقات سے پھل حاصل کرے۔ [2] مزہ وکیف [3] اور صبر کیجئے اپنے رب کے حکم کے لئے کیوں کہ آپ ہمارے سامنے ہیں۔ [4] محبوب کے سامنے ہونے کے خیال میں [5] راحت سے بدل جاتی ہے۔ [6] آپ ہی کے عشق کے جرم میں مجھے قتل کر رہے ہیں اس کی دہائی ہے تو آپ بھی چھت کے کنارہ آ دیکھئے کیوں کہ ایک اچھا تماشا ہے [7] چھت کے کنارہ پر ۱۲

کہ ان کے ایک تیر آ کر لگا۔ لیکن قرآن پڑھنا ترک نہیں کیا۔ آخر ایک دوسرے صحابی سوتے تھے جاگنے کے بعد انہوں نے اس حالت کو دیکھا اور بعد سلام ان سے پوچھا تو فرمانے لگے کہ جی نہ چاہا کہ تلاوت قرآن شریف کو قطع کر دوں۔ غرض محبت ایسی چیز ہے لیکن چونکہ ہم نے محبت کا مزہ چکھا نہیں اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصیبت میں ہیں اور واقع میں وہ مصیبت میں نہیں ہیں کیونکہ مصیبت نام ہے حقیقت مصیبت کا نہ کہ صورت مصیبت کا پس وہ شبہ بھی جاتا رہا کہ اللہ والے مصیبت میں ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نافرمانی کے ساتھ راحت اور عزت نہیں اور اطاعت کے ساتھ تکلیف اور ذلت نہیں۔ پس اگر ہم عزت کے خواہاں ہیں تو اطاعت خداوندی کو اختیار کریں ہم نے اس کو جب سے چھوڑ دیا ہے اسی وقت سے ہماری راحت اور عزت بھی جاتی رہی ہے۔

کشف[1] و کرامت[2] کا دلیل کمال نہ ہونا

بعض عوام جو کہ بزرگوں سے ملنے کے شائق رہتے ہیں کچھ ایسی بدتمیزی ہو گئی ہے کہ تارک تعلقات[3] ہندوؤں کو بھی بزرگ سمجھتے ہیں اور ان مسلمانوں کو بھی جو کہ شراب پی کر نشہ[4] کی حالت میں یا جنون کے مرض میں بے تکی ہانکنے لگتے ہیں۔ ان کو مجذوب سمجھتے ہیں اور ان لوگوں نے مجذوبوں کی ایک عجیب پہچان تراشی ہے کہ اگر اس کی پشت کی طرف کھڑے ہو کر درود پڑھا جائے تو وہ فوراً اس کی طرف منہ کر لے سو اول تو یہ خود اطلاع کی بھی دلیل نہیں ممکن ہے کہ اتفاقاً منہ کر لیا ہو دوسرے زیادہ سے زیادہ اس کے صاحب کشف ہونے کی دلیل ہو گی۔ اور صاحب کشف[5] ہو جانا کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے تو اس کو کشف ہونے لگتا ہے۔ نیز مجانین کو بھی کشف ہوتا ہے چنانچہ صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے۔

---

[1] درمیان سے حجابات اٹھ جانا پھر چھپی چیز یا بات نظر آ جانا ۱۲۔ [2] عام لوگوں کے معمول و عادت کے خلاف کوئی بات یا کام ظاہر ہونا۔ [3] لوگوں سے تعلق چھوڑنے والے حالانکہ کفر و شرک خدا اور رسول کی دشمنی ہے پھر دوستی یعنی ولی ہونا کیسے ممکن ہے۔ [4] نشہ ۱۲ [5] جو روح کا علاقہ جسم سے کم کر لے یا دیوانگی کی وجہ سے کم ہو جائے اس کو کشف ہو سکتا ہے مقبول ہو یا مردود۔

حکایت: میں نے خود ایک مجنونہ کو دیکھا کہ اس کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا لیکن جب اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ ہی کشف بھی نکل گیا تو کشف بھی دلیل مجذوب ہونے کی نہیں غرض عوام کو یہ معلوم ہونا نہایت دشوار ہے کہ یہ شخص مجذوب ہے اور بالفرض اگر وہ اس علامت سے مجذوب بھی ثابت ہو گئے تو تم نے مجذوب کو تو تلاش کر لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مبارک کی بے ادبی کی کہ قصداً اس کی پشت کی طرف درود شریف پڑھا پھر یہ کہ اس کے مجذوب ہونے سے تم کو کیا فائدہ مجذوب سے تو نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے نہ دین کا۔ دین کا تو اس لئے نہیں کہ وہ تعلیم پر موقوف ہے اور تعلیم اس سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور دنیا کا اس لئے کہ وہ دعا سے ہوتا ہے اور مجذوب دعا کرتے نہیں کیونکہ وہ لوگ اکثر صاحب کشف ہوتے ہیں ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس طرح ہوگا تو اس کے موافق دعا کرنا تو تحصیل[1] حاصل ہے اور خلاف دعا کرنا تقدیر کا مقابلہ ہے البتہ وہ کشف کی بناء پر بطور پیشین گوئی کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں یوں ہوگا۔ سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا۔ اس طرح ہو جانا کچھ ان کے کہنے کے سبب سے نہیں ہوا۔ ہاں سالک سے ہر طرح کا نفع ہوتا ہے کیونکہ وہاں تعلیم بھی ہوتی ہے اور دعا بھی بلکہ مجذوب کے فکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں۔ حاصل یہ کہ غیر مومن کو مقبول سمجھنا بالکل قرآن کا معارضہ[2] ہے لہٰذا جوگیوں اور جاہل فقیروں کے پیچھے پڑنا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔

اعمال کا مدار خلوص پر ہونا

قبول اعمال کا تفاوت خلوص سے ہوتا ہے کیونکہ اہل علم کے درجات میں امتیاز اس خلوص ہی کے سبب سے ہوا جیسا اوپر مذکور ہوا ہے اور اس مسئلہ کو بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آج کل اعمال کے تو شائق ہیں لیکن خلوص کی پرواہ اکثر نہیں ہوتی۔ حالانکہ خلوص وہ

---

[1] حاصل شدہ چیز کا حاصل کرنا جو محال ہے کہ اب اس کا حاصل کرنا کیا معنی ۱۲

[2] مخالفت ہے ارشاد ہے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (اللہ تعالیٰ کے ولی ودوست صرف تقویٰ والے ہی ہیں) اور تقویٰ کی پہلی شرط کفر و شرک سے بچنا ہے۔ پھر گناہوں سے

چیز ہے کہ اسی کی بدولت صحابہ کرام کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ ان کا نصف مد[1] جو خرچ کرنا اور ہمارا احد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کرنا برابر نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ صحبت نبوی ؐ کی برکت سے ہے تو میں کہوں گا کہ ان کا خلوص بھی صحبت ہی کی برکت سے ہے تو یہ دونوں متلازم[2] ہیں۔ اب خواہ صحبت کو سبب کہہ دیجئے خواہ خلوص کو بالکل وہ حالت ہے کہ

عبارا[3]تنا شتی و حسنک واحد　　　فکل الیٰ ذاک الجمال یشیر

کہ سب ایک ہی جمال کی تعبیر ہیں میں نے اپنے پیر و مرشد سے سنا ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے تو وجہ یہی ہے کہ اس کی ایک رکعت میں بوجہ معرفت کے خلوص زیادہ ہوگا۔

خداوند تعالیٰ کو حاضر[4] و ناظر[5] سمجھ کر اعمال میں مشغول ہونا

قرآن شریف میں ہے وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر خبردار ہیں۔ اس جملہ سے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک مضمون کا مراقبہ سکھلایا ہے کہ اگر اس کو مستحضر[6] رکھیں تو عمل میں کبھی کوتاہی نہ ہو یعنی ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن کو دیکھ رہے ہیں اس کی مزاولت[7] سے بعد چندے ایک حال پیدا ہوگا اور ذوقاً[8] یہ سمجھے گا کہ گویا میں خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں اور قرآن و حدیث میں اس قسم کے جتنے مضامین ہیں یہ سب مراقبات[9] ہیں ان میں بتلا دیا ہے کہ اطاعت کی اصلی اور راسخ[10] حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ یہ مراقبات مستحضر[11] ہو جائیں کیونکہ جب یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اس کام کی حاکم کو بھی اطلاع ہے تو پھر اس میں کوتاہی نہیں ہوا کرتی اور یہ نہایت

---

[1] آدھا مد جو چودہ چھٹانک کے قریب ہوتا ہے۔ (مسلم) [2] ایک دوسرے کو لازم ہیں کہ ایک ہو تو دوسرا بھی ہو۔ [3] ہماری عبادتیں تو الگ الگ ہیں مگر آپ کا حسن ایک ہی ہے سب تعبیرات اسی جمال کو ظاہر کرتی ہیں۔ [4] موجود یعنی ہر شے کا علم والا ہونا کہ وہ جگہ سے پاک ہیں۔ [5] دیکھنے والا [6] ذہن میں حاضر [7] ہمیشگی کرنے سے کچھ دن بعد دل میں ایک حالت ہوگی۔ [8] طبیعت کے ذوق میں [9] دل کی سوچ [10] جمی ہوئی [11] ذہن میں حاضر

سہل مراقبہ ہے۔اس میں فی نفسہ[1] کسی شیخ کی کسی خلوت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہر شخص اس سے منتفع ہوسکتا ہے۔

کسی کامل شیخ[2] کی صحبت کی اور خلوت کی ضرورت

عادت اللہ یوں جاری ہے کہ کسی قدر خلوت کی اور کسی شیخ سے مشورے کی بھی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس وقت علوم اور اعمال میں ایک گونہ ضعف آ گیا ہے۔توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر عمل میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو رائے کے درست ہونے کی اور دوسرے ہمت کی ہم لوگوں میں دونوں کی کمی ہے۔رائے کی کمی یہ کہ بسا اوقات بعض اعمال کے منشاء[3] یا ناشی کے متعلق ہم ایک امر کو شر سمجھتے ہیں اور وہ خیر ہوتا ہے اور بسا اوقات کسی امر کو ہم خیر سمجھتے ہیں اور وہ شر ہوتا ہے۔علی ہذا البعض اوقات باوجود درستی رائے کے کسی عمل میں ہمت اکثر ٹوٹ جاتی ہے۔پس شیخ چونکہ صاحب تجربہ وصاحب بصیرت ہوتا ہے۔اس سے رائے کی بھی مدد ملتی ہے اور اس کے کہنے میں کچھ برکت ہوتی ہے کہ اس سے ہمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔اور اس کی[4] رسم اصلی جو کچھ بھی ہو یہ ضرور قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو شیخ بنالیا جاتا ہے تو اس کی مخالفت کم ہوتی ہے تو رائے کے صحیح کرنے کا اور ہمت کے قوی کرنے کا عادۃً[5] بجز شیخ بنانے کے اور کوئی ذریعہ نہیں بس بقاعدہ مقدمۃ[6] الواجب واجب عمل کے لئے کسی شیخ کا دامن پکڑنا ضروری ہوگا اور وہ شیخ کامل ہونا چاہیے اور اس کے پہچاننے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے لہٰذا اس کی پہچان معلوم کرنا ضروری ہے۔سو پہچان یہ ہے کہ علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو۔خواہ پڑھ کر خواہ علماء کی صحبت سے عمل میں مستقیم ہو امر بالمعروف نہی عن المنکر طالبین کو کرتا ہو کسی مسلم[7] شیخ سے تعلق رکھتا ہو۔علماء سے نفور[8] نہ ہو۔ان سے استفادے[9] میں عار نہ کرے۔اس کی صحبت میں رغبت آخرت ونفرت[10] عن الدنیا کی خاصیت ہو پس جس

---

[1] خود تو [2] پیر جو باطنی خرابیاں دور کرادے۔ [3] سبب جس سے یہ ہوا اور نتیجہ جو اس پر ہوگا۔
[4] بیعت نبوی اس کی اصل ہو یا بزرگوں کا معمول ۱۲۔ [5] عادت کے موافق [6] جس پر واجب موقوف ہو وہ بھی واجب ہے جب حسب عادت بدوں پیر سے تعلق کئے دین درست نہیں ہوتا اور دین درست کرنا واجب ہے تو صحیح پیر سے تعلق کرنا بھی واجب ہوا۔ [7] تسلیم کیا ہوا علم وعمل والوں کا۔ [8] نفرت کرنے والا۔
[9] فائدہ لینے میں۔ [10] دنیا سے نفرت۔

شخص میں یہ علامتیں ہوں وہ کامل ہے اس سے ارتباط[1] پیدا کر لے۔

آخرت سے بے رغبتی کی شکایت

مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو۔ کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے۔ کیونکہ وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے یوں بسیں گے۔ جائیداد ہوگی ہم ملازم ہوں گے۔ ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ اب انصاف سے دیکھ لو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوتی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہوگی اس میں باغات اور مکانات ہوں گے یوں حوریں ہوں گی۔ غالباً کبھی بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے تو دنیا کی جس قدر محبت ہے نہ آخرت کی وہ محبت نہ وہاں جانے کا اتنا شوق۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ہوتی تو جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں کی زندگی کے بھی تو ہوتے اور جیسے دنیاوی امور میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں اور یہاں کی خوشیوں میں کھپے رہتے ہیں ایسا ہی امور آخرت کے متعلق بھی کچھ ہوتا۔ سو بعض ایسے ہیں کہ وہ دنیا کی خوشیاں مناتے ہیں اور آخرت کی امنگ کبھی خواب میں بھی نہیں آتی اور بعض ایسے ہیں جن کے پاس دنیا میں خوشی کا کوئی سامان نہیں اور اس لئے وہ ہمیشہ غمزدہ رہتے ہیں۔ اور ان کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ شاید میرے جواب میں یوں کہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی نہیں وارث نہیں کیسے زندگی کٹے گی تو میں جواب میں کہوں گا کہ مجھ کو ان کی یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کی زندگی کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیوں کر سہی جاوے گی۔ پھر جیسے یہاں کی تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کٹ جاوے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان

---

[1] میل جول یعنی تعلق اصلاح کا مع بیعت یا بلا بیعت۔

ہو جاوے۔ ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کو بھی سوچا ہے۔ حالانکہ دنیا کے مصائب تو بعض ایسے ہیں کہ ان کی تدبیر ہی نہیں ہے اور اس لئے اس کو سوچنا ہی عبث ہے۔ مگر پھر سوچتے ہو اور آخرت کی تو کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں ہے جو لا علاج ہو بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے لیکن پھر بھی نہ اس کا ذکر نہ فکر اگر بعض لوگ ایسے ہوئے بھی کہ وہ کبھی علی سبیل التذکرہ[1] آخرت کا ذکر کر دیتے ہوں اور اس لئے سمجھتے ہوں کہ ہم کو تو دین کی فکر ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔

دیکھو اگر کسی کے پاس آٹا بھی اور توا بھی اور لکڑیاں بھی ہوں لیکن پکائے نہیں مگر ان سب معاونوں کا ذکر کرتا رہے اور سوچتا رہے تو اس ذکر سے اور اس سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ تدبیر تو یہ ہے کہ ہمت کر کے اٹھے اور پکانا شروع کر دے اور جب بھوک لگے کھائے۔ لہٰذا آخرت کی فکر بھی یہ ہے کہ یوں سمجھتے کہ میں مروں گا خدا کا سامنا ہوگا اور اس طرح عذاب ہوگا اور یہ سوچ کر عذاب سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کی تدابیر شروع کر دے شیطان نے بہت سے لوگوں کو بہکا رکھا ہے کہ گاہ گاہ ان کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دل میں ڈال دیتا ہے کہ تم کو دین کی بہت فکر ہے صاحبو! اگر تمہارے پاس سامان نہ ہوتا تو اتنا ہی غنیمت تھا لیکن خدا تعالیٰ نے ارادہ دیا ہمت دی بھلے برے کی پہچان دی۔ پھر کیا وجہ کہ دنیا کے معاملات میں تو نری فکر پر بس نہیں کیا جاتا اور دین کے کام میں نری فکر کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ واقع میں آخرت کا خیال نہیں ہے۔ بہرحال اگر کوئی دنیا کی خوشیاں مناتا ہے تو یہ شکایت ہے کہ آخرت کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں اور اگر کوئی غم میں رہتا ہے تو اس سے یہ شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں۔ اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہے ہم تو گناہ گار ہیں اور دنیا کی خوشی تو حاضر ہے اس کو کیسے نہ منائیں تو یہ شیطان کا دھوکہ ہے۔ اس میں دو دعوے ہیں اور دونوں غلط ہیں یعنی اول بھی غلط کہ دنیا کی خوشی حاضر ہے دوسرا بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ہے پہلا تو اس لئے غلط کہ جو کہا جاتا ہے یوں بیٹا ہوگا یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضے میں

---

[1] بات کرنے کے طریقہ پر کہ کام تو اس کے واسطے کچھ نہیں کرتے صرف بات بات کرتے ہیں۔

کہاں ہے۔ ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ پھر اگر خوشی ہوتی بھی ہے تو تجربہ یہ ہے کہ تمنائیں[1] ہمیشہ عدد میں حاصل سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یعنی حاصل ہوتا ہے کم اور تمنا ہوتی ہے زیادہ تو جس کی تمنا جس قدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا۔ اللہ والے البتہ خوش رہتے ہیں اس لئے کہ وہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے، اولاد ہوئی اس پر خوش ہیں نہ ہوئی اس پر خوش ہیں ہر حال میں راضی ہیں اور دنیا داروں کو خوشی کہاں۔ واللہ راحت جس چیز کا نام ہے اگر وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر اس کا جتنا سامان ہوگا زیادہ موجب[2] تکلیف اور موجب حسرت ہوگا لوگ روپے پیسے کو راحت سمجھتے ہیں حالانکہ راحت روپیہ پیسہ نہیں ہے ورنہ چاہیے تھا کہ صندوق کو زیادہ لذت ہوتی مگر یہ لوگ صندوق سے بھی زیادہ بدتر ہیں کیونکہ اس کو ادراک الم[3] کا تو نہیں ہے اور یہ لوگ تو آلام میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیادار بہت ہی کم آرام میں ہیں۔ غرض دنیا میں کہیں خوشی نہیں ہے اور دوسری بات کہ آخرت میں کونسی خوشی ہے اس لئے غلط ہے کہ وہ بعد وعدہ الٰہیہ بالکل تمہارے اختیار میں ہے چنانچہ دنیا کی خوشی تو کبھی کبھی حاصل بھی نہیں ہوتی کہ ساری عمر چاہو اور نہ ہو اور آخرت کی کوئی راحت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اختیاری نہ ہو خدا کی یہ رحمت ہے کہ آخرت کی کتنی ہی بڑی سے بڑی تمنا ہو مگر وہ باستثناء[4] منصوص مثلاً درجات نبوت وغیرہ مباشرت[5] اسباب سے ضرور پوری ہوتی ہے مثلاً اگر چھوٹے درجے کا آدمی عاصی گناہ گار بڑے درجے میں جانا چاہیے۔ مثلاً حضرت جنیدؒ کے درجے میں تو جا سکتا ہے۔ اس طرح سے کہ اپنے اعمال میں ترقی کرے تو بس وہاں تو خوشی ہی خوشی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے۔ تو اس کی فکر کرو اور اس کی امنگیں پیدا کرو اور اس کی تدبیر کرو یعنی معصیت کو چھوڑ دو نمازیں پڑھو جو اب تک چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا کرو زکوۃ دو اس کے بعد سب خوشی تمہارے ہی واسطے ہے اس کے بعد حق ہے کہ خوشی مناؤ اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے

---

[1] کہ سینکڑوں آرزوئیں دل میں قائم کی جایا کرتی ہیں مگر ان میں سے حاصل ہوا کرتی ہے ایک دو۔
[2] تکلف کا سبب اور افسوس کا ذریعہ [3] تکلیف جمع آلام [4] سوائے ان کے جن کو صاف فرما دیا ہے کہ وہ محض فضل سے دیئے جاتے ہیں۔ [5] سببوں کو حاصل کرنے سے ۱۲

کہ یہاں کی مصیبت تو حاضر ہے اس لئے کہ اس کا اہتمام ہے اور وہاں تو اللہ غفور[1] رحیم ہے پھر کیوں غم کریں تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے غفور رحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے خواہ تم ہی کرو میں تم کو جنت میں بلا عقوبت[2] اول ہی بار داخل کر دوں گا۔ غرض نہ آخرت کی نعمت کو کوئی سوچتا ہے نہ وہاں کی مصیبت کو۔

دنیا کو سرائے اور آخرت کو گھر سمجھنے کی ترغیب

اے مسلمانو! یہ تمہارا وطن آخرت ہے مگر تم نے اپنے لئے دنیا کو وطن بنا رکھا ہے۔ اور اپنے لئے اور اپنے عزیزوں کے لئے دنیا ہی دنیا چاہتے ہو۔

حکایت: میری ایک خاندانی بزرگ بی بی نے مجھ کو ایک بار یہ دعا دی تھی کہ اللہ کرے اس کا بھی دنیا میں ساجھا ہو کیسے گندے عنوان سے دعا کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تو دین ہی دین ہے۔ خدا کرے دنیا میں بھی پھنس جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دنیا ہی بڑی چیز تھی۔ اس لئے چاہا کہ ہمارے پیارے بھی اس میں پھنسیں انا للہ الخ کیسے غضب کی بات ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ سارے غم اس سے ہیں کہ دنیا کو گھر بنا رکھا ہے ورنہ اگر اس کو گھر نہ سمجھتے تو کوئی بھی غم نہ ہوتا۔ دیکھو جب کبھی سفر میں جاتے ہو اور کسی سرائے میں قیام ہوتا ہے تو وہاں کی چارپائی میں کبھی کھٹمل ہوتے ہیں کبھی چارپائی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے مگر سوچتے ہو کہ ایک شب تو قیام ہی کرنا ہے جس طرح ہو گزار دو۔ ایک شب کی تکلیف ہی کیا۔ پھر تو گھر پہنچ جائیں گے۔ غرض سرائے کی تکلیف اس لئے تکلیف نہیں معلوم ہوئی کہ اس کو گھر نہیں سمجھا یہی حال دنیا کی تکلیف کا ہے اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اس کے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا۔ ہرگز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا۔ نہ اس کا اس قدر سلسلہ گھسیٹتے۔ بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے وہاں چین آرام کریں گے۔

یہاں کی ذرا سی تکلیف کا کیا ہے حالانکہ ہم کو کبھی بھی یہ خیال نہیں ہوتا۔

---

[1] بہت بخشنے والے بڑے مہربان [2] سزا ۱۲

آخرت کو گھر نہ سمجھنے کی کلفتیں اور گھر سمجھنے کی راحتیں

اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستا سکتی تھی اور اپنے وطن اصلی کو یاد کر کے راحت ہو جایا کرتی خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی۔ مثلاً اس شخص کا کوئی پیارا بچہ مر جاتا تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوتی۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً اگر کوئی سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ گم ہو جائے اور اس کو یہ معلوم ہو کہ میرا بچہ وہاں چلا گیا ہے جہاں میرا گھر ہے اور جہاں میں بھی جا رہا ہوں تو کیا وہ روئے پیٹے گا ہرگز نہیں بلکہ اس کو یہ سن کر اطمینان ہو جائے گا اور سمجھے گا کہ اب کوئی دن میں میں بھی اس سے جا کر مل لوں گا تو اگر ہم آخرت کو اپنا وطن سمجھتے تو اولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا قصہ لے کر نہ بیٹھا کرتے۔ ہاں جدائی کا غم ہوتا ہے۔ سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں اس کی اجازت ہے لیکن جیسے جدائی کا غم ہوتا ہے تسلی بھی تو ہونی چاہیے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہنچ گیا۔ ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے۔ خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس آیت کے دوسرے جملہ میں سکھایا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون[1] یعنی جو چیز گئی وہ خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے اور سب کے سب جمع ہو جائیں گے تو اس کو سوچ کر تسلی ہونی چاہیے تھی اگر آخرت کو گھر سمجھتے لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائیداد چھین لی غرض یہ کہ یوں ہونا چاہیے تھا جیسے دنیا کی مثال میں سمجھا دیا مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس سے سمجھ میں آیا ہوگا کہ اولاد کے مرنے کا ایسا غم بھی اس لئے ہوتا ہے کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں پس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ثابت ہوئی کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ اسی لئے یہاں سے جدا ہونے کا رنج و غم ہوتا ہے۔ ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہو جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے اور یہ حالت دنیا داروں ہی کی ہے۔ کیونکہ وہ دنیا ہی کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کو اس کا ذرا بھی غم نہیں ہوتا اور ان کو نہ اپنے مرنے کی پروا ہوتی ہے نہ اولاد

---

[1] بے شک ہم سب اللہ کے ہیں۔ اور یقیناً ہم سب انہی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ۱۲

کے مرنے کی پرواہوتی ہے حتیٰ کہ بعض دفع تو جہلا کو ان کے سنگ دل ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ان سے زیادہ تو کوئی رحم دل ہی نہیں ہوتا مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک گونہ مفارقت سے قلق ہوا بس زیادہ نہیں۔ کیوں کہ وہ آخرت کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں جس طرح عادت ہے کہ سفر سے واپس آتے ہوئے گھر کے قریب پہنچ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں چنانچہ اس خوشی کو ایک بزرگ کہتے ہیں۔

خرم[1] آں روز کزیں منزل ویراں بردم　　راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم

نذر[2] کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا درے کدہ شادان و غزلخواں بردم

حکایت: حضرت مولانا مظفر حسین صاحب (قدس سرہ) کاندھلوی سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بوڑھے ہو گئے آپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمد اللہ اب قریب وقت آیا مگر ان حکایات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو اعمال پر یا مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے اس لئے احتمال مواخذہ نہ ہونے سے خوش رہتے ہیں۔ استغفر اللہ ناز کی مجال کس کو ہے بلکہ وہ خوشی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کو دارو گیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے لیکن رحمت خداوندی سے امید بھی ہوتی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ پھر چھوٹ جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہو اور سرائے نہایت پختہ ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کرے گا اور سوچے گا کہ اگر چہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے لیکن میں ان شاء اللہ تعالیٰ پھر اس کو پختہ کرلوں گا۔ اسی طرح اگر چہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی ہے تو ضرور رحمت ہوگی۔ غرض وطن سے طبعی محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو

---

[1] خوش اس دن ہوں گا کہ اس اجڑے گھر (دنیا) سے جاؤں گا۔ اپنی جان کا آرام چاہوں گا اور محبوب کے لئے جاؤں گا۔ [2] میں نے منت مان لی ہے کہ اگر میرے سر میں یہ خیال کسی دن آئے گا تو مے خانہ (جنت) تک خوش خوش غزل پڑھتا جاؤں گا۔

تو کوئی یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ ان کو ناز ہوتا ہے۔

دنیا میں سامان جمع کرنے کی مثال

ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے' وہ بھی ہو جائے یہ ایسا ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دیئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے خاص کر جب کہ یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہیں کر سکے گا اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین[1] میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود[2] القیام سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔ اول تو سرائے میں اگر قیام اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے۔ اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہیے بلکہ اس سے توحش[3] اور ضیق رہنا چاہیے اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک۔

الدنیا[4] سجن المومن کے لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی کہے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا کیونکہ بعض مومنین کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس لئے فرمایا کہ جیل خانہ میں کبھی جی نہیں لگتا۔ اگر چہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے اگر چہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور وہ گھر نہیں ہے پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچیں گے کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح سے بھی گزر جائے اور دنیا کی سوچ کے بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لئے یہ سامان ہونا چاہیے اور یہ فکر ہونا چاہیے۔ اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہیے اور یہ سوچے کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر یوں بہار ہوگی اور یوں عیش ہوگا۔ ورنہ یوں مصیبت ہوگی یوں پریشانی ہوگی اب غور کر کے دیکھ لو کہ کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہیں

---

[1] زینت دینے [2] ایک حد تک قیام کرنے کی سرائے ہے کسی کے لئے ایک دو دن کسی کے لئے سو پچاس برس
[3] وحشت اور تنگ دلی [4] دنیا مسلمانوں کا جیل خانہ ہے۔ مسلم ترمذی

میں تو یہ کہتا ہوں کہ دنیا دار تو الگ رہے دین داروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے۔ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ[1]

دیکھو ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے اس کے لئے کیا زادراہ[2] تیار کر رکھا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ وطن اور گھر بھی ہے کہ اس صورت میں تو اس کے لئے بہت کچھ سامان کرنا چاہیے تھا یعنی قطع سفر کے لئے زاد اور ناشتہ اور گھر پر بیٹھنے کے لئے کمائی اور ذخیرہ پس ایک اثر تو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا ایک دوسرا اثر اس کے گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کے حوادث کے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے اور نہ لگے سگے کے واسطے۔ گھر تو وہاں ہے اب جو موت سے ہم کو موت آتی ہے یہ صرف اسی لئے کہ اس کو گھر نہیں سمجھتے بلکہ موت کے خیال سے ایسی حالت ہوتی ہے جیسے کسی کو جیل خانے میں لے جاتے ہیں۔

حکایت: ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا کہنے لگا کہ میری بیوی مرتی ہے حضرت فرمانے لگے کہ اچھا ہوا جیل خانے سے چھوٹتی ہے اور پھر فرمایا کہ کیوں غم کرتا ہے تو بھی چلا جائے گا۔ کہنے لگا روٹی کون پکائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے وہی روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی تو موت کے متعلق اس تمام ترکرب[3] و رنج کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا غم ہوتا اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا کہ کسی سے عداوت اور رنج نہ ہوتا۔ اگرچہ معمولی طور پر کسی بات میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی۔ دیکھو ریل میں مسافروں میں لڑائی تو ہوتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ اپنے سفر کے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ اس سے سفر کھوٹا ہوگا۔ مگر اس طرح سے دنیا کے فضول قصوں میں بھی کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا

---

[1] اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھ لے کہ اس نے کیا عمل کل کے لئے آگے بھیجے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ [2] توشۂ ناشتہ [3] مشقت

ہے کہ آخرت کو گھر نہیں سمجھتے نیز اگر آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تو دنیا کے ساز و سامان پر اترایا نہ کرتے چنانچہ اگر سفر میں کہیں بیچ بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی بھی اس پر اتراتا نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے ہوں تو ہم ان پر اتراتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ہم دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔

کسب دنیا مذموم[1] نہیں' حب دنیا یعنی انہماک[2] فی الدنیا مذموم ہے

دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں مگر نہ یہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جاؤ جیسے ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ گویا خدا تعالیٰ سے کوئی واسطہ نہیں ہم کو مثلاً جب کپڑا لے کر پسند کرنے بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ گویا ان کا یہی دین یہی ایمان ہے جب زیور کے پیچھے پڑیں گے تو اس طرح کہ بس وہی دل میں بسا ہوگا میں پھر کہتا ہوں کہ میں دنیا کا کام کرنے سے منع نہیں کرتا مگر یہ کہتا ہوں کہ اس میں دل نہ لگاؤ۔ کام سب کرو مگر جی اترا ہوا ہونا چاہیے۔

دل کا کھپا دینا یہی زہر ہے یہ وہ بلا ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت یہی غالب نہ ہو جائے اور اللہ و رسول کے نام سے اس وقت بالکل بےتعلقی نہ ہو جائے لہٰذا جہاں تک ہو اس کی کوشش کرو کہ دنیا میں دل لگا ہوا نہ ہو۔ دل خدا تعالیٰ ہی میں لگاؤ ہاتھ سے کام کرو کچھ حرج نہیں۔

حکایت: حدیث[3] شریف میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وازواجہ وسلم گھر میں سب کام کر لیتے تھے لیکن اذان کے وقت یہ حالت ہوتی کہ **قام[4] کانہ لا یعرفنا** اور ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی دنیا کے کام میں مصروف ہوں گے تو اس میں اس قدر منہمک[5] ہوں گے کہ پھر نہ نماز کی فکر رہے گی نہ روزے کی۔ غرض کہ اس قدر انہماک ہے جس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دین کی کچھ خبر اور فکر ہی نہیں اور دین کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ افسوس! کیا

---

[1] برا [2] اس میں کھپ جانا کہ دوسری چیز کے ہوش نہ رہیں (دنیا میں محو ہو جانا۔
[3] مسلم [4] اس طرح اٹھ کھڑے ہوتے کہ گویا ہم کو جانتے پہچانتے ہی نہیں۔ [5] محو

دین ایسی ہی بےفکری کی چیز ہے۔ یہ معاملہ تو دنیا کے ساتھ ہونا چاہیے کسی نے خوب کہا ہے۔

غم[۱] دیں خور کہ غم غم دین است ہمہ غمہا فرو تر ازیں است

غم دنیا[۲] مخور کہ بیہودہ است ہیچ کس در جہاں نیا سود است

دنیا کے رنج اور خوشی کی مثال

واقعی یہاں کا غم ہی کیا یہاں کے غم کی تو ایسی مثال ہے جیسے خواب کا غم سو خواب میں اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے اور اسی وقت آنکھ کھل جائے اور دیکھے کہ ایک نہایت عمدہ سیج بند کسے ہوئے پلنگ پر آرام کر رہا ہے اور بہت بڑا محل ہے۔ لوگ ادھر ادھر کھڑے جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں تو کیا اس شخص کے ذہن میں وہ خواب رہے گا۔ ہرگز نہیں اسی طرح یہاں کی خوشی بھی خواب کی سی خوشی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ میں تخت سلطنت پر متمکن[۳] ہوں۔ اور آنکھ کھل جائے تو دیکھے کہ چاروں طرف پولیس کے سپاہی بیڑیاں لئے کھڑے ہیں اور اس کو جیل خانے لے جانا چاہتے ہیں تو کیا اس خواب کی بادشاہت سے کچھ اس کو راحت پہنچے گی ہرگز نہیں۔ بس یہی حالت ہے دنیا کے غم اور دنیا کی خوشی کی کہ اگر خدا کے سامنے خوش گیا تو یہاں کے عمر بھر کے غم و رنج کچھ بھی نہیں ہیں اور اگر خدا کے سامنے غمزدہ گیا تو یہاں کی عمر بھر کی خوشی بھی خاک ہے۔ مگر اب لوگ اس خواب و خیال کو حقیقی غم اور خوشی سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے بس یہی ہے کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔

مصائب دنیا سے کاملین کے پریشان نہ ہونیکی وجہ

صحابہ کرامؓ میں بس یہ بات نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان حضرات میں نہ تکبر تھا نہ شیخی تھی اور نہ وہ کسی مخلوق سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ہر وقت وقت آخر کے منتظر تھے اور صحابہ کرامؓ کی تو بڑی شان ہے۔ اولیاء اللہ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو ان کو غم بھی نہیں ہوتا کیونکہ غم

۱؎ دین کا فکر کرو کہ سوچ کے قابل دین کا ہی فکر ہے اور ہر ایک سوچ فکر اس سے نیچے ہی ہے۔ ۲؎ دنیا کا فکر اور سوچ مت کرو کیونکہ یہ سوچ بےفائدہ ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی بھی آرام سے نہیں ہوا ہے۔ ۳؎ بیٹھا ہوا یعنی مالک

خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے تو جو شخص کسی چیز کے بارے میں یہ امید رکھے کہ یہ ہم سے جدا نہ ہوگی اس کو اس چیز کے جدا ہونے کا غم ہوگا۔ ورنہ کوئی بھی غم نہ ہونا چاہیے۔ ہاں طبعی رنج دوسری بات ہے میں پریشانی کے غم کی نفی کر رہا ہوں۔ یہی فرق ہے ان لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ارضیتم[1] بالحیوٰۃ الدنیا من الأ خرۃ فما متاع الحیوٰۃ الدنیافی الأخرۃ الا قلیل

آخرت کو یاد کرنے کا اثر اور طریقہ

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جائے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکل جاوے گی اور آخرت کی نعمت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے۔ پھر ایک دن ہمارا حساب ہوگا۔ اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی۔ ورنہ سخت سخت عذاب ہوں گے۔ اور نفس سے کہا کرو کہ اے نفس تو دنیا کے چھوڑنے والا ہے قبر میں تجھ سے سوال ہوگا اگر اچھے جواب دے سکا تو ابداً[2] الابداد کا چین ہے۔ ورنہ سدا کی تکلیف ہے۔ پھر تجھے قیامت کو اٹھنا ہے اور اس روز تمام نامہ اعمال اڑائے جائیں گے۔ تجھے پل صراط سے گزرنا ہوگا۔ پھر آگے یا جنت ہے اور یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو اس سے آخرت کے ساتھ تعلق ہو گا۔ اور دنیا سے دل[3] سرد ہو جائے گا۔

موت سے وحشت ہونے کا علاج

موت کے مراقبے سے ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان ہو کہ اس سے تو وحشت ہوگی۔ اور جی گھبرائے گا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالیٰ کی رحمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی

---

[1] کیا تم آخرت کے بجائے دنیا کی زندگی پر راضی ہو بیٹھے تو دنیا کا ساز و سامان تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔۱۲
[2] ہمیشہ ہمیشہ کا [3] ٹھنڈا بے رغبت

محبت نہیں ہے تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس مراقبے کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل راغب ہو اور گناہ کو جی چاہے اور کوئی گناہ صادر ہو چکا ہے تو مراقبے کی تجدید کے ساتھ توبہ کرلیا کرو۔

توبہ بغیر ادائے حقوق کے قبول نہیں ہوتی

توبہ کا متمم[۱] یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمہ ہو اس کو بہت جلدی ادا کردو۔ اس سے ان شاء اللہ خدا تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کردے گا پھر ان شاء اللہ تمہارے لئے آخرت کا دائمی عیش ہوگا۔

اپنے لئے اعتقادِ اباحت[۲]

اور عدمِ مضرت معاصی کا ابطال

بعض لوگ اعتقاداً[۳] بعض[۴] حالاً یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ بھی کریں۔ ہم کو گناہ نہیں ہوتا جن کو اعتقاد ہے وہ کفر میں مبتلا ہیں وہ اپنی مثال ایسی سمجھتے ہیں کہ جیسے ایک دریا ہو کہ اس میں اگر پیشاب کے قطرات گریں تو وہ دریا ناپاک نہیں ہوتا بلکہ وہ پیشاب ہی اس میں فنا ہو جاتا ہے ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تم نے جو اپنے کو دریا سے تشبیہ دی یہ تشبیہ تمہاری تراشی ہوئی ہے یا قرآن و حدیث میں کہیں یہ تشبیہ ہے اگر تراشی ہوئی ہے اور تمہارے نزدیک ٹھیک ہے تو یہ بھی کرو کہ گورنمنٹ جس کی اب تک اطاعت کی ہے اب اس کی عملداری میں ڈکیتی ڈالو اور جب گرفتار ہو کر آؤ کہہ دو کہ ہم دریا ہو گئے ہیں اگر اس عذر کو سن کر سرکار چھوڑ دے تو خدا سے بھی امید رکھو اور جیسے خدا سے امید باندھے بیٹھے ہو کہ وہ ہم کو دریا سمجھ کر چھوڑ دے گا۔ ایسے ہی ڈکیتی ڈالنے میں سرکار سے بھی امید رکھنی چاہیے۔ یہ سب نفس کی شرارتیں ہیں۔ حضور ﷺ جو کہ

۱؎ پورا کرنے والا ۱۲۔ ۲؎ ہر بات کے جائز ہونے اور گناہوں سے ضرر نہ ہونے کے عقیدہ کا باطل ہونا جیسے کہ بعض گمراہ لوگ اپنے لئے کسی پر کے لئے ایسا کہتے ہیں۔ ۳؎ عقیدہ رکھنے میں۔ ۴؎ حالت بنانے میں کہ دل میں تو یہ عقیدہ نہیں مگر حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ جیسی اس عقیدہ والے کی ہو

واقع میں دریا تھے چنانچہ ارشاد ہے۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ

ترجمہ: تاکہ اللہ تعالیٰ بخش دیں آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ۔۱۲

آپؐ نے جو کبھی یہ دعویٰ کیا ہو تو آج کس کا منہ ہے کہ وہ اپنے کو دریا کہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مقبولیت پر یہ فرماتے[1] تھے۔ کہ انی[2] اخشاکم لله و اعلمکم بالله تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا اور اس بناء پر کسی کا حق نہیں دبایا تو پھر دوسرے کا کیا منہ ہے۔

حکایت: ایک[3] مرتبہ آپؐ نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھودی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا۔ آپؐ نے فوراً فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کردی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میرا بدن تو کھلا تھا۔ اور آپ تو کپڑا پہنے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے فوراً کرتا اٹھا دیا وہ صحابی آپ کے پہلو مبارک سے چمٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور عرض کیا یارسول اللہ میرا مقصود تو یہ تھا لوگوں نے جو وفات نامہ میں حضرت عکاشہؓ کی حکایت گھڑلی ہے وہ صحیح نہیں صحیح حکایت یہ ہے۔

صحابہ کرام کی تواضع

اسی طرح حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی اپنے کو اتنا بڑا نہیں سمجھا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اتفاقاً اگر کسی پر سختی ہوگئی تو بدلہ نہ دیا ہو۔

حکایت: حضرت ابوعبیدہؓ ملک شام میں ایک لشکر کے سپہ سالار تھے وہاں کسی عیسائی بادشاہ کی تصویر کھڑی تھی۔ بعض مسلمانوں نے جوش میں اس تصویر کی ایک آنکھ پھوڑ دی۔ حضرت ابوعبیدہؓ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ میں راضی ہوں کہ وہ لوگ اس تصویر کے بدلے میں میری ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں۔

---

[1] بخاری [2] میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ جاننے والا ہوں
[3] جمع الفوائد

حکایت: حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا گیا کہ آپ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے ہیں اور فرمارہے ہیں۔ ھٰذا[1] اورد فی الموارد

حکایت: اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو دیکھا گیا کہ مشکیزے میں پانی لے کر محلے میں پھرتے ہیں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ایک شخص نے آکر تعریف کی تھی میں نے غور کر کے دیکھا کہ نفس اس سے خوش ہوا اس لئے اس کا علاج کر رہا ہوں غور کیجئے ان دونوں صاحبوں نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تو دریا ہیں ہمیں سب معاف ہے۔

حکایت: حضرت علیؓ نے کرتہ پہنا اور اس کی آستینیں تراش دیں پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب میں نے اس کو پہنا تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوا اور طبیعت اس میں مشغول ہوئی اس لئے میں نے اس کی آستینیں تراش دیں تاکہ یہ بدنما ہو جائے اب یہ حالت ہے کہ اگر کہیں بخیہ میں بھی کمی رہ جائے تو درزی کے سر پر مارتے ہیں وہ حضرات اچھے کپڑے کو بھی خراب کر لیتے تھے۔ غرض یہ کہ کسی کا یہ خیال کہ ہم دریا ہو گئے ہیں اور ہمیں گناہ سے ضرر نہ ہوگا بالکل غلط خیال ہے اس قسم کے لوگ اب بھی موجود ہیں اور پہلے بھی ہوئے ہیں چنانچہ حضرت جنیدؒ سے پوچھا گیا کہ بعض لوگ اپنی نسبت یہ کہتے ہیں کہ نحن وصلنا فلا حاجة لنا فی الصلوٰة والصوم یعنی ہم پہنچ گئے ہیں اس لئے ہم کو نماز روزے وغیرہ کی ضرورت نہیں آپ نے جواب میں فرمایا کہ۔ صدقوا[2] فی الوصول ولکن الیٰ سقر اور فرمایا کہ اگر ہزار برس کی میری عمر ہو تو اخیر عمر میں بھی ایک وظیفہ تک نہ چھوڑوں۔ غرض یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس آیت میں فمن[3] یعمل مثقال ذرة خیراً یره خداتعالیٰ اس کا ابطال فرماتے ہیں۔

گنہگار کو بھی حسنات[4] پر ثواب ملے گا

اگر گناہ گار بھی نیک کام کرے گا تو اس پر اجر ملے گا۔ اور معصیت کا وبال معصیت پر اگر وہ معاف نہ ہو تو الگ ہوگا۔ جیسے کوئی حاکم اپنے عہدہ کے کام کو بھی انجام دے اور رشوت بھی لے تو اگر حکام بالا کو اطلاع ہو جائے تو رشوت لینے پر سزا ملے گی لیکن جس وقت تک

---

[1] اس نے مجھے بلاکتوں میں مبتلا کیا ہے۔ [2] پہنچ گئے تو سچ کہا مگر دوزخ تک پہنچ گئے۔ [3] اور جو شخص ذرہ برابر بھی اچھا کام کرے گا اس کو دیکھ لے گا۔ [4] نیکیوں پر ۱۲

عدالت کا کام کیا ہے اس وقت تک کی تنخواہ بھی ضرور ملے گی۔

بغیر ترک گناہ کے حسنات میں نور نہ ہونا

اگر نیک کام کیا جائے اور گناہوں سے بچتا رہے تو اس وقت طاعت کی بدولت جو نور ہوگا وہ گناہوں کے ساتھ ہرگز نہ ہوگا۔ اور وہ رونق اور شگفتگی[1] اور مسرت جو کہ طاعت کرنے سے ہوتی ہے وہ نہ ہوگی بلکہ ایسا ہوگا جیسا کہ بہت لذیذ کھانا پکایا اور اس میں تھوڑی راکھ بھی جھونک دی تو راکھ جھونکنے کے بعد بھی وہ کھانا تو رہا لیکن کرکرا ہو گیا۔ اسی طرح گنہگار آدمی نماز تو پڑھتا ہے لیکن طبیعت پھیکی پھیکی رہتی ہے۔ وہ نشاط[1] اور انبساط جو نماز سے ہوتا ہے وہ اس کو نہیں ہوتا۔ اگر چہ دلیل سے گھیر جیپ کر یہ سمجھے کہ ثواب ملے گا لیکن قلب بالکل کورا ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس قدر بے برکتی ہوتی ہے کہ جو ثواب ملتا ہے وہ نظر ہی نہیں آتا۔ بلکہ گناہوں کے حجاب میں چھپ جاتا ہے اس کی ایسی مثال سمجھئے کہ جیسے کسی آئینہ میں چراغ کو رکھ کر اوپر سے سیاہ کپڑا لپیٹ دو اس صورت میں چراغ کی روشنی تو باقی رہے گی لیکن اس قدر دھیمی ہو جائے گی کہ بعض اوقات راستہ بھی نظر نہ آئے گا۔ البتہ بہت ہی کوئی دقیق النظر ہو تو وہ دیکھ لے گا یا کوئی دیکھ کر بتلا دے تو مان لیں گے باقی خود کچھ نظر نہ آئے گا تو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ثواب ملے گا اس لئے ہم مانیں گے کہ اندر روشنی ہے مگر اوپر سے اس قدر مٹی پڑی ہے کہ وہ بالکل نظر نہیں آتی۔

گناہ کے حابط[2] طاعت ہونے کی تحقیق اور تفصیل

گناہ کو طاعات سے دو قسم کا علاقہ ہے بعض تو وہ گناہ ہیں کہ نصوص سے ثابت ہے کہ وہ طاعات کو حبط[3] کر دیتے ہیں آسان لفظوں میں اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں کہ قبولیت طاعت کے لئے ان کا نہ ہونا شرط ہے اور بعض[4] ایسے ہیں کہ ان کو کوئی دخل نہیں ہے اور جن کو دخل ہے ان کی دو قسمیں ہیں بعض کا نہ کرنا صحت کی شرط ہے اور بعض کا نہ ہونا[5] بقا کی

---

[1] خوشی اور دل کھلنا [2] عبادتوں کو غارت اور بیکار کر دینے والا [3] بیکار [4] عمل وعبادت کا صحیح ہونا اس وقت ہوگا کہ ان کو نہ کیا جائے اگر کیا گیا تو عبادت بالکل صحیح نہ ہوگی۔ [5] کہ ان کو کیا گیا تو عبات جو صحیح ہوگئی تھی صحیح باقی نہ رہے گی۔ بیکار ہو جائے گی تو ان کا نہ ہونا صحیح باقی رہنے کی شرط ہے۔

شرط ہے۔ اول جیسے کفر کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی عمل نیک صحیح نہیں ہے اور نہ باقی رہتا ہے۔ یعنی اگر کوئی کافر نماز پڑھے تو صحیح نہیں اور اگر کوئی نماز پڑھ کر کافر ہو جائے تو وہ نماز باقی نہ رہے گی یہاں سے لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو کہ کلمات کفر کی پرواہ نہیں کرتے چنانچہ دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کو جب روزہ رکھنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو۔ اگر کسی کے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا تو وہ کافر ہو گیا[1] اور اس کو نکاح پھر کرنا چاہیے حج پھر کرنا چاہیے پہلے کے سب عمل اس کے[2] حبط ہو گئے۔ جب تک اس سے توبہ نہ کرے تب تک اگر یہ کوئی عمل نیک آئندہ کو کرے گا تو وہ بھی مقبول نہ ہوگا۔ دوسرے علاوہ اس کے ایک اور عمل بھی ہے کہ نص قطعی سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس کا اثر بھی مثل کفر ہی کے ہے۔ یعنی اس عمل سے حبط عمل ہو جاتا ہے اور وہ عمل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچائی جائے اور حضور کی شان میں بے ادبی کی جائے اگر چہ بلا قصد ہو مگر قلت مبالات[3] سے ہو اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ معلوم ہوگا کہ آپ کتنے جلیل القدر ہیں وہ نص قطعی یہ ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝

(اے مسلمانو تم اپنی آواز کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو اور ان کے ساتھ اس طرح زور زور سے نہ بولا کرو جیسے بعض بعض کے ساتھ زور سے بولتے ہو خوف ہے کہ تمہارے عمل غارت نہ ہو جائیں اور تم کو احساس نہ ہو)

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ بے ادبی سے حبط عمل ہوگا۔

بزرگوں کے ساتھ ادب کی تعلیم اور تکلیف سے ممانعت

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے سامنے ذرا جھک کر بولنا چاہیے۔ البتہ بات جو کہو نہایت صاف کہو کہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور گنجلک نہ رہ جائے۔ اب ہم میں یہ منحوس

---

[1] کیوں کہ اس نے خدا تعالیٰ کے حکم کی توہین کی ہے [2] بیکار غارت اور ضائع [3] اہتمام کم کرنے سے۔

حالت ہے کہ ہم دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ اب یا تو تکلف ہوتا ہے کہ اپنی حالت بھی صاف بیان نہیں کرتے جیسا کہ آج کل مدعیان محبت کی یہ حالت ہے کہ اگر ادب کریں گے تو چار دن تک رہیں گے لیکن یہ نہ بتلائیں گے کہ کس ضرورت کے لئے آئے ہیں اور جب عین چلنے کا وقت ہوگا تو کہیں گے کہ میرے بارے میں کیا ارشاد ہے' اور اگر کہو کہ بھائی تم نے اپنی حالت تو کہی ہوتی پھر رائے لی ہوتی تو اس کا جواب یہ کہ حضور کو تو سب روشن ہے۔ حضور کو اپنی تو خبر ہی نہیں ان کی حالت حضور پر روشن ہوگئی میں کشف کا انکار نہیں کرتا لیکن کشف اختیاری نہیں ہوتا وہ بالکل خارج از اختیار ہے۔

دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کو مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی اگر کشف امر اختیاری تھا تو کیوں حضرت یعقوب علیہ السلام مطلع نہیں کئے گئے اور جب خبر ہوئی تو اس طرح کہ مبشر[1] کرتہ لے کر چلا تو آپ نے فرمایا کہ انی[2] لاجد ریح یوسف لیکن یہ کہہ کر ڈرے کہ لوگ کہیں گے کہ اب تک تو آپ کو پتہ نہیں چلا اب یوسف کی خوشبو آنے لگی اس لئے میرے کلام کو ہذیان پر محمول کریں گے۔ اس لئے فرمایا۔ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ۝ (اگر تم مجھے کم عقل نہ قرار دو انہوں نے کہا خدا کی قسم آپ تو اپنی پرانی گمراہی میں ہی ہیں)

وہ حالت یہ ہے۔

گہے[3] برطارم اعلیٰ نشینم ۔۔۔ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

تو یہ کیا ضروری ہے کہ ہر وقت کشف ہوا ہی کرے اور وہ تمہارا حال خود بخود جان جایا کرے اس کی تعلیم فرماتے ہیں۔ عارف[4] شیرازیؒ

چند[5] آں کہ گفتم درد از طبیاں ۔۔۔ درمان نکردند مسکین غریباں

مادر[6] و دل را با یار گفتیم ۔۔۔ نتواں نہفتن درد از حبیباں

---

[1] بشارت وخوشخبری دینے والا [2] یقیناً میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں۔ [3] کبھی تو میں اونچے سے بالا خانہ پر بیٹھتا ہوں اور کبھی اپنے پیر کی پشت کو بھی نہیں دیکھتا۔ [4] حافظ [5] جتنا بھی ہم نے طبیبوں سے دردِ دل کو بتایا ان مسکین غریبوں نے علاج نہ کیا۔ [6] آخر ہم نے دردِ دل محبوب سے کہہ دیا اور دوستوں سے تو تکلیف چھپا بھی نہیں سکتے۔

مصرعہ ثالث میں بتلا دیا کہ اپنا حال دل پوشیدہ نہ کرے۔

مرشد سے اپنے عیوب بھی نہ چھپاوے

یہاں تک تعلیم ہے کہ اگر عیب بھی ہو تو مرشد سے صاف کہہ دے کہ میرے اندر یہ مرض ہے۔ بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ لڑکوں کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے اس مرض کو بلی کے گوہ کی طرح چھپاتے ہیں۔ اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوتا اور چھپانے کا حکم اس موقع پر ہے کہ جہاں اظہار میں کوئی مصلحت نہ ہو۔ اور طبیب کو دکھلانے کی ممانعت نہیں ہے۔ اظہار کی ممانعت ایسے موقع پر ہے جیسے کہ ایک شخص کی نسبت سنا ہے کہ جب حج کو گیا تو رمی[1] جمار کے وقت ایک لمبا جوتا لے کر ان تین پتھروں میں سے ایک پتھر کو خوب پیٹ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کمبخت فلاں دن تو نے مجھ سے یہ گناہ کرایا تھا اور فلاں رات کو تو نے مجھے زنا میں مبتلا کیا تھا تو ایسے موقع پر بلا کسی ضرورت اور مصلحت کے اظہار کرنا یہ تو حماقت ہے۔ مگر طبیب سے ہرگز نہ چھپاؤ۔ اور اگر یہ خیال ہے کہ ہم ان کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے تو ایسے شخص کو پیر نہ بناؤ۔

اولیاء اللہ کسی کو ذلیل وحقیر نہیں سمجھتے

جو سچے لوگ ہوتے ہیں وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے کیوں کہ جانتے ہیں کہ

تا[2] یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

وہ کتے کو بھی ذلیل نہیں سمجھتے وہ کسی کی نسبت یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ مقبول نہ ہوگا۔

ان کا مذہب یہ ہے کہ

غافل[3] مرد کہ مرکب مردان زہد را ۔۔۔ در سنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند

نومید[4] ہم مباش کہ رنداں بادہ نوش ۔۔۔ ناگہ بیک خردش بمنزل رسیدہ اند

---

[1] پتھروں کو کنکریاں مارنا شیطان کو مارنا ہے۔ [2] تا کہ محبوب کس کو چاہتا ہے اور اس کی رغبت کس کی طرف ہوتی ہے۔ [3] غفلت کے ساتھ نہ چلو کہ زہد کے مردوں کی سواریوں کی جنگل کے پتھر یلے مقامات میں کوچیں کاٹ دی گئی ہیں یعنی اسباب زہد میں خلل پڑ پڑ جاتا ہے۔ [4] لیکن کام میں لگے رہو ناامید بھی نہ ہو کیونکہ محبت الٰہی کی شراب پیتے رہنے والے اچانک ایک نعرہ سے بھی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

تو جن کا یہ مذہب ہو تو وہ کسی کو حقیر سمجھیں گے اور اگر کہے کہ وہ کسی سے کہہ دیں گے اور وہ ہم کو ذلیل سمجھے گا تو یاد رکھو کہ وہ کسی سے نہ کہیں گے وہ خدا کا راز تو کہتے ہی نہیں جس کے ظاہر کرنے سے خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں تمہارا راز کیا کسی سے کہیں گے جس کا اظہار تمہارے لئے مضر ہے۔

حکایت: حضرت شیخ عبدالحق رودَلوی خود اسرار اللہ[1] کے باب میں فرماتے ہیں کہ منصور بچہ[2] بود از یک قطرہ بفریاد آمد ایں جا مردانند کہ دریاہا فرد برندد آروغ نزنند غرض جب یہ بھی اندیشہ نہیں تو ویسی ہی عزت سب کی نظر میں رہے گی جیسے کہ اب ہے اور ویسی ہی ان کی نظر میں بھی رہے گی اور اسی لئے حدیث[3] میں آیا ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے کچھ مانگو تو صلحاء یعنی بزرگوں سے مانگو کیونکہ بھیک بوجہ اپنی ذلت اور دوسرے کی گرانی کے حرام ہے اور بزرگوں میں یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں گی۔ ذلت تو اس لئے کہ وہ کسی کو ہرگز ذلیل نہیں سمجھتے اور گرانی اس لئے نہیں ہوتی کہ بوجہ آزادی کے پابند نہیں کہ ضروری ہی دیں اگر نہ ہوگا بے تکلف عذر کر دیں گے اور کبھی غفلت سے ایسا ہو بھی کہ وہ ذلیل سمجھیں تو ان کو فوراً تنبیہ کیجاتی ہے اس لئے پھر آئندہ اس کا احتمال نہیں رہتا۔

حکایت: حضرت جنیدؒ نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ خوب قوی اور تندرست موٹا تازہ ہے اور بھیک مانگتا ہے انہوں نے اپنے دل میں اس پر طعن اور اعتراض کیا رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی مردے کا گوشت کھانے کو کہتا ہے اور ان کے انکار پر کہتا ہے کہ تم نے آخر اس فقیر کی غیبت کر کے مردے[4] کا گوشت کھایا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو اس کو کچھ نہیں کہا جواب[5] ملا کہ کیا غیبت دل میں نہیں ہوتی بلکہ اول تو دل ہی میں پیدا ہوتی ہے۔

ان[6] الکلامہ لفی الفواد و انما　　جعل اللسان علی الفواد دلیلا

---

[1] اللہ کے بھیدوں کے بارہ میں [2] منصور ایک بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے شور میں آ گیا' یہاں وہ مرد ہیں کہ سمندر کے سمندر اندر اتار لیں اور ڈکار نہ لیں۔ [3] ابوداؤد۔ نسائی [4] کیوں کہ قرآن شریف میں غیبت کرنے کو مردہ کا گوشت کھانا قرار دیا ہے۔ [5] بڑی شان کے لوگوں سے ایسی بات پر بھی گرفت ہوتی ہے گو دل کا یہ وسوسہ گناہ نہیں ہے۔ [6] اصل بات تو دل میں ہی ہوتی ہے زبان تو دل کی حالت پر ایک راہ بتانے والی چیز ہے۔

آپ بیدار ہو کر چلے معاف کرانے کے لئے ایک شخص نے آپ کو آتے دیکھ کر یہ آیت پڑھی۔ هو الذی یقبل التوبة عن عباده (اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں)

اور پھر فرمایا کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا تو یہ شخص بہت بڑا کامل تھا غرض بزرگوں کی اس طرح اصلاح ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ کسی کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ دنیا بھر سے اپنے ہی کو اذل[1] وارذل سمجھتے ہیں حتیٰ کہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ کوئی شخص مومنِ کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے آپ کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے[(1)] تو چونکہ وہ لوگ اپنے کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں اس لئے ان کے سامنے اپنے عیب کا ظاہر کر دینا کچھ مضائقہ نہیں[2]۔

بزرگوں کے کشف کے اعتماد پر اپنا حال نہ کہنا غلطی ہے

اور اگر کہو کہ کسی بزرگ کا کلام ہے

چہ[3] حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن   کہ حال خستہ دلاں را تو خوب میدانی

تو سمجھو کہ یہ خطاب خدا تعالیٰ کو ہے نہ کہ کسی ولی یا بزرگ کو لیکن کہو خدا تعالیٰ سے بھی ضرور تا کہ تمہاری عاجزی اور احتیاج ظاہر ہو اور پیر سے اس لئے ضرور کہو کہ اس کو کشف ہونا ضروری نہیں ہے۔ دوسرے اگر کبھی ہوا بھی تو تم کو کیا خبر۔ کیا تم کو بھی اس کے کشف کا کشف ہوا ہے۔

تکلف کی طرح بے ادبی سے بھی تکلیف ہوتی ہے جب کہ مودب[4] سے ہو

تو یہ تو تکلف ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر کچھ نہ کہے اور یہ بے ادبی ہے کہ وہاں جا کر[5] پتھر توڑنے لگے اسی کو فرماتے ہیں۔ لاترفعوا[6] اصواتکم فوق صوت النبی ولا

---

[1] بہت ذلیل اور کمینہ [2] اس طرح کہ وہ اسلام لا کر پاک ہو کر مرے یہ ممکن ہے اور میں گناہگار ہوں۔
[3] آپ کے سامنے دل کی حالت بتانے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ زخمی دلوں کی حالت کو آپ تو خوب جانتے ہیں۔ [4] ادب و تہذیب دئے ہوئے۔ [5] ایسی باتیں یا حرکتیں کرنے لگے جو پتھر کی طرح ہوں۔ [6] پوری آیت اور ترجمہ مضمون (نمبر ۴۳) کے آخر میں ملاحظہ ہو۔ (۱) کہ ممکن ہے وہ مسلمان ہو کر پاک صاف ہو جائے

تـجهروا له بالقول اور ایذا ہوتی ہے ایسے شخص کی بے ادبی سے جو مؤدب سمجھا جاتا ہو اور یہ فطری قاعدہ ہے چنانچہ حکام کو دیکھو کہ دیہاتیوں سے بہت سی باتیں گوارا کر لیتے ہیں جو کہ شہریوں سے ہرگز گوارا نہیں ہوسکتیں۔

حکایت: ایک دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس نے ایک درخواست پیش کی تو کاغذ پر ٹکٹ نہیں لگایا اور جب حاکم نے اس سے کہا کہ اس پر ٹکٹ لگاؤ تو روپیہ جیب سے نکال کر کہتا ہے لے روپیہ بس تیری صاحبی معلوم ہوگئی۔ اس میں سے ٹکٹ لگا لیجیو جو بچے رکھ لیجیو۔ حاکم ہنس کر خاموش ہوگیا اور درخواست مفت لے لی بھلا کوئی شہری تو ایسا کر کے دیکھے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے اسی کو کہتے ہیں

ملت[1] عاشق زملتہا جد است	عاشقاں را مذہب وملت خداست
گر[2] خطا گوید ورا خاطی مگو	درشود پرخوں شہید آں رامشو
موسیا[3] آداب داناں دیگرند	سوختہ جاں دردانان دیگرند

تو دیکھئے خود فرماتے ہیں کہ

موسیا[4] آداب داناں دیگرندے

اس لئے مولانا فرماتے ہیں کہ

با ادب[5] ترنیست زوکس در نہاں	بے ادب ترنیست زوکس در جہاں

اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض عشاق باادب ہوتے ہیں اور بعض مغلوب الحال ہوتے ہیں پہلوں کو فوراً تنبیہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بارش پر یہ فرمایا کہ آج کیسے موقع سے بارش ہوئی ہے۔ فوراً تنبیہ کی گئی کہ او بے ادب اور بے موقع کس روز ہوئی تھی۔ سن کر ہوش اڑ گئے اور

---

[1] عاشق کا مذہب ہی سب مذہبوں سے جدا ہے عاشقوں کا مذہب اور دین تو صرف خدا ہے اسی کے اشارات سے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔ [2] عاشق حق اگر بظاہر غلط بھی کہے تم اس کو غلط گو نہ کہو جیسے اگر شہید خون میں لت پت ہو تو اس کو نہ دھوؤ۔ کہ بظاہر خون ہے مگر وہی اعزاز ہے۔ [3] اے موسیٰ (علیہ السلام) عقل والوں کے آداب اور ہیں جان و روح پھونکے ہوئے لوگ دوسرے ہی ہیں۔ [4] اے موسیٰ عقل والوں کی تہذیبیں دوسری ہیں۔ [5] باطن میں اس سے زیادہ ادب والا کوئی نہیں اور ظاہری جہاں میں اس سے زیادہ بے ادب کوئی نہیں۔

مواخذہ بالکل سچا ہے کیونکہ بے موقع کبھی بھی نہیں ہوتی تو باادب جب بے تمیزی کرتا ہے تو بہت ہی ناگواری ہوتی ہے۔

آخرت کا اہتمام کس قدر ضروری ہے

مسلمان اگر غور کر لے تو اس کو معلوم بھی ہو جائے کہ آخرت کی فکر کتنی ضروری ہے نیز اپنی حالت موجودہ میں غور کرنا اس ضرورت کو اور بھی موکدہ[1] کر دیتا ہے کیونکہ ہر شخص اپنی روزمرہ حالت کو دیکھ اور سوچ لے کہ اس کے تمام وقت میں سے آخرت کی فکر میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے۔ حالانکہ ہر شخص کے نزدیک موت کا آنا یقینی ہے بلکہ ایسا یقینی کہ دوسرے تمام خطرات اتنے یقینی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی سخت مقدمہ میں ماخوذ اور مثل پوری اس کے خلاف ہو تو اگرچہ اس کو غالب گمان اپنے سزا پانے کا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی رہائی کا احتمال بھی باقی رہتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو جائے تو جس طرح اس کو ہلاک ہونے کا گمان ہوتا ہے اسی طرح صحت کا بھی گمان ہوتا ہے۔ غرض ہر امر میں دونوں پہلو ہوتے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کس تندہی اور توجہ سے اس کی فکر میں مشغول ہوتے ہیں اور ہمہ تن اسی میں کھپ جاتے ہیں لیکن موت میں کسی شخص کو بھی یہ احتمال نہیں کہ میں اس سے محفوظ رہوں گا نہ کافر اس سے بچے گا نہ مسلمان' حتیٰ کہ شیطان جو سب سے بڑا کافر اور شریر ہے اس کو بھی ایک دن موت آئے گی کیونکہ اس کو جو مہلت دی گئی ہے۔ انظرنی الیٰ یوم یبعثون[2] سے ظاہر ہے غرض موت میں کسی کو شبہ نہیں بلکہ توحید جیسی یقینی چیز سے لوگوں نے انکار کیا مگر موت سے انکار نہ کر سکے۔ معاد[3] کے متعلق مختلف رائیں ہوئی کوئی حق پر ہے کوئی باطل پر ہے مگر موت میں سب متفق رہے مگر باوجود اس قدر یقینی اور متفق علیہ مسئلہ ہونے کے اس کو ہم نے ایسا بھلا دیا ہے کہ یاد دلانے سے بھی ہم کو یاد نہیں آتی نہ تذکیر قولی[4] سے نہ تذکیر فعلی سے مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی مرتا ہے تو ہم اس کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں۔ قبرستان تک جاتے ہیں لیکن ہنستے کھیلتے چلے آتے ہیں

---

[1] قوی اور تاکیدی [2] مجھے قیامت تک کی مہلت (زندگی دیدیجئے) [3] دوبارہ زندہ ہونے کے لئے
[4] نہ زبانی یاددلانے اور وعظ و نصیحت سے نہ کسی واقعہ سے۔

ہمارے قلب پر تفکر[1] یا تدبر کے آثار ذرا بھی نہیں ہوتے۔ غرض کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ ہم کو اس سے موت کی طرف توجہ ہو جائے تو صاحبو کیا یہ مہمل حالت چھوڑنے کے قابل نہیں کیا یہ ضروری العلاج نہیں اگر ہے تو فرمایئے آج تک اس کا کیا علاج کیا اگر نہیں کیا تو اب کرنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ علاج میں جس قدر دیر اور غفلت کی جاتی ہے مرض بڑھتا جاتا ہے چنانچہ مشاہدہ ہے ہر شخص غور کرے کہ جس قدر خوف بچپن میں تھا جوانی میں نہیں ہے اور جس قدر جوانی میں ہے بڑھاپے میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ سالہا سال تک ان کو ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور بعض کو اگرچہ موت یاد ہے لیکن خوف اور دہل نہیں ہے دیکھو اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ میرے گرفتار کرنے کے لئے گارڈ پھرتی ہے تو اس کے قلب کی کیا حالت ہوگی کہ عیش تلخ ہو جاتا ہے۔ چین و آرام برباد ہو جاتا ہے۔ ہر وقت یہ دھن ہوتی ہے کہ کسی طرح میں اس مصیبت سے نجات پاؤں۔ غرض موت سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔ خصوص جب کہ گناہوں کا انبار بھی سر پر لدا ہوا ہو جس سے سزا کا بھی سخت اندیشہ ہے۔ آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔

مصیبت کے وقت بجائے استغفار کے خرافات[2] بکنے کی مذمت

مگر ہم لوگ اس سے ایسے بے خبر ہیں کہ کسی مصیبت میں گناہوں کو کبھی یاد ہی نہیں کرتے۔ بلکہ مصیبت میں اکثر یہ مقولہ زبان پر لے آتے ہیں کہ کرتو ڈر نہ کرتو ڈر مطلب یہ کہ ہم نے تو کوئی جرم نہیں کیا مگر اڑنگے میں آگئے سو خوب سمجھ لو کہ یہ ایک جاہلانہ مقولہ ہے کیونکہ نہ کرکے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ورنہ اگر کچھ نہ کرکے بھی ڈرنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ گویا ظالم ہیں خوب یاد رکھو کہ ایسا کہنا سخت توہین کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ کی۔ صاحبو خدا تعالیٰ تو کئے پر بھی کم گرفت کرتے ہیں اور بے کئے تو پکڑے ہی نہیں چنانچہ قرآن شریف میں منصوص ہے۔

---

[1] سوچ اور انجام بینی۔ [2] بے عقلی کی باتیں۔ بات بے معنی سے۔

ما[1] اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفوا عن کثیر

یعنی ہماری کرتوتوں میں بہت سے معاف ہو جاتے ہیں اور ان پر گرفت نہیں ہوتی۔

حکایت:۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چور کو گرفتار کیا اور قطع ید کا حکم دیا اس چور نے کہا کہ اے امیر المومنین یہ میرا پہلا قصور ہے مجھے معاف کر دیجئے پھر کبھی نہ کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تو غلط کہتا ہے۔ خدا تعالیٰ پہلے جرم میں کبھی کسی کو رسوا نہیں کرتے۔ چنانچہ تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس سے قبل دو تین مرتبہ چوری کر چکا ہے۔

حلم[2] حق با تو مواساہا کند   چونکہ از حد بگذری رسوا کند

خدا تعالیٰ کا حلم بہت کچھ مواساۃ کرتا ہے لیکن جب ہم حد سے بالکل ہی نکل جاویں تو آخر غیرت خداوندی ہم کو رسوا کر دیتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ گناہوں پر بھی ہم کو بہت کم پکڑتا ہے۔ لیکن چونکہ ہم لوگ اپنے بہت معتقد ہیں اس لئے اپنے معاصی کی ہم کو خبر نہیں ہے۔

گناہوں سے غفلت سخت مرض ہے

اور بعض اوقات تجاہل[3] بھی ہوتا ہے کہ غفلت کی وجہ سے ہم کو پتہ نہیں چلتا چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی۔ اللہ اکبر گویا ہم کو کسی وقت اپنے گناہ سے خالی ہونے کا بھی گمان ہوتا ہے۔ صاحبو اپنے گناہوں سے غفلت کرنا بہت بڑا مرض ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں۔

بعض لوگ عوام کے اعتقاد سے مغرور ہو کر گناہوں سے اور بھی بے فکر ہو جاتے ہیں

اور بعض ایسے بھی ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کے معتقد ہیں۔ ایسے لوگ اور بھی زیادہ تباہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے تقدس[4] کی گویا دلیل بھی موجود ہوتی ہے کہ

---

[1] جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی کئے ہوئے کی وجہ سے ہے اور بہت کو تو معاف فرما دیتے ہیں

[2] اللہ تعالیٰ کی بردباری تمہارے ساتھ بہت غمخواریاں کرتی ہے جب تم حد سے ہی گزر جاتے ہو تو رسوا کر دیتی ہے۔

[3] اپنے کو ناواقف ظاہر کرنا جاہل بن جانا۔ [4] بزرگی وپاکی

جب اتنے لوگ ہم کو اچھا کہتے ہیں تو یقیناً ہم اچھے ہوں گے۔ ہماری بالکل وہ حالت ہے۔

حکایت: جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک مکتب کے لڑکوں نے اتفاق کیا کہ آج استاد صاحب سے چھٹی لینی چاہیے اور تو کوئی سبیل نہ نکل سکی آخر اس پر رائے ٹھہری کہ جب استاد صاحب آئیں تو سب مل کر ان کی مزاج پرسی کرو اور ان کو بیمار بتلاؤ۔ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا۔ دو چار لڑکوں کو تو استاد صاحب نے جھڑک دیا لیکن جب متواتر سب نے یہی کہا تو استاد صاحب کو بھی خیال ہوا۔ آخر سب کو گھر لے کر چلے گئے اور حکم کیا کہ تم دہلیز میں بیٹھ کر پڑھو میں آرام کرتا ہوں لڑکوں نے دیکھا کہ مقصود اب بھی حاصل نہ ہوا' آخر نہایت زور سے چلا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ استاد صاحب کو مصنوعی درد وغیرہ تو پیدا ہو ہی گیا تھا۔ چلا کر پڑھنے سے اس میں واقعی ترقی ہونے لگی مجبور ہو کر سب کو چھوڑ دیا۔ جیسا وہ معلم لڑکوں کے کہنے سے مبتلائے[1] وہم مرض جسمانی ہو گیا تھا ہم سب معتقدین کے کہنے سے مبتلائے[2] وہم مرض نفسانی یعنی تقدس ہو گئے ہیں۔ لیکن بطور لطیفہ یہ بھی کہا جائے گا کہ ایسے لوگوں میں جہاں اپنے کو مقدس سمجھنے کا مرض ہے اس کیساتھ ہی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی مقدس سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال کو باوقعت جانتے ہیں تو خیر ان میں جہل کے ساتھ تواضع بھی ہے مگر یہ اعتقاد دوسروں کو اس باب میں سچا سمجھنے کا ایسا ہے کہ جیسے

حکایت: کسی نائن نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ نتھ اتار کر منہ دھو رہی ہے۔ نتھ اتری دیکھ کر فوراً اپنے شوہر کے پاس دوڑی گئی اور کہا کہ ہماری بیوی صاحبہ تو بیوہ ہو گئیں جلدی جا کر اس کے شوہر کو خبر کر۔ نائی صاحب فوراً اس بیوی کے شوہر کے پاس پہنچے اور کہا حضور آپ کیا بے فکر بیٹھے ہیں آپ کی بیوی صاحبہ بیوہ ہو گئیں۔ ججمان[3] صاحب نے رونا شروع کر دیا۔ گریہ و بکا کی آواز سن کر دوست احباب جمع ہو گئے۔ سب پوچھا تو یہ لغو حرکت معلوم ہوئی۔ دوستوں نے کہا کہ بھائی جب تم زندہ ہو تو تمہاری بیوی رانڈ کیوں کر ہو گئیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن یہ نائی نہایت معتبر شخص ہے یہ جھوٹ نہ بولے گا۔ یہی

---

[1] جسم کی بیماری کے وہم میں مبتلا [2] نفس کی بیماری یعنی بزرگی کے گمان کے وہم میں مبتلا ہو گئے

[3] یہ نائیوں کا محاورہ ہے آقا کو کہتے ہیں

ہماری حالت ہے کہ اپنے گناہوں کا ہم کو علم ہے۔ اپنی حالت خوب جانتے ہیں لیکن محض اس وجہ سے کہ دوسرے لوگ ہم کو اچھا کہتے ہیں ہم بھی اپنے معتقد ہو گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا کوئی معتقد بھی نہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے معتقد ہیں تو چونکہ تقدس کا یقین اپنے اوپر ہے اس لئے اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں ہم پکڑے گئے۔ صاحبو! ہم کو تو نہ پکڑے جانے پر تعجب ہونا چاہیے جو شخص روزانہ ڈکیتی ڈالتا ہو اگر چھ ماہ تک بچا رہے تو تعجب ہے اور اگر گرفتار ہو جائے تو کچھ بھی تعجب نہیں۔ ہم لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جن گناہوں پر مواخذہ نہیں ہوا ان سے خدا تعالیٰ ناراض نہیں ہوئے چنانچہ جب مصیبت کے وقت التفات کرتے ہیں تو نئے گناہوں کو دیکھتے ہیں۔

گناہ پر فوری مواخذہ نہ ہونے سے بے فکر نہ ہو

یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر گناہ آج کیا ہو تو آج ہی مواخذہ بھی ہو دیکھے اگر کوئی شخص کچی مٹھائی کھا لے تو عادۃً پھوڑے پھنسیاں نکلتی ہیں لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ جس روز کھایا ہے اسی روز نکلنے لگیں۔ فرعون نے چار سو برس تک خدائی کا دعویٰ کیا لیکن کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوا اور پکڑا گیا تو اس طرح کہ ہلاک ہی کر دیا گیا۔ خدا تعالیٰ کے یہاں ہر کام حکمت سے ہوتا ہے۔ کبھی ہاتھ در ہاتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی مدت کے بعد گرفتاری ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا نیکیوں میں بھی کبھی ہاتھ در ہاتھ جزا دے دی جاتی ہے کبھی توقف ہوتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعا کی اور وہ قبول بھی ہو گئی چنانچہ ارشاد ہوا قد اجیبت دعوتکما[2] لیکن باوجود دعا قبول ہو جانے کے اسی وقت اس پر اثر مرتب نہیں ہوا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون[3] کہ تم دونوں ترتب اثر میں جلدی نہ کرنا کہ یہ نادانوں کا طریقہ ہے۔ بلکہ استقامت اور استقلال سے کام لینا حتیٰ کہ چالیس برس تک حضرت موسیٰؑ نے انتظار کیا اور اس کے بعد فرعون اور اس کی قوم ہلاک ہوئی ان دونوں واقعوں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نہ کسی جرم پر فوراً اثر مرتب ہونا ضروری ہے نہ

---

[1] بزرگی [2] بیشک تم دونوں (حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام) کی دعا قبول کر لی گئی۔
[3] تم دونوں استقلال سے رہو اور ہرگز ان لوگوں کی پیروی نہ کرنا جو بے علم ہیں (نادان ہیں)

نیکی پر چنانچہ فرعون کو چار سو برس مہلت دی گئی اور حضرت موسیٰ کو چالیس سال تک منتظر رکھا گیا اور جب یہ ہے تو اگر کبھی جرم کی فوراً سزا نہ ملی تو اس کی نسبت یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس جرم سے خدا تعالیٰ ناخوش نہیں ہوئے یا یہ جرم قابل سزا و گرفت نہ تھا یا ہم کو معاف کر دیا گیا۔

مصیبت کے وقت پہلے گناہوں کو بھول جانا اور نئے گناہ کی سوچ میں پڑ جانا اور یاد نہ آنے پر مصیبت سے تعجب کرنا

لوگ اس غلطی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمیشہ نئے گناہ کو دیکھا کرتے ہیں اور جب کوئی نیا گناہ نظر نہیں آتا تو اپنی مصیبت پر تعجب کرتے ہیں اور گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت کر کے یہ کہتے ہیں کہ کر تو ڈر نہ کر تو ڈر۔ صاحبو! کسی مسلمان کے منہ سے اس جملہ کا نکلنا سخت حیرت ہے کیا کسی کے نزدیک خدا تعالیٰ کی سلطنت اودھ کے نوابوں کی سلطنت ہے جس میں کوئی ضابطہ ہی نہیں جب جس طرح جی چاہا کر لیا خیر یہ جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ دنیا کے خطرات کو تو یہاں تک مہتم بالشان بنایا کہ کچھ نہ کر کے بھی ڈرتے ہیں اور آخرت کے بارے میں اس قدر غفلت ایسی بے پرواہی کہ آئے دن سینکڑوں خرافات میں مبتلا ہیں۔ ہزاروں گناہوں کے بار میں دبے جاتے ہیں لیکن ذرا بھی پروا نہیں کیا یہ مرض نہیں ہے اور اگر ہے تو کیا اس کی تدبیر ضروری نہیں۔ صاحبو! یہ یاد رہے کہ جس قدر اس کی جانب سے غفلت ہوگی تدبیر دشوار ہوتی جائے گی اور صاحبو! ہماری وہ حالت ہے کہ

تن[1] ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

دیندار بھی گناہوں کے اصلی معالجہ میں بے پروائی کرتے ہیں

دوسرا مرض جو دینداروں میں زیادہ ہے یہ ہے کہ جب کبھی ان کی حالت زاران کو یاد

---

[1] سارا ہی بدن داغ داغ ہو گیا کہاں کہاں پھاہا رکھوں۔

دلائی جاتی ہے تو تنبہ[1] تو ہوتا ہے لیکن صرف اس قدر کہ تھوڑی دیر روئے۔ بڑی ہمت کی ایک دو وقت کھانا ترک کر دیا۔ صورت غمگین بنا کر بیٹھ گئے لیکن تدبیر کی جانب ذرا توجہ نہیں بلکہ اس غمگینی میں بھی اگر کوئی دنیا کا قصہ یاد آ گیا تو فوراً اس میں مصروف ہو گئے خوب کہا ہے۔

زنہار[2] ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بہ سجودے و نبی را بدرودے

بعض لوگ ان سے بھی چند قدم آگے ہیں کہ تاسف[3] سے پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کبھی تدبیر کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور تدارک کا خیال نہیں ہوتا حالانکہ نری پریشانی سے کیا ہو سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو اول درجہ دق کا شروع ہو جائے اور اس کو اطلاع بھی ہو جائے اور پریشانی بھی ہونے لگے لیکن وہ صرف یہی کرے کہ جب کوئی اس سے ملنے آئے تو اس کے سامنے رونا شروع کر دے اور دن رات کڑھا کرے مگر علاج کی طرف توجہ نہ کرے تو نتیجہ اس کا کیا ہوگا صرف یہی کہ دس پانچ روز میں دوسرا تیسرا درجہ بھی شروع ہو جائے گا اور آخر کار ایک روز خاتمہ ہو جائے گا۔ تو غلطی اس کی یہ ہے کہ پریشانی کو علاج سمجھتا ہے حالانکہ تدبیر اس کی یہ تھی کہ روپیہ خرچ کرتا طبیب سے رجوع کرتا تلخ دواؤں پر صبر کرتا اور پرہیز پر مستعد ہو جاتا اگرچہ کسی ایک کے آگے بھی پریشانی کا اظہار نہ کرتا۔ اسی طرح امراض باطنی اور معاصی میں بھی اصل تدبیر یہی ہے کہ کسی کامل[4] کی طرف رجوع کرے۔ گناہوں سے پرہیز پر مستعد ہو جاوے تلخ تجاویز پر صبر کرے۔ اس تدبیر سے ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں امراض دور ہو جائیں گے۔ اور اخلاق حسنہ پیدا ہوں گے۔ خوب کہا ہے

عاشق[5] کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد!   اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

یہ شیطان کی رہزنی ہے کہ دین کے رنگ میں دین سے ہٹا رہا ہے یعنی یہ خیال دل میں جما دیا ہے کہ صرف گریہ و بکا ہی کافی ہو جائے گا۔ عرفی کہتا ہے

عرفی[6] اگر بگریہ میسر شدے وصال!   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن!

---

[1] توجہ اور غفلت کا نہ رہنا۔ [2] تم ہرگز اس جماعت میں نہ ہونا کہ جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں [3] افسوس ہونا [4] صحیح پیر [5] عاشق ہی کون ہوا ہے کہ محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو۔ اے جناب درد ہی نہیں ورنہ طبیب تو موجود ہے۔ [6] عرفی اگر رونے سے ملاقات ہو سکتی تو سو سال تک بھی ملاقات کی تمنا میں رویا جا سکتا۔

حکایت: مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک بدوی کو دیکھا کہ وہ بیٹھا رو رہا ہے اور سامنے ایک کتا پڑا سسک رہا ہے۔ بدوی سے رونے کا سبب پوچھا تو کہا کہ یہ میرا رفیق تھا چونکہ مر رہا ہے اس کے غم میں رو رہا ہوں اس شخص نے کتے کے مرنے کا سبب پوچھا۔ بدوی نے کہا کہ صرف بھوک سے مر رہا ہے یہ سن کر اس شخص کو بہت صدمہ ہوا۔ نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو ایک بوری نظر پڑی۔ بدوی سے پوچھا کہ اس بوری میں کیا چیز ہے۔ بدوی نے کہا کہ اس میں روٹی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ ظالم تیرے پاس روٹی موجود ہے اور کتا بھوکوں مر رہا ہے۔ اگر اس کے مرنے کا تجھے غم ہے تو اس میں سے روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا۔ تو آپ کہتے ہیں کہ صاحب اتنی محبت نہیں کہ اس کو روٹی بھی دے دوں کیونکہ اس کو دام بھی لگتے ہیں۔ ہاں اتنی محبت ہے کہ اس کے غم میں رو رہا ہوں کیونکہ آنسوؤں میں تو دام نہیں خرچ ہوتے۔

گر جاں[1] طلبی مضائقہ نیست   در زر طلبی سخن دریں ست

ہماری وہی حالت ہے کہ گھر بار سب تمہارا لیکن کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا کہ گناہوں میں مبتلا ہونے سے رنج بھی ہے اور ان کے مٹ جانے کی تمنا بھی ہے لیکن تدبیر نام کو نہیں ہاں ہے تو صرف اس قدر کہ دو آنسو بہا لئے۔

محض بزرگوں کی توجہ کو علاج گناہ کیلئے کافی سمجھ لینے کی غلطی

اور بعض لوگوں کو توجہ بھی ہوتی ہے تدبیر بھی کرتے ہیں لیکن یہ کہ کسی بزرگ کے پاس گئے اور اپنی حالت بیان کر کے فرمائش کی کہ آپ کچھ توجہ کیجئے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص طبیب کے پاس جائے اور اپنے امراض کو بیان کرے اور جب طبیب نسخہ تجویز کرے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے یہ نسخہ آپ ہی پی لیں۔ ظاہر ہے کہ اس کو ساری دنیا احمق کہے گی اور سب قہقہہ لگائیں گے۔ بس یہی حالت طالبین توجہ کی بھی ہے

---

[1] اگر تم جان طلب کرو تو کوئی تنگی نہیں اور اگر روپیہ طلب کرو تو اس میں گفتگو ہے۔

کہ مریض تو یہ مگر توجہ کریں بزرگ اور یہ توجہ[1] نہ کریں۔

حکایت: حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ' جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا کہ حضور دعاء فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کرے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک شرط پر دعا کروں گا وہ یہ کہ جس دن جہاز چلے اس دن مجھے پورا اختیار اپنے نفس پر دے دو کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں تم کو بٹھلا دوں اور وہ جہاز تم کو لے کر روانہ ہو جائے اور جب تک یہ نہ ہو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے کیونکہ جب تم قصد نہ کرو گے دنیا کے کاروبار کو نہ چھوڑو گے' نہ وہ خود کم ہوں گے تو صرف میری دعا تم کو حج کیونکر کرا دے گی۔ کیونکہ خود کعبہ تو تم تک آنے سے رہا۔ اس کو کیا غرض پڑی ہے اور جن کو یہ شرف نصیب ہو بھی گیا ہے تو ان کو بھی اس صورت سے حج نصیب نہیں ہوا۔ حج کرنے کے لئے ان کو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا اور جب ایسوں کو بھی خود کعبے کی طرف جانے کی احتیاج تھی تو اس سوداگر کو تو کیوں ضرورت نہ ہوگی اور یہ تجارت چھوڑ کر جائیں نہیں تو محض حاجی صاحب کی دعاء[2] سے ان کو کیا نفع ہو سکتا ہے تو جو لوگ کچھ تدبیر کرتے بھی ہیں صرف اس قدر کرتے ہیں کہ بزرگوں سے دعا کرا لیتے ہیں۔ اور خود کچھ نہیں کرتے۔ صاحبو! خیال کیجئے ابو طالب جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں اور بہت بڑے محب کہ جس موقع پر تمام قریش نے مخالفت کی اور آپ کے دشمن ہو گئے اس موقع پر بھی ابو طالب نے ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بے حد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ انہوں نے ارادہ نہیں کیا حضورؐ کی کوشش اور محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی اور آخر کار اپنی قدیم ملت پر ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس پر حضور علیہ ﷺ کو بہت رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ

جس کو آپؐ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کرے۔

---

[1] یعنی کام نہ کریں جو بتایا جائے اس پر عمل نہ کریں پیر صاحب کے کام کرنے سے ان کو سب مل جائے گا۔
[2] صرف دعاء سے بغیر ان کے کام کئے۔

آج کل کام کی تمنا[1] کرتے ہیں مگر ارادہ[2] نہیں کرتے

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ تمنا دوسری چیز ہے ارادہ دوسری چیز ہے۔

ایک مرتبہ دو شخص حج کو جانے کی بابت تذکرہ کر رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے میں نے کہا کہ صاحب یہ بالکل غلط ہے اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا تو ضرور سب کے سب حج کر آتے۔ ہاں تو یوں کہیے کہ تمنا ہر مسلمان کی ہے۔ سونری تمنا سے کام نہیں چلتا۔ ارادہ کہتے ہیں سامان کے مہیا کرنے کو مثلاً ایک شخص زراعت تو کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا کوئی سامان مہیا نہیں کرتا اور ایک شخص اس کا سامان بھی جمع کر رہا ہے تو پہلے شخص کو متمنی[3] اور دوسرے کو مرید[4] کہیں گے۔ اسی طرح اگر دو شخص جامع مسجد پہنچنا چاہیں مگر ایک تو اپنی جگہ بیٹھا ہوا تمنا ظاہر کئے جائے اور ایک شخص چلنا شروع کر دے تو دوسرے کو مرید کہیں گے اور پہلے کو متمنی۔ تو جب ارادہ ہوتا ہے کام بھی ضرور پورا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی تو کوئی رہبر مل جاتا ہے۔ جو معین ہو کر کام پورا کر دیتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ

السعی منی والاتمام من اللہ

میری طرف سے کوشش کرنا ہے اور پورا کرنا اللہ کی طرف سے ہے۔

پس کام شروع کر دینا چاہیے خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے اور کام پورا ہو جائے گا۔ میں ایک عالی ہمتی کی حکایت آپ کو سناتا ہوں۔

حکایت: اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے بلایا ہے تو جس مکان میں ان کو لے کر گئی ہے تو یکے بعد دیگرے سات حصے اس مکان کے تھے اور ہر حصہ مقفل تھا۔ اور قفل بھی ہر حصے کے نہایت مضبوط تھے۔ غرض پورا سامان کیا گیا تھا کہ حضرت یوسف باہر نکل کر نہ جا سکیں۔ آخر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی

---

[1] دل دل میں خیال کرنا [2] وہ قصد جس میں سامان بھی کرلیا جائے۔ [3] تمنا کرنے والا
[4] ارادہ کرنے والا۔

خواہش کا اظہار کیا' دھمکی بھی دی۔ لجاجت[1] بھی کی' لیکن عصمت نبوت کے سامنے ایک بھی نہ چلی۔ واقعی یوسف علیہ السلام کا کام تھا کہ اس مصیبت میں بھی ان کو اتنا قوی توکل رہا جو آگے معلوم ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ مکان سب مقفل ہیں نکلنے کی کوئی صورت بظاہر نہیں مگر ساتھ ہی قوت توکل نے ہمت دلائی کہ مجھ کو اپنا کام تو کرنا چاہیے خدا تعالیٰ ضرور مدد کریں گے چنانچہ آپ نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا اور زلیخاں آپ کے پیچھے ہوئی۔ لکھا ہے کہ جس دروازے پر آپ پہنچتے تھے قفل ٹوٹ کر گر جاتا تھا اور دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور آپ صحیح وسالم عفت کے ساتھ باہر نکل آئے۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے مولاناؒ فرماتے ہیں۔

گرچہ[2] رخنہ نیست عالم راپدید خیرہ یوسف دارمی باید و دید!

کہ اگرچہ قصر عالم میں کوئی دروازہ نظر نہیں آتا کہ اس سے نکل کر تم نفس وشیطان کے پھندے سے بچ سکو۔ لیکن مایوس پھر بھی نہ ہونا چاہیے حضرت یوسفؑ کی طرح دوڑنا چاہیے پھر دیکھئے دروازہ پیدا ہوتا ہے کہ نہیں۔

(۵۸) توجہ الی اللہ کیلئے فراغت کا انتظار نفس کا حیلہ ہے

بہت لوگ اس انتظار میں ہیں کہ فلاں کام سے فراغت کر لیں تو پھر توبہ کر کے اپنی اصلاح کی تدبیر میں لگیں۔ کسی کو لڑکے کے نکاح کی فکر ہے کسی کو مکان بنانے کی فکر ہے کسی کو جائیداد کا شغل ہے۔

صاحبو! ذرا غور کرو کتنے برس یہ کہتے ہوئے گزر گئے کہ اب کے برس کچھ ضرور کر لیں گے۔ مگر آج تک ضروریات اور حاجات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

لا ینتھیٰ ارب الا الیٰ ارب
دنیا کی ہر ضرورت کا خاتمہ ایک نئی ضرورت پر ہوتا ہے اور اس
کا خاتمہ ایک دوسری ضرورت پر

---

[1] خوشامد [2] اگرچہ جہاں میں خدا تک جانے کے لئے کوئی روزن یا دروازہ ظاہر کا نہیں لیکن سرمست ہو کر حضرت یوسف کی طرح دوڑ پڑنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خود راستہ دیں گے۔

وھکذا[1] الیٰ غیر النہایۃ

''آخر یہ عمرِ[2] دنیا یوں ہی تمام ہو جاتی ہے''۔

پس امروز و فردا[3] پر ٹالنے سے کیا فائدہ۔ ہمت کر کے کام شروع کر دینا چاہیے۔ خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے۔ کامل نہ ہو گے تو خالی بھی نہ رہو گے۔ اگر تم کو صدیقیت[4] کا درجہ نہ بھی نصیب ہوا تو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہو رہو گے۔ کم از کم خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت اور لگاؤ دنیا سے بے تعلقی اور طبیعت کا اچٹاؤ تو ضرور ہی ہو جائے گا۔ مگر افسوس ہے ہماری حالت یہ ہے

ہر شبے[4] گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز زا فردا کنم

کہ روز یہی وعدہ رہا کہ کل ضرور کرلیں گے مگر ساری عمر اسی کل کل[5] میں گزر گئی اور[6] کل نصیب نہ ہوئی حتیٰ کہ موت کا وقت سر پر آ جاتا ہے اور اس وقت بجز حسرت کے اور کچھ نہیں بن پڑتا اور یہ تمنا کرتا ہے کہ

رب[7] لولا اخرتنی الیٰ اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین مگر یہ تمنا رد کر دی جاتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے۔

ولن[8] یوخر اللہ نفساً اذا جآء اجلھا کہ اب ایک ساعت کی بھی مہلت نہیں مل سکتی اور صاحبو! ہم تو کیا چیز ہیں کہ ہم کو کچھ مہلت مل سکے۔

حکایت: حضرت سلیمان علیہ السلام جو کہ نبی معصوم و مقبول ہیں۔ انہوں نے جب بیت المقدس کی تعمیر شروع فرمائی اور اختتام تعمیر سے قبل آپ کی وفات کا وقت آ گیا تو آپ نے یہ تمنا کی کہ بیت المقدس کی تعمیر تیار ہو جانے تک مہلت دی جائے لیکن قبول نہ ہوئی۔ غور کیجئے نبیؑ کی درخواست اور بیت المقدس کی تعمیر کے لئے مگر نامنظور۔ آخر آپؑ نے یہ درخواست کی کہ مجھے اس طرح موت دی جائے کہ جنات کو میری موت کی اطلاع اس وقت تک نہ ہو جب تک یہ تعمیر پوری نہ ہو جائے۔ چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور آپ حسب

---

[1] اور اسی طرح حد سے آگے تک [2] آج کل [3] صدیق ہونے کا [4] ہر رات کہہ لیتا ہوں کہ کل کو اس محبت کے خیال کو چھوڑ دوں گا۔ مگر جب کل ہوتی ہے آج کو کل بنا لیتا ہوں۔ [5] جھگڑے [6] راحت [7] اے میرے پروردگار کیوں نہ مجھے قریبی مدت تک مہلت دے دی کہ میں صدقہ خیرات کر لیتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا۔ [8] ہرگز اللہ تعالیٰ کسی کو مہلت نہیں دیتے جب اس کا وقت آ جاتا ہے

عادت اپنے عصاء پر سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ اور اسی حالت میں روح قبض ہو گئی۔ اور سال بھر تک آپ کی لاش اسی طرح کھڑی رہی۔ جنات نے آپ کو زندہ سمجھ کر کام جاری رکھا۔ حتیٰ کہ جب تعمیر پوری ہو گئی اس وقت آپ کی لاش زمین پر گر پڑی اور جنات کو اس وقت آثار سے معلوم ہوا کہ آپ کے انتقال کو اس قدر زمانہ گزر گیا ہے۔ اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ما دلھم[1] علیٰ موته الا دابة الارض تا کل منسا ته' فلما خر تبینت الجن ان لو کانوا یعلمون الغیب مالبثوا فی العذاب المھین

اور اس طریقہ پر موت دینے سے لوگوں کو یہ بھی ہدایت ہو گئی کہ جنوں کو علم غیب نہیں ہے تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو بیت المقدس تیار کرنے کے لئے مہلت نہ دی گئی تو ہم کو بیت المقدس[2] تیار کرنے کے لئے کب مہلت مل سکتی ہے۔ غرض اس جملہ تقریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم لوگ ارادہ تو کرتے ہیں لیکن ارادۃ[3] الفعل نہیں کرتے کیونکہ ارادۃ الفعل وہ ہے جو کہ مقارن[4] ہو فعل کے ساتھ کہ اس کے بعد فعل متخلف[5] ہی نہ ہو اور جس کو ہم ارادہ کہتے ہیں وہ نری ہوس ہے دیکھئے کہ اگر ایک شخص کھانا کھانے کا ارادہ کرے لیکن ہاتھ نہ ہلائے منہ نہ چلائے نہ منہ کھولے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کھانے کا ارادہ کیا یہ کہیں گے کہ اس نے کھانے کی ہوس اور تمنا کی۔

بزرگوں کی توجہ کے مؤثر ہونے کے شرائط

اور جو بزرگوں کی توجہ کے امیدوار بیٹھے ہیں ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ کیا ان بزرگ کو بھی نری توجہ سے سب کچھ حاصل ہو گیا تھا یا ان کو کچھ کرنا پڑا تھا۔ اگر ان کو کچھ خود بھی کرنا پڑا ہے تو کیا وجہ ہے کہ تم کو نری توجہ سے حاصل ہو جائے اور بزرگوں کی توجہ سے انکار نہیں بیشک بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن اس توجہ کے اثر کے لئے محل قابل کی بھی ضرورت ہے۔ دیکھو اگر کھیتی کرنا چاہو تو زمین میں تخم ریزی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ تخم ریزی اس وقت

---

[1] جنوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت پر صرف زمین کے ایک کیڑے (دیمک) نے مطلع کیا جو ان کی لاٹھی کو کھا رہا تھا۔ جب وہ گر پڑے تو جنوں پر یہ کھلا اگر وہ غیب کی بات جانتے تو اس بوہانت کرنے والی تکلیف میں نہ ٹھہرے رہتے۔ [2] گندا گھر اور وہ تھا پاک گھر [3] کام کرنے کا ارادہ [4] متصل [5] پیچھے نہ ہٹ سکے۔

کارآمد ہوتی ہے جب کہ زمین بنجر نہ ہو ورنہ تخم بھی ضائع ہوتا ہے اور محنت اور جانکاہی بھی رائیگاں جاتی ہے پس اول قابلیت پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول ارادہ کرو۔

صرف ارادہ بھی بغیر توجہ بزرگوں کے اکثر کافی نہیں

ہاں نرا ارادہ بھی کافی نہیں جب تک کہ توجہ بزرگان نہ ہو کیونکہ

بے[1] عنایات حق و خاصان حق — گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

اصل میں ارادہ کے پورا ہونے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ عنایت خداوندی متوجہ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ بزرگ خود متوجہ ہوں۔ اکیلے کوئی کسی کام کا نہیں ہوا۔

یار[2] باید راہ را تنہا مرد! — بے قلاؤز اندریں صحرا مرد

کہ "اس جنگل میں تنہا نہ چلو کسی رہبر کو ضرور ساتھ لے لو کہ وہ تم کو راستے کے خطرات سے محفوظ رکھے۔" آگے کہتے ہیں۔

ہر کہ[3] تنہا نادر ایں راہ را برید — ہم بہ عون ہمت مرداں رسید

کہ اگر تم نے کسی کی حکایت سن لی ہو کہ وہ بغیر کسی رہبر کے اس راستے کو طے کر گئے تو اول تو یہ نادر ہے دوسرے واقع میں وہ بھی کسی کی ہمت کی بدولت منزل تک پہنچے ہیں۔ اگرچہ ظاہر نظر میں معلوم نہ ہو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی بہت سی مخلوق بلا کسی تعلق کے ہمارے لئے دعا کرتی ہے گو ہم کو خبر بھی نہ ہو تو کوئی شخص اپنے کو مستغنی[4] نہ سمجھے۔ اسی لئے فریدالدین عطار کہتے ہیں۔

بے[5] رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق!

گر[6] ہوائے ایں سفر داری دلا — دامن رہبر بگیر و پس بیا

---

[1] بغیر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اللہ کے خاص بندوں کی عنایت کے اگر فرشتہ (جیسا) بھی ہوگا اس کا عمل نامہ سیاہ ہوگا۔

[2] ایک مددگار چاہیے راستہ کیلئے تنہا مت جاؤ بغیر واقف کار کے اس جنگل میں مت جاؤ۔

[3] جو شخص شاذ و نادر تنہا ہی اس راستے کو طے کر گیا ہے وہ بھی مردان خدا کی روحی مدد سے ہی پہنچ گیا ہے۔

[4] بے پروا [5] بغیر کسی رفیق کے جو بھی عشق کے راستہ میں چلا ہے عمر گزر گئی اور عشق سے واقف تک نہیں ہوا۔

[6] اے دل اگر تو اس سفر کی خواہش رکھتا ہے تو کسی راہبر کا دامن پکڑ اور پیچھے چلا آ۔

در ارادت[1] باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید!

غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بغیر رفیق سیدھا راستہ ملتا ہے۔ دیکھو اگر ایک نابینا شخص کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اول اس کو چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے ہی نہیں تو ہزار رفیق ملنے پر بھی راستہ قطع نہیں ہوگا اور چلنے کے بعد رفیق و رہبر کی ضرورت ہے کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ناآشنا راستہ میں ضرور کسی جگہ ٹکر کھا کر گرے گا۔ بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے کہ اپنے پیروں چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑ لے۔ بالکل ایسی ہی حالت اس راستہ کی بھی ہے کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا ہاتھ پکڑنا ہے۔

صرف مرید ہونا بغیر اپنی سعی کے کافی نہیں

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ لوگ جو آج کل نری پیری مریدی کو اصل کام سمجھتے ہیں یہ غلطی ہے۔ نری پیری مریدی میں کچھ نہیں رکھا اصلی کام خود چلنا ہے۔ اور کسی رہبر کا ہاتھ پکڑ لینا اگرچہ مرید کسی سے بھی نہ ہو میرا مطلب یہ نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے کے برکات کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس کے برکات ضرور ہیں لیکن اسی کو اصل الاصول[2] سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ آج کل اس پیری مریدی کے متعلق وہ جہل پھیلا ہوا ہے کہ الامان[3] والحفیظ

حکایت: میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ایک مکار پیر صاحب کسی گاؤں میں پہنچے اتفاق سے بہت ہی نحیف ہو رہے تھے۔ مریدوں نے پوچھا کہ پیر تم اس قدر ضعیف کیوں ہو پیر صاحب نے جواب دیا ظالمو تمہیں میرے ضعف کی خبر نہیں۔ دیکھو میں اپنا کام بھی کرتا ہوں اور تمہارا بھی۔ تم نماز نہیں پڑھتے میں تمہاری طرف سے نماز پڑھتا ہوں۔ تم روزہ نہیں رکھتے میں تمہاری طرف سے روزے رکھتا ہوں اور سب سے بڑی مشقت یہ ہے کہ سب کی طرف سے پل صراط پر چلنا ہوگا۔ جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ بس ان فکروں نے لاغر کر دیا۔ مرید یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور ایک گوجر نے خوش ہو کر کہا کہ پیر میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت بخش دیا۔ پیر کو خیال ہوا کہ دیہاتی لوگوں کا

---

[1] حق تعالیٰ تک پہنچنے کے ارادہ میں اے فرید سچا بن تا کہ معرفت کے خزانہ کی چابی حاصل کر سکے۔

[2] سب جڑوں کی جڑ اور اصل مقصود [3] اللہ اس سے امن اور حفاظت عطا کرے۔

کچھ اعتبار نہیں ہے۔ اسی وقت چل کر قبضہ کر لینا چاہیے۔ کہا بھائی ابھی چل کر دے دو۔ چنانچہ وہ گوجر ساتھ ہولیا۔ راستے میں اتفاق سے کسی ڈول سے پیر صاحب کا پیر پھسل گیا اور گر گئے گرنے کے ساتھ ہی اس گوجر نے ایک لات رسید کی اور کہا کہ تو جب اتنی چوڑی منڈیر پر نہیں چل سکا تو پل صراط پر کس طرح چلے گا۔ تو جھوٹا ہے جا ہم تجھے اپنا کھیت نہیں دیتے۔

تو صاحبو! سچ بات یہی ہے کہ کام اپنے ہی کئے سے ہوتا ہے کسی دوسرے کے کئے کوئی کام نہیں ہوتا اور میں کہتا ہوں کہ اگر دوسرے کے کرنے سے کام ہو جاتا ہے اور اپنے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو اس کی کیا وجہ کہ یہ قاعدہ دین ہی کے کاموں میں برتا جائے۔ دنیا کے کاموں سے بھی کیوں ہاتھ نہیں اٹھالیا جاتا اور ان کو بھی کیوں پیر صاحب کے بھروسے پر نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ بس نہ کھاؤ نہ پیو نہ کھیتی کرو۔ سب کام تمہاری طرف سے پیر ہی کر لیا کریں گے۔ ان ہی کے کھانے سے تمہارا پیٹ بھر جائے گا ان ہی کے پینے سے تمہیں تسکین ہو جائے گی افسوس ان کاموں میں تو اس قاعدے پر عمل نہیں کیا گیا بلکہ اپنے کرنے کو ضروری سمجھا گیا اور دین کے کام کو اس قدر سستا اور بے وقعت سمجھا گیا کہ اس میں اس قسم کے قاعدے برتے گئے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔

اودھ میں ایک پیر تھے کہ وہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے ان کے مرید کہا کرتے تھے کہ وہ مکہ جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے سن کر کہا کہ صاحب اس کی کیا وجہ کہ نماز کے لئے تو مکہ کو اختیار کیا جائے اور کھانے ہگنے کے لئے ہندوستان کو، اگر نماز وہاں پڑھی جاتی ہے تو کھانا ہگنا بھی وہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ ہندوستان میں ہوتا ہے تو نماز بھی ہندوستان میں ہونی چاہیے کیونکہ ہندوستان بم پولیس نہیں ہے اور اپنے اس قاعدے میں کہ سب پیر ہی کر لیں گے۔ غور کر کے دیکھو اس کا حاصل تو یہ ہے کہ گویا پیر تمھارے کمیں ہیں کہ گناہ تم کرو اور پیر اس کو اٹھائیں۔ یاد رکھو کہ پیر صرف راستہ بتلانے کے لئے ہیں۔ کام کرنے کے لئے نہیں کام تم کو خود کرنا چاہیے۔

مرشد کی توجہ سے جو قلب میں کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ نہ قابل اعتماد ہے اور نہ باقی

اس تقریر پر شاید اہل فن کو یہ شبہ ہو کہ بعض مرتبہ مرشد کی توجہ سے طالب کے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ خود محنت کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس کیفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے تو یہ کیفیت باقی بھی نہیں رہتی۔ اس کیفیت کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن کا گرم ہو جانا۔ لیکن یہ گرمی باقی نہیں رہتی۔ آگ کے سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوئی اسی طرح اس کیفیت میں بھی پیر سے جدا ہوتے ہی کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

حکایت: ایک بزرگ نے اپنے ہم عصر بزرگ سے کہا کہ تم اپنے مریدوں سے محنت لیتے ہو اور ہم نہیں لیتے۔ انہوں نے یہ سن کر اپنے ایک مرید سے کہا کہ تم ذرا ان کے مرید سے مصافحہ تو کرو۔ مصافحہ کرنا تھا کہ وہ کم محنت مرید خالی رہ گئے۔ پیر نے ان سے کہا کہ دیکھا نتیجہ محنت نہ کرنے کا۔ اب تم ہمارے کسی مرید کو تو اس طرح کورا کر دو۔ بات یہ ہے کہ اپنی کمائی کی قدر بھی خوب ہوتی ہے اور مفت کی چیز کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔

ہر کہ[1] اوارزاں خرد ارزاں دہد! گوہرے طفلے بقرص نان دہد

مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑ کا جوتا دوشالے سے جھاڑ رہا تھا۔ لوگوں نے اس سے سبب پوچھا تو کہا کہ دوشالہ تو میرے والد کی کمائی کا ہے اور جوتا میری کمائی کا ہے۔

جو لوگ خود کام کرتے ہیں ان کی حالت پائیدار ہوتی ہے

اور جو لوگ اپنے بوتہ پر کام کرتے ہیں ان کی حالت ساری عمر یکساں رہتی ہے۔ البتہ ان میں شور و غل اچھل کود نہیں ہوتی اور نہ یہ مطلوب ہے۔ دیکھو اگر کوئی بچہ کی تربیت کرنا

---

[1] جو شخص سستا خریدتا ہے۔ سستا دے دیتا ہے ایک بچہ موتی کو روٹی کی ٹکیہ کے بدلہ میں دے دیتا ہے۔

چاہے تو طریقہ اس کا یہ ہے کہ اس کو تھوڑا کھلائے وہ جز و بدن ہو اور اس سے نشو و نما پیدا ہو۔ اسی طرح شیخ کامل بھی ایک ہی دن سب کچھ نہیں بھر دیتا کیونکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ طالب کو حالات کا ہیضہ ہو اور ایک ہی دن میں خاتمہ ہو جائے۔ بلکہ وہ بتدریج[1] اس کو آگے کو بڑھاتا ہے اور جو لوگ اناڑی ہیں اور طریق تربیت سے ناواقف و ناآشنا ہیں وہ ایک دم میں بھر دینا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو عوام الناس بہت بزرگ سمجھتے ہیں حالانکہ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے تعلقات اس سے چھوٹ جاتے ہیں۔ نہ بیوی کے کام کا رہتا ہے نہ بچوں کے۔ اور یہ کمال نہیں بلکہ نقص ہے۔

تو برائے[2] وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ایک عام عنوان سے فرماتے ہیں۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

(اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ نے ان کو وابستہ رکھنے کا)

افسوس آج اسی کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں۔ دیکھئے اولاد کو منہ بھی نہیں لگاتے۔ بیوی تک کو نہیں پوچھتے۔ ہر وقت قرب خداوندی میں غرق رہتے ہیں۔ صاحبو کیا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قرب میں زیادہ ہو سکتا ہے۔ کبھی نہیں پھر دیکھ لیجئے حضورؐ کی حالت کیا تھی۔ آپؐ ازواج مطہرات کے حقوق بھی ادا فرماتے تھے۔ اولاد کے حقوق بھی ادا فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما میں سے ایک کو پیار کر رہے تھے اور ایک نجد کے رئیس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے دس بیٹے ہیں میں نے تو آج تک کسی ایک کو بھی کبھی پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تیرے دل میں سے رحم نکال لیا ہو تو اس کو میں کیا کروں۔

اور آپ کا ارشاد ہے۔ **من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر کبیرنا فلیس منا**

(جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا احترام نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ترمذی)

---

[1] درجہ بدرجہ [2] تم تو میل کرنے کے واسطے آئے ہو جدائی کرنے کے واسطے نہیں آئے۔

اس واقعہ سے پورا اندازہ حضورؐ کی حالت اور مرضی کا ہو گیا ہو گا۔ پس یہ جوش اور مستی یا ترک[1] تعلقات واجبۃ الابقاء بزرگی نہیں ہو سکتا ہے اور اگر اسی کا نام بزرگی ہے تو نشہ شراب اور حالت جنون میں بھی بزرگی ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں یہ بات خوب حاصل ہو جاتی ہے۔

بزرگی کا حقیقی معیار

صاحبو! بزرگی کا حقیقی معیار یہ ہے کہ جتنی درویشی میں ترقی ہو جائے حضور ﷺ سے مشابہت بڑھتی جائے کیونکہ ولایت[2] مستفاد عن النبوت ہے۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ علماء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس لئے بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ بزرگی کا ایک معیار یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے اٹھا کر زمین پر پٹک دے وہ بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ بالکل ہی لغو ہے۔ اگر یہ بزرگی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ضرور اس کو برتنا چاہیے تھا۔ پھر کیا وجہ کہ جب کفار نے آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہا تو آپ ﷺ اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہو جائیں تو میں نکل کر جاؤں۔ کیوں آپ ﷺ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش نہیں کر دیا۔

حکایت[3]: جب مدینہ طیبہ تشریف لے چلے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چاروں طرف دیکھتے چلتے تھے۔ سراقہ جو کہ آپ ﷺ کی تلاش میں بھیجا گیا تھا جب سامنے آ گیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ سراقہ چلا آ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اس وقت بھی خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ اللھم اکفنا شرہ[4] چنانچہ پیٹ تک اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ نے کہا کہ غالباً آپؐ نے میرے لئے بددعا کی ہے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں قریش کو آپؐ کا پتہ نہ دوں گا۔ چنانچہ آپؐ نے دعا فرمائی اور اس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا۔ اور پھر کسی سے اطلاع نہیں کی۔

---

[1] جن تعلقات کا باقی رکھنا واجب ہے ان کو ترک کرنا۔ [2] ولی ہونا نبوت کے فیض سے ہی حاصل ہوتا ہے
[3] بخاری و مسلم [4] اے اللہ آپ ہم کو اس کے شر سے کافی ہو جایئے۔

پہلے زمانہ میں صدق وایفاءعہد کی صفت عام تھی

اس واقعہ سے آج کل کے لوگوں کو سبق لینا چاہیے کہ اس زمانے کے کفار میں بھی صدق وایفا عہد تھا۔ آج کل کی طرح پولٹیکل چالیں نہ تھیں بلکہ آج سے چند روز پیشتر تک یہ اوصاف اکثروں میں موجود تھے۔ مگر صد حیف کہ آج کل بالکل مفقود ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو اس وقت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے۔ دن میں سینکڑوں جھوٹے وعدے کرتے ہیں بیسیوں مکر کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ رنج کی بات یہ ہے کہ مقدسین بھی اس حالت سے پاک نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم   چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

کہ میں جو قمار خانہ میں گیا تو دیکھا کہ سب پاکباز جمع ہیں مطلب یہ ہے کہ قمار خانہ کے جو مقرر کردہ اصول تھے سب کے سب ان پر چل رہے تھے۔ اس میں کسی قسم کا دغل نہ تھا اور بعنوان محاورہ کسی قسم کی بے ایمانی نہ تھی کیونکہ وفائے عہد کو لوگ ایمانداری کہتے ہیں خلاصہ یہ کہ جن اصولوں پر قمار ٹھہرا تھا ان میں خلاف عہد نہیں ہوتا ہے اور جب صومعہ[1] میں گیا تو دیکھا کہ جن اصولوں پر یہاں حق تعالیٰ سے عہد کیا تھا اس میں وفا نہیں۔ اور ان کو پورا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً عہد کیا تھا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم آپ کی ہی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد یں چاہتے ہیں) حالانکہ اس عہد کو وفا نہیں کیا جاتا کیونکہ دل میں ہزاروں[2] غیر اللہ من وجہ درجہ معبودیت اور مستعانیت لئے ہوئے بھرے ہیں۔ صاحبو! پہلے لوگ اس قدر سیدھے سادے بھولے بھالے ہوتے تھے کہ ان کو کسی قسم کی چالاکی آتی ہی نہ تھی۔

حکایت: ایک صاحب زمیندار تھے ایک مرتبہ کاشت کار اناج لایا۔ ان زمیندار نے پوچھا کہ یہ کس قدر ہے۔ کاشت کار نے نوے من بتلایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے تو اسی من ٹھہرا تھا۔ کاشت کار نے کہا کہ نہیں جناب نوے من ٹھہرا تھا۔ بہت دیر تک اس میں جھگڑا رہا۔ آخر ان کے صاحبزادے نے بہت سی کنکریاں جمع کر کے ایک ڈھیر نوے کنکریوں کا اور

---

[1] عبادت گاہ [2] اللہ کے سوا ہزاروں کسی نہ کسی طرح سے معبود ہونے اور مدد چاہا ہوا ہونے کا درجہ لئے ہوئے ہمارے دلوں میں بھرے ہیں۔

دوسرا اسی کنکریوں کا لگایا اوران زمیندار سے گنوا کر پوچھا کہ یہ اسی زائد ہے یا نوے۔ انہوں نے نوے کو زائد بتلایا تو انہوں نے کہا کہ کاشتکار اس قدر من دینا چاہتا ہے جس قدر یہ نوے کنکریاں ہیں تب ان دونوں کا جھگڑا ختم ہوا۔

سبحان اللہ کیسے اچھے وقت تھے کہ کفار میں بھی چالیں نہ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ سراقہ نے جو عہد آپؐ سے کیا تھا اس کو پورا کیا اور جو شخص اس کو راستے میں ملتا گیا اس سے کہتا گیا کہ میں بہت دور تک دیکھ آیا ہوں ادھر کہیں نہیں ملے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہایت امن و امان سے مدینہ پہنچ گئے۔ تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کے ساتھ یہ نہیں کیا کہ اس کو ایک نظر میں اڑا دیتے یا گرا دیتے بلکہ خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تشویش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا یعنی نظر سے بیہوش کرنے کا کبھی احتمال نہ تھا۔ ورنہ صدیق اکبرؓ پریشان نہ ہوتے بلکہ مطمئن رہتے کہ حضور ایک نظر بھی کریں گے تو یہ فوراً ہی لوٹ پوٹ ہو جائے گا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی کمال نہیں ہے۔

بزرگوں کی نظر وتوجہ سے راہ پر لگ جاتا ہے آگے جو کچھ ہوتا ہے اپنے کرنے سے ہوتا ہے

ہاں نظر وتوجہ سے صرف اس قدر ہوتا ہے کہ راہ پر لگا دیا جائے آگے جو کچھ ہوتا ہے اپنے کرنے سے ہوتا ہے۔

حکایت: چنانچہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی بابت سنا ہے کہ بڑے امیر زادہ اور نظر کردہ ہیں ان کی حالت یہ تھی کہ متوحشانہ جنگلوں میں پھرا کرتے تھے ان کے والد ان کو نکما بیکار سمجھا کرتے تھے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کو مکشوف ہوا کہ فلاں مقام پر فلاں رئیس کا ایک لڑکا ہے اس کی تربیت کر۔ حضرت نجم الدین کبریٰ تشریف لائے۔ حافظ شیرازیؒ کے والد نے نہایت تعظیم وتکریم سے مہمان کیا اور عرض کیا کہ کیسے تکلیف کی۔ انہوں نے کہا کہ اپنے بیٹوں کو جمع کرو چنانچہ انہوں نے حافظ کے سوا سب بیٹوں کو بلا کر پیش کیا۔ آپ

نے سب کو دیکھا اور فرمایا کہ ان کے سوا کوئی اور لڑکا نہیں۔ حافظ کے والد حافظ کو کالعدم کہتے تھے۔ اس لئے جواب دیا کہ اور کوئی نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک مجھے معلوم ہوا ہے اور وہ ان میں معلوم نہیں ہوتا۔ تب انہوں نے کہا کہ ایک اور ہے۔ مگر نہایت آوارہ دار جنگلوں میں پھرتا ہے۔ حضرت نجم الدینؒ نے فرمایا کہ ہاں اسی کی ضرورت ہے۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے والد کو بڑا تعجب ہوا کہ اس دیوانے سے حضرت کو کون سا کام ہوگا اور یہ خبر نہ تھی۔

کہ آب[1] چشمہ حیواں درون تاریکجا ست

چنانچہ تلاش کے بعد حافظ ملے۔ وحشی خاک آلودہ اور ان کو حضرت نجم الدین کبریٰؒ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حافظ نے جب حضرت کی صورت دیکھی تو بے اختیار زبان سے نکلا۔

آنانکہ[2] خاک را بنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

درد[3] وم نہفتہ بہ زطبیاں مدعی!   باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

آپ نے سینے سے لگا کر فرمایا کہ[4] بہ تو نظر کردم۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ بہت بڑے شخص ہیں ان کا انتقال اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ انہوں نے کسی کو کوئی شعر پڑھتے سنا کہ اس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

جاں[5] بدہ و جاں بدہ و جاں بدہ

آپ نے فرمایا کہ افسوس محبوب جان طلب کر رہا ہے اور کوئی نہیں سنتا اور فرمایا کہ

جاں[6] دادم و جاں دادم و جاں دادم

اور اس میں انتقال ہو گیا۔ غرض حافظ کو سینے سے لگا کر انہوں نے فیض دیا۔ لیکن وہ فیض کافی نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد یا اس سے قبل مجاہدے کی بھی ضرورت ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ قابلیت تامہ کی وجہ سے زیادہ مجاہدے کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔

---

[1] ہمیشہ کی زندگی کے چشمہ کا پانی تاریکی میں ہے۔ [2] وہ لوگ کہ مٹی کو ایک نظر میں کیمیا (سونا) بنا دیتے ہیں۔ کیا ہوسکتا ہے کہ نظر مبارک کا ایک کنارہ ہماری طرف بھی کر دیں۔ [3] میرا درد دعویدار طبیبوں سے تو چھپا رہنا ہی بہتر ہے ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ ہی غیب کے خزانہ سے اس کی دوا کر دیں۔ [4] میں نے تم پر نظر کر دی۔ [5] جان دے دو جان دے دو جان دے دو۔ [6] میں نے جان دے دی میں نے جان دے دی میں نے جان دے دی۔

قوی الاستعداد کو تھوڑا سا مجاہدہ بھی کافی ہے

چنانچہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ قوی الاستعداد ہوتے ہیں ان کو تھوڑے کام میں بہت نفع ہو جاتا ہے۔

حکایت: حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ کے پاس ایک شخص آیا اور ایک ہفتہ میں خلافت لے کر چلا گیا۔ آپ کے دوسرے مرید اس کو دیکھ کر دل میں بہت خفا ہوئے اور یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شیخ ہماری طرف پوری توجہ نہیں فرماتے۔ آپ نے ان لوگوں کے انداز سے اس وسوسہ کو تاڑ لیا اور ان کے علاج کے لئے فرمایا کہ کچھ تر اور کچھ سوکھی لکڑیاں جمع کرو۔ جب جمع ہو گئیں تو فرمایا کہ گیلی لکڑیوں میں آگ لگا دو۔ سب نے بہت کوشش کی لیکن ان میں آگ نہ لگی۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان سوکھی لکڑیوں میں آگ لگا دو چنانچہ ان میں فوراً آگ سلگ اٹھی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا وجہ یہ لکڑیاں اس قدر جلد کیوں سلگ اٹھیں اور پہلی لکڑیوں میں کیوں آگ نہیں لگی۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ حضور پہلی لکڑیاں گیلی تھیں۔ اور یہ سوکھی ہوئی ہیں۔ گیلی لکڑیوں میں آگ نہیں لگا کرتی آپ نے فرمایا کہ ظالمو تم سب گیلی لکڑیاں ہو کر میری شکایت کرتے ہو اور اس سوکھی لکڑی کے جل اٹھنے پر تعجب کرتے ہو۔ وہ سوختہ ہو کر آیا تھا صرف ایک پھونک کی ضرورت تھی چنانچہ ایک ہی پھونک میں بھڑک اٹھا اور تم گیلی لکڑی ہو کہ رات دن دھونکتا ہوں مگر تم آگ ہی نہیں پکڑتے۔ سو اس میں میری جانب سے کمی ہے یا تمہارا قصور ہے۔ غرض بعض سوختہ دل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کو تھوڑے ہی کام میں بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن پہلے یا بعد کو کچھ نہ کچھ مجاہدہ ضرور کرنا پڑتا ہے۔

مجاہدہ پر بھی جو کچھ ملتا ہے فضل ہے

اور کرنے پر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ محض فضل ہے کیونکہ خدا تعالیٰ پر کسی کا زور نہیں ہے مگر عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ جو ادھر توجہ کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کو بہت کچھ دے دیتے ہیں من[1] تقرب

---

[1] جو شخص ہماری طرف ایک بالشت آتا ہے ہم اس کی طرف ایک ہاتھ آتے ہیں ۱۲ منہ

الی شبراً تقربت الیه ذراعاً کے یہی معنی ہیں۔تو صاحبو! کیا یہ بات کچھ کم ہے کہ کام پیسے کا کیا جائے اور ملے ایک اشرفی

خود[۱] کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را

کہ دیا تو ایک پھول اور اس کے عوض مل گیا ایک باغ خوب کہا ہے

نیم[۲] جاں بستاند وصد جاں دہد — آنچہ درد ہمت نیاید آں دہد

کہ آدھی جان لے کر سینکڑوں جانیں دیتے ہیں غرض یہ ہے کہ جو تدبیر کرنے کی ہے لوگ اسے نہیں کرتے صرف ناتمام تدابیر پر اکتفا کرتے ہیں حالانکہ تدبیر پوری کرنی چاہیے۔تب فائدہ مرتب ہوتا ہے۔

غفلت[۳] عن الآخرہ تعجب کی بات ہے

دیکھئے جب کسی سفر کا قصد ہوتا ہے تو اس کے لئے کس قدر سامان کرتے ہو کہ مثلاً چار دن پہلے سے دھوبی کو حکم کرتے ہو کہ کپڑے جلدی دینا۔ ناشتہ کا سامان کرتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں کیا جاتا کہ عین وقت پر سارا سامان کیا جائے بلکہ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو بیوقوف بنائے جاتے ہیں اور خود بھی اپنے کو بے وقوف سمجھتے ہیں کیوں صاحب جب اس چھوٹے سے سفر کے لئے اتنے پیشتر سامان فراہم کیا جاتا ہے تو یہ موت کا اتنا بڑا سفر کتنے پہلے اور کتنا بڑا سامان چاہتا ہوگا۔ کیونکہ یہ وہ سفر ہے کہ اس سے پھر کبھی واپسی ہی نہیں ہوگی۔ پھر اس کے لئے کیا سامان مہیا کیا۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو اطاعت خداوندی میں سرگرم ہیں دوسرے وہ جو مخالفت میں پھنسے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے یہ سفر۔ سفر رغبت[۴] اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے سفر رہبت[۵] ہے اور یہ دونوں صورتیں دنیا کے سفروں میں بھی ہوتی ہیں پس دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کا مدعو ہو جو کہ سفر رغبت ہوگا اس کے لئے کیا کچھ سامان پہلے سے کرے گا۔ اپنے پاس نہ ہوگا تو دوسروں سے قرض لے کر مستعار

۱؎ خود سے کون ایسا بازار پا سکتا کہ جہاں ایک پھول کے بدلہ تم پورا چمن خرید لیتے ہو۔ ۲؎ آدھی سی جان لیتے اور سینکڑوں جانیں عطا فرما دیتے ہیں بلکہ جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا وہ دے دیتے ہیں۔
۳؎ قیامت اور دوسرے جہان سے غافل ہونا ۴؎ شوق کا سفر ۵؎ خوف کا سفر

مانگ کر چیزیں جمع کرے گا اور ہر طرح سے درست ہو کر ارادہ سفر کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے مثلاً چوری کی ہو اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کے نام سمن آ گیا تو غور کیجئے کہ جانے سے پہلے وہ کیا کیا سامان کرے گا۔ اپنی صفائی کے گواہ جمع کرے گا۔ وکلاء سے مل کر مشورہ کرے گا دوست احباب سے رائے لے گا۔ وغیرہ وغیرہ غرض دونوں قسموں کے سفر میں مختلف طرح کے سامان کئے جاتے ہیں۔ تو کیا وجہ کہ جب یہی دونوں صورتیں آخرت کے سفر میں بھی محتمل ہیں اس میں کیوں سامان نہیں کیا جاتا اور سہل انکاری برتی جاتی ہے۔

صاحبو! یہ تو یقینی ہے کہ سفر آخرت آنے والا ہے پس اگر ہم مطیع ہیں تو یہ سفر ہمارے لئے رغبت کا سفر ہوگا ورنہ رہبت اور خوف کا سفر ہوگا۔ پس بتلایئے کہ آپ نے رغبت کے کیا سامان جمع کئے ہیں اور خلاصی کی کونسی صورتیں پیدا کی ہیں۔ کونسی عبادت کی ہے کتنے حق العباد ادا کر دیئے ہیں بلکہ اگر غور سے دیکھو تو سفر آخرت ہر مسلمان کے لئے رغبت اور رہبت دونوں پہلو لئے ہوئے ہے کیونکہ ایمان بین[1] الخوف والرجا ہے۔ یعنی نہ خدا تعالیٰ پر ناز ہو سکتا ہے اور نہ مایوس ہونا چاہیے۔

غافل[2] مرد کہ مرکب مردان زہد را | در سنگ لاخ باد یہ پے ہا برید اند
نومید[3] ہم مباش کہ رندان بادہ نوش | ناکہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

ہر مسلمان کو رغبت[4] ورہبت دونوں کی ضرورت ہے

مسلمانوں کی اصل حالت یہ ہونی چاہیے کہ رغبت اور رہبت ملی ہوئی ہو چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی حالت بیان فرماتے ہیں يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (یہ ہم کو پکارتے ہیں شوق کے ساتھ اور خوف کے ساتھ) یعنی یہ دونوں وصف ان میں جمع ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر میدان قیامت میں یہ نداء ہو کہ صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو مجھے یہ امید ہوگی کہ وہ شخص میں ہوں اور اگر یہ نداء ہو کہ صرف ایک شخص جہنم

---

[1] ڈر اور امید کے درمیان [2] اس راہ میں غفلت سے نہ چلو کیونکہ بعض زہد کے جوانمردوں کی سواری کی جنگل کے پتھریلے میدانوں میں کوچ کاٹ دی گئی جس سے وہ منزل تک نہ پہنچ سکے۔ [3] ناامید بھی نہ ہو جاؤ کیونکہ بعض عشق الٰہی کی شراب پینے والے اچانک ایک نعرہ سے بھی منزل پر جا چکے ہیں۔ [4] شوق اور خوف

میں جائے گا تو مجھے یہ اندیشہ ہو گا کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔

غرض مسلمان کو ہر وقت رغبت بھی ہونی چاہیے اور ہیبت بھی۔ اور جب یہ ہے تو ہر وقت استغفار بھی کرتے رہنا چاہیے اور اعمال میں بھی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے اور صاحبو! ایک آدھ وقت کر لینے سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ روز کا دھندا ہو جائے۔ فرماتے ہیں۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص یہ غور کر لیا کرے کہ (قیامت) کے لئے کیا آگے بھیجا ہے) یعنی اس کو سوچو کہ کل کے لئے کیا رکھا ہے۔

فکر آخرت سے مراد دنیا کے سب کام چھوڑ دینا نہیں ہے

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر معطل ہو جاؤ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی دھن لگ جائے اگر روزانہ نصف گھنٹہ بھی اس تفکر کے لئے نکال لیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت کم نافرمانی ہو گی اور دنیا کی محبت جاتی رہے گی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ یہ حالت ہو گی کہ تم دنیا کے سب کاروبار کرو گے لیکن ان کاموں میں جی نہ لگے گا اور اس کے بعد دو چیزیوں کی اور ضرورت ہو گی ایک تو بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کی۔ سو بحمد اللہ اب اس کا سامان بہت میسر ہو گیا اور ہر شخص کو ہر جگہ رہ کر اس کا سیکھنا آسان ہے اس کے لئے یہ کرو کہ کوئی جامع رسالہ[1] لے کر اس کو کسی عالم سے پڑھنا یا اگر پڑھنے کا موقع نہ ہو تو نہایت غور سے دیکھنا شروع کر دو اور ہمیشہ اس کا ورد رکھو

دوسرے کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر لو مگر تعلق دین کے لئے پیدا کرو۔ دنیا طلبی کے لئے اہل اللہ سے تعلق نہ پیدا کرنا چاہیے۔ ہاں شاذ و نادر اگر کوئی دنیا کا کام بھی ان سے نکل جائے تو مضائقہ نہیں۔

اہل اللہ سے دنیا کے واسطے تعلق مت پیدا کرو

لیکن محض دنیا کو ہی نصب[2] العین بنا کر اہل اللہ سے راہ و رسم پیدا نہ کرنا چاہیے مثلاً بعض

---

[1] مثلاً بہشتی زیور اور حضرت کے وعظ۔ [2] جس پر نظر جمائی جائے یعنی مقصود

لوگ اہل اللہ سے اس لئے ملتے ہیں کہ ان کی ملاقات بڑے لوگوں سے ہے ان کے ذریعے سے ہمارے کام نکلیں گے۔ یا بعضے لوگ تعویذ گنڈوں کے لئے ملتے ہیں حالانکہ اہل اللہ سے اس قسم کے کام لینے کی ایسی مثال ہے کہ کسی سنار سے کھرپا بنانے یا لوہار سے زیور بنانے کی فرمائش کی جائے۔ بعض لوگ مشورہ لیا کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کی تجارت کریں اناج کی تجارت کریں یا کپڑے کی۔ خدا جانے یہ لوگ اہل اللہ کو خدا تعالیٰ کا سررشتہ دار سمجھتے ہیں کہ ان کا بتلانا خدا کا بتلانا ہوگا اور جب خدا بتلا دے گا تو اس کام میں ضرور نفع ہوگا۔ یا خدا تعالیٰ کا راز دار سمجھتے ہیں کہ یہ خدا سے مشورہ کر کے بتلا دیں گے۔ صاحبو! اس دربار انبیاء کا پتہ بھی پانی ہوتا ہے دوسروں کی تو کیا مجال ہے۔

ہست سلطانی[1] مسلم مردرا! نیست کس راز ہرہ چون و چرا

فرماتے ہیں۔ قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم و امہ و من فی الارض جمیعًا (آپ کہہ دیجئے تو کون مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کس چیز کا اگر وہ ارادہ کرلیں کہ مسیح ابن مریم اوران کی والدہ اور جو لوگ زمین میں ہیں سب کے سب کو ہلاک کردیں) تو انبیاء کی نسبت جب یہ کہا جارہا ہے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔

ایک صاحب نے مجھ سے یاد نہیں رہا کوئی دنیوی فرمائش کی۔ میں نے کہا یہ کام مجھ کو نہیں آتا۔ کہنے لگے اللہ والوں کو سب آتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر سب کچھ آتا ہے تو کل ایک چارپائی بھی لے آنا کہ اس کو بن دیجئے۔ غرض مولویوں سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پوچھے اور اہل طریقت سے اللہ تعالیٰ کا نام پوچھے دنیا کی فرمائش کسی سے نہ کیجئے۔ ہاں دنیا کے لئے دعا کرانے کا مضائقہ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کسی قسم کا دخل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

اپنے کام کے لئے دعا خود بھی کرو

دعا کے متعلق بھی یہ نہ کرو کہ صرف ان پر ہی ڈال دو بلکہ تم خود بھی اپنے لئے دعا کرو اور بزرگوں سے بھی دعا کراؤ۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ

---

[1] بادشاہت صرف انہی کے لئے تسلیم کی ہوئی ہے کسی کا پتہ نہیں کہ کہہ سکے یہ کیوں ہے کس لئے ہے؟

خود دعا کروں میں نے کہا کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں۔ کہنے لگے کہ پڑھتا ہوں میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ تم کلمہ پڑھنے کے قابل تو ہو مگر دعا کرنے کے قابل نہیں۔ شیطان کی شرارت ہے کہ دل میں یوں ڈالتا ہے کہ دعا کے قابل نہ سمجھنا تواضع ہے۔

ایک صاحب نے یہ فرمائش کی تھی کہ تم ہی استخارہ دیکھ دو۔ غرض اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ سب کچھ دوسرے ہی کر دیں۔ مجھے پھر یاد آتا ہے کہ کھانے میں کبھی یہ نہ سوچا کہ بزرگوں سے کہتے کہ آپ ہی کھالیا کیجئے۔ ہمارے کھانے کی ضرورت نہیں۔

تو خلاصہ تدبیر کا یہ ہے کہ کام دین کا خود کرو اور بزرگوں سے اس میں صلاح مشورہ لیتے رہو۔

آخرت کی فکر دائماً[1] ہونی چاہیے

اور عمر بھر اسی تدبیر میں لگے رہو یہ نہ کرو کہ چار دن کیا اور چھوڑ دیا کیونکہ ہم کو تو جہنم روگ لگا ہے اس کے لئے عمر بھر کی ضرورت ہے۔

عارف رومیؒ فرماتے ہیں۔

اندریں[2] رہ می تراش و می خراش	تادم آخر دمے فارغ مباش
تادم[3] آخر دمے آخر بود	کہ عنایت با تو صاحب سر بود

عوام اکثر شیخ کامل کی شناخت میں غلطی کرتے ہیں

عوام اکثر شیخ کامل کی شناخت کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص تمام رات جاگتا ہے کسی سے بات بھی بہت کم کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو کہ صرف فرائض و واجبات و سنن ادا کرتا ہے رات کو گھنٹہ دو گھنٹے جاگ لیتا ہے حفاظت دماغ کی تدابیر بھی کرتا ہے۔ نصیحت و پند بھی کرتا ہے۔ خلق اللہ کی دلجوئی کے لئے لوگوں سے ملتا بھی ہے۔ بچوں سے مزاح بھی کر لیتا ہے تو عوام الناس اس کے مقابلہ میں پہلے شخص کو زیادہ کامل سمجھیں گے۔ چنانچہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عابد ہے (بلکہ عابد کی جگہ معبد

---

[1] ہمیشہ یعنی ہر وقت [2] اس راستہ کی کاٹ چھیل کرتے ہی رہو یعنی چلتے رہو آخری دم تک ایک منٹ کو بھی بیکار مت بیٹھو۔ [3] آخری دم تک کہ آخری سانس ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت تمہارے لئے راز دار بن جائے۔

کہتے ہیں خدا جانے یہ لغت کہاں سے ایجاد کیا ہے) اور دوسرے شخص کو چونکہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ عبادت نہیں کرتا اس لئے اس کو زیادہ کامل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ عابد واقع میں یہی شخص ہو کیونکہ عبادت عبد بننے کو کہتے ہیں اور عبدیت بجا آوری احکام کا نام ہے۔ جس وقت بھی جو حکم ہو پس اختلاط[1] خلق اغراض صالحہ سے نیز عبادت میں دخل ہے۔

تحقیق ماہیت عبدیت

عبدیت کے متعلق حضرت حاجی صاحب کی ایک تحقیق بیان کرتا ہوں۔ فرمایا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

(نہیں پیدا کیا ہم نے انسان اور جن کو مگر عبادت کرنے کے واسطے)

تو باوجود اس کے کہ ملائکہ اور حیوانات جمادات نباتات جواہر واعراض سب کے سب عبادت میں مصروف ہیں جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بارہ میں ارشاد ہے۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ

(فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں رات میں اور دن میں اور تھکتے نہیں)

حیوانات وغیرہ کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ

(نہیں کوئی چیز مگر اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی تعریف کے ساتھ لیکن تم ان کے بیان کرنے کو سمجھتے نہیں)

ان کے علاوہ اور متعدد آیات سے ہر ایک چیز کا عبادت میں مشغول ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پھر انسان اور جن کی تخصیص عبدیت میں کیوں فرمائی گئی۔ فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے اور ایک غلام ہوتا ہے۔ نوکر کی خدمات ہمیشہ معین ہوا کرتی ہیں یعنی اگر چہ کتنے ہی مختلف کام نوکر سے لئے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کرے

---

[1] مخلوق سے میل جول جو نیک غرضوں کے لئے ہو یہ بھی عبادت ہے جیسے اصلاح اعمال تبلیغ احکام وتعلیم وتدریس وتربیت وغیرہ کیلئے

اور کہہ دے کہ میں اس کام کے لئے نہیں ہوں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کرو تو وہ ہرگز منظور نہیں کرے گا اور عذر کر دے گا۔ علی ہذا اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جس پر نوکر سے زیادہ قبضہ اور تسلط ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے۔

حکایت: چنانچہ ہمارے ایک خاندانی سید معزز دوست نے ایک ایسے موقع پر کہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا تھا اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دے دیا ہے۔ اہل محلّہ کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے پانی بھر آیا کرو۔ وہ لڑکا بہت خفا ہوا برخلاف غلام کے کہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی نیابت کرتا اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے نجس کپڑوں کو صاف کرتا ہے۔ ایک وقت بھنگی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفارت کا کام کرتا ہے۔ پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے۔ سفیر بھی ہے خلیفہ بھی ہے۔ پس انسان اور جن تو بمنزلہ غلام کے ہیں اور دوسری مخلوقات مثل نوکر کے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی عبادت کو تسبیح و تقدیس وسجدہ وغیرہ الفاظ سے فرمایا اور انسان اور جن کی عبادت کو بلفظ عبدیت فرمایا اور جب انسان اور جن عبد اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک وقت نماز روزہ کرنا عبادت ہوگا تو دوسرے وقت سونا اور قضائے حاجت کرنا لوگوں سے ملنا وغیرہ وغیرہ کام عبادت ہوں گے۔

چنانچہ حدیث[۱] میں ہے

نھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یصلی حاقناً او کماقال

کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور دفع فضلہ واجب ہے۔

دیکھئے ایک وقت انسان کے لئے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد جانا حرام اور بیت الخلاء جانا واجب ہوا۔

---

[۱] ابوداؤد [۲] حدیث میں ہے کہ جب شام کا کھانا اور نماز حاضر ہوں تو کھانا پہلے کھاؤ مگر یہ سخت بھوک کا حکم ہے

شریعت میں اعمال کے حدود مقرر ہیں

اسی طرح اگر کوئی شخص اول وقت نماز پڑھنا چاہے اور اس کو شدت سے بھوک لگی ہو تو شریعت حکم کرے گی کہ نماز کو موخر کرو اور کھانا کھاؤ۔ اسی راز کو امام ابوحنیفہؒ نہایت پاکیزہ الفاظ میں فرماتے ہیں۔

لان یکون اکلی کله صلوٰة خیر من ان یکون صلوتی کلها اکلاً

میرا سارا کھانا نماز ہو جاوے بہتر ہے اس سے کہ ساری نماز کھانا بن جاوے۔

کیونکہ جب کھانا کھانے میں نماز کا برابر خیال رہا تو یہ سارا وقت انتظار صلوٰۃ میں گذرا۔ اور انتظار صلوٰۃ میں صلوٰۃ کا ثواب ملتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر بھوک میں نماز شروع کر دی جائے تو جوارح تو نماز میں مشغول ہوں گے اور دل کھانے میں پڑا ہوگا۔ تو نماز کھانے کی نذر ہو جاوے گی اور یہی فہم ہے جس کی بدولت ان حضرات کو فقیہ اور مجتہد کہا جاتا ہے آج یہ فہم مفقود ہے ہم لوگ کتابیں ان سے زیادہ پڑھتے ہیں مگر وہ بات حاصل نہیں ہوتی۔

ع نہ ہر کہ آئینہ[1] دارد سکندری داند

اور اسی راز کی بناء پر ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر جسم ہند میں رہے اور دل مکہ میں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ[2] میں رہے اور دل ہندوستان میں۔ غرض انسان کے لئے کوئی خاص عبادت مقرر نہیں کیونکہ اس کی شان عبدکی ہے اور جب یہ ہے تو ایک تو وہ شخص ہے کہ نماز پڑھ کر کسی دیہاتی سے باتوں میں مشغول ہے اور کھیتی باڑی کے حالات پوچھ رہا ہے اور دوسرا شخص لا الہ الا اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے۔ تو بظاہر یہ دوسرا شخص افضل اور اکمل معلوم ہوتا ہے لیکن غور کریں تو معلوم ہو کہ اگر پہلے شخص کی نیت درست ہے مثلاً مسافر کے انبساط[3] کے لئے ایسا کر رہا ہے یا کوئی دوسری ایسی ہی نیت ہے تو یہ باتیں زیادہ افضل اور مقبول ہیں۔

---

[1] یہ بات نہیں کہ جو آئینہ رکھتا ہو وہ سکندر کے کام جانتا ہو کہ جس نے آئینہ ایجاد کیا تھا [2] ہجرت کر کے جانے والا جس کے اہل وعیال اور جائیداد وغیرہ وطن میں ہوں دل ان میں پڑا ہو۔ [3] دل خوش کرنا اور مسلمانوں کا دل خوش کرنا کار ثواب بھی ہے مسلمان بھائی کا حق ادا کرنا بھی ہے

کاملین کا ظاہر میں عامہ سے ممتاز[1] نہ ہونا

باطن میں ان کا مشارک[2] نہ ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول[3] تھا کہ کھانے پینے حتیٰ کہ ایام جاہلیت کے تذکروں میں بھی صحابہؓ کے ساتھ شامل رہتے تھے اور ان لوگوں کے تذکروں کو سن کر آپ ﷺ تبسم فرماتے تھے۔ اور آپ کا ہنسنا تبسم سے زیادہ نہ ہوتا تھا اور کبھی کسی نے آپؐ کی آواز قہقہہ کی نہیں سنی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تجربہ ہے کہ جب کسی وجہ سے غم کا غلبہ ہوتا ہے تو ہنسی کی آواز نہیں نکلتی۔ اگرچہ کم و بیش تبسم کی حالت ہو جائے ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو تجربہ سے ثابت ہے اور ایک مقدمہ شمائل ترمذی سے ملا یئے شمائل میں ہے۔ کان[4] دائم الفکرۃ متواصل الاحزان اور وجہ اس کی خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ کیونکہ چین سے رہوں حالانکہ صاحب صور تیار کھڑا ہے کہ اب حکم ہو اور صور پھونک دوں گویا یہ حالت تھی کہ

مرا در منزل[5] جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ۔۔۔ جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

ہنسی تو ان لوگوں کو آ سکتی ہے جو بالکل بے فکر ہوں۔ سو اللہ والوں کو بے فکری کہاں البتہ دوسروں کی خاطر سے کبھی کچھ ہنس دیتے ہیں اس کے مناسب حکایت ہے کہ۔

حکایت: حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ملاقات ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کثیر[6] التبسم تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کثیر[7] البکاء تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ کیا تم خدا کی رحمت سے بالکل ناامید[8] ہو گئے کہ کسی وقت تمہارا رونا ختم ہی نہیں ہوتا۔ حضرت یحییٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام کیا تم خدا کے قہر

۱؎ الگ یعنی اعمال و افعال میں بظاہر عام لوگوں کے قریب ۲؎ شریک ۳؎ بہت حدیثوں میں یہ واقعات ہیں ۴؎ ہمیشہ کی سوچ والے اور مسلسل فکروں والے کہ مخلوق الٰہی کے دوزخ سے نجات کی سوچ اور ساری امت کے متعلق فکر ۵؎ مجھے محبوب کے راستہ و منزل میں کیا بے فکری و راحت ہو کر جب ہر وقت گھنٹہ یہ فریاد کر رہا ہے کہ سفر کے لئے کجاوے یعنی سامان باندھ لو۔ ۶؎ بہت تبسم کرنے والے ہلکی ہنسی والے۔ ۷؎ بہت رونے والے ۸؎ یعنی ظاہری حالت عام لوگوں کی نظر میں ناامیدی کی ہے وہ اس کو دیکھ کر ناامید ہو جائیں گے کہ جب نبی کا یہ حال ہے تو ہمارا کیا ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ حقیقت میں ان کی یہ حالت تھی نبی تو کامل ہوتے ہیں اور یہی معنے اگلے جملے کے ہیں۔

سے بالکل مامون ہو کہ تم کو ہر وقت ہنسی ہی آتی رہتی ہے آخر ایک فرشتہ آیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم تم دونوں میں فیصلہ کرتے ہیں اے عیسیٰ جلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب رہتے ہو لیکن خلوت میں یحیٰ کی طرح گریہ زاری کیا کرو۔ اور اے یحییٰ خلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب ہو لیکن لوگوں کے سامنے کچھ تبسم بھی کرلیا کرو کہ لوگوں کو میری رحمت سے مایوسی نہ ہو جائے کہ جب نبی کا یہ حال ہے تو ہم کو نجات کی کیا امید ہے۔

اور یہ حکایت اس لئے بیان کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کا تبسم جو کچھ تھا وہ محض اس لئے تھا کہ آپ ﷺ کے ساتھ مصالح خلق کے وابستہ تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید تبسم بھی نہ ہوتا غرض جس وقت حضور ﷺ باتوں میں ہنسی میں مشغول ہوتے تھے۔ اس وقت حضورؐ کے کمال کی عوام کو کیا خبر ہوتی ہوگی۔ اسی لئے کافر کہتے ہیں۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِى الْاَسْوَاقِ

(یہ کیسے رسول ہیں جو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں پھرتے ہیں)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں

جملہ[1] عالم زیں سبب گمراہ شد	کم کسے زابدال حق آگاہ شد
ہمسری[2] با انبیاء برداشتند	اولیاء راہمچو خود پنداشتند
گفت[3] اینک مابشر ایشاں بشر	ماؤ ایشاں بستہ خوابیم و خور
ایں[4] ندانستند ایشاں از عمیٰ	درمیان فرقے بود بے منتہا
ایں[5] خورد گرد و پلیدی زوجدا	واں خورد گرد و ہمہ نور خدا

کہ ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے دوسرا کھاتا ہے تو اس سے نور خدا نکلتا ہے

میں جب حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مثنوی پڑھا کرتا تھا تو اس شعر میں مجھے خیال ہوا کہ

---

[1] سارا عالم اس وجہ سے (کہ ظاہر میں اللہ والے انہی جیسے ہیں) گم کردہ راہ ہو گئے (نہ ان کو پہچانا نہ ان سے فائدہ لیا) کم لوگ ہی حق تعالیٰ کے ولیوں اور ابدال سے واقف ہو سکے۔ [2] (باطن میں) انبیاء کے ساتھ ساتھ ہونے کو اٹھا ڈالا۔ اولیاء کو (ظاہر ظاہر دیکھ کر) اپنے جیسا سمجھ لیا۔ [3] یہ کہہ اٹھے۔ بات یہ ہے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہم اور وہ سونے اور کھانے کے پابند ہیں۔ [4] اندھے پن سے یہ نہ جان سکے کہ ان کے ان کے درمیان ایک بڑا فرق ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ [5] یہ کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے وہ کھاتے ہیں تو سب نور الٰہی بن جاتا ہے۔

یہ فرق محض شاعرانہ طور پر مولانا نے فرما دیا ہے کیونکہ واقعی فرق تو اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب اہل اللہ کے پیٹ سے فضلہ نہ نکلتا۔ جب سبق شروع ہوا تو حضرت قبلہ نے کیا خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد اخلاق ذمیمہ[۱] ہیں اور نور خدا سے مراد اخلاق حسنہ[۲] ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق حمیدہ میں مدد ملتی ہے اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق ذمیمہ میں مدد ملتی ہے تو باوجود اس فرق عظیم کے کفار نے نہ سمجھا اور انبیاء کو اپنی مثل کہا کیونکہ ان میں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ کھانا بھی کھاتے تھے پانی بھی پیتے تھے۔

کھانا پینا چھوڑنے کا نام بزرگی نہیں ہے

آج کل بھی ایسے لوگوں کو جو کھانا چھوڑ دیں پانی چھوڑ دیں بہت بزرگ سمجھا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر پانی یا کھانے کے چھوڑنے پر بزرگی کا مدار ہے تو سرسری اور سانڈا جو ایسے جانور ہیں بہت بزرگ ہیں کیونکہ سرسری پانی بالکل نہیں پیتی اور سانڈا نہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے صرف ہوا اس کی غذا ہے۔ صاحبو! بزرگی تو وہ چیز ہے

میان[۳] عاشق و معشوق رمزیست ... کراماً کاتبین راہم خبر نیست

یعنی بزرگی نسبت مع اللہ کا نام ہے جس کی پوری حقیقت کا بعض دفعہ فرشتوں کو بھی پتہ نہیں لگتا۔ البتہ اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تمام افعال واقوال حرکات میں تشبہ ہو یعنی جس طرح نماز ادا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری متابعت کی کوشش کی جائے اسی طرح آپس کے برتاؤ اور روزمرہ کی باتوں میں سونے میں جاگنے میں غرض ہر ہر بات میں حضورؐ کے اتباع کی کوشش کی جائے اور یہ اتباع عادت ہو جائے کہ بے تکلف سنت کے موافق افعال صادر ہونے لگیں تو بزرگی اور نسبت کی علامت یہ ہے اور کم کھانے یا کم پینے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

کم کھانے کی اصلی حقیقت

دوسرے کسی شخص کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بہت کھاتا ہے یا کم کھاتا ہے تو

---

[۱] برے [۲] اچھے [۳] عاشق و معشوق کے درمیان وہ چھپے راز ہیں کہ عمل لکھنے والے فرشتوں کو بھی اسکی خبر نہیں ہوتی

قطع نظر بزرگی کی علامات ہونے کے خود اس کا حکم بھی مشکل ہے کیونکہ کم کھانا یہ ہے کہ بھوک سے کم کھائے تو ممکن ہے کہ جس کو تم بہت کھانے والا سمجھے ہو اس کی بھوک اس خوراک سے دونی ہو تو وہ کم کھانے والا ہوا۔

حکایت: ایک شیخ سے ان کے مریدوں نے ایک دوسرے مرید کی شکایت کی کہ حضرت یہ بہت کھاتا ہے۔ چالیس پچاس روٹیاں کھا جاتا ہے۔ شیخ نے اس کو بلا کر کہا کہ بھائی اتنا نہیں کھایا کرتے۔ **خیر الامور اوسطھا** (سب کاموں میں بہتر درمیان کے درجہ کا کام ہوتا ہے) اس مرید نے کہا کہ حضرت ہر ایک کا اوسطا الگ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں اتنی مقدار کھا جاتا ہوں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ میں زیادہ کھاتا ہوں کیونکہ اصلی خوراک میری اس سے بہت زیادہ ہے جب تک مرید نہ ہوا تھا اس سے دونی کھایا کرتا تھا۔ تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہو گا کہ بعض آدمیوں کی خوراک ہی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اصلی خوراک کے اعتبار سے وہ بہت کم کھاتے ہیں تو یہ معیار صحیح نہیں ہے۔

قلت[1] طعام و منام کی شرح

اور ہر ایک کے لئے اس کا مناسب نہ ہونا

اگر کسی کو شبہ ہو کہ بزرگوں نے قلت الطعام اور قلت المنام کا حکم فرمایا ہے تو سمجھو کہ اول تو ہر ایک کی قلت جدا ہے جیسا حکایت بالا سے معلوم ہوا دوسرے ہر ایک کے لئے قلت کو تجویز بھی نہیں کیا جاتا بلکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی بڑے مفسد[2] کے دفع کرنے کے لئے کسی خفیف مکروہ کے ارتکاب کو بھی جائز رکھا جاتا ہے جب کہ اس کے ذریعہ سے کسی گناہ کبیرہ سے بچانا منظور ہو۔

حکایت: چنانچہ ایک چور کسی بزرگ سے بیعت ہوا اور چوری کرنے سے توبہ کی لیکن چونکہ مدت کی عادت پڑی ہوئی تھی اس لئے ہر شب چوری کرنے کا سخت تقاضا طبیعت میں پیدا ہوتا اور اس کو دبانے کے لئے وہ یہ کرتا کہ تمام ذاکرین کے جوتے اٹھا کر گڑبڑ کر دیتا اس

---

[1] کھانا اور سونا کم کرنے کا مطلب [2] خرابی

کے جوتے کے ساتھ اس کا اس کے جوتے کے ساتھ اس کا۔ غرض کسی ایک کا جوتا بھی اپنے ٹھکانے نہ ملتا۔ آخر لوگوں نے دق ہو کر ایک شب بیدار رہ کر دیکھا معلوم ہوا کہ یہ نو گرفتار ہیں۔ صبح ہوئی تو شیخ سے شکایت کی۔ انہوں نے بلا کر اس سے دریافت کیا۔ اس نے کہا حضور میں بیشک ایسا کرتا ہوں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت سے مجھے چوری کرنے کی عادت تھی اب میں نے توبہ کر لی ہے رہ رہ کر طبیعت میں تقاضا پیدا ہوتا ہے جس کو میں یوں پورا کرتا ہوں۔ اب آپ اگر مجھے اس سے منع فرمائیں گے تو میں اضطرارا[۱] پھر چوری کروں گا غرض میں نے چوری سے توبہ کی ہے، ہیرا پھیری سے توبہ نہیں کی۔ شیخ نے کہا کہ بھائی تجھے اس کی اجازت ہے تم ہیرا پھیری کر لیا کرو ان مراتب کو سمجھنا بڑی بصیرت پر موقوف ہے۔

سالک کے لئے بعض اوقات قطع تعلقات و معاش مضر ہوتے ہیں

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ ترک ملازمت اور قطع تعلقات کی ہرگز اجازت نہ دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اب تو صرف ایک بلا میں گرفتار ہے۔ چھوڑ دے گا تو خدا جانے کیا کچھ کرے گا اور کس قسم کی آفات کا شکار ہو گا تو اتنی بلاؤں سے ایک ہی بلا اچھی ہے اب لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ پیر صاحب لنگوٹہ بندھوا دیں اور بیوی بچوں کو چھڑا دیں۔ ایسے لوگوں کو تنخواہ پیر صاحب تو دینے سے رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے کہ جب حوائج[۲] ضروری پوری نہیں ہو سکتیں آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا تو جھوٹی شہادتیں دینا، جھوٹے مقدمے لڑانا، قرض لے کر دبا لینا، غرض اسی طرح کی صدہا آفات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ملازمت ترک کرانے کی کیا ضرورت، خدا تعالیٰ کا نام جب دل میں جگہ کر لے گا وہ خود ہی چھڑا دے گا کیونکہ

عشق[۳] آں شعلہ است کہ چوں برفروخت   ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

۱؎ سخت مجبوری کی وجہ سے ۲؎ ضرورت کی حاجتیں کہ جن کے بغیر زندگی دشوار بن جائے۔ ۳؎ عشق الٰہی ایک ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو جو کچھ بھی محبوب کے علاوہ ہوتا ہے سب کو پھونک ڈالتا ہے۔

تیغ[1] لا در قتل غیر حق براند! درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند[2] الا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

مشہور ہے کہ آب[3] آمد تیمم برخاست۔ پس آب کو تو آنے دو تیمم خود ہی جاتا رہے گا۔ یہی راز تھا جس کے لئے حضرت فرماتے تھے کہ چھڑانے کی کیا ضرورت ہے وقت پر خود ہی چھوٹ جائے گا اور یہ حکم ایسے شخص کے لئے تھا جس کے کھانے پینے کی کوئی سبیل نہ ہو کہ این[4] بلا رفع بلا ہائے بزرگ" اور اگر کسی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود ہو تو اس کو یہی مناسب ہے کہ اس[5] پر قناعت کرلے اور یاد خدا میں مشغول ہو۔ مولانا نظامیؒ فرماتے ہیں۔

خوشا[6] روزگارے کہ دارد کسے! کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر[7] ضرورت بیارے بود! کند کارے از مرد کارے بود

یعنی اگر ضرورت کے لائق موجود ہو اور اس پر قناعت کر کے کام میں مشغول ہو جاوے تو یہ بہت اچھا ہے تو اس فرق کو دریافت کرنا اور لوگوں کے حالات اور طبائع کا اندازہ کرنا یہ کامل ہی کا کام ہے۔

مشیخت[8] حقہ کی حقیقت

اور یہی شان مشیخت ہے ورنہ کسی بزرگ کے ملفوظات یاد کر لینے یا تصوف کے مسائل ازبر ہونے سے شیخ نہیں ہوتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

حرف[9] درویشاں بدزد و مرد دوں تا کہ پیش جاہلاں خواند فسوں!

---

[1] لا (نہیں) کی تلوار دوسروں کے قتل میں چلا دیتا ہے۔ پھر دیکھو کہ (لا الٰہ الا اللہ) میں سے آخر لا کے بعد کیا رہ گیا؟
[2] الا اللہ ہی رہ گیا (یعنی صرف اللہ اللہ اس کے دل میں رہ گیا) باقی سب چلا گیا۔ اے محبت کی شرکت کو پٹرول کی طرح جلا ڈالنے والے عشق مرحبا مرحبا [3] پانی آ گیا تو تیمم اٹھ گیا [4] یہ بلا بڑی بڑی بلاؤں کا دفعیہ ہے
[5] اس ذریعہ پر [6] کیا اچھا وقت ہے اگر کوئی رکھتا ہو کہ اس کی حرص کا بازار بہت نہ ہو۔
[7] ضرورت کے موافق فراخی ہو بس پھر کام کیا کرے اگر کام کا مرد ہے [8] صحیح اور حق پیر ہونے کی حقیقت
[9] بزرگوں کے لفظوں کو کمینہ آدمی چرا لیتا ہے تا کہ ناواقف لوگوں کے سامنے ان کے منتر پڑھ لے۔ یعنی ان کے لفظوں میں گرمی و حرارت ہوتی ہے لطف و کیف ہوتا ہے یہ لوگوں کے سامنے نقل کر کے ان کو اپنا معتقد بناتا ہے چنانچہ شاعروں میں اور پراپیگنڈہ والے پیروں میں یہی دیکھا جا رہا ہے۔

باتوں کے یاد کر لینے سے کچھ نتیجہ نہیں اگر ایک شخص کو بہت سی مٹھائیوں کے نام یاد ہوں اور نصیب ایک بھی نہ ہو اس کو فقط اسماء سے کوئی بھی فائدہ نہیں لیکن اگر نام ایک کا بھی یاد نہ ہو اور کھانے کو دونوں وقت ملتی ہوں تو سب کچھ حاصل ہے۔

مولانا فرماتے ہیں

میم[1] مواد و میم و نون تشریف نیست لفظ مومن جز پے تعریف نیست

کہ نام تو صرف پہچان کے لئے ہے ورنہ اس میں کیا رکھا ہے۔ اصل تو معنی ہیں اور وہ اس سے[2] بفراسخ دور ہیں۔ آج یہ حالت ہے کہ دو چار تعویذ گندے یاد کر لئے۔ جھاڑ پھونک سیکھ لی اور شیخ وقت بن گئے۔ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

اے[3] بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی تا راہ بیں نباشی تو کہ راہ بر شوی

در مکتب[4] حقائق و پیش ادیب عشق! ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

تو پہلے پسر(۱) تو بن لیں اس کے بعد پدر(۲) بننے کی نوبت آئے گی۔ یہ تو پیروں کی حالت ہے۔ مریدوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے انتخاب کے معیار عجیب وغریب اختراع[5] کر رکھے ہیں۔ جس میں ذرا حق پاتے ہیں اس کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ محض گرمی[6] تلبع سے ہونے لگتا ہے۔

حکایت: ایک شخص شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ دل کے دھڑکنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے۔ قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں۔ یہ بہت کامل ہیں۔ اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں ہوتی '

---

[1] م۔و۔م۔ن کا مجموعہ لفظ مومن عزت نہیں لفظ مومن سوائے کافر سے الگ کر کے پہچان لینے کے کچھ نہیں یعنی جب تک دل میں ایمان کامل نہیں لفظ سے پہچان ہی پہچان ہے۔ [2] میلوں [3] اے ناواقف ذرا کوشش تو کر کہ تو واقف کار بن جائے جب تک تو خود راستہ دیکھے ہوئے نہ ہو گا۔ راستہ دکھانے والا کب ہو جائے گا۔

[4] حقیقتوں کے مدرسہ اور عشق الٰہی کے ماہر کے سامنے ہاں بیٹے محنت تو کرتا کہ ایک دن تو باپ بن سکے۔

[5] گھڑ رکھے [6] حرارت سے ہو جاتا ہے جو کچھ جوانی یا مزاج کی ہو گی کچھ ذکر کی اور بزرگی تو اللہ کی قوی نسبت ہے یہ نہیں۔ (۱) بیٹا۔ (۲) باپ

ان کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت ہیں یعنی ان میں کمالات باطنی نہیں حالانکہ کمالات باطنی بالکل مخفی ہیں اوران کو بوٹیوں کے تھر کنے سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

کمالات واقعیہ جو مدار مشیخت ہیں

وہ کمالات یہ ہیں کہ فن میں ماہر ہو‘امت کے لئے حکیم[1] ہو۔شریعت کا پورا پابند ہو۔ یہ باتیں نہ ہوں تو ہزار مجاہدہ ریاضت ہو کچھ نہیں‘ جفا کش کہیں گے محنتی کہیں گے‘لیکن بزرگی سے کچھ علاقہ نہیں بہرحال عوام الناس اپنے اعمال میں بھی غلط معیار پر چلتے ہیں اورانتخاب بھی غلط معیار سے کرتے ہیں کہ ان کی بدولت اکثر حقوق[1] واجبہ بھی تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔

حکایت: ایک سرحدی عابد کی نسبت سنا ہے کہ آخر شب میں تہجد ادا کرنے کے لئے مسجد میں آئے اتفاق سے اس روز مسجد میں کوئی مسافر بھی سو رہا تھا آپ نے نماز شروع کی لیکن مسافر کے خراٹوں کے سبب سے نماز میں مرضی کے موافق یکسوئی اوراجتماع خیالات نہ ہوسکا۔آپ نے نماز توڑ دی اور مسافر کو خواب سے جگا دیا کہ ہماری نماز میں خلل پڑتا ہے۔ اس کے بعد پھر آ کر نیت باندھ لی۔مسافر چونکہ تکان سے بہت خستہ ہو رہا تھا۔تھوڑی دیر میں پھر سو گیا اور خراٹوں کی آواز پھر شروع ہوئی۔آپ نے پھر نماز توڑ کر اس کو بیدار کیا اوراس کے بعد نماز شروع کی تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور چھری لے کر اس غریب مسافر کو شہید کر دیا اور پھر بفراغت نماز پڑھی۔صبح کو نماز کے لئے لوگ جمع ہوئے تو مسجد میں لاش کو دیکھا تعجب سے پوچھا کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا! تو عابد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس نے ہماری نماز میں خلل ڈالا اس لئے ہم نے قتل کر دیا۔ یہ تو بالکل کھلی حماقت تھی اس لئے سب نے اس پر نفرین[2] کی ہو گی لیکن آج اس سے بہت بڑی بڑی حماقتیں لوگ کرتے ہیں اوران کی طرف ذرا التفات نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس سے خامض[3] ہوتی ہیں۔

---

[1] فرض وواجب حق اللہ کے بھی نماز‘روزہ زکوٰۃ‘ حج وغیرہ اور بندوں کے بھی نفقہ وخدمت اوراخلاق وغیرہ
[2] ملامت [3] گہری۔ (۱) بڑی عقل والا‘روحانی بیماریوں کا ماہر

کیفیات ومواجید[1] کمال ومقصود نہیں

اور سبب اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے تو ہم پر یہ کیفیات کیونکر طاری ہوتیں حالانکہ یہ کفار پر بھی طاری ہوتی ہیں اس کی حقیقت ایک واقعہ سے سمجھ میں آئے گی۔

حکایت: ایک سجادہ نشین نے مجلس عرس میں صاحب کلکٹر اور صاحب جج کو مدعو کیا۔ وہ چونکہ خلیق تھے شریک ہو گئے۔ آخرتن تن شروع ہوئی اور قوالوں نے گانا شروع کیا کچھ ایسا سماں بندھا کہ صاحب جج پر محویت کے آثار طاری ہونے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر گرنے لگے۔ تھوڑی دیر تو تحمل کیا جب نہ سنبھل سکے تو صاحب کلکٹر سے کہا کہ مجھ کو کیا ہوا کہ میں گرا جاتا ہوں۔ صاحب کلکٹر نے کہا کہ میری بھی یہی حالت ہے آخر وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے اور چل دیئے۔

تو صاحبو! کیا یہ صاحب[2] کلکٹر اور صاحب جج بھی بزرگ تھے۔ معلوم ہوا کہ کیفیات کا مدار قبول اور بزرگی پر نہیں وہ ایک انفعال[3] ہے جو کہ اکثر ذکر وشغل سے اور دوسرے اسباب سے بھی پیدا ہونے لگتا ہے اسی طرح بعض اشغال سے ذکر میں یکسوئی بھی زیادہ ہوتی ہے اور خطرات[4] کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ ان اشغال سے رطوبات کم ہو جاتی ہیں تو یہ سب اسباب طبیعہ کے دخل سے ہوتی ہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ کیفیات محض بیکار ہیں۔ ہرگز نہیں کیفیات نافع بھی ہیں لیکن مقصود یہ ہے کہ ان میں زیادہ دخل اسباب طبیعہ کو ہے۔

حکایت: ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بڑھاپے میں روتے تھے۔ سبب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ جوانی میں لذت زیادہ ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ نسبت کا اثر ہے لیکن اب وہ حالت نہیں رہی معلوم ہوا کہ وہ سب جوانی کا نشاط تھا۔ اب چونکہ وہ نہیں رہی اس لئے وہ کیفیت بھی نہیں رہی اور نسبت کی گرمی بڑھاپے میں جا کر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے

خود[5] قوی تر تومی شود خمر کہن! خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

---

[1] وجد کی حالتیں جن میں واقعی بیخودی ہو جائے اور بغیر بیہوشی کے تو دھوکہ بازی ہے [2] جو غیر مسلم انگریز تھے۔ [3] اثر لینے کی کیفیت [4] وسوسے [5] پرانی شراب خود بہت قوی ہوتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کے پاس کی ہو۔

دوسرے بزرگ فرماتے ہیں

ہرچند[1] پیرو خستہ و بس ناتواں شدم　　　　ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

غرض یہ نفسانی کیفیات نہ محمود ہیں نہ مذموم ہیں۔ البتہ اگر یہ آلہ[2] مقصود کا ربن جائیں تو پھر محمود ہو جاتی ہیں۔ ورنہ ہیچ مثلاً بعض کیفیات بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھی باقی رہتی ہیں اور اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مقبول اور خاصاں خدا میں ہیں لیکن یادرکھو کہ وہ مذموم ہیں اور یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ مخالفت احکام پر بھی دعویٰ مقبولیت کا کرتے تھے چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے دوست ہیں)

یعنی ہم مثل بیٹے کے ہیں کہ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو ہر حال میں چاہتے ہیں خدا تعالیٰ ان کے اس خیال کا رد فرماتے ہیں کہ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (آپ کہہ دیجئے کہ پھر کیوں اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیں گے) تو اس امت میں بھی بعض لوگ اس خیال کے موجود ہیں مگر سمجھ لینا چاہیے کہ قیامت میں ایسے لوگوں کی گردن ناپی جائے گی ان اعمال کی وہاں کچھ بھی قدر نہ ہوگی کیونکہ مقصود عبادات ہیں[3] مجاہدات وریاضات مقصود نہیں۔

مجاہدات وریاضات کی مصلحت

لیکن چونکہ ہم لوگوں کی عبادت میں وہ خلوص مطلوب پیدا نہیں ہوتا اسی لئے یہ مجاہدات کئے جاتے ہیں کہ ہماری نمازوں میں اور نیز دوسری عبادات میں صحابہؓ کی عبادات کی شان پیدا ہو جائے پس یہ ریاضات مقصود[4] بالغیر ہوئے۔

حکایت: لکھا ہے کہ حضرت جنیدؒ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ حضرت وہ تصوف کے نکات جو زندگی میں بیان ہوتے تھے یہاں بھی کچھ کام آئے۔ فرمایا کہ سب فنا

---

[1] اگرچہ میں بوڑھا کمزور اور بہت ضعیف ہو گیا ہوں مگر جب تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔ [2] جو کام مقصود ہے یہ اس کا ذریعہ یعنی عبادت وخلوص کا ذریعہ۔ [3] محنتیں اور مشقتیں۔
[4] غیر کی وجہ سے مقصود ہیں یعنی عبادت میں خلوص پیدا ہونے کے لئے۔

ہو گئے۔ ہاں کچھ نماز اخیر شب میں پڑھ لیتا تھا وہ البتہ کام آ گئی۔ مانفعنا[1] الا رکیعات فی جوف اللیل لوگ خدا جانے ان کیفیات کو کیا کچھ سمجھے ہوئے ہیں۔

خواجہ[2] پندارد کہ دارد حاصلے　　حاصل خواجہ بجز پندار نیست

لیکن اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اور مجاہدات کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ ظاہری اعمال میں خلوص شرط ہے اور آج وہ مفقود[3] ہے۔ اور یہ مجاہدات اس خلوص کا مقدمہ[4] ہیں۔ اور مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے جیسے وضو کا مقدمہ ہے۔ صلوٰۃ کا' خود مطلوب بالذات[5] نہیں۔ لہٰذا بدون ان مجاہدات کے نرے اعمال اکثر کافی نہیں۔

رضا بالدنیا[6] ایک عام مرض ہے

اب یہ وہ پالیسی ہوگئی ہے کہ اہل علم اور درویشوں میں بھی یہ مرض ہے الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ درویشوں کو زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ کثرت سے ایسے مولوی اور درویش ہیں کہ اس رضاء بالدنیا سے ان کا مذہب یہ ہو گیا ہے کہ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں ہمارے چار پیسے سیدھے ہو جائیں اور یہی وہ جماعت ہے جن کو دیکھ کر اہل دنیا علم دین سے نفور[7] ہو گئے ہیں۔

صاحبو! علم دین کو ہم نے خود ذلیل کیا۔ ورنہ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں لیکن اگر ہم خود ہی بے قدری کرائیں تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ یہی حالت ہوگئی ہے پیروں کی کہ طمع[8] سے ان کی بھی سخت بیقدری ہوگئی ہے۔

حکایت: مجھے ایک گنوار کا واقعہ یاد آیا کہ فصل پر جب کمینوں کا اناج نکالنے بیٹھا تو گھر والوں نے سب کو شمار کیا' دھوبی کو بھی' خاکروب کو بھی' اور یہ بیٹھا سنتا رہا۔ جب سارے کمینوں کا نام سن چکا تو کہنے لگا کہ اس سسرے پیر کا بھی تو حصہ نکال دو۔ مگر یہ پیر بھی ایسے

---

[1] ہم کو صرف ان رکعتوں نے فائدہ دیا جو رات کے بیچ میں تھیں [2] پیر صاحب گمان کرتے ہیں کہ ان کو کچھ حاصل ہو گیا ہے' حالانکہ ان کو سوائے گمان گمان کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا [3] غائب یا گم [4] وہ شے جس پر دوسری چیز موقوف ہو [5] خود اپنی ذات سے مقصود نہیں۔ فرض نماز کے اس پر موقوف ہونے کی وجہ سے فرض ہوئی۔ [6] دنیا کو پسند کرنا اور اس سے خوش ہونا [7] نفرت کرنے والے [8] لالچ

ہوتے ہیں کہ ایک موضع کے بعضے لوگ ایک بزرگ سے مرید ہو گئے تھے۔ پھر خاندانی پیر صاحب کو جب خبر ہوئی تو کہنے لگے کہ اچھی بات ہے دیکھو میں بھی تمہیں پل صراط پر سے دھکا دوں گا۔ تو ایسے پیر ہیں ہی اس قابل۔ علیٰ[1] ھذا بعضے علماء بھی ایسے ہونے لگے ہیں۔

حکایت: ایک صاحب جج پرانی وضع پرانی روشنی کے ایک مقام پر بدل کر آئے۔ انہوں نے چاہا کہ وہاں کے رؤسا سے مل آئیں ایک رئیس صاحب کے پاس پہنچے تو وہ دور ہی سے صورت دیکھ کر گھر میں چلے گئے۔ انہوں نے خادم کے ذریعے سے کہلا کر بھیجا کہ میں فلاں شخص ہوں آپ سے ملنے کو آیا ہوں۔ نام سن کر وہ رئیس صاحب باہر آئے اور معذرت کر کے کہنے لگے کہ آپ کا عبا[2] دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں کچھ لینے کی غرض سے آئے ہیں۔ یہ خیالات ہیں عوام کے علماء دین کے متعلق۔ مگر اس میں زیادہ قصور ان عوام کا نہیں بلکہ ایسے حضرات کا ہے کہ انہی نے اپنے افعال سے عوام کے خیالات کو خراب کیا۔ اگر یہ علماء حضرات اس سے پرہیز کرتے تو عوام کو کبھی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ کہ رضاء بالدنیا کی ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں حتیٰ کہ مولوی اور درویش بھی اور مولویوں اور درویشوں سے ایسا ہونا یہ زیادہ برا ہے کیونکہ یہ دھوکہ دیکر کماتے ہیں مگر ہر جماعت میں کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہیں۔ دنیا داروں میں بھی اور دینداروں میں بھی دنیا میں جی بھی لگایا اور دنیا ان کے دل میں بھی گھس گئی۔ اس کا ازالہ ذرا مشکل ہے دنیا سے تو دل گھبرانا چاہیے مگر ہر مسلمان بتلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اس کا جی گھبرایا ہے اور کب وحشت ہوئی ہے۔ ہاں اگر وحشت ہوتی ہے تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہیے کہ جو سرائے سے ہوتا ہے کہ اگرچہ وہاں سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل گھر میں پڑا رہتا ہے اس کا مطلب بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ بالکل غلط ہے ہاں مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا سے سرائے کا تعلق رکھو دیکھو کیا سرائے میں کھاتے نہیں ہو یا کوٹھڑی کرایہ پر نہیں لیتے۔ سب کچھ کرتے ہو مگر وہاں جی نہیں لگتا اور دنیا میں جی لگا لیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔

---

[1] اسی طرح [2] لمبا چوغہ

ہماری بعینہ وہ حالت ہے جیسے بچہ سرائے کے کسی آرام کو دیکھ کر ضد کرنے لگے کہ میں تو یہیں رہوں گا۔ باقی جن کو دنیا کی حقیقت سے واقفیت ہے ان کی یہ حالت ہے کہ کہتے ہیں۔

خرم[۱] آں روز کزیں منزل ویراں بردم — راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم

نذر[۲] کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے — تادر میکدہ شاداں وغزل خواں بردم

دیکھئے منت مان رہے ہیں کہ اگر یہاں سے چھٹکارا ہو تو یوں کریں گے۔

دنیا کی محبت زائل ہونے کی آسان تدبیر

ایک ترکیب بتلاتا ہوں اور وہ ایسی ترکیب ہے کہ جس سے تم کو ان شاء اللہ تعالیٰ صحبت[۳] کی برکت حاصل ہوگی اور یہ جو دائرے سے باہر قدم نکلا جارہا ہے یہ رک جائے گا۔ اور وہ حالت ہو جائے گی جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ سب کچھ کرتے رہو لیکن کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی تو وہ ترکیب یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں موت کو یاد کیا کرو اور پھر قبر کو یاد کرو۔ پھر حشر کو یاد کرو اور یوم حشر کے اہوال[۴] کو اور وہاں کے شدائد کو یاد کرو اور سوچو کہ ہم کو خدا تعالیٰ قادر کے روبرو کھڑا کیا جائے گا اور ہم سے باز پرس ہوگی ایک ایک حق اگلنا پڑے گا پھر سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ اسی طرح روزانہ سونے کے وقت سوچ لیا کرو دو ہفتے میں ان شاء اللہ تعالیٰ کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اور جو اطمینان وانس ودلچسپی دنیا کے ساتھ اب ہے باقی نہ رہے گی۔

قلت[۵] تدبر فی الدنیا کی شکایت

بعض وہ ہیں کہ ذی علم ہیں اور باوجود اس کے ان میں قلت تدبر ہے یعنی اپنی حالت کو سوچتے نہیں۔ دنیا کا کام جس طرح سوچ کر سمجھ کر کرتے ہیں سچ یہ ہے کہ دین کے کاموں

۱؎ میں تو اس دن خوش ہوں گا کہ اس اجڑے گھر سے جاؤں گا روح کی راحت چاہوں گا اپنے محبوب سے ملنے کے واسطے جاؤں گا۔ ۲؎ میں نے منت مانی ہے کہ اگر کسی دن یہ خیال سر میں آ جائے گا تو میخانہ کے دروازہ تک خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا۔ ۳؎ اولیاء اللہ کی صحبت ۴؎ ہولناکیاں، خوف کی باتیں ۵؎ دین کے بارے میں غور وفکر کرنے کی کمی کی۔

میں اتنا اہتمام نہیں بلکہ جس میں جتنا دین ہے وہ عادت کی وجہ سے ہے۔ اگر چہ یہ خوشی کی بات ہے کہ دین کی عادت ہوئی لیکن شکایت یہ ہے کہ اس سے زیادہ التفات کیوں نہیں ہے یعنی یہ بقیہ میں بھی تدبر[1] سے کام لیتے دیکھئے دنیا میں کبھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس کی ترقی اور زیادتی میں مشورہ کرتے ہیں تدبیر کرتے ہیں اگر چہ کامیابی بھی نہ ہو کیونکہ دنیا میں کامیابی اکثر کم ہوتی ہے ورنہ اگر سب کامیاب ہوا کرتے تو آج ساری دنیا بادشاہ ہوتی۔ تو دنیاوی مساعی[2] میں باوجود کامیابی کم ہونے کے پھر بھی کوشش کی جاتی ہے اور یہ خدا کی مصلحت ہے کہ کسی کی تدبیر کارگر کر دیتے ہیں اور کسی کو ناکام۔ آج جن لوگوں کی تدابیر[3] مساعد ہوگئی ہیں وہ تدابیر ہی کو موثر سمجھتے ہیں صاحبو! ذرا ان سے پوچھو کہ جن کو تمام عمر ناکامی ہی رہی۔ تو صرف تدبیر نہ مؤثر ہے اور نہ یہ تدبیر محض بیکار ہے۔ مگر آخرت کے لئے ناکامی کبھی نہیں ہوتی۔ پس تعجب ہے کہ جس میں اکثر ناکامی ہو اس میں توسعی و اہتمام کیا جائے اور جس میں کبھی ناکامی نہ ہو اس میں کبھی التفات نہ کیا جائے حالانکہ جس قدر سعی دنیا کے لئے کی جاتی ہے اس سے نصف بھی آخرت کے لئے کریں تو ناکام نہ رہیں۔ غرض بعض میں خرابی قلت[4] تدبر کی وجہ سے ہے۔ بہر حال یہ مرض ہم میں ضرور ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی مرض ہم میں ہے بلکہ منجملہ اور بہت سے امراض کے یہ مرض بھی ہے اور یہ مرض قریب عالمگیر ہے مگر پھر بھی اس کے معالجے کی طرف التفات نہیں ہے تو اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری حالت یعنی عدم تدبر وہ ہے جس کا مقابل حدیث میں مذکور ہے یعنی تدبر تو چونکہ یہ مضمون اس مرض کی ضد ہے اس لئے اس کا علاج اس سے ہو جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ سعید وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے اور ظاہر ہے کہ یہ تدبر ہی میں داخل ہے۔ اور عجب نہیں کہ ایسا مضمون بہت دفعہ سنا ہو۔ چنانچہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ تازی پٹے اور ترکی کانپے۔ اس مثل کا خلاصہ یہی ہے کہ **السعید من وعظ بغیرہ** کہ سعادت مند وہ ہے کہ دوسرے کی حالت دیکھ کر اس کو عبرت حاصل ہو پس یہ مضمون تسلیم شدہ ہونے کے سبب مستقل تسلیم کرانے کی ضرورت نہیں اب دیکھنا یہ ہے

---

[1] غور و فکر [2] کوششیں [3] کامیاب اور موافق [4] کم غور و فکر

کہ ہم میں یہ مرض ہے یا نہیں تو اگر ذرا بھی اپنی حالت غور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ بہت شدت سے ہم میں یہ مرض ہے۔ اور ہر ہر امر میں ہماری یہی حالت ہے۔

دوسروں کی حالت دیکھ کر عبرت حاصل کرنا چاہیے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ کہ امم سابقہ کے قصے اسی واسطے نقل کئے جاتے ہیں کہ لوگ عبرت پکڑیں اور عبرت کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی امر مشترک کی وجہ سے اپنے کو ان پر قیاس کریں کہ فلاں شخص نے ایسا کیا تھا۔ اس کو یہ نتیجہ ملا تو ہم کو بھی یہی نتیجہ ملے گا۔ یہ حقیقت ہے عبرت کی اب دیکھ لیجئے کہ دوسروں کی مصائب کے قصے سن کر کون شخص سبق حاصل کرتا ہے اکثر لوگ مسلمانوں کی مصیبت کو سنتے ہیں مگر کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ اور فی صدی ننانوے آدمی ایسے نکلیں گے کہ جن کو خاک بھی اثر نہیں ہوتا۔

چو از محنت دیگراں بے غمی ۔۔۔ نہ شاید کہ تامت نہند آدمی

جب دوسروں کی تکلیف کو سن کر ہمارا دل نہ دکھا تو بیشک ہم اس قابل نہیں کہ آدمی کہلاویں۔

مصائب کی علل[1] سمجھنے میں اسباب پرستوں کی کوتاہ نظری

اور اگر کچھ تنبیہ[2] ہوتا ہے تو اس سے احتراز[3] کی تدابیر سوچتے ہیں اور صرف اسباب ظاہری پر نظر کرتے ہیں سبب اصلی کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا۔ یاد رکھو کہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ ہوا' آگ' پانی وغیرہ سب خداوند کریم کے حکم کے تابع ہیں۔ ان کو جب حکم ہوتا ہے اور جیسا حکم ہوتا ہے ویسا ہی وہ کرتے ہیں۔

خاک[4] و آب و باد و آتش بندہ اند ۔۔۔ بامن و تو مردہ باحق زندہ اند!

یہ ہمارے سامنے مردہ معلوم ہوتے ہیں ورنہ واقع میں سب زندہ اور تابع فرمان ہیں۔

حکایت: ایک کافر بادشاہ نے بہت سے مسلمانوں کو آگ میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وہ

---

[1] علتیں اور سبب [2] ہوشیاری [3] بچاؤ [4] مٹی' پانی' آگ' ہوا سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں میرے تمہارے ساتھ مردہ بے حس ہیں مگر خدا تعالیٰ کے ساتھ زندہ و فرمانبردار ہیں۔ [5]

لوگ بت کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے تھے۔ آخر ایک عورت کو لایا گیا اور اس سے بھی سجدہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے بھی انکار کیا۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گود سے بچہ لے کر آگ میں پھینک دو چنانچہ پھینک دیا گیا۔ قریب تھا کہ وہ عورت سجدہ کر لے کہ لڑکے نے آواز دی۔

اندر[1] آما در کہ من اینجا خوشم | گرچہ در ظاہر میان آتشم

اس کے بعد اس بچہ نے اور لوگوں سے بھی خطاب کرنا شروع کیا کہ یہاں آؤ یہاں آؤ۔ بہت بڑا عجیب باغ ہے۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ لوگ بے قرار ہو کر اس میں کودنے لگے۔ سپاہی روکتے تھے مگر لوگ برابر آگ میں کودتے تھے۔ جب بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو آگ کو خطاب کر کے کہا کہ اے آگ کیا تو آگ نہیں رہی یا تجھ میں سے جلانے کی قوت سلب ہوگئی تو آگ نے جواب دیا کہ۔

گفت[2] آتش من ہمانم آتشم! | اندر آتا تو بہ بینی تابشم!

یعنی تو اندر آئے تو معلوم ہو کہ میں آگ ہوں یا نہیں۔ باقی ان کو کیونکر جلاؤں اس لئے کہ چھری کاٹتی ہے مگر چلانے[3] سے۔

طبع[4] من دیگر نگشت و عنصرم | تیغ حقم ہم بدستوری برم!!

بس جس قدر مصائب آتے ہیں سب حکم خداوندی سے نازل ہوتے ہیں اور سبب اصلی جرائم و معاصی ہوئے کہ ان سے غضب حق ہوتا ہے اور پھر حکم سے بلا اور مصیبت نازل ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

ہرچہ[5] بر تو آید از ظلمات و غم | آن زبیباکی و گستاخی است ہم

غم[6] چو بینی زود استغفار کن | غم بامر خالق آمد کار کن!

---

[1] اماں آگ کے اندر آ جاؤ کیونکہ میں تو یہاں آرام میں ہوں گو ظاہر میں آگ میں ہوں۔ [2] آگ نے جواب دیا میں تو وہی ہوں آگ ہی ہوں تو اندر آ تا کہ تو میری تیزی کو دیکھے۔ یعنی مجھے ان پر تو اثر کرنے کی اجازت نہیں ذرا تو اندر آ کے دیکھ کیسی تیزی ہے۔ [3] ایسے ہی آگ جلاتی ہے اللہ تعالیٰ کے جلوانے سے [4] میری طبیعت دوسری نہیں ہوئی اور نہ میرا خمیر دوسرا ہو گیا ہے میں تو حق کی تلوار ہوں اجازت سے ہی کاٹتی ہوں۔ [5] تم پر جو گھٹنیں اور غم آتے ہیں وہ بھی بے باکی اور گستاخی کرنے کی وجہ سے آتے ہیں۔ [6] جب تم غم دیکھو جلدی سے توبہ و استغفار کر لو کیونکہ یہ غم تو اللہ تعالیٰ کے ہی حکم سے اپنا کام کر رہا ہے جب توبہ قبول ہوگی گناہ بھی معاف اور بلاؤں کا حکم بھی معاف ہو جائے گا۔

تو جب کوئی مصیبت دیکھو فوراً استغفار پڑھو۔ سبحان اللہ کیا عجیب تعلیم ہے۔

حکایت: کئی سال ہوئے کہ جب ہمارے قصبہ اور اس کے گردونواح میں طاعون بہت زور وشور سے پھیلا تھا تو قبل طاعون کے ایک بزرگ آخر شب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ قلب پر یہ آیت وارد ہوئی۔ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (ہم نازل کرنے والے ہیں اس آبادی والوں پر آسمان سے ایک عذاب اس وجہ سے کہ وہ حکم عدولی کرتے تھے)

تو ان[(۱)] بزرگ نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن اپنی طرف منسوب نہیں کیا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا ہے مگر لوگوں نے توجہ نہ کی۔ اور پھر طاعون پھیلا تو ایک سبب وہ گناہ بھی ہوا جو قوم[۱] لوط میں تھا۔

نظر[۲] بازی کا مرض بعضے پرہیز گاروں میں بھی ہے

اس وقت لوگوں میں یہ مرض بہت شدت سے پھیل گیا کوئی تو خاص اصلی گناہ میں ہی مبتلا ہے۔ اس کو تو وہ خود بھی برا جانتا ہے اور اس کی برائی بالکل ظاہر ہے۔ اور کوئی اس کے مقدمات میں یعنی۔ امردوں[۳] پر نظر کرنا اور یہ مرض تاک جھانک کا اکثر سالکین اور پرہیز گاروں میں بھی ہے اور ان کو دھوکہ اس سے ہو جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی طبائع میں شہوت کی خلش نہیں پاتے۔ اور اس سے سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر شہوانی نہیں لیکن پھر بہت جلد شہوت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لئے ابتداء ہی سے احتیاط واجب ہے صاحبو امام ابو حنیفہؒ سے بڑھ کر تو آج کل کوئی مقدس نہیں ہوگا مگر دیکھئے کہ

حکایت: امام محمدؒ کو امام صاحبؒ نے اول دفعہ تو دیکھا لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کے داڑھی نہیں ہے تو یہ حکم کر دیا کہ جب تک داڑھی نہ نکل آئے پشت کی طرف بیٹھا کرو دونوں طرف متقی مگر احتیاط اتنی بڑی (اور احتیاط تو اسی لئے تھی کہ متقی تھے) بعد مدت دراز ایک مرتبہ

۱؎ چونکہ ان لوگوں کے لئے آیت نازل ہوئی تھی تو اشارہ ہوا کہ اس آبادی میں بھی یہی وجہ ہے۔

۲؎ نامحرم عورتوں کو دیکھنا یا بے ریش لڑکوں کو ۳؎ بے داڑھی والے لڑکوں پر۔ (۱) اس سے مراد خود حضرت تھانوی ہیں مگر ظاہر نہیں کیا۔

اتفاقاً امام صاحب کی نظر پڑ گئی تو تعجب سے پوچھا کہ کیا تمہارے داڑھی نکل آئی ہے؟

تو جب امام ابو حنیفہؒ نے اس قدر احتیاط کی تو آج کون ہے جو اپنے اوپر اطمینان کرے اور جب انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر کم ہمتوں سے تو اس کا چھوٹنا بہت ہی مشکل ہے۔ ہاں اگر ہمت کی جائے اور پختہ قصد تو چھوٹ بھی سکتا ہے کیونکہ اس میں کوئی مجبوری نہیں ہے اور اس کے چھوٹنے سے کوئی کام نہیں اٹکتا۔ ہاں نفس کو تھوڑی سی تکلیف[1] ضرور ہوگی مگر ہمت والوں کو بہت آسان ہے بہت سے باہمت لوگوں نے خدا کی راہ میں جانیں دے دی ہیں۔ تو بھلا ذرا سی نگاہ کا روکنا تو ان کو کیا مشکل ہو سکتا ہے۔ اور کم ہمتی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ پھر افسوس یہ ہے کہ لوگ اس کو اس قدر خفیف جانتے ہیں کہ گویا حلال ہی سمجھتے ہیں حالانکہ معصیت[2] کا حلال سمجھنا قریب بکفر ہے۔ ایک بیباک شاعر نے تو اس کو ایک مثال میں بیان کیا ہے۔

نگاہ پاک لازم ہے بشر کو روئے جاناں پر　　　خطا کیا ہوگئی گر رکھ دیا قرآں کو قرآں پر

اس میں یہ بڑا سخت دھوکا ہے کہ ناپاک کو پاک سمجھا۔ دوسرے اگر پاک[3] بھی مان لیا جائے۔ تو خوب سمجھ لو کہ شیطان اول اول تو اچھی نیت سے دکھاتا ہے چند روز کے بعد جب محبت جاگزیں ہوتی ہے تو پھر نگاہ کو ناپاک کر دیتا ہے۔ پس ضروری امر یہ ہے کہ علاقہ ہی نہ کرو۔ اور علاقہ ہوتا ہے نظر سے لہٰذا نظر ہی نہ کرو۔ غالباً حدیث میں ہے یا کسی بزرگ کا قول ہے۔

النظر سهم من سهام ابليس (نگاہ بد شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے)

کہ اس کا زخم بھی نہیں ہوتا اور سواد[4] قلب میں اترتا چلا جاتا ہے کسی کا شعر ہے کہ

درون[5] سینہ من زخم بے نشاں زدہ　　　بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ

---

[1] اول اول ہوگی اور وہ تکلیف بھی ثواب کا ذریعہ ہے۔ [2] اگر حرام قطعی ہو تو بالکل کفر ہے ورنہ قریب کفر کے۔ [3] اول تو یہ نفس کا دھوکہ ہے تاویل ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ نظر ویسی نہیں جیسے سن رسیدہ مردوں پر ہوتی ہے تو پاک کہاں ہوئی اگر مان بھی لیں تو یہ جواب ہے [4] دل کی سیاہی یعنی دل کے بیچ میں جو سیاہ نقطہ ہوتا ہے اس میں۔ [5] تم نے میرے سینے کے اندر ایک بے فغان زخم لگا دیا ہے میں حیرت میں ہوں کہ عجیب تیر بے کمان کے تم نے مارا ہے۔

یہ نظر ایسی چیز ہے کہ اس کا اثر پیدا ہونے کے بعد مدت تک یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کو تعلق ہو گیا ہے بلکہ جب کبھی محبوب جدا ہوتا ہے اس وقت قلب میں ایک سوزش سی ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ تعلق ہو گیا اور جس قدر یہ سوزش بڑھتی جاتی ہے خدا کی محبت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس سے خدا تعالیٰ کو بہت غیرت آتی ہے کہ ان کے علاوہ اور کسی کی طرف التفات کیا جائے۔ پس وہ اپنی محبت کو کم کرتے کرتے سلب کر لیتے ہیں۔ والعیاذ باللہ! اور کیوں غیرت نہ آئے جب کہ محبوبانِ دنیا کو بھی اس سے غیرت آتی ہے۔

حکایت: مثنوی میں ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا۔ اس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے۔ کہنے لگا کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہوسناک تو تھا ہی فوراً پیچھے لوٹا۔ جب وہ لوٹنے لگا تو اس نے ایک دھول اس کے رسید کیا اور

گفت[1] اے ابلہ اگر تو عاشقی   در بیان و دعویٰ خود صادقی

پس[2] چرا برغیر افگندی نظر   ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیروں پر کیوں نگاہ کی محبت تو وہ چیز ہے کہ

ہمہ[3] شہر پر زخوباں منم و خیال ماہے   چہ کنم کہ چشم یک بیں نہ کند بہ کس نگاہے

جس کو خدا سے تعلق ہو گیا پھر چاہے تمام دنیا بھی حسینوں سے بھر جائے مگر یہ اپنے محبوب حقیقی کو چھوڑ کر کبھی دوسری طرف متوجہ نہ ہو۔

ایں[4] نہ عشقت آنکہ برمردم بود!   ایں فساد خوردن گندم بود

یہ کیسی محبت کہ دعویٰ خدا کی محبت کا اور دوسروں سے تعلق ہے۔ اگر چار دن کھانے کو نہ ملے تو سب بھول جائیں۔ یہ سب نفس کی شرارت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عشق ان ہی کو ہوتا

---

[1] اس عورت نے کہا کہ اے بیوقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے بیان اور دعویٰ میں سچا ہے۔

[2] تو تو نے غیر پر نظر کیوں ڈالی۔ اے بے کمالے کیا یہی ہوتا ہے عشق کا دعویٰ

[3] سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے مگر میں ہوں اور ایک چاند جیسے کا خیال کیا کروں کہ ایک کو دیکھنے والی آنکھ دوسرے پر نظر ہی نہیں کرتی۔ اصل شاعر نے بدیں کہا تھا حضرت نے یک بیں سے اصلاح فرمائی ہے۔

[4] یہ عشق نہیں ہے جو انسانوں پر ہوتا ہے یہ تو گندم کھانے کی خرابی و مستی ہوتی ہے۔

ہے جن کو خوب فرصت و فراغ ہے ورنہ جو لوگ کام میں لگے ہوئے ہیں ان کو کبھی ایسی لغویات کی نہیں سوجھتی۔ افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ نے تو فراغت اس لئے دی تھی کہ دین کا کام کریں۔ مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ محروم ہیں خوب کہا ہے۔

خوشا[1] روزگارے کہ دارد کسے | کہ بازار حرصش نہ باشد بسے
بقدر[2] ضرورت یسارے بود | کند کارے از مرد کارے بود

کہ بڑا خوش نصیب وہ ہے کہ اس کو حرص نہ ہو اور ضرورت کے موافق کھانے کو ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم قدر نہیں کرتے اور اس بیکاری میں اپنے پیچھے یہ علتیں لگا لیتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ بعض سالکین یہ کہتے ہیں کہ ان امردوں[3] کے حسن میں خدا کا حسن جلوہ گر ہے۔

حکایت: حضرت شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ بقراط نے کسی شخص کو ناچتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا اس کو کیا ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی امرد حسین کو دیکھ لیا۔ اس سے بے خود ہو گیا کہ اس میں جلوہ حق نظر آیا۔ کہنے لگا کہ یہ کیا بات ہے کہ اس کو امرد میں تو جلوہ حق نظر آیا میرے اندر کبھی نظر نہ آیا۔ یہ بقراط کا قول ہے اس کا اگر اعتبار نہ کرو تو خود شیخ کے قول کا تو اعتبار کرو گے۔ وہ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

محقق[4] جاں مسیند اندر ابل! | کہ در خوبرویاں چین و چگل!
خداوند[5] صاحب دلاں دل بپوست | اگر ابلہے داد بے مغز اوست

معالجہ عشق مجازی

اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے کو کسی کام میں لگا دو جس میں کھپ جاؤ۔ اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کا کوئی جائز کام کرو مگر کسی کام میں لگ جاؤ۔ طبیبوں نے بھی اس کے متعلق لکھا ہے کہ یعرض للباطلین (یہ مغز بیکار لوگوں کو پیش آتا ہے) پس خوب سمجھ لو کہ امرد کو لذت

---

[1] کتنا اچھا ہے یہ زمانہ اگر کوئی اس کو رکھتا ہو کہ اس کی حرص کا بازار بہت نہ ہو۔ [2] ضرورت کے موافق فراغت ہو اور پھر کام کرے اگر کام کا مرد ہو۔ [3] بے داڑھی کے لڑکے۔ [4] محقق تو خدا تعالیٰ کی قدرت اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے جو چین و چگل کے حسینوں میں دیکھتا ہے۔ [5] اہل دل لوگوں نے (جن کا دل خدا سے لگ چکا ہے) کھال اور چھلکے کو دل نہیں دیا اگر کسی بے وقوف نے دیا ہے تو وہ خود بے مغز ہے۔

کے لئے دیکھنا اور اس کی آواز کا لذت کے لئے سننا اور اس کے تصور سے مزہ لینا یہ سب لواطت میں داخل ہے۔ مبعد عن الحق[1] ہے اللھم احفظنا منہ پس جو مصیبت آوے اس کو کسی گناہ کا ثمرہ سمجھا کرو۔ اور جب کسی کو گناہ میں دیکھو تو اس سے عبرت حاصل کرو۔

مرنے والوں اور مصیبت زدوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے

جب کوئی مرے تو چونکہ ہمارے لئے بھی یہ دن آنے والا ہے تو اس سے عبرت حاصل کرو۔ مگر آج کل کچھ ایسی غفلت بڑھی ہے کہ مردے کو دیکھ کر بھی ہماری حالت میں ذرا تغیر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور امور دنیاوی کی باتوں میں مشغول ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہیں تو اس کو اسی تک محدود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سمجھنا یہ چاہیے کہ اس پر یہ مصیبت کیوں مسلط ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیے۔ اسی لئے حدیث[2] میں ہے کہ جب کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھو تو کہو

> الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاک به و فضلنی علیٰ کثیر ممن خلق تفضیلا (شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس تکلیف سے عافیت دی ہے جس میں تم کو مبتلا کیا۔ اور اپنی مخلوق میں سے مجھ کو بہت پر بہت کچھ فضیلت دی ہے)

اس میں بھی تذکیر[3] ہے احتمال ابتلاء کی اور اس میں تنبیہ[4] اجمالی ہے اسباب ابتلا کی۔ کہ معصیت ہے اسی پر یہ شکر سکھایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی مبتلا نہ ہو جائیں لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

لا تظهر[5] الشماتة لا خیک

---

[1] اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والا ہے اے اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھئے [2] ترمذی [3] اس کے لئے بھی مصیبت میں مبتلا ہونے کے احتمال کی یاد دہانی ہے۔ [4] مبتلا ہونے کے سببوں پر مختصری تنبیہ ہے۔
[5] اور دوسرے کی تکلیف پر خوشی ظاہر نہ کیا کرو اور یہ اپنی عافیت کو ظاہر کرنا بھی مثل اسی کے ہے کہ گویا اس کی تکلیف پر خوشی ہوئی کیونکہ خوشی گو تکلیف سے نہیں اپنی عافیت سے ہوئی مگر ہوئی تو اس کو دیکھ کر۔

بعض تو وہ ہیں جو کہ دوسرے کے مصائب پر ہنستے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں کہ افسوس تو کرتے ہیں مگر طعن کے طور پر اس کی بابت اسی حدیث میں ہے۔

فیرحمه الله و یبتلیک[1] یعنی ہنسومت شاید بجائے اس کے تم مبتلا ہو جاؤ۔

حکایت: کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس وقت ایک فقیر مانگنے آیا۔ اس نے فقیر کو جھڑک دیا۔ اتفاق سے کچھ ایسا انقلاب ہوا کہ یہ شخص بالکل تباہ و پریشان ہو گیا۔ حتیٰ کہ جب بیوی کا نان و نفقہ بھی نہ چل سکا تو اس کو بھی طلاق دے دی۔ اور اس نے کسی اور دولتمند سے نکاح کر لیا۔ اتفاق سے اس دولتمند کے دروازہ پر کوئی شخص سوال کرنے آیا اس شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو بھیک دے آؤ۔ یہ جو دروازہ پر گئی تو وہاں سے روتی ہوئی لوٹی۔ شوہر نے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ میرا پہلا شوہر ہے اور اسی تذکرہ میں وہ قصہ سائل کے جھڑک دینے کا بھی بیان کیا۔ اس شوہر ثانی نے کہا کہ وہ سائل جو جھڑکا[2] گیا تھا میں ہوں۔ خدا تعالیٰ نے مجھے مال بھی دیا اور اس کی بیوی بھی دی۔

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے۔ پس عبرت حاصل کرو اور دوسروں کو مبتلائے مصائب دیکھ کر ڈرو۔ بزرگوں نے بہت جگہ اس کو یاد دلایا ہے مگر ہم بے فکر ہیں۔

خالق[3] اسباب کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے مصائب میں پریشانی نہیں ہوتی

مصیبت سے بچنے کے لئے ظاہری اسباب پر دارومدار مت رکھو کہ ہمارے پاس تو تعویذ ہے ہم کو طاعون نہیں آ سکتا یہ سب حکم خداوندی کے سامنے کیا حقیقت رکھتے ہیں سبب اصلی کو اختیار کرو اور وہ ارضائے[4] حق ہے اعمال میں احکام کے امتثال[5] میں کوشش کرو کہ اس کے

---

[1] کہ پھر اللہ تعالیٰ اس پر رحم کر دیں اور تم کو مبتلا کر دیں۔ [2] خود قرآن شریف میں سائل کو جھڑکنے سے منع فرمایا ہے لیکن اگر کوئی لپٹ کر ہی رہ جائے تو وہ جھڑکنا سائل ہونے کی وجہ سے نہ ہوگا اس کی زیادتی کی وجہ سے ہوگا وہ درست ہے پیشہ ور سائل اگر معلوم ہو جائے کہ یہ پیشہ ور ہے اس کو دینا اس کے حرام فعل کی امداد کرنا ہے اس کو نہ دینے میں یہ بات نہیں۔ [3] تمام کاموں کے ذریعوں اور سببوں کو پیدا کرنے والے۔ [4] اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا [5] تعمیل

بعد مصیبت حقیقی نہ آوے گی۔ یعنی ظاہری مصائب مثل مرض موت رنج وغیرہ کے تو ہوں گے۔ مگر اطاعت کی برکت سے تمہارا قلب پریشان نہیں ہوگا۔ جیسے کہ بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے تو کسی چیز سے پریشان نہیں ہوتا اسی طرح اس مطیع کو چونکہ قرب حق نصیب ہو جاتا ہے لہٰذا یہ بھی پریشان نہیں ہوتا اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

موحد[1] چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امیدو[2] ہراسش نباشد زکس   ہمیں است بنیاد توحید و بس

بلکہ اس سے ترقی کر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ دوست کی طرف سے بلا کی آرزو کرنے لگتا ہے اسی کو عراقی فرماتے ہیں کہ

نشود[3] نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

لہٰذا چاہیے کہ مصیبت کے مبتلا کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں اور اطاعت حق میں مشغول ہوں کہ اس سے بچنے کی اصل ترکیب یہی ہے۔

انسان کی مصیبت کا راز

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان نہیں ہے جس کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ انسان تحت[4] القدرۃ ہے مستقل نہیں ہے اگر چہ ہر امر میں انسان کی ایک مستقل تجویز بھی ضرور ہوتی ہے جسے اس کا ذہن اختراع[5] کر لیتا ہے مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے۔ ام للانسان ما تمنی یعنی انسان کو اس کی ہر تمنا نہیں ملتی۔ تمنائیں انسان کی بہت کچھ ہوتی ہیں مگر ملتی کم ہیں بلکہ جو خدا تعالیٰ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے اور وہی انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے اگر چہ اول نظر میں اس کی بہتری انسان کو محسوس نہ ہو لیکن اس کے نتیجے پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حکمت معلوم ہو

---

[1] توحید والا وہ ہے کہ اس کے پیروں پر سونا گرا دو یا ہندی فولادی تلوار اس کے سر پر رکھ دو [2] اس کو کسی سے امید اور ڈر نہ ہو توحید کی بنیاد بس یہی ہے [3] دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ ہم دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر کو ان پر آزمایا کرے [4] خدا تعالیٰ کی قدرت کے ماتحت ہے خود مستقل نہیں کہ جو چاہے وہ ہو نہ چاہے نہ ہو۔ [5] تجویز کرتا گھڑ لیتا ہے

جاتی ہے اور اول نظر میں چونکہ حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لئے خلاف تمنا کو ہر مصیبت کہتے ہیں۔

مصیبت کی حقیقت

اگر حکمت اور مصلحت پر نظر ہو تو کوئی مصیبت مصیبت نہیں۔ بلکہ ہر مصیبت نعمت ہے۔ مگر مراد مصیبت غیر اختیاریہ ہے اور اسی میں گفتگو ہو رہی ہے برخلاف ان کے جن کو اپنے ہاتھوں اختیار کرتے ہیں یعنی گناہ کہ انسان اس کو اپنے اختیار سے کرتا ہے سو اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گناہ اور معصیت قرار دیا گیا ہے اور اس سے روکا گیا ہے۔ اور یہی فرق ہے۔ در[1] میان فعل، عبد اور فعل حق کے کہ کوئی فعل شر کا[2] خدا تعالیٰ سے صادر نہیں ہوتا۔ فعل شر وہی ہے جو بندہ اپنے اختیار سے خلاف رضائے حق کرتا ہے تو امور اختیار[3] یہ عبد تو خیر و شر دونوں ہیں اور غیر اختیاری جو محض من جانب اللہ ہے وہ خیر محض ہے اس لئے عارفین نے اپنے متعلقین کو یہ تعلیم کی ہے اور اس سے انہیں ایک استواری پیدا ہوگئی ہے کہ جس سے وہ پریشان نہیں ہوتے۔

در[4] طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست
در صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

تو جو پیش آئے اس کو خیر سمجھے۔ خواہ وہ بیماری ہو یا دشمن کا اپنے اوپر غالب آنا ہو۔ یا فقر و فاقہ ہو یا اور کوئی مصیبت ہو غرضیکہ سب میں بہتری ہے مگر یہ بہتری ایسی ہے کہ جیسے دوا کی بہتری کہ شفیق ماں باپ تو یہ جانتے ہیں کہ حلق سے اترتے ہی تریاق کا کام دے گی۔ لیکن بچہ نہیں سمجھتا بلکہ ماں باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے کہ انہوں نے ایسی دوا پلا دی۔ یا جیسے دنبل میں نشتر دینا کہ ماں باپ خوش ہیں مگر بچہ ان کو دشمن سمجھتا ہے۔ نشتر[5] زن ماں باپ سے انعام طلب کرتا ہے اور بچہ تعجب کرتا ہے لیکن ہر عاقل جانتا ہے کہ واقع میں یہ کام انعام کا

---

[1] بندہ کے کام اور اللہ کے کام میں [2] برائی کا کام ان سے نہیں ہوتا گو انسان کے قصد پر پیدا کر دیں یہ پیدا کرنا بہت حکمتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے برا نہیں اچھا ہے اس کا تو کرنا برا ہے۔ [3] جو باتیں بندے کے اختیار میں ہیں۔ [4] اللہ کے راستہ میں جو چیز راستہ چلنے والے کو بے اختیار پیش آتی ہے وہ اس کے لئے بہتر ہی بہتر ہے اے دل سیدھی راہ میں کوئی گمراہی نہیں [5] نشتر مارنے والا اپریشن کرنے والا

ہے۔تو بچہ کے علم کو جو تفاوت ماں باپ کے علم سے ہے اس سے بہت زیادہ تفاوت بندہ اور خدا کے علم میں ہے۔تو خداتعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ جس حادثہ کو بندہ مصیبت سمجھ رہا ہے اس میں کیا کیا حکمتیں مخفی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً و ھو خیر لکم (قریب ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو)

اس پر جس کی نظر ہوگی وہ ہرگز اسکو مصیبت نہ سمجھے گا جسطرح جراح نے نشتر لگا کر مصیبت میں نہیں پھنسایا[1]۔اسی طرح خداتعالیٰ جو بندے کے ساتھ کرتے ہیں سب بہتر[2] ہی ہوتا ہے مگر بندہ اس کی حکمت کو سمجھتا نہیں حالانکہ اگر ذرا غور کرے تو بعض حکمتیں معلوم بھی ہوسکتی ہیں۔

مصیبت کے فوائد اور خاصیتیں

مصیبت میں یہ خاصیت ہے کہ اخلاق درست ہو جائے انسان خدا کو یاد کرنے لگتا ہے تو یہ نصیب ہو جاتی ہے۔تنبہ[3] ہوتا ہے کہ فلاں امر کی وجہ سے یہ ہوا تو یہ کھلے فائدے نظر آتے ہیں مگر بعض لوگ اس کو یاد نہیں رکھتے۔ پس اسی معنی کو مصیبت نہ کہی جائے گی۔مگر ظاہر نظر میں وہ مصیبت ہے کیونکہ حقیقت لغویہ[4] مصیبت کی یہ ہے کہ کوئی بات خلاف طبیعت پیش آوے اور چونکہ زندگی میں زیادہ واقعات ایسے ہی پیش آتے ہیں اس لئے کوئی بھی مصیبت سے خالی نہیں ہے۔کوئی مال کی طرف سے پریشان ہے کوئی صحت کی طرف سے پریشان ہے کوئی اولاد کی طرف سے پریشان ہے۔غرض ہر شخص کو کوئی نہ کوئی مصیبت لاحق ہے اگرچہ ہر ایک پر اثر الگ الگ ہوتا ہے اور ایک سرسری اثر ایسا بھی ہے کہ کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں اگرچہ برائے چندے ہی ہو اور وہ اثر تنبہ[5] ہے اپنی بدعملی پر اور اپنے ضعف و عجز پر بڑا ظالم ہے وہ شخص کہ اس پر کوئی مصیبت آئے اور وہ اس پر متنبہ[6] نہ ہو بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ انسان ہی نہیں ہے اور جو انسان ہوگا وہ ضرور اس طرح متاثر[7] ہوگا اور یہ تاثر[8] بہت بڑی نعمت ہے۔

---

[1] بلکہ اگلی بڑی مصیبت سے بچایا ہے [2] دنیا و آخرت کی بڑی مصیبت سے بچاتے ہیں اور ثواب بھی دیتے ہیں
[3] ہوشیار ہونا متوجہ ہو جانا [4] لغت اور زبان کے لفظ کے اصلی معنی [5] توجہ [6] متوجہ
[7] اثر لینے والا [8] اثر لینا

تکبر قبول حق سے بڑا مانع ہے

قبولِ حق[1] اور رجوع عن الباطل سے بڑا سدراہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو سب سے بڑا سمجھے۔ اسی وجہ سے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اگرچہ جانتے تھے کہ آپ پیغمبر برحق ہیں خدا کے نبی ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے کے پیشتر ہی وہ حضور کو جانتے تھے۔ حتیٰ کہ مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ہم تمہاری خبر لیں گے جب وہ رسول تشریف لے آئیں گے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ لیکن جب آپ ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ کی اتباع میں اپنے جاہ کا نقصان ہوتے دیکھ کر آپ کے ساتھ کفر کیا سمجھے کہ آج تو ہم احبار[2] کہلاتے ہیں مقتدا شمار ہوتے ہیں اگر ایمان لے آئیں گے تو جھوٹے ہو جائیں گے۔ اسی طرح رؤسا مکہ یہ کہتے تھے۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ کہ اگر یہ کلام خدا کا کلام ہوتا تو کسی بڑے شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ ایک یتیم پر کیوں نازل ہوا پھر یہ کہ آپ کے پاس تمول بھی نہ تھا۔ اس لئے رؤساء کہتے تھے کہ کسی رئیس پر کیوں نازل نہ ہوا۔ تو ان کو قبول حق سے یہی مانع تھا اور اس کی بڑی مذمت ہے۔ حدیث میں ہے کہ رائی برابر بڑائی بھی جس کے قلب میں ہوگی وہ جنت[3] میں نہ جائے گا اور اس مرض سے بہت کم لوگ خالی ہیں۔ کم وبیش سب میں ہوتا ہے اور اس نے شیطان کو جس نے آٹھ لاکھ برس تک عبادت کی تھی ایک پل میں مردود بنا دیا اور اسی راز کی وجہ سے حکماء[4] امت نے کہا ہے کہ صرف وظیفوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک کسی کامل کی صحبت نہ ہو کہ وہ اس کے تکبر کا علاج کرے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ محض کتابیں دیکھ کر کچھ کرتے ہیں ان کے اخلاق درست نہیں ہوتے۔ غرضیکہ شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا اور اس کے سبب ملعون ہوا۔

---

[1] حق بات کو قبول کر لینے اور باطل شے کو فنا آنے میں راہ کی بڑی رکاوٹ۔
[2] بڑے بڑے عالم [3] یعنی اوّل اوّل بلکہ مسلمان ہوگا تو بعد عذاب کے جائے گا
[4] امت کے بڑے بڑے عقلمندوں یعنی سچے پیروں نے۔

بلا تکبر کا بھی علاج ہے

سو مصیبت سے ایسے بڑے مرض کا علاج ہو جاتا ہے غرضیکہ کوئی ایسا مسلمان نہیں جس پر مصیبت کا اثر نہ ہو۔

مصیبت میں لوگوں کے حال کا تفاوت

لیکن فرق یہ ہے کہ بعض لوگ تو یاد رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں اور بھول جانے کے یہ معنی نہیں کہ ان کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو قدرت نہیں ہے مگر برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے جس سے دوسرا ناواقف یہ اخذ کر سکتا ہے اور اس مرض کے کئی درجے ہیں۔ بعض کو تو مصیبت آتے وقت بھی پوری طرح تنبہ[1] نہیں ہوتا۔ سخت تعجب اس شخص پر ہے جو کہ مصیبت آنے پر یہ کہتا ہے کہ معلوم نہیں ہم سے کیا گناہ ہوا ہے جس کی پاداش بھگت رہے ہیں۔

صاحبو! کونسا وقت ہے کہ ہم اس میں گناہ نہیں کرتے۔ ہم تو ہر وقت ہی گناہ میں مبتلا ہیں۔ پھر اس سوال کے کیا معنی اور بعض کو دوسرے طرز کی غفلتیں ہوتی ہیں چنانچہ ہم میں تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ کہ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم نے کیا کچھ کیا ہے۔ جس سے مصیبت آئی دوسرے وہ کہ ان کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ کیا ہے مگر پھر بھی تدارک نہیں کرتے استغفار نہیں کرتے بلکہ بعضے تو اور زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں۔

حکایت: جہاز میں دیکھا ہے کہ عین شدت طوفان کے وقت نہایت پریشانی میں بعض لوگ یا علیؓ یا علیؓ کہتے تھے۔ اور بہت سے لوگ حضرت غوث الاعظمؒ کو پکارتے تھے۔ اللہ اکبر یہ لوگ مشرکین عرب سے بھی بڑھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں کفار کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا۔

حکایت: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کافر سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا کہ سات ہیں چھ زمین میں اور ایک آسمان میں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت کا خدا کونسا ہے اس نے کہا کہ آسمان والا تو مشرکین عرب مصیبت کے وقت ایک

---

[1] توجہ

خدا ہی کو پکارتے تھے مگر ہندوستان میں مصیبت کے وقت بھی دوسروں ہی کو پکارتے ہیں۔

تیسرے قسم وہ ہے کہ گناہ کو یاد کر کے تدارک بھی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف رجوع بھی ہوتے ہیں لیکن وہ حالت ہوتی ہے کہ

اہل[1] کاراں بوقت معزولی! شبلی وقت وبا یزید شوند!
شمر ذی الجوشن و یزید شوند باز[2] چوں می رسند برسرکار

یعنی جب تک مصیبت رہی اللہ بھی یاد رہے۔ رسول بھی یاد رہے اور جب مصیبت ٹلی تو ایسے آزاد کہ گویا خدا تعالیٰ کی حدود حکومت ہی سے نکل گئے۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا (جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ ہم کو پکارتا ہے)

اور اس کی وجہ فرماتے ہیں کہ

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ایسے ہی زینت دے دیئے گئے حد سے بڑھنے والوں کے لئے ان کے عمل جو وہ کرتے ہیں)

یعنی وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حدود سے باہر ہو گئے ہیں اور یہ خاصیت ہے کہ نیک عمل میں بصیرت[3] ٹھیک رہتی ہے اور جب گناہ کرتا ہے تو بنیش[4] جاتی رہتی ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ ان کو اعمال[5] خوش معلوم ہوتے ہیں پس علت اس کی اسراف[6] ہے کہ اس کی وجہ سے بری باتیں مزین[7] معلوم ہونے لگتی ہیں۔

صاحبو! آخر کس بات نے تم کو اس قدر بے فکر کر دیا ہے کہ جو تم کو کسی حادثہ سے بھی تنبہ[8] نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ کو تو ہر جگہ ہر طرح کی قدرت ہے اس سے بچ کر آخر کہاں جاؤ گے پھر معاصی پر کس طرح دلیر ہو مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ

حکایت: ایک ملاح سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے۔ اس نے

---

[1] اہل کار یعنی حکومت کے ملازمت پیشہ لوگ ملازمت سے الگ ہونے کے وقت تو شبلی زمانہ اور بایزید ہو جاتے ہیں [2] پھر جب دوبارہ کام پر آ جاتے ہیں پھر شمر و یزید بن جاتے ہیں۔ [3] دل کی نظر [4] یہ نگاہ [5] برے کام [6] حد سے بڑھنا جو حد کام کی مقرر تھی اس سے نکل کر گناہ کرنا۔ [7] زینت دی ہوئی اور اچھی [8] توجہ اور ہوشیاری

کہا کہ دریا میں ڈوب کر کہنے لگے اور دادا کہا کہ دریا میں کہنے لگا کہ پھر بھی تم دریا میں رہتے ہو ڈرتے نہیں۔ ملاح نے کہا کہ تمہارے باپ کہاں مرے۔ کہنے لگا گھر میں پوچھا کہ دادا کہنے لگے کہ گھر میں ملاح نے کہا کہ پھر بھی تم گھر میں رہتے ہو ڈرتے نہیں تو خدا تعالیٰ کی قدرت تو ہر جگہ موجود ہے اس کے قہر سے تو کسی جگہ اور کسی وقت مامون نہیں ہو سکتے۔

خدا تعالیٰ کے قہر سے نہ ڈرنا ہر حالت میں خلاف عقل ہے

تو جو شخص کہ خدا سے ایک وقت میں ڈرے اور دوسرے وقت نہ ڈرے وہ کس قدر نادان ہے دوسرے اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ خاص اس مصیبت ہی کے وقت میں زیادہ خطرہ ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ دوبارہ اسی مصیبت میں مبتلا کر دیں اور اس طرح مسلط فرمائیں کہ وہ ہلاک ہی کر دے۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ ام[1] امنتم ان یعید کم فیه تارۃ اخرٰی صاحبو! اپنے کو کسی وقت خدا تعالیٰ کے قبضہ سے نکلا ہوا مت سمجھو اور سب گناہوں کو ترک کر دو دیکھو گناہ میں مصیبت اس لئے آتی ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ اور یہ بات سارے گناہوں کو عام ہے۔ اگر چہ وہ کسی قسم کے گناہ ہوں تو جب خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور ہر قصہ ان کے قبضہ میں ہوا تو ممکن ہے کہ پھر کسی قصہ میں مبتلا کر دیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا تو نمرود کو ایک مچھر سے پریشان کر دیا۔

حکایت: اہل سیر نے لکھا ہے کہ نمرود کی یہ حالت تھی کہ جب سر پر چوٹ لگتی تھی تو چین آتا تھا دیکھو کہاں نمرود اور کہاں مچھر۔ مگر خدا تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ ہمارا ایک معمولی سپاہی بھی کافی ہے اور بچانے والا سوائے خدا کے اور کون ہے اور اگر وہ نہ بچاوے تو ادنیٰ ذرہ ہی پریشان کرنے کو کافی ہے۔

حکایت: ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس کی ناک پر بار بار ایک مکھی آ کر بیٹھتی تھی اس نے تنگ آ کر کہا کہ معلوم نہیں مکھی کو کیوں پیدا کیا ہوگا۔ وزیر نے کہا کہ اس واسطے پیدا کیا ہے کہ متکبرین کا تکبر ٹوٹے۔ حاصل یہ ہے کہ ذرا سنبھل کر خدا تعالیٰ کی مخالفت کیا کرو تم میں تو ایک مکھی کی مقاومت[2] کی تاب بھی نہیں۔ بس اگر بچنے کی کوئی صورت ہے تو یہی کہ خدا تعالیٰ

---

[1] یا کیا تم لوگ اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تم کو پھر دوبارہ اسی میں لوٹا دیں۔ [2] برابری اور مقابلہ

کی طرف رجوع کرو۔ افلاطون کی ایک حکایت لکھی ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ سے پوچھا کہ اگر آسمان قوس[1] ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہوں تو بچ کر کہاں جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز سے قریب ہو جائے کہ تیر دور والے پر چلاتے ہیں۔ افلاطون نے کہا کہ بیشک آپ نبی ہیں کیونکہ یہ جواب سوائے نبی کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر خدا کے ان لشکروں سے بچنا چاہو تو خدا کا قرب حاصل کرو اور فوراً توبہ کرو اور اس توبہ پر قائم رہو کہ اس سے خدا تعالیٰ راضی ہوں گے اور سب مصائب کو زائل فرمائیں گے۔

ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے

کیونکہ یہ کارخانہ ظاہری وابستہ ہے۔ کارخانہ باطن کے ساتھ اول حکم وہاں سرزد ہوتا ہے پھر اسی کے موافق یہاں ہوتا ہے۔

حکایت: شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ کی حکایت ہے کہ ایک مرتبہ شہر کا انتظام بہت سست تھا۔ ایک شخص نے شاہ صاحب سے وجہ پوچھی فرمایا کہ آج کل یہاں کے صاحب[2] خدمت سست ہیں۔ پوچھا کہ کون ہیں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک کنجڑہ بازار میں خربوزہ فروخت کر رہا ہے وہ آج کل صاحب خدمت ہے۔ یہ اس کے امتحان کے لئے گئے۔ اور امتحان اس طرح کیا کہ خربوزے کاٹ کاٹ اور چکھ چکھ سب ناپسند کر کے ٹوکرے میں رکھ دیئے۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ چند روز کے بعد دیکھا کہ انتظام بالکل درست ہو گیا۔ اسی شخص نے پھر پوچھا کہ آج کل کون ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک سقہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا ہے۔ مگر ایک پیاس کی ایک چھدام[3] لیتا ہے۔ یہ ایک چھدام لے گئے اور ان سے پانی مانگا۔ انہوں نے پانی دیا اس شخص نے پانی گرا دیا کہ اس میں تو تنکا ہے اور دوسرا کٹورہ مانگا۔ انہوں نے پوچھا کہ اور چھدام ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ انہوں نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ خربوزہ والا سمجھا ہوگا۔ اس شخص نے آ کر بیان کیا کہ یہ واقعہ ہوا۔ شاہ صاحب

۱؎ کمان ۲؎ وہ ولی جس کے متعلق غیر اختیاری کاموں کا باطنی انتظام ہو۔ ۳؎ پرانے پیسے کا چوتھائی حصہ ۱۲

نے فرمایا کہ دیکھ لو آج کل یہ ہیں کہ سب کو نچا رکھا ہے۔ تو سمجھ لو کہ ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے۔ پھر اس باطن کا ایک باطن ہے کہ وہ حکم حق ہے جس کے صدور میں طاعت و معصیت کو بھی دخل عظیم ہے۔ یعنی جب خدا کو ناراض کرو گے تو اول محکمہ باطن میں حکم نازل ہوگا پھر اس کے تابع ظاہر میں ہوگا اور مصائب نازل ہوں گی۔ لہٰذا ان کی اصل تدبیر یہ ہے کہ خدا کو راضی کرلو پھر کوئی مصیبت نہ آوے گی۔

اصحاب خدمت فقرا کو ڈھونڈنا بیکار ہے

اس[1] اوپر کی حکایت کو سن کر کوئی شخص اس غلطی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ ایسے فقیروں کو ڈھونڈنے لگے کہ ان کا ڈھونڈنا محض بیکار ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کے قبضہ میں ہیں۔ ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے۔ اگر چہ ان کی خدمت بھی نہ کرو بلکہ جو ان کے منہ سے نکلواتا ہے اس کو راضی کرو لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں اسی طرح بزرگوں کی فاتحہ[1] اس نیت سے دلانا کہ اس سے ہمارا کوئی کام نکلے گا۔ یہ بھی سخت غلطی ہے۔ دیکھئے آخر فرشتے بھی تو بڑے مقبول ہیں مگر ان کی فاتحہ کوئی نہیں دلاتا کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بالکل مجبور اور حکم خدا کے تابع ہیں۔ پس اسی طرح یہ حضرات بھی ہیں اور اگر کہا جاوے کہ فرشتے تو زندہ ہیں اس لئے ان کی فاتحہ نہیں دلاتے تو میں کہوں گا کہ زندہ لوگوں کو بھی تو ثواب پہنچانا جائز ہے۔ پس جب ان کی فاتحہ اس لئے نہیں کرتے کہ وہ بالکل حکم خدا کے تابع ہیں تو سمجھو یہ حضرات بھی بالکل حکم خدا کے تابع ہیں اور سارے اہل خدمت اور اقطاب حکم حق کے سامنے بالکل مجبور ہوتے ہیں کہ جیسا حکم ہو ویسا کرتے ہیں۔ بس ان سے محبت تو رکھنی چاہیے۔ مگر ان سے دنیا کا کوئی کام نکلنے کی کوئی امید رکھنا سخت غلطی ہے۔

دعا کے برکات

ہاں بزرگوں سے دعا کراؤ اور وہ بھی صرف ان بزرگوں سے جو انبیاء کے مشابہ ہوں کہ وہ دعا بھی کریں گے اور تعلیم و اصلاح بھی کریں گے کیونکہ وہ طبیب ہیں اور دعا کرانے

---

[1] ایصال ثواب جو شرعی طریقہ سے ہو ورنہ ایسے ہی گناہ ہوگا۔ (۱) حصہ اول کی آخری۔

کے ساتھ اپنے اعمال کی بھی درستی کرو گناہوں سے توبہ کرو کیونکہ بدوں درستی اعمال کے محض ان کی دعا سے معتدبہ[1] نفع نہ ہوگا اور نہ ان کی سفارش کچھ کام دے گی۔ اس وقت لوگوں نے عمل کو بالکل چھوڑ ہی دیا اور اگر کرتے ہیں تو یہ کہ بہت سے وظیفے پڑھ لئے حالانکہ دنیا کی غرض سے وظائف پڑھنے میں قلب میں ایک دعویٰ مضمر[2] ہوتا ہے چنانچہ ان کو تیر بہدف سمجھا جاتا ہے۔ بخلاف دعا کے کہ اس میں عجز وانکسار ہوتا ہے۔

اصلاح اعمال کی ضرورت

غرض یہ ہے کہ اعمال کی درستی کرے اور ہمیشہ اس سبق کو یاد رکھے اور پھر خدا کو ناراض نہ کرے اور ناراض کرنا خاص یہی نہیں کہ اس خاص گناہ کا مرتکب ہو بلکہ سارے گناہوں کا ارتکاب موجب ناراضگی ہے۔ لہٰذا سارے گناہ چھوڑ دے کیونکہ یہ تو محض اسی کا خیال ہے کہ فلاں گناہ سے مصیبت آئی ہے ممکن ہے کہ کسی دوسرے گناہ سے آئی ہو پھر اگر گذشتہ مصیبت کسی خاص ہی گناہ سے آئی ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ مستقبل میں دوسرے سے نہ آئے گی دیکھو اگر انگارے سے چھپر جل جائے تو کیا چنگاری کو چھپر میں رکھ دیں گے۔ غرض گناہ چھوٹا ہو یا بڑا سب چھوڑ دو۔

دنیا میں کھپ جانا جملہ معاصی کی جڑ ہے

معاصی کی مختصر سی فہرست تو ہر شخص کے ذہن میں ہے۔ یعنی زنا چوری جھوٹ بولنا وغیرہ کہ ان کو سب گناہ جانتے ہیں لیکن بعض معاصی ایسے بھی ہیں کہ وہ ان سب کی جڑ ہیں اور اسی لئے سب سے اول فہرست معاصی میں ان کا نام ہونا ضروری ہے۔ مگر ہم کو ان کی طرف التفات بھی نہیں۔ نہ ہماری فہرست معاصی میں ان کا شمار ہے۔ اور یہ بہت بڑی غفلت ہے اب اس کے نام سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اس کو اپنی فہرست میں بے شک شمار نہیں کیا اور وہ دنیا میں منہمک ہونا ہے۔ اب جس سے چاہے دریافت کر لیجئے معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے بھی اس کو معصیت نہیں سمجھا۔ نماز نہ پڑھنے کو دوسرے کا مال دبا لینے کو

---

[1] شمار کے قابل یعنی کافی [2] چھپا ہوا

زنا کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں مگر دنیا میں کھپ جانے کو کوئی گناہ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یہ ایسا مرض عام ہے کہ جس میں قریب قریب سب مبتلا ہیں اور ایسا قوی ہے کہ سب معاصی اسی کی فروع[1] ہیں۔ مثلاً کوئی شخص نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ دنیا میں غرق ہے اور دین سے بے فکر ہے۔ علیٰ ہذا روزہ حج زکوٰۃ جس چیز میں بھی کوتاہی ہو اس کا سبب یہی ہے اگر کوئی شخص بدکاری میں مشغول ہے تو اس کی وجہ یہی دین سے بے فکری اور دنیا میں انہماک ہے۔ غرض اس میں طویل تقریر کی ضرورت نہیں اگر ذرا غور کیا ہوگا تو معلوم ہوا ہوگا کہ وجہ سب معاصی کی یہی[2] انہماک فی الدنیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ سب ہی کا شعار[3] ہو رہا ہے حتیٰ کہ دیندار بھی باستثناء عارفین و اہل تقویٰ و اہل فکر کے سب اس میں مبتلا ہیں۔ دینداروں کی دینداری بھی اتنی ہی ہے کہ نماز پڑھ لیں اگر چہ بے فکری ہی سے ہو۔ اور داڑھی نیچی کر لیں اگر چہ لوگوں کا مال دبا رکھا ہو۔ معاملات میں ضرر پہنچاتے ہوں۔ غرض دینداری بھی آج کل اس کا نام ہے کہ صورت دینداروں کی سی ہو اور سیرت میں صرف وہ باتیں ہوں جو رسوائی سے بچائیں مثلاً پانچ وقت کی نماز پڑھنا روزہ رکھ لینا اگر چہ حالت یہ ہو کہ

از برون[4] چوں گور کافر پر خلل — واندروں قہر خدائے عزو جل

از برون[5] طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ می دارد یزید

تو حالت یہ ہے لیکن وہ خود بھی اپنے کو اور دوسرے بھی اس کو دیندار سمجھیں گے۔ اور ان کی اس حالت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ خود تو بگڑے ہی تھے۔ دوسروں کے لئے بھی ایک برا نمونہ بن گئے اور ایسے ہی لوگ ہیں جو مرض کو ہنر اور ہنر کو مرض سمجھتے ہیں کہ زیادہ تقویٰ کرنے سے دنیا کا نقصان ہوتا ہے تو جب ان کی یہ حالت ہے تو دنیا داروں کی کیا شکایت کی جائے۔ غرض مرض[6] انہماک فی الدنیا اس لئے[7] اشد ہو گیا ہے کہ لوگ اس سے غافل ہیں اور انہوں نے اس کو صحت سمجھ رکھا ہے۔

---

[1] شاخیں۔ [2] دنیا میں کھپ جانا [3] خصوصیت [4] باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح ہے کہ حلوں والی زیب وزینت والی مگر اندر خدا تعالیٰ کا عذاب [5] تم باہر اور ظاہری حالت سے تو حضرت بایزید بسطامی پر طعنہ کرنے والے یعنی شرمانے والے ہو اور تمہارے باطن سے یزید بھی شرم رکھتا ہے۔ [6] دنیا میں کھپ جانے کی بیماری [7] بہت سخت

حب دنیا کی مذمت اور حب دنیا مذموم کی حقیقت

حق تعالیٰ آیت كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ میں ایک شکایت کو ظاہر فرمارہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگ دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو یہاں تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (تم دنیا سے محبت کرتے ہو۔) کے بعد تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (آخرت کو چھوڑتے ہو) بڑھانے سے حب دنیا کی تفسیر بھی ہوگئی۔ یعنی حب دنیا اس کو کہیں گے جس میں آخرت کا ترک ہو جائے اور اس سے حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبت ہر گناہ کی سردار ہے یہ حدیث میں ہے) کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ہوں گے۔ یعنی حب دنیا وہ ہے کہ جس کی بدولت آخرت چھوٹ جائے ورنہ اگر آخرت نہ چھوٹے تو وہ حب دنیا نہ سمجھی جائے گی۔ اور وہ [1] راس کل خطیئۃ (ہر گناہ کی سردار) میں داخل نہ ہو گی گو اس کی طرف طبعی میلان اور بقدر ضرورت اس کا اکتساب[1] بھی ہو اب اس کے معلوم ہو جانے سے بہت سے اشکالات[2] رفع ہو جائیں گے۔

اہل دنیا کے اس اعتراض کا جواب
کہ مولوی دنیا کو ترک کراتے ہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء ہم کو دنیا کے لینے سے بالکل روکتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم مسجد کے ملا ہو کر بیٹھ جائیں چنانچہ ان لوگوں نے اس قسم کی ایک حکایت بھی گھڑی ہے کہتے ہیں کہ

حکایت: کسی بادشاہ کے یہاں بہت سے مولوی جمع ہو گئے تھے۔ سب نے اتفاق کر کے بادشاہ سے کہا کہ فوج پر جو یہ روپیہ فضول خرچ ہو رہا ہے اس کو موقوف کر دو۔ اس نے کہا کہ فوج اس ضرورت سے رکھی گئی کہ اگر کوئی غنیم آئے تو یہ اس کو دفع کریں۔ مولویوں نے کہا

---

[1] کمانا۔ [2] دنیا چھڑانا نہیں ہے نہ اس کی طرف طبعی رغبت کو روکنا ہے نہ ضرورت کے موافق اس کا کمانا برا ہے۔ ہاں اس میں کھپ جانا اور دل کو اس میں اور اس کو دل میں جما لینا برا ہے۔

کہ اگر ایسا ہوگا تو اس کام کو ہم انجام دیں گے۔ غرض فوج موقوف کردی گئی یہ خبر مشہور ہوئی تو کوئی غنیم آ چڑھا بادشاہ نے مولویوں سے خبر کی۔ یہ لوگ کتابیں لے کر پہنچے اور وہ وعظ و نصیحت سنایا وہ کیوں سننے لگا تھا۔ آخر ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ بڑا نالائق ہے۔ مانتا ہی نہیں خیر پھر آپ ملک چھوڑ دیجئے۔ آپ کا ملک گیا اس کا ایمان گیا۔

اس حکایت کو پیش کر کے کہا کرتے ہیں کہ اگر مولویوں کے کہنے پر چلیں تو گھر بار سب چھوڑ دیں۔ صاحبو اس افواہی حکایت کی تو کچھ اصل ہی نہیں ہے جس کا جواب دیا جائے۔ لیکن اصل اعتراض کی نسبت کہتا ہوں کہ آپ آ کر کسی عالم کے پاس رہے ہی نہیں اس لئے آپ کو اس قدر وحشت و اجنبیت ہے چند روز تک آ کر کسی عالم کے پاس رہیے تو ان شاء اللہ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو مولوی کیا تعلیم دیتے ہیں۔

امراض روحانی کے علاج کے لئے چند روز کا نکالنا کافی ہے

اور اگر آپ کہیں کہ ہم اتنا وقت کہاں سے لائیں تو میں کہوں گا کیا آپ امراض جسمانی کی ضرورت سے رخصت لیتے ہیں یا نہیں اور اس رخصت میں تین تین یا چار چار ماہ گنوا دیتے ہیں۔ یا نہیں تو جب امراض جسمانی کے لئے ایک انگریزی سول سرجن کے کہنے سے چار مہینے فضول گنوا دیتے ہیں تو امراض روحانی کے علاج کے لئے ایک عربی سول سرجن کے کہنے سے بجائے چار مہینے کے چالیس ہی دن اس کے پاس فارغ ہو کر رہ لو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ معتقدانہ رہو بلکہ ممتحنانہ رہنے کی اجازت ہے۔ ہاں معاندانہ[1] طور پر نہ رہو اب اس سے زیادہ اور کیا آسانی ہوگی کہ عمر بھر میں سے صرف چالیس دن مانگے جاتے ہیں واللہ اگر آپ ایسا کر لیں تو قریب قریب تمام سوالات کے جوابات خود بخود بدوں مناظرہ کے آپ کی سمجھ میں آ جائیں اور جب آپ چلنے لگیں تو اس وقت آپ سے پوچھا جائے گا کہ آیا یہ کہنا صحیح تھا یا نہیں کہ

اے[2] لقائے تو جواب ہر سوال　　　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

---

[1] مخالف اور دل سے برا جاننے والا بن کر [2] اے وہ صاحب کہ آپ کی ملاقات ہر سوال کا جواب ہے اور ہر مشکل آپ سے خود بخود حل ہو جاتی ہے بغیر اس کے کہ عرض کیا جائے اور جواب ملے۔ مگر ان صاحب کا صحیح بزرگ ہونا ضروری ہے جہاں یہ بات نہ پیدا ہو سمجھ لیجئے کہ وہ نیک تو سہی مگر بزرگ نہیں۔

اوراس وقت کہا جائے گا کہ دیکھ لو

آفتاب[1] آمد دلیل آفتاب　　گر دلیلت باید ازوئے رومتاب

اور چالیس دن کی تخصیص میں اپنی رائے سے نہیں کرتا بلکہ خود حدیث سے ہم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم چالیس دن تک کسی کام کو نباہ کر کرلیں تو پھر ہماری مدد ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں من اخلص[2] حضور مقبول کے قربان جایئے کہ ہر ہر ضرورت میں ہماری دستگیری فرمائی اور ایک معیار ہم کو بتلا دیا کہ اس کے موافق ہم کام کر سکیں اور وہ معیار یہ ہے کہ اس میں اخلاص ہو ایسا چلہ نہ ہو کہ جیسے ایک گنوار نے کیا تھا۔

حکایت: ایک گنوار کو ایک مولوی صاحب نے نماز پڑھنے کے لئے کہا اور چلہ بھر پڑھنے پر ایک بھینس کا وعدہ کیا۔ جب چلہ پورا ہو گیا تو یہ شخص مولوی صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ چالیس دن پورے ہو گئے۔ لہٰذا بھینس دیجئے مولوی صاحب نے کہا کہ بھائی میں نے تو اس لئے کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے چلہ بھر جم کر نماز پڑھ لی تو عادت پڑ جائے گی۔

اور پھر نہ چھوٹ سکے گی۔ کہنے لگا بہتر ہے نہ دیجئے۔ جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے تو جیسے اس کو بے وضو پڑھنے کی وجہ سے اثر نہ ہوا اسی طرح اگر تم بھی مثلاً اس نیت سے رہو کہ مولوی صاحب کے پاس رہ کر خوب دعوتیں کھانے کو ملیں گی تو خاک بھی اثر نہ ہوگا بلکہ میں یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس جا کر رہنے کا قصد ہو تو اپنے پاس ہی. سے کھانا بھی ہوگا کہ خرچ کر کے تعلیمات کی قدر تو ہو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز مفت آتی ہے اس کی کچھ قدر نہیں ہوا کرتی۔

ہر[3] کہ او ارزں خرد ارزاں دہد　　گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

لہٰذا اس تعلیم کا معاوضہ پر یہ ہے کہ چالیس دن تک اپنا خرچ کر کے رہو۔

---

[1] آفتاب خود ہی آفتاب یعنی روشنی دینے فائدہ پہنچانے والا ہونے کی دلیل ہے اگر تم کو روشنی اور فائدہ کی دلیل چاہیے تو اس کی طرف سے منہ نہ پھیرے اسی طرح بزرگ حضرات کا حال ہے۔ [2] جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے چالیس دن تک اخلاص کر لے گا سب سے دل کو خالی کر کے اوپر لگا لے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل پر عقل و دانائی کے چشمے جاری کر دیں گے۔ یا اور جو لفظ ہوں۔ [3] جو شخص کہ سستا خریدتا ہے سستا ہی دیتا ہے ایک بچہ ایک موتی کو روٹی کی ٹکیہ کے بدلہ دے دیتا ہے۔

حکایت: مجھے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ نے ایک کتاب چھپوانے کے لئے فرمایا میں نے اس کے مفت تقسیم کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ فرمایا کہ بھائی مفت تقسیم نہ کرنا کیونکہ لوگ دیکھیں گے بھی نہیں غرض علماء اور اطباء روحانی سے وحشت یا ان پر اعتراضات یا مسائل اسلام میں شکوک اسی وقت تک ہیں کہ جب تک آپ ان کے پاس جا کر نہیں رہتے مگر نہایت افسوس ہے کہ اظہار طلب اور شکوک ہونے کے باوجود بھی یہ نہیں ہوتا کہ چالیس دن کسی کے پاس جا کر رہ لیں۔

حکایت: ایک تحصیلدار صاحب نے ایک شخص کو پیش کیا کہ ان کو بعض مسائل اسلام میں شکوک ہیں میں نے کہا کہ ان شکوک کا علاج یہ نہیں کہ اس مختصر جلسہ میں یہ ان کو پیش کریں اور میں جواب دے دوں گا۔ اور یہ سن کر چل جائیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ چند روز کے لئے میرے پاس آ کر رہیں اور میں جو کہا کروں اس میں یہ غور کیا کریں۔ ان صاحب نے نہایت زور کے ساتھ آ کر رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مدت گزر گئی اور ان کا وعدہ وفا نہیں ہوا اصل بات یہ ہے کہ لوگ اپنی حالت کو مرض نہیں سمجھتے۔

حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کوئی مرض بھی اس کے برابر نہیں نیز مرض بھی پرانا ہے لہٰذا ایک دو جلسے میں اس کا ازالہ ممکن نہیں۔ کم از کم ایک چلہ تو حکیم کے پاس رہنا چاہیے جیسا حدیث میں مذکور ہوا اسی حدیث کا گویا حافظ شیرازی نے ترجمہ کیا ہے۔

شنیدم[1] رہر دے درسر زمینے! ہمی گفت ایں معما باقرینے
کہ[2] اے صوفی شراب آنگہ شود صاف کہ در شیشہ بماندار بعینے

شیشے سے مراد قلب ہے اور شراب سے مراد محبت الٰہی ہے معلوم ہوا کہ ایک چلہ علاج کرنے سے ان شاء اللہ اصل مرض جاتا رہے گا اور پھر ان شاء اللہ عمر بھر مقویات[3] پہنچتی رہیں گی گویا مسہل تو طبیب کے پاس رہ کر ہو جائے گا اور ازالہ مرض کے بعد تقویت پہنچانے والی دوائیں دور رہ کر بھی پہنچتی رہیں گی خدا کے لئے صاحبو اس علاج کو آزما کر تو دیکھو اور

۱؎ میں نے سنا ہے کہ کوئی راہ چلنے والا کسی زمین میں اپنے ایک ساتھی سے یہ معمی کہہ رہا ہے ۲؎ اے صوفی شراب تو اسی وقت صاف اور عمدہ ہوتی ہے اور بوتل میں ایک چلہ (۴۰) دن رہے۔ ۳؎ قوت دینے والی دعائیں۔

چونکہ میں نے اصل علاج بتلا دیا ہے لہٰذا مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں جزئی[1] شکوک اور شبہات کا جواب دوں۔

حب دنیا اور کسب دنیا میں فرق

حب دنیا وہی ہے جس میں ترک آخرت ہو نہ کہ کسب دنیا بس کسب دنیا جائز اور حب دنیا ناجائز۔ کسب اور حب میں وہی فرق ہے جو کہ غلیظ[2] کے صاف کرنے اور کمانے اور کھانے میں کہ اول برا نہیں اور دوسرا برا اور معیوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ
تُحِبُّوْنَ[3] الْعَاجِلَةَ فرمایا تَكْسِبُوْنَ[4] الْعَاجِلَةَ نہیں فرمایا اب اپنے اوپر منطبق کر لیجئے اور دیکھئے کہ آپ تحبون[5] کے مصداق ہیں یا تکسبون[6] کے۔

(۱۱۲) اپنی حالت پر آیات کی تطبیق کرنے میں بعض کی غلطی

اس انطباق میں عوام سے تو کچھ اور خوف اور اندیشہ اس لئے نہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں ان بیچاروں سے جو بات کہہ دی گئی انہوں نے سن لی اور عمل کر لیا اور علماء سے اس لئے خوف نہیں کہ ان حضرات کی نظریں اصل حقیقت تک پہنچی ہوئی ہیں۔ البتہ ان نیم خواندہ[7] خود رائے لوگوں سے (جو بوجہ نیم ہونے کے تلخ بھی ہیں۔ ڈر لگتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ کر یہ نہ کہہ دیں کہ ہم کو یہ آیت سن کر اپنی حالت پر منطبق کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہم اس کے مخاطب ہی نہیں۔ کیونکہ یہ آیت مکی ہے کفار اس کے مخاطب ہوں گے ہم مسلمان اس کے مخاطب ہی نہیں ہو سکتے ہم سے اس آیت کو کیا تعلق۔ لہٰذا اب میں اس کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

اکثر لوگ آیات کے متعلق یہ سن کر کہ کفار کو خطاب کیا گیا تھا۔ بے فکر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس سے بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اور زیادہ فکر میں پڑ جانا چاہیے اور زیادہ اثر لینا چاہیے کیونکہ جب کوئی آیت عتابیہ[8] کفار کی شان میں نازل ہوتی ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس آیت کے مضمون کا خطاب کفار کو ان کی ذات[9] کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی صفت کی وجہ سے اور

---

[1] ایک ایک کا [2] نجاست [3] تم دنیا سے محبت کرتے ہو [4] دنیا کو کماتے ہو [5] تم محبت کرتے ہو
[6] تم کماتے ہو [7] آدھے پڑھے ہوئے تھوڑی تعلیم والے [8] عتاب و ناراضی والی [9] یعنی صرف انسان ہونے کی وجہ سے

ظاہر ہے کہ ذات کی وجہ سے یہ خطاب نہیں ہوا ورنہ ہر انسان کو گو وہ متقی ہی ہو اس کا خطاب ہوتا کیونکہ ''ذاتاً''[1] سب متحد ہیں اور لازم[2] باطل ہے۔ فالملزوم[3] ھکذا پس معلوم ہوا کہ کسی صفت کی وجہ سے یہ خطاب ہوا ہے اور کوئی حالت خاصہ اس مضمون کے ترتب کی علت ہے تو اگر وہ علت کفار کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی پائی جاوے گی تو اس جگہ بھی یہ مضمون مرتب ہو گا۔ مثلاً اسی آیت میں وعید کا مدار[4] حب عاجلہ ہے۔ لہٰذا اگر حب[5] عاجلہ تمہارے اندر پائی جائے گی تو تم بھی وعید کے تحت میں داخل ہو گے۔ پس اب غور کرلو اور اگر اپنے اندر حب عاجلہ دیکھو تو بہت جلد اس کا علاج کرو اور اپنی حالت پر افسوس کرو کہ جو امور اس زمانہ میں کفار میں ہوتے تھے آج وہ مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔

آیت میں تحبون وتذرون کی ایک تاویل[6] فاسد کا جواب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحبون و تذرون سے مطلق محبت اور ترک مراد نہیں بلکہ یہ دونوں لفظ خاص ہیں یعنی وہ ترک مراد ہے جو اعتقاداً[7] ہو اسی طرح محبت سے وہ محبت مراد ہے جو اعتقاداً[8] بقائے دوام کے ساتھ ہو اور ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ بحمد اللہ قیامت کے قائل ہیں۔ دنیا کو فانی جانتے ہیں۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ قرآن شریف میں کوئی قید نہیں[9] ہے اور تمہارے پاس اس قید کی کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل کوئی دعویٰ مسموع نہیں ہوتا۔ پس اس قسم کی قید لگانا قرآن شریف کے مقصود کو بالکل باطل کرنا ہے اور اس تاویل کی ایسی مثال ہے کہ

---

[1] انسان انسان ہونے میں سب ایک ہیں۔ [2] یعنی انسان ہونے کی وجہ سے ہوتا تو لازم آتا ہے کہ متقی لوگوں کو بھی ہوتا کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور یہ لازم کہ متقی لوگوں کو بھی یہ خطاب ہو باطل ہے کیونکہ ان کو دنیا کی محبت ہی نہیں ہوتی۔ [3] تو جس کو یہ لازم تھا وہ بھی ایسے ہی ہے یعنی باطل اور یہ بات لازم آئی تھی۔ محض انسان ہونے کی وجہ سے خطاب ہونے کو لہٰذا محض انسان ہونے کی وجہ سے ان کو خطاب ہونا باطل ہے۔ [4] سزا کا مدار دنیا کی محبت ہے۔ [5] کہ جب سزا دنیا کی محبت کی وجہ سے ہوگی اور دنیا کی محبت ہمارے اندر بھی ہوگی تو ہم بھی سزا کے مستحق ہوں گے۔ [6] غلط یا خراب تاویل [7] عقیدہ میں ہو کہ آخرت کا عقیدہ ہی نہ رکھتے ہوں۔ [8] عقیدہ میں کہ ہمیشہ دنیا میں رہنے کے ساتھ دنیا سے محبت ہو۔ [9] جس سے عقیدہ میں مراد ہو عمل میں مراد نہ ہو بلکہ دونوں صورتوں کو عام ہے۔

حکایت: ایک شخص نے کسی مقام پر پہنچ کر ایک مجمع میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا کہ میں جب یہاں آیا تھا تو ایک عورت سے میری آشنائی ہوئی۔ اور میں اس کے گھر جایا کرتا تھا اور اس کا گھر ایسا تھا اور اس کا شوہر ایک بار آ گیا تھا اور اس نے مجھ کو اس طرح چھپا دیا تھا اور اس مجمع میں اس عورت کا شوہر بھی تھا اور اس کے پکڑنے کی فکر میں تھا۔ اب یہ اقراری مجرم مجمع عام کے سامنے ہو گیا۔ جرم ثابت ہونے میں کوئی حجت باقی نہ رہی اس عورت کو خبر ہوئی اور کچھ اشارہ کر دیا۔ جس کو یہ سمجھ گیا اور تمام قصہ ختم کر کے آخر میں کہہ دیا کہ بس اتنے میں آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا یہ سب خواب تھا۔ کہنے لگا کہ اور نہیں تو بھلا میں غریب پردیسی مجھ کو کون پوچھتا ہے تو ایسی تاویل آپ حضرات ہی کو مبارک ہو غرض یہ کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی غرض کے مطابق جہاں چاہو اور جس طرح چاہو کر لو[۱] مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی ذرا پروا نہیں۔ وہ حالت ہو رہی ہے کہ

بر[۲] ہوا تاویل قرآن می کنی — پست و کرشداز تو معنی سنی

چون[۳] ندارد جان تو قندیلها — بہر بینش می کنی تاویلها

کردہ[۴] تاویل لفظ بکررا — خویش را تاویل کن نے ذکررا

اہل درد ہر مضمون سے اپنے مقصد کی طرف منتقل ہوتے ہیں

اور میں علی سبیل[۵] التنزل کہتا ہوں کہ اگر یہ معنی نہ بھی ہوں اور تنزون مقید ہی ہو اعتقادی ترک کے ساتھ تب بھی آپ کو بے فکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ جس دل میں درد ہوتا ہے اس کو تھوڑے سے التفات سے بھی[۶] متنبہ ہو جاتا ہے گو وہاں دوسری ہی کسی حالت کا بیان ہو مشہور ہے کہ

باسایہ[۷] ترا نمی پسندم — عشق است و ہزار بدگمانی

---

۱ تاویل کر لو۔ ۲ تم اپنی خواہش نفسانی پر قرآن مجید کی تاویل کرتے ہو تمہاری حرکت سے قرآنی بہترین معنے پست اور ٹیڑھے ہو گئے ۳ جب تمہاری جان قندیلیں نہیں رکھتی (علوم نبوی کی روشنیاں نہیں رکھتی تو اب اس کو دیکھنے کو تاویلیں کرتے ہو ۴ تم نے اچھوتے لفظ کی تاویل کر ڈالی تم تو اپنے کو تاویل کرو (رضا کی طرف رجوع کرو) قرآنی لفظوں کی تاویل نہ کیا کرو ۵ نیچے اترنے کے طریقہ پر ۶ توجہ ۷ میں آپ کو سایہ کے ساتھ بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ عشق ہوتا ہے تو ہزاروں بدگمانیاں ہوتی تو جیسے باوجود سایہ سے کسی بات کا احتمال نہ ہونے کے عشق میں گوارا نہیں ہوتا اگر آیت میں عقیدہ میں ہی ترک آخرت اور محبت دنیاداری ہوتی عمل میں ترک و محبت کا احتمال بھی نہ ہوتا تب بھی عشق اس قریبی چیز کو گوارا نہیں کر سکتا۔

حکایت: حضرت شبلیؒ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سبزی فروش صدا لگا تا ہوا آیا کہ الخیار العشرة بدانق جس کے معنی یہ ہیں کہ دس ککڑیاں ایک دانق[1] کے عوض۔ لیکن حضرت شبلیؒ نے سن کر ایک چیخ ماری اور رونے لگے اور فرمایا کہ جب دس پسندیدہ[2] آدمیوں کی یہ قیمت ہے تو ہم گنہگار کس شمار میں ہیں۔ ان کا ذہن منتقل ہوا خیار کے دوسرے معنی کی طرف یعنی نیک لوگ ان لوگوں کے دل میں ہر وقت وہی بات رچی رہتی ہے حضرت حاجیؒ صاحب فرماتے ہیں۔

بسکہ[3] در جان فگار و چشم بیدارم توئی　　　ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

اور یہ صرف شعراء کے کلام ہی سے استدلال نہیں بلکہ حدیث شریف سے ثابت ہے حدیث میں آیا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کچھ کھڑے تھے اور کچھ بیٹھے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اجلسوا یعنی بیٹھ جاؤ اس ارشاد کو سن کر جو شخص جس جگہ تھا اسی جگہ بیٹھ گیا حتیٰ کہ ایک صحابی اسی وقت مسجد میں داخل ہوئے تھے۔ ارشاد نبوی کو سن کر فوراً جوتوں کے پاس ہی بیٹھ گئے حالانکہ جانتے تھے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو جگہ پر پہنچ کر بھی نہیں بیٹھے۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ حضورؐ کا اشاد ہے اور تمہارے کانوں میں پڑا ہے اگرچہ تم بظاہر مخاطب نہیں لیکن خطاب محبوب کو سننے والے تو ہو لہٰذا بیٹھ ہی جانا چاہیے۔ تو آپ لوگ جامیؒ اور شبلیؒ کو بھی جانے دیجئے۔ خود حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ درد دل کا اور محبت کا مقتضاء یہ ہے کہ احتمال پر بلکہ مشابہت احتمال پر بھی اپنے کو مخاطب سمجھے۔ اگرچہ اپنے مخاطب ہونے کا یقین نہ ہو بلکہ مخاطب نہ ہونے کا بھی یقین ہو غرض جس طرح آپ چاہیں ثابت سمجھیں حدیث سے یا شعراء کے اقوال سے ہمارا مقصود ہر طرح حاصل ہے۔

---

[1] چھوٹی چاندی کا سکہ [2] خیار کے دوسرے معنے خیر عمدہ وپسندیدہ لوگوں کے تھے۔ تو مطلب یہ بھی بن سکتا ہے کہ نیک وپسندیدہ دس لوگ ایک دانق کے برابر ہیں۔ بس عشق نے اس سے چوٹ کھائی۔ [3] میری زخمی روح اور جاگتی رہنے والی آنکھ میں صرف تو ہی تو ہے جو کوئی دور سے ظاہر ہوتا ہے سمجھتا ہوں کہ تو ہی ہے

اصلی نفع، نفع دینی ہے باوجود ضروری ہونے دنیوی نفع کے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (اے ہمارے پروردگار ان ہماری اولاد میں ایک ایسے رسول بھیجے جوانہی میں سے ہوں ان پر آپ کی آیتیں تلاوت کریں اور کتاب الٰہی اور دانائی سکھائیں اور ان کو گناہوں اور برائیوں سے پاک کریں بے شک آپ ہی غلبہ والے اور حکمت والے ہیں)

اس مقام پر یہ مضمون حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنائے کعبہ کے وقت جو دعائیں ان دونوں صاحبوں نے کی ہیں ان میں ایک دعا یہ بھی ہے کہ جس کا نفع ان کی اولاد کو پہنچا ان حضرات نے اول اپنے لئے دعا کی۔ اس کے بعد اپنی اولاد کے لئے دعا کی۔ منجملہ[1] دعاء للاولاد کے یہ بھی ہے حاصل اس دعا کا یہ کہ حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اپنی اولاد کو ایک دینی نفع پہنچایا۔ اس دعا کے طرز سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امر اصلی قابل التفات نفع دینی ہے اور نفع دنیوی اس کے تابع ہے۔ اور اس کے ساتھ ملحق ہم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سبق لینا چاہیے کہ انہوں نے جہاں اپنی اولاد کے لئے نفع دنیاوی کی دعا کی کہ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ[2] وہاں اس دینی نفع کی بھی دعا کی کہ ربنا وابعث الخ تو نفع دنیاوی کے لئے دعا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ضروری ہے اور ظاہر بھی ہے کہ اگر دنیا کا نفع نہ ہو تو دنیا میں بہت کم طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں پس اپنے رزق کی وسعت کے لئے اپنی صحت کے لئے بھی خدا تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔

حکایت: اور یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک صحابی کو دیکھا کہ بہت لاغر ہو رہے ہیں تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے کچھ دعا تو نہیں کر لی کہنے لگے کہ ہاں دعا تو کی تھی آپ نے فرمایا کیا دعا کی تھی۔ کہنے لگے کہ یہ دعا کی تھی کہ جو کچھ عذاب ہونا

---

[1] اولاد کے واسطے جو دعائیں کی تھیں ان میں سے [2] اور رزق دیجئے اس آبادی والوں کو ہر طرح کے پھل ان کو جو ایمان لے آئیں اللہ پر اور روز آخرت پر

ہو دنیا میں ہو جاوے۔ آپؒ نے ان کو متنبہ[1] فرمایا تو یہ غلطی کی بات ہے کیونکہ انسان ضعیف ہے۔ اور احتیاج اس کی خمیر میں ہے۔

حکایت: ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ میرے لئے دس روپیہ کا انتظام کر دیجئے کیونکہ مجھے سخت ضرورت ہے اس کے بعد ادھر ادھر کا تذکرہ کرنے لگا فقیر کا دم بھرنے لگا کہنے لگے کہ جنت کی کیا پرواہ ہے اور دوزخ کا کیا ڈر ہے۔ میں نے کہا میاں بیٹھو تم سے دس روپیہ سے تو صبر ہو نہیں سکا۔ جنت سے کیا صبر کر سکو گے۔ اگر ایسے مستغنی تھے تو دس روپے ہی سے صبر کر لیا ہوتا تو واقعی انسان ایسا محتاج ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی اس کو ضرورت ہے اور آخرت کا دنیا سے زیادہ محتاج ہے۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے جیسے دنیا کے لئے دعا کی ایسے ہی آخرت کے لئے بھی دعا کی۔ تو گویا ہم کو سبق سکھلاتے ہیں اور اولاد عام ہے خواہ اولاد حقیقی ہو یا مذہبی۔ بلکہ اولاد حقیقی بھی جب ہی اولاد ہوتی ہے کہ اتباع کرے چنانچہ ارشاد ہے مَنْ سلک[2] طریقی فھو الیٰ گو بعض لوگوں نے من سلک طریقی کو عام کیا ہے کہ جو شخص بھی متبع ہو وہ آل میں داخل ہے۔ خواہ نسباً آل ہو یا نہ ہو مگر میرے خیال میں اتنا عام نہیں ہے۔ بلکہ صرف آل کو عام ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ اولاد نسبتی میں معتدبہ[3] آل وہ ہے کہ اتباع کرے یعنی شرف تو صرف اولاد ہونے سے بھی ہوگا لیکن پورا شرف اسی وقت ہوگا جب اتباع ہو تو[4] من سلک آل ہی کے لئے ہے مگر آل ہی میں ایک قید معتبر ہے کہ معتد بہ درجہ میں شرف اسی وقت ہوگا۔ بہر حال انبیاء کی اولاد بھی وہی مقبول ہے کہ جو متابعت رکھتی ہو ورنہ ایسا ہے جیسے غلط لکھا ہوا قرآن کہ اس کا نہ ادب ہے نہ بے ادبی۔ ادب تو اس لئے نہیں کہ وہ صحیح قرآن نہیں ہے۔ اور بے ادبی اس لئے نہیں کی جائے گی کہ کچھ تو قرآن کے اجزاء[5] ہیں۔ تو انبیاء کی زیادہ تر نظر اس پر ہے کہ دین کا نفع ہو اور آل ہو تو ایسی ہو کہ وہ ان کے قدم بقدم ہو تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے لئے یہ دعا کی اور اس سے گویا ہم کو

---

[1] غلطی پر مطلع فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے یہاں بھی اور وہاں بھی عافیت اور امن طلب کرنا چاہیے ان کا کرم تو بہت وسیع ہے۔ [2] جو شخص میرے طریقہ پر چلے گا وہ میری اولاد ہے۔ [3] شمار کے قابل [4] جو میرے راستہ پر چلے گا۔
[5] ایسے ہی یہاں بھی کچھ نہ کچھ نبی کا جز ان میں ہے

یہ سبق سکھلایا کہ اپنی اولاد کے لئے دنیا سے زیادہ اہتمام دین کا کرنا چاہیے۔

ہم کو اولاد کے لئے دینی نفع کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے

اب ہم کو سبق لینا چاہئے کہ ہم کہاں تک اپنی اولاد کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر چلتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ اپنی اولاد کے حقوق ادا نہیں کرتے لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ توجہ محض دنیا پر ہے اس کی زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ اولاد چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاوے اور جب اس قابل بنا دیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے حقوق واجبہ ادا کر چکے۔ آگے اپنی اصلاح یہ خود کر لیں گے۔ اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے دین کی وقعت بالکل نکل گئی ہے۔ اسلئے ہمہ تن دنیا پر جھک پڑے ہیں۔

انبیاء اور ان کے متبعین کو معاش[1] و معاد دونوں کی عقل کامل عطا ہوتی ہے

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہ تھی۔ اس لئے ان کو دنیا کی طرف توجہ نہیں ہوئی تو عقل اور نقل دونوں اس شبہ کی تکذیب کر رہی ہیں۔ نقل تو یہی سابق دعا جو اپنی اولاد کے لئے انہوں نے فرمائی۔

وارزق[2] اھلہ من الثمرات اور عقل اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حق سبحانہ وتعالیٰ کے نائب ہیں اور جیسے حق سبحانہ وتعالیٰ معاش اور معاد دونوں کی تربیت فرماتے ہیں حق سبحانہ وتعالیٰ کے نائب بھی دونوں کی تربیت فرماتے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کو اصلاح کے لئے بھیجا جاتا ہے اور اصلاح جب تک ممکن نہیں جب تک کہ معاش اور معاد دونوں کی اصلاح نہ کی جائے نیز تاریخ اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کو عقل معاش بھی کامل ہوتی ہے مگر لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں۔

انبیاء و اولیاء کو عقل معاش ہونے کے معنی

عقل معاش ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نوکریوں اور صنعتوں کے طریقے بتلا

---

[1] دنیا و آخرت　[2] اور ان کو طرح طرح کے پھل رزق دیجئے۔

دیں۔ لوگ یہ سمجھ کر بزرگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں باوجود یکہ دنیا کی ضرورت یقینی ہے۔ مگر یہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔

صاحبو یہ تسلیم ہے کہ دنیا کی ضرورت ہے لیکن اول تو یہ غور کیجئے کہ ضرورت[1] اس کو کہتے ہیں دوسرے معاش کے طریقے بتلانا اور اس پر ترغیب دینا یہ علماء کا کام نہیں ہے۔ دیکھو حکیم عبدالعزیز خاں، حکیم عبدالمجید خاں اپنے فن کے ماہر تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ وہ امراض کی تشخیص کریں۔ اب فرض کرو کہ ایک مریض ان کے پاس آیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر تپ دق تجویز کی اور اس کے لئے نسخہ لکھ دیا جب وہ نسخہ لے کر چلا تو راستے میں ایک موچی ملا اور اس مریض کی کیفیت دریافت کی۔ اس نے کہا کہ حکیم صاحب نے تپ[2] کہنہ تجویز کیا ہے کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے جوتے کے متعلق کچھ کہا اس نے کہا کہ جوتے کے متعلق تو کچھ نہیں کہا کہنے لگا کہ وہ حکیم نہیں ہیں۔ ان کو اتنی ضرورت کی تو اطلاع ہی نہیں یہ نہ دیکھا کہ ایک شخص جوتے لئے بیٹھا ہے اور یہ ننگے پیر ہے آخر اس کو جوتا پہننا چاہیے یا نہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اس موچی کی نسبت آپ کیا فتویٰ دیں گے۔ کیا اس کو عقلاء میں شمار کیا جاوے گا ہرگز نہیں بلکہ پاگل کہا جاوے گا۔ اس نے طبابت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور اس کے فرائض منصبی پر اس کو اطلاع نہیں۔ البتہ حکیم پر اس وقت الزام تھا کہ وہ نسخہ کے اندر بلاوجہ یہ کہہ دیتے کہ جوتا نہ پہننا اور جب کہ وہ اس سے سکوت کرتے ہیں تو ان پر کوئی الزام نہیں وہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کر چکے تو علماء پر دنیا کی ترغیب نہ دینے کا الزام اس وقت ہو سکتا تھا کہ جب ان کا فرض منصبی ترغیب دنیا ہوتا یا وہ دنیا حاصل کرنے اور ادھر متوجہ ہونے سے روکتے[3] اگر کہئے کہ علماء تو روکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یہ روکنا بلاوجہ نہیں اس روکنے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے حکیم عبدالمجید خاں کسی کو دیکھیں کہ اس نے اس طرح جوتی سلوائی کہ ٹانکے کھال کے اندر سے نکالے گئے ہیں تو وہ اس طرح سے جوتا سلوانے کو ضرور روکیں گے۔ کہ زخم کی سمیت[4] تمام بدن میں دوڑ جانے کا احتمال ہے۔ آپ لوگ بھی دنیا کی جوتیاں

---

[1] وہ جس کے نہ ہونے سے جان و مال آبرو میں ضرر ہو۔ یہ لمبے چوڑے ساز و سامان ضرورت کے درجہ میں کہاں ہیں۔ [2] پرانا بخار [3] بے وجہ اور بالکل [4] زہر

اس طرح سلوار ہے ہیں کہ آپ کا دین برباد ہو رہا ہے۔ لہٰذا اب ان پر فرض ہے کہ وہ آپ کو منع کریں تو یہ منع کرنا بے وجہ نہ ہوگا۔

اگر[1] بینم کہ نابینا و چاہست　　اگر خاموش بنشینم گناہست

غرض علماء کی نسبت یہ تجویز کرنا کہ وہ دنیا کی ترغیب دیں غلط ہے اور مبنیٰ اس کا یہ ہے کہ سلف کو اپنی طرف معاش و معاد کا جامع سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ بتایئے کسی نبی نے کسی رفارمر نے کہیں دنیا کے حاصل کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ ایک جگہ بھی نہیں۔ البتہ اخلاق اعمال معاشرت پر گفتگو کی ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتلایا کہ یوں ہل چلتا ہے اور اس طرح بویا جاتا ہے۔ انبیاء اور سلف کا کام یہ نہ تھا۔ ہاں معاش کا وہ حصہ جو مضرّ معاد ہو اس کو بتلا کر منع فرما دیا ہے اور اس میں گفتگو کرنا ایسا ہے جیسے طبیب کسی مریض کو گوشت کھانے سے منع کرے تو حکیم کا کام بحالت ضرر منع کرنے کا تو ہے لیکن گوشت کے پکانے کا طریقہ بتلانا یہ حکیم کا کام نہیں۔ پس معاش کے متعلق انبیاء کی جو گفتگو ہے وہ یہ ہے کہ نافع کو مجملاً بتلا دیا اور مضر کو منع کر دیا۔ غرض انبیاء علیہم السلام نے اپنی اولاد کے لئے اس کی رعایت کی ہے کہ دینی نفع ان کو زیادہ پہنچے اور دنیاوی نفع کے واسطے جو رعایت رکھی ہے۔ اس سے ان حضرات کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں **من اٰمن منھم باللہ والیوم الاٰخر** یعنی اے اللہ میرے اہل بلد کو ثمرات دے۔ مگر سب کو نہیں بلکہ اہل ایمان کو تو فرمانبردار اولاد کے لئے دعا کی اس سے اندازہ کیجئے کہ ان کی نظر میں دین کس قدر عزیز ہے کہ باغی کے لئے دعا بھی گوارہ نہیں۔ اگرچہ خداوند تعالیٰ نے تخصیص نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا۔ **ومن کفر فامتعہ قلیلاً** یعنی کچھ دنوں کے لئے دنیا میں کفار کو بھی عیش دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو عام فرمایا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوجہ کفار کے باغی ہونے کے ان کے لئے دعا نہیں فرمائی۔ اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اہل اللہ کا ذوق ہے اور ہونا چاہیے کہ باغیوں پر کچھ رحم نہ کریں نہ ان کے لئے دعا کریں اور خدا تعالیٰ

---

[1] اگر میں دیکھوں کہ اندھا ہے اور کنواں ہے یعنی وہ اس میں گرنے والا ہے اگر چپکا بیٹھ جاؤں تو یہ گناہ ہے

[2] آخرت کو ضرر دینے والا ہو

نے حضرت ابراہیم علیہم السلام کا قول نقل فرما کر کفار کے لئے دعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ذوق مقبول ہے تو یہی مذاق ہونا چاہیے۔ مطیعین کے لئے دعا کریں اور باغیوں کو خدا کے سپرد کردیں۔

ذم[1] قلت اہتمام دین و معنی دیندار

مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی ہے اس کا مضمون قابل غور ہے اور اس وقت اس کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا چونکہ ہم میں اس وقت ایک بہت بڑا مرض کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے وہی اصلی مرض ہے۔ پیدا ہو گیا ہے یعنی قلت اہتمام دین اور یہ وہ مرض ہے کہ اس کی بدولت آج ہم مسلمان کہلانے کے قابل نہیں رہے۔ اس کی بدولت اکثر حصہ دین کا ہم سے نکل گیا۔ دیکھو مالدار وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس کافی سے بھی کچھ زیادہ مال ہو اور جس کے پاس دو چار پیسے ہوں وہ مالدار نہیں کہلاتا ورنہ چاہیے کہ ساری دنیا مالدار کہلانے لگے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ دو قسمیں کہلائی جاتی ہیں۔ ایک غریب ایک امیر تو جیسے مالدار وہ شخص ہے کہ جس کے پاس[2] وافر روپیہ ہو اسی طرح ایماندار بھی وہی ہے جو عقائد اور اعمال وغیرہ میں پوری طرح شریعت کا متبع ہو۔

حدیث[3] من قال لا الہ الا اللہ الخ کے فہم میں بعض لوگوں کی ایک غلطی اور اس کا ازالہ

اور یہ ایمان کچھ ایمان نہیں ہے جس کو اکثر لوگوں نے[4] من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة سے سمجھ رکھا ہے۔ اگرچہ یہ کلمہ واقع میں صحیح ہے لیکن اس وقت اس کو پیش کر کے جو مقصود ثابت کیا جاتا ہے اس کے اعتبار سے[5] کلمة حق ارید به الباطل کہا جا سکتا ہے تو پہلی غلطی یہ ہے کہ اعمال کو ناقابل شمار سمجھتے ہیں دوسرے یہ کہ خود ایمان کے کلمہ میں بھی اختصار کیا

---

[1] دین کا اہتمام کم ہونے کی برائی [2] بہت [3] بخاری و مسلم [4] جو لا الہ الا اللہ کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں کہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ [5] بات تو حق ہے اس سے باطل مراد لے لیا گیا۔

ہے۔یعنی بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ محمد رسول اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں (نعوذ باللہ) میں نے خود یہ تقریریں چھپی ہوئی دیکھی ہیں کہ رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے اور میں نے حدیث سے ضرورت رسالت پر استدلال کیا ہے مجھ سے ایک سفر میں اس کے متعلق ایک صاحب نے دریافت کیا کہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ میں نے کہا کہ آپ یہ بتلایئے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں یاسین پڑھتا ہوں تو اس یاسین پڑھنے کے کیا معنی ہیں آیا یہ کہ صرف یہ کلمہ پڑھتا ہوں یاسین یاسین یا یہ کہ ساری سورت پڑھتا ہوں کہنے لگے کہ یاسین پڑھنے کے معنی تو ساری سورت پڑھنے کے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی طرح لا الہ الا اللہ پڑھنے کے معنی سارا کلمہ پڑھنے کے ہیں۔ دلالت کے لئے صرف جز کا اطلاق کافی ہے دوسرے جزو پر بوجہ ملازمت[1] خود دلالت ہو جائے گی۔ ان لوگوں کے لا الہ الا اللہ پڑھنے کے معنی سمجھنے پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حکایت: ایک طالب علم نے میرے پاس خط بھیجا کہ مجھ کو فلاں تردد ہے اس کے لئے کوئی دعا بتلا دیجئے میں نے کہا کہ لاحول پڑھا کرو۔ چند روز کے بعد مجھ سے ملے اور پھر شکایت کی میں نے پوچھا اس سے قبل میں نے کیا بتلایا تھا کہنے لگا کہ لاحول پڑھنے کو بتلایا تھا سو میں پڑھتا ہوں۔ اتفاقاً میں یہ سوال کیا کہ کس طرح پڑھا کرتے ہو کہنے لگا کہ یوں کہتا ہوں۔ لاحول۔ لاحول۔ لاحول وہلم[2] جرا تو جیسے یہ بزرگ لاحول پڑھنے کے یہ معنی سمجھے کہ صرف لفظ لاحول کو پڑھ لیا جائے حالانکہ لاحول اس پورے کلمہ کا لقب ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی لا الہ الا اللہ سے صرف یہی جملہ سمجھا حالانکہ لا الہ الا اللہ سے وہی مراد ہے جس کے ساتھ محمد رسول اللہ بھی ہو۔ لہٰذا اس سے استدلال نہیں ہوسکتا۔ نیز دوسرے دلائل پر بھی تو نظر ہونی چاہیے۔ مشکوٰۃ میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث میں ہے۔ **شهادة ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله** (اس کی دل سے گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور حضرت محمد اللہ کے پیغامبر ہیں یہ اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ اسلام کیا ہے)

تو اس انہماک فی الدنیا کے سبب سے اس قسم کی غلطیاں کر رہے ہیں پس ان کا علاج

---

[1] لازم ہونے کی وجہ سے [2] آگے تک اور

یہ ہے کہ دین کی طرف توجہ کریں۔اور علوم دینیہ حاصل کریں۔

حکایت: اسی خیال کے ایک اور صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ رسالت کے اقرار کی ضرورت نہیں ہے۔صرف توحید کا اقرار نجات کے لئے کافی ہے میں نے کہا کہ اول تو دلائل عقلیہ ونقلیہ جو رسالت کے ضروری ہونے پر قائم ہیں وہ تمہارے مکذب[1] ہیں۔دوسرے رسالت کا انکار کرنے سے خدا تعالیٰ کی خدائی کا بھی انکار ہو جاتا ہے۔اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے ماننے کے یہ معنی ہیں کہ ان کو صرف موجود مان لیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان کو کمال ذات وصفات میں یکتا سمجھے۔کیونکہ یہ مسئلہ[2] اجماعیہ ہے کہ اگر ذات کا قائل ہو لیکن صفات کا قائل نہ ہو تو وہ کافر ہے۔اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص بادشاہ کو بادشاہ تو مانے لیکن اس کے اختیارات شاہی نہ مانے تو کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ اس نے بادشاہ کو مانا کبھی نہیں تو خدا تعالیٰ کے ماننے اور توحید کے مقر ہونے کے معنی یہی ہیں کہ ہر صفت کمال کے ساتھ علی وجہ[3] الکمال اتصاف سمجھے کہنے لگے کہ بے شک یہ تو ضروری ہے میں نے کہا کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے اس کے ساتھ بھی متصف ماننا ضروری ہوگا۔کہنے لگے کہ ہاں ضروری ہوگا میں نے کہا کہ قرآن شریف میں موجود ہے۔محمد رسول اللہ پس اس کا ماننا ضروری ہوا اور جو اس کو نہ مانے گا وہ موحد بھی نہ ہوگا کیونکہ اس نے خدا تعالیٰ کے صدق کو نہ مانا جس کا ماننا ضروری تھا اور میں نے کہا کہ دس برس کی مہلت جواب کے لئے دیتا ہوں۔

بعض لوگ اعمال میں بھی اختصار کرتے ہیں

یہ تو عقائد میں اختصار تھا جس کی مثالیں آپ نے سن لیں۔اسی طرح اعمال میں اختصار کرلیا ہے کہ بعض تو اعمال کی فرضیت ہی کے منکر ہیں اور بعض منکر تو نہیں مگر عملاً مثل منکرین کے ہیں۔تو ان دونوں قسم کے لوگوں کی غلطی قرآن کی آیات سے ثابت ہوتی ہے۔رہا من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ سو اس کے معنی کے لئے ایک مثال عرض کیا کرتا

---

[1] جھوٹ کو ثابت کرنے والی [2] تمام امت کا اس پر اجماع ہے۔ [3] کمال کی ہر صفت کے ساتھ پوری طرح موصوف ہونا۔

ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح کرے تو نکاح میں محض ایجاب وقبول دو لفظ ہوتے ہیں۔ پس ایجاب وقبول کے بعد بیوی اپنے خورد ونوش کے لئے مطالبہ کرے اور شوہر کہے کہ میں نے ان چیزوں کا دینا قبول نہیں کیا تھا تو وہ اس کا کیا جواب دے گی۔ ظاہر ہے کہ یہی جواب دے گی کہ اگرچہ تم نے ہر ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ قبول نہیں کیا۔ لیکن میرا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے۔ اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ بھی اس مجلس گفتگو میں موجود ہوں تو کیا کہیں گے یہی کہیں گے کہ یہ ایک قبول ہی سب کا قائم مقام ہے تو جب لا الہ الا اللہ کہہ لیا تو سب عقائد اور اعمال کا ذمہ لے لیا تو اس حدیث کا یہ مدلول ہے کہ اب چاہیے اعمال کو جزو[1] ایمان کہا جائے۔ یا اس سے خارج مگر لازم لیکن ایمان میں اختصار سخت غلطی ہے۔ ایمان جب ہی کہلائے گا کہ جب اس کی شان پائی جائے۔ ہم لوگ مسلم کہلاتے ہیں مگر غور کرنے کے قابل یہ ہے کہ ہماری حالت اسلام سے کس قدر قریب اور اس کے کتنی مناسب ہے۔ جیسے میں نے مثال دی ہے کہ مالدار اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا سامان ضرورت سے زیادہ ہو۔ یہی حالت اسلام کی ہے تو ہم کو اپنی حالت دیکھنی چاہیے کہ کس قدر دین سے بے اعتنائی ہو گئی ہے کہ نہ عقائد کی پروا نہ اعمال کی فکر نہ حسن معاشرت کا خیال نہ بداخلاقی پر رنج۔

دعائے ابراہیمی کی شرح

سو دیکھ لیجئے کہ دعا ابراہیمی میں کن کن اجزاء ایمان کو ضروری کہا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے میں ایک رسول بھیجئے جن کی صفت یہ ہو کہ ان لوگوں کو آپ کے احکام سنا دیں اور یہ شان ہو کہ ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں۔ ان کا تزکیہ[2] کریں رذائل سے بے شک آپ قادر ہیں اور حکیم ہیں کہ موافق کے حکمت کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے۔ اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ رسول

---

[1] یعنی چاہے ایمان عقیدہ وعمل دونوں کے مجموعہ کا نام ہو تو عمل ایمان کا ایک جزو ہوگا جیسے کہ بہت سے علمائے امت کا یہ قول ہے یا ایمان صرف عقیدہ کا نام ہو اور عمل اس کے لئے شرط اور لازم ہو جو دوسرے علماء کا قول ہے دونوں قول پر لا الہ الا اللہ کہنا عقیدوں اور عملوں کی پابندی کا اقرار کرنا ہے۔ [2] بری عادتوں سے پاک صاف کر دیں۔

کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ اوران رسول سے مراد ہمارے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے کہ داعی[1] حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیے۔ اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بھی متعدد انبیاء ہوئے مگر وہ بسلسلہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہوئے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سلسلہ میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ لہٰذا آپ ہی مراد ہوئے اور دیگر دعاؤں میں بعثت رسول کی دعا کرنا ایک بڑی رحمت[2] کاملہ کا مانگنا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے کہ ان کو پاک کیجئے اوران کو کتاب دیجئے اوران کو قبول کیجئے۔

تعلیم بواسطہ وحی تعلیم بلاواسطہ سے افضل ہے

لیکن تعلیم بواسطہ وحی اس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلاواسطہ وحی کے بذریعہ الہام کے ہو اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم بلاواسطہ زیادہ قرب کا ذریعہ ہے اسی وجہ سے اکثر عوام اور بعض خواص کی یہ رائے قائم ہوگئی ہے کہ اور یہاں تک اس کا اثر ہوا ہے کہ انبیاء کی تعلیم کی بھی وہ قدر نہیں کی جاتی جس قدر کسی بزرگ کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے۔

حکایت: میرے استاد مولانا فتح محمد صاحب کے پاس ایک شخص آیا اوراپنی عسرت اور قرض کو بیان کیا اور کہا کہ کوئی دعا بتلا دیجئے کہ قرض ادا ہو جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو۔ **اللّٰھم اکفنی بحلالک عن حرامک و اغننی بفضلک عمن سواک** (اے اللہ مجھے آپ کافی ہو جایئے اپنے حلال کے ساتھ حرام سے اوراپنے فضل کے ساتھ اپنے ماسوا سے) اوراس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ یہ حدیث[3] میں وارد ہوئی ہے۔ حدیث کا نام سن کر اس شخص کی یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے سرد پڑ گیا ہو اور کہنے لگا کہ حدیث میں تو بہت سی دعائیں ہیں آپ اپنے پاس سے کوئی چیز بتلایئے جو کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہو۔ یہ فاسقانہ کلمہ سن کر مولانا کو بہت ہی غصہ آیا اور آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر دوسروں

---

[1] دعا مانگنے والے دو ہیں۔ [2] وجہ اگلے مضمون نمبر ۱۲۴ میں ہے [3] ترمذی بیہقی

کی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے تو یہ اسی خیال کا اثر ہے جس کے باعث حضورؐ کی تعلیم پر کفایت نہ ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جاہل عابد جس شوق سے وظیفہ یا نفلیں پیر کی بتلائی ہوئی پڑھتے ہیں۔ قرآن شریف اور پانچ وقت کی نماز اس شوق سے نہیں پڑھتے۔

حکایت: ایک شخص نے مجھ سے فخراً کہا کہ اگرچہ کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے لیکن پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ کبھی قضا نہیں ہوتا اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ سے اس قدر تعلق نہیں ہے جس قدر کہ پیر سے ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اگر پیر سے تعلق نہ ہو تو حضور سے کم تعلق ہوگا لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے بھی بڑھ جائے۔

گر فرق[1] مراتب نہ کنی زندیقی

غرض یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ الہام بلاواسطہ ہے اور وحی بواسطہ ہے تو جس میں واسطہ کم ہو گا اس میں زیادہ قرب ہوگا۔ مگر شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ تعلیم بواسطہ تعلیم بلاواسطہ سے افضل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ تعلیم بواسطہ میں واسطہ کس کا ہے۔ اگر واسطہ کسی معمولی شخص کا ہو تو بے شک بلاواسطہ تعلیم افضل ہے لیکن جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ہے تو اتنے بڑے واسطہ کے ذریعہ سے جو تعلیم ہوگی وہ افضل ہوگی۔

علم بواسطہ وحی کے علم بلاواسطہ سے افضل ہونے کا راز

اور راز اس میں یہ ہے کہ جو علم بلاواسطہ وحی کے ہو اس میں غلطی کا احتمال بوجہ نقصان استعداد[2] کے زیادہ ہے اور بواسطہ وحی تعلیم میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ رہا حضور سے ہم تک پہنچنے کا واسطہ سو اس میں چونکہ ثقات[3] ہیں۔ ان میں غلطی کا احتمال نہیں ہے ایک تو یہ تفاوت ہے دوسرے ایک لطیف تفاوت ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے تو جو تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہوگی اس میں ابتلا[4] کا احتمال نہ ہوگا۔ برخلاف بلاواسطہ کے اس میں احتمال ابتلاء کا ہوتا ہے۔

---

[1] اگر مرتبوں کا فرق نہ کرو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔ [2] حاصل کرنے کی قابلیت کے کم ہونے کی وجہ سے [3] بھروسہ کے یعنی اگر اتنے اتنے ہیں کہ عقل ان کے جھوٹا ہونے کو محال سمجھے تو یقینی ہے اگر دو دو یا زائد ہوں تو دو کی شہادت ہر جگہ معتبر ہے اگر کہیں ایک بھی رہ جائے تو اس کے لئے نیک اور سچا ہونا شرط ہے وہ بھی بھروسہ کا ہے۔ [4] غلطی میں پڑنے کا اور امتحان کا

حکایت: ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو فرما رہے ہیں کہ شراب پی اس نے علماء سے کہا انہوں نے کہا کہ شراب حرام ہے تجھ کو خواب پورا یاد نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ شراب سے مراد محبت الٰہی ہو تو دیکھئے چونکہ بلا واسطہ تعلیم تھی اس میں ابتلا ہوا کہ دیکھئے یہ سمجھتا ہے کہ نہیں اور حضور کے ذریعہ سے جو علوم ہوتے ہیں ان میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خواب میں دیکھے اس میں یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ یہ شیطان[۱] ہوگا۔ کیونکہ آپ کی شان محض ہدایت کی ہے لہٰذا اس میں یہ اختلاط نہیں ہوسکتا بزرگوں نے لکھا ہے کہ شیطان خواب میں آ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں خدا ہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نبی ہوں وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حکمت[۲] ابتلاء کے لئے صفت مضل کے ساتھ بھی متصف ہے۔ دوسرے اول صورت میں تنبہ ممکن ہے کیونکہ خدا تعالیٰ منزہ ہے اور جس کو خواب میں دیکھا ہے وہ منزہ نہیں ہے اور دوسری صورت میں تنبہ ممکن نہ تھا اس لئے آپ کے واسطے کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا تو معلوم ہوا کہ حضور کا واسطہ ایک بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام نے بجائے کتاب وغیرہ براہ راست مانگنے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ قرار دیا نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کی طبیعت[۳] مجبول ہے کہ اپنی بنی نوع کو دیکھ کر اقتدا کرتے ہیں یعنی اس کو ایک نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی فرق ہے اس میں اور جانور میں کہ جانوروں کو ضروریات کی تعلیم کی حاجت نہیں۔ غرض جانوروں میں جو کچھ کمالات ہیں۔ وہ طبعی[۴] ہیں۔ اکتسابی نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے اور ایک بڑے سے بڑے تیراک شخص کا بچہ تیراک نہ ہوگا کمالات انسان کے طبعی نہیں بلکہ ان کو ایک نمونہ دیکھنے کی ضرورت ہے اور ضرورت نمونہ ہی باعث ہے کہ انسان کو تعلیم کتب سے بھی اس قدر نفع نہیں ہوتا جس قدر کاملین کی صحبت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے۔

---

[۱] حدیث میں ہے کہ شیطان حضورؐ کی صورت میں نہیں آ سکتا [۲] امتحان کی حکمت کے لئے گمراہ کرانے والا ہونے کی صفت سے موصوف [۳] اس پر پیدا ہوئی [۴] طبیعت میں پیدا کئے ہوئے ہیں کہیں سے حاصل کئے ہوئے نہیں۔

بچپن ہی سے صحبت نیک کا اہتمام ضروری ہے

اکثر لوگ اپنی اولاد کے لئے تمام آسائشوں کی فکر کرتے ہیں مگر اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے کہ صحبت بھی نیک ہو بلکہ اکثر بداخلاق معلموں کے سپرد کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر چہ یہ ناقص ہیں لیکن ابھی بچپن ہے کیا حرج ہے حالانکہ یہ تجربہ ہے کہ اگر مبادی[1] خراب ہوں تو مقاصد بھی خراب ہوتے ہیں۔ یاد رکھو کہ خاک[2] از تودہ کلاں بردار یہ ضرور ہے کہ اگر کامل سے سیکھے گا تو گو کامل نہ ہو جائے گا لیکن ذی استعداد ہو جائے گا کیونکہ کامل آدمی فن کی حقیقت کو ظاہر کر دیتا ہے بخلاف ناقص کے اور یہ تو علمی ضرر ہے جس پر کم و بیش توجہ بھی ہے۔ مگر بڑا ضرر یہ ہے کہ ناقص کی محبت میں اخلاق بالکل برباد ہوتے ہیں۔ اس پر لوگوں کو ذرا توجہ نہیں۔

حکایت: ہمارے یہاں ایک معلم ہیں ان کی نسبت سنا گیا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو دوسرے معلم کے ہاں بھیجتے ہیں کہ جا کر اس کے مکتب کی چٹائیاں توڑ ڈالیں۔ بتلایئے جب بچپن سے ہی یہ حالت ہوگی تو بڑے ہو کر ان کی کیا اصلاح ہوگی مگر اس پر بالکل خیال نہیں۔ بلکہ اکثر کہتے ہیں کہ بچہ وہی ہے جو شوخ ہو حالانکہ شوخی دوسری چیز ہے اور شرارت دوسری چیز ہے غرض انسان اپنے ابنائے[3] نوع سے سبق لیتا ہے۔ جو حالت دوسرے کی دیکھتا ہے وہی خود اختیار کرتا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے گھر کے لوگوں کو علاج کرانے کے لئے ایک طبیب کے پاس لے گیا ان کو میں نے دیکھا کہ بے حد متحمل تھے۔ باوجودیکہ بے حد نازک مزاج تھے۔ تو میں چونکہ ان کے پاس جاتا تھا اس لئے میرا غصہ کم ہو گیا تھا میں نے غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ محض پاس بیٹھنے کا اثر ہے تو بہت اچھا طریقہ تربیت کا صحبت ہے۔ اب لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی عمر کو پہنچ کر خود ہی سنبھل جائیں گے۔ یہ غلط ہے بچہ بولنے پر بھی قادر نہیں ہوتا اسی وقت سے اس کے دماغ میں دوسروں کی تمام حرکات منقش[4] ہوتی ہیں اور وہ ان سے متاثر ہوتا ہے اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ بچے کے سامنے کوئی حرکت خلاف تہذیب نہ کرنی چاہیے راز

---

[1] بنیادیں یا ابتدا کی باتیں [2] مٹی بڑے ٹیلے سے اٹھاؤ [3] اپنی نوع اور قسم والوں سے [4] جم جاتی

اس میں یہی ہے کہ انسان کے دماغ کی مثال پریس کی سی ہے کہ کاپی لکھ کر جب لگاؤ تو چھپ جائے گا اسی طرح جو چیز دماغ انسان کے روبرو ہوتی ہے وہ اس میں منقش ہو جاتی ہے اگر چہ اس وقت شعور نہیں ہوتا لیکن اس انتقاش[1] کے لئے شعور کی ضرورت نہیں ہے اگر ہم پریس میں انگریزی چھاپ لیں اور پھر انگریزی سیکھ لیں تو چند روز کے بعد ضرور پڑھ لیں گے۔ علیٰ ہذا اگر چہ بچہ اس وقت نہیں سمجھ سکتا لیکن بڑا ہو کر سمجھے گا چنانچہ ایک عاقل عورت نے یہ کہا ہے کہ پانچ چھ برس[2] کے بعد بچہ قابل تربیت نہیں رہتا ہے بلکہ ہر حالت پختہ ہو جاتی ہے وہ کہتی تھی کہ اگر پہلے بچے کو درست کر دے تو اس کے بعد سب بچے اسی سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ غرض معلوم ہوا ہوگا کہ صحبت کا کیا اثر ہے تو جناب باری تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے یوں دعا کرائی کہ ان میں ایک پیغمبر بھیجئے اور پھر آپ کو مبعوث فرمایا کہ آپ نمونہ ہوں سو بعض نے آپ کو دیکھا اور بعض نے آپ کی سیرت دیکھ کر آپ کی حالت معلوم کی اور اسی طرح آپ ہمارے بھی پیش نظر ہیں اور اس اعتبار سے اگر فیکم[3] رسولہ کو عام لیا جائے تو درست ہوگا۔

حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیر[4] جزئیہ کا اتباع بہ نسبت قوانین کلیہ کے سہل تر ہے

واقعی آپ کی سیر کو دیکھ کر جس قدر آسانی سے ہم اتباع کر سکتے ہیں قوانین کلیہ کو دیکھ کر نہیں کر سکتے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں تو ہم سے بھی باز پرس ہوگی کہ تم اس نمونہ کے موافق بن کر کیوں نہیں آئے اس کی ایسی مثال ہے کہ

---

[1] نقش ہونا جم جانا [2] اور سات برس کی عمر میں عقل بھی قائم ہو جاتی ہے اسی لئے سات سال کے بچہ کو نماز کا حکم کرنے کا ارشاد ہے اور اسی عمر کے بعد بچہ ماں کی پرورش کا محتاج نہیں رہتا باپ کو لینے کا شرعاً حق ہے۔

[3] تمہارے اندر ان کے رسول ہیں۔ یہ صحابہ کے لئے خاص نہیں بلکہ ایسے عام ہے کہ اب ہمارے اندر بھی باعتبار سیرت کے ہیں۔ [4] سیرت کی جمع ہے یعنی حضور کی ایک ایک روش اور طور طریق کی پیروی بہ نسبت کلی قاعدوں کے زیادہ آسان ہے

جیسے ہم کسی درزی سے اچکن سلوائیں اور نمونہ کے لئے اپنی اچکن اس کو دیں تو اس اچکن کے دینے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ جدید اچکن کی کاٹ تراش سلائی وغیرہ سب اس پہلے کے مطابق ہو اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ تراش وغیرہ میں فرق ہو جائے تو درزی کو مستحق عتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس عتاب کے جواب میں اگر وہ یہ کہنے لگے کہ زیادہ تر تو موافق نمونہ کے ہے اور للاکثر[1] حکم الکل تو ہرگز یہ جواب مسموع نہیں ہوتا تو جو برتاؤ آپ نے اس درزی سے کیا اسی کے لئے آپ خدا تعالیٰ کے سامنے تیار ہو جایئے۔ اور سوچ لیجئے کہ جب آپ خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور نمونہ نبوی پر پورے نہ اتریں گے تو کس سخت عذاب کے سزاوار ہوں گے۔ اسی کو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ **لقد[2] کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ** کہ بالکل اس نمونہ جیسے بن جاؤ نماز ایسی ہو جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روزہ وہی ہو۔ نکاح شادی کا طرز وہی ہو علیٰ ہذا ہر چیز میں وہی طرز ہو جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز تھا۔ یہ تو نمونہ ہے لیکن یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے اس نمونہ میں وسعت کر دی۔

قرآن شریف میں مقصود اصلی خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کی تعلیم ہے حکایتیں وغیرہ مقصود نہیں ہیں

قرآن شریف میں اصل مقصود خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کے طریقوں کا بیان کرنا ہے۔ اور اگر حکایتیں قرآن میں ہیں تو وہ بھی تابع ہو کر ذکر کی گئی ہیں کہ فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو ان کو یہ سزا ملی اور فلاں قوم نے یہ کیا تھا ان کو یہ اجر ملا یعنی ہم اگر ایسا کریں تو ہم کو بھی ایسی ہی سزا یا اجر ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جمل[3] خبریہ ہیں ان سے مقصود بھی انشائیہ[4] ہی ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اعتناء فی الدین نہایت ضروری ہے۔ جس کی تفصیل آیت میں ہے۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہماری اولاد میں سے ایک رسول پیدا کر کہ

---

[1] زیادہ کے لئے کل کا ہی حکم ہوتا ہے۔ [2] بے شک تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے
[3] جملے [4] یعنی صرف خبر دینا ہی مقصود نہیں بلکہ ہم کو حکم ہے کہ ایسا کرو۔

وہ ان کو تیری آیات سنا دے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے اور ان کو پاک کرے۔ اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اور سمجھ کر ہم سے دعا کی۔

دین کے اجزاء

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں۔ سو وہ مفصلاً تو تین چیزیں یتلوا[1] یعلم اور یزکی اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں۔ اس لئے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم اور دوسرا عمل۔ جیسے فن طب کہ اس میں اول علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی۔

قرآن کا طب[2] روحانی ہونا اور وہ مرض جس کا وہ علاج ہے

تو قرآن بھی اصل میں طب روحانی ہے کہ اس میں روحانی امراض کے قواعد اور جزئیات بتلائے گئے ہیں۔ امراض خواہ متعلق قلب کے ہوں یا جوارح[3] کے اور امراض قلب کا مرض ہونا حواس سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ وجدان سے معلوم ہوتا ہے اور جب تک وجدان صحیح نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی اطلاع بالدلیل ہوتی ہے وہ دلیل یہ ہے کہ اطاعت خداوندی صراط مستقیم ہے اور صراط مستقیم سے خارج ہونا اعتدال سے خارج ہونا ہے کیونکہ خط مستقیم ایک ہی خط ہوتا ہے یعنی اگر دو نقطوں کے درمیان بہت سے خطوط اتصال کیا جائے تو ان خطوط میں خط مستقیم ایک ہی ہوگا جو کہ سب سے اقصر[4] ہوگا۔ باقی سب ٹیڑھے ہوں گے اور اعتدال سے خارج ہونا مرض ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنا مرض ہوا اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ سب طریقوں سے مختصر طریق اور اقصر طریق شریعت اسلامی ہے۔ اس اعتدال

---

[1] آیات الٰہی کی تلاوت کتاب اللہ اور حکمت (ارشادات نبویؐ) کی تعلیم اور بری عادتوں سے پاک کرنا۔
[2] روح کی بیماریوں کا علاج۔ [3] ظاہری اعضا ہاتھ پیر زبان آنکھ ناک کان وغیرہ
[4] چھوٹا مثلاً ((i)) مستقیم یعنی سیدھا سب سے چھوٹا ہے

سے جب کوئی خارج ہوگا وہ مریض کہلاوے گا اور قرآن میں اس کو مرض کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فی[1] قلوبھم مرض اس کی تفسیر جب تک کہ وجدان صحیح نہ ہو سمجھ میں نہیں آ سکتی کیونکہ اس کے مرض ہونے کی صفت امر مبطن[2] ہے جو حواس سے ادراک نہیں ہوتا لیکن جب وجدان صحیح ہو جاتا ہے تو اس کا مرض ہونا وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے جیسے امراض ظاہری کی حالت ہے کہ بعض اوقات وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا تو جیسے امراض طبیہ میں بعض امراض وجدانی ہیں اسی طرح امراض باطنی بھی وجدانی ہیں جب وجدان صحیح ہوتا ہے تو ان کا ادراک ہوتا ہے اور اس کا ایک امتحان بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو دیکھئے کیسی تکلیف اور رنج ہوتا ہے اور اپنے نفس کو انسان کیسی ملامت کرتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی بھی رنج نہیں ہوتا دن رات گناہ کرتے ہیں لیکن کچھ بھی تکلیف و رنج کا احساس نہیں ہوتا تو میں کہوں گا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتداء سے آج تک یہ شخص مرض ہی میں مبتلا ہے صحت کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی کہ اس کی راحت کا ادراک ہوا اور اس سے مرض گناہ کی کلفت کا احساس[3] ہو اس شخص کی ایسی مثال ہے جیسے ایک اندھا مادر زاد کہ اس کو یہی ادراک نہیں ہو سکتا کہ میں اندھا ہوں کیونکہ عمی[4] عدم البصر کو کہتے ہیں۔ تو جس کو بصر کا ادراک نہ ہوگا اس کو عمی کا ادراک کیونکر ہوگا تو مریض بھی اپنے کو وہی سمجھے گا اور مرض کی کلفت بھی اسی کو ہوگی جس نے کبھی صحت دیکھی ہو پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم کو تو کبھی تکدر[5] نہیں ہوتا توجہ اس کی یہ ہے کہ اس کو کبھی انشراح[6] ہی نہیں ہوا اس کو چاہیے کہ انشراح پیدا کرے اس کے بعد دیکھے کہ اگر کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اس میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ کم از کم یہی کرے کہ امتحان ہی کے لئے ایک ہفتہ کی رخصت اپنے معمولی کاموں سے لے اور کسی صاحب برکت کے پاس جا کر رہے اور اس سے اللہ کا نام پوچھ کر جس طرح وہ بتلائے لیتا رہے ایک ہفتہ تک کام میں مشغول ہونے کے بعد دیکھے گا

---

[1] ان دلوں میں بیماری ہے۔ [2] چھپی ہوئی بات [3] چنانچہ جو گناہ عمر بھر میں پہلی بار ہوتا ہے اس میں یہ کیفیت ہوتی ہے [4] اندھا پن تو بینائی نہ ہونے کو کہتے ہیں تو جس کو بینائی کی خبر ہی نہیں کہ کیسی ہوتی ہے اس کو اس کے نہ ہونے اور اندھے پن کی بھی خبر نہیں ہو سکتی ہاں جو پہلے بینا ہو پھر اندھا ہو گیا ہو اس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ بینا ہونا کیا تھا اور اندھا ہونا کیا ہے۔ [5] دل کا میلا ہونا۔ [6] دل کا کھلنا اور نورانی ہونا

کہ دل کی ایک نئی حالت ہوگئی جو کہ اس کے قبل نہ تھی۔ اس کو محفوظ رکھے پھر دیکھے کہ پہلی حالت اور اس جدید حالت میں کوئی فرق ہے یا نہیں واللہ آپ دیکھیں گے کہ پہلی حالت نہایت مکدر تھی اور اب ایک صحت نصیب ہوگئی ہے۔ اور ایک قسم کا انشراح قلب ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جب وجدان صحیح ہو جاتا ہے تو وجدان سے اس کا مرض ہونا معلوم ہو جاتا ہے تو اس کی کوشش کیجئے کہ وجدان صحیح ہوتا کہ مرض کا مرض ہونا تو معلوم ہو جائے کہ اس کے بعد علاج پر توجہ ہو دیکھئے۔ اگر معمولی زکام ہو جاتا ہے تو اس کے لئے کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے مگر افسوس ہے کہ اتنا بڑا مرض ہم لوگوں کو لگ رہا ہے کہ ہماری روح اس میں تحلیل ہو رہی ہے لیکن ہم کو ذرا فکر نہیں ہے۔

قرآن شریف نے ہم کو مرض نافرمانی کا کیا علاج بتلایا ہے

قرآن شریف نے ہم کو اس کا علاج بتلایا ہے اور اس کے مضار[1] پر اطلاع دی ہے تو قرآن مطب روحانی ہے۔ اس میں صرف یہی دو چیزیں ہیں۔ ایک علم اور دوسرا عمل[2] یزکی میں عمل کی طرف اشارہ ہے اور یعلم[3] میں علم کی طرف حاصل یہ ہوا کہ سننے والو اہتمام کے قابل دو چیزیں ہیں علم اور عمل ان ہی کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا پھر علم میں دو مرتبہ ہیں ایک الفاظ اور ایک معانی کیوں کہ کسی جز کے جاننے کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس میں کچھ الفاظ ہوتے ہیں اور کچھ ان الفاظ کے معانی خواہ اردو میں ہو یا عربی میں خواہ زبانی علم ہو یا کتاب سے۔ تو گویا ترتیب کسی فن کے جاننے کی یہ ہوتی ہے کہ اول الفاظ کا تحقق ہوتا ہے اور پھر[4] دلالت علی المعانی اور پھر ان کی حقیقت کا انکشاف اور پھر عمل مثلاً اگر کسی طبیب سے کوئی نسخہ دریافت کیا تو اول اس کے الفاظ معلوم ہوئے پھر ان الفاظ سے معانی پر دلالت ہوئی پھر ان کی حقیقت کا انکشاف ہوا ان سب مراتب کے بعد اس نسخے پر عمل کیا گیا یہی ترتیب عقلی دین میں بھی ہے۔

---

[1] مضرتوں پر [2] بری عادتوں سے پاک کرتے ہیں [3] قرآن وحکمت سکھاتے ہیں۔ [4] پہلے لفظ دماغ میں آتے ہیں پھر لفظوں کے معنے کو ظاہر کرنا آتا ہے پھر معنی کی حقیقت کا کھلنا ہوتا ہے

خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دین آسان صورت میں بھیجا ہے

خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے دین کی کوئی عجیب شکل نہیں بنائی بلکہ جو ترتیب ہمارے روزمرہ کے امور میں ہے وہی ترتیب اس میں بھی رکھی کہ سہولت ہو حالانکہ دین وہ چیز ہے کہ اگر اس کا ڈھنگ بالکل نرالا اور سخت بھی ہوتا تب بھی اس کو بکوشش حاصل کرنا چاہیے تھا۔

تحصیل دین میں ہمارا ہی نفع ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کا

کیونکہ دین حاصل کرنے میں ہمارا ہی نفع ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کا اور نہ حاصل کرنے میں ہمارا نقصان ہے جیسے کوئی طبیب کڑوا نسخہ لکھ دے تو اس کے پینے سے جو کچھ نفع ہوگا۔ مریض کو ہوگا۔ اور نہ پینے سے بھی جو کچھ ضرر ہوگا مریض کو ہوگا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو دوٹوک کر کے فرما دیا ہے۔

من شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر[1] اور قرآن میں بہت سی جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ ہمارا نہ کوئی نفع تمہارے ایمان سے ہے اور نہ کوئی ضرر تمہارے کفر سے اور یہ فرمانا ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کہے کہ اگر تم دوا پیو تو ہمارا کیا نفع اور نہ پیو تو ہمارا کیا ضرر بلکہ حکیم کو تو ایک[2] گونہ نفع بھی ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو کچھ بھی نفع نہیں اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے لئے استکمال[3] بالغیر محال ہے ہر چیز ان کے افادہ اور وجود کی محتاج ہے مگر وہ کسی امر میں کسی کے محتاج نہیں۔ آفتاب عالم تاب عطر خانہ اور گھورہ سب پر روشن ہے لیکن نہ اس کو عطر خانہ سے خوشبو پہنچتی ہے نہ گھوڑے سے بدبو اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

ع ما بری[4] از پاک و ناپاکی ہمہ　　وزگر انجانی و چالاکی ہمہ

کہ ہم تو ایسے مقدس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں۔ پاکی سے پاک ہونے کے معنی

۱؎ جو چاہے ایمان لے آئے جو چاہے کفر کرلے۔ یعنی انجام دونوں کا کھلا ہوا ہے۔ ۲؎ کہ دوا کے پیسے ملیں گے شہرت ہو کر دکان چمکے گی۔ ۳؎ اپنی ذات کے علاوہ کسی اور شے کے ذریعہ کمال حاصل کرنا ناممکن ہے کہ یہ غیر کا محتاج ہونا ہوا اور محتاج ہونا خدائی کے خلاف ہے۔ ۴؎ ہم تو پاکی اور ناپاکی سستی و چالاکی پستی سب سے بری ہیں۔
۵؎ پاکی بیان کرنا۔

یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اس پاکی سے پاک ہیں کیونکہ انسان کتنی بھی تقدیس[۵] کرے لیکن احصا[۱] غیر ممکن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لا[۲] احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک واقعی بڑی سے بڑی تعریف اور تقدیس بھی اس کے واقعی تقدیس[۳] کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں اس کی مثال مولانا نے بیان فرمائی ہے کہ

شاہ[۴] را گوید کسے جولاہہ نیست ایں نہ مدح ست اوگر آگاہ نیست

یعنی اگر کوئی شخص بادشاہ کی یہ تعریف کرے کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ جولاہہ نہیں ہیں تو کیا اس کو کوئی مدح کہے گا ہرگز نہیں اسی طرح ہمارے فہم کے موافق ہمارے نفع کے لئے تسبیح کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔ اسی کو مولانا روم فرماتے ہیں

؎ من[۵] نہ گردم پاک از تسبیح شاں پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

یعنی لوگوں کی تسبیح و تقدیس سے ہم پاک نہیں ہوں گے۔ غرض خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہاں نہ نفع پہنچے نہ ضرر حدیث[۶] میں ہے کہ اگر ساری دنیا مطیع ہو جائے تو خدا کی سلطنت میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوتا جتنا کہ مچھر کا پر۔ برخلاف یہاں کے سلاطین کے کہ جس قدر رعایا اطاعت کرے سلطنت زوردار ہے اور اگر رعایا اطاعت نہ کرے تو سلطنت کمزور ہے وجہ یہ ہے کہ دنیا کے بادشاہ رعایا کے بنائے ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ خود بالذات کامل ہیں لہٰذا رعایا کو خود اپنے نفع کی فکر کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی عبادت سے کچھ بھی نفع نہیں ہے۔ غرض طبیب جس میں[۷] بوسائط بعیدہ نفع کا احتمال ہے جب اس کو حق ہے کہ وہ جیسا نسخہ چاہے تجویز کرے تو خدا تعالیٰ کو اس سے زیادہ حق ہے کہ جیسا قانون چاہے مقرر کرے کیونکہ وہ حاکم علی[۸] الاطلاق بھی ہیں اور اس میں ہمارا ہی نفع بھی ہے۔ مگر یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے نہایت آسانی اور سہولت رکھی ہے۔

۱؎ احاطہ ۲؎ آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ بس آپ ایسے ہیں جیسے آپ نے خود اپنی ثناء فرمائی ہے۔ ۳؎ پاکی بیان کرنا۔ ۴؎ بادشاہ کی تعریف کوئی یہ کرے کہ وہ جولاہہ نہیں تو یہ تعریف نہیں ہوتی مگر اس کو احساس نہیں ہے ۵؎ ان کے پاکی بیان کرنے سے میں پاک نہیں بن گیا ہوں وہی اس سے پاک بھی بنتے ہیں اور موتی بکھیرنے والے یعنی ثنا خواں ۶؎ احمد ترمذی ۷؎ دور کے واسطوں سے ۸؎ سب کے حاکم

موجودہ آسانی سے زیادہ دین میں آسانی کی درخواست یا تجویز کرنے والوں کی غلطی

مگر افسوس ہے کہ لوگ اس پر عمل کرتے بھی جان چراتے ہیں۔علماء سے درخواست کی جاتی ہے کہ احکام میں کچھ آسانی کر دو گویا یہ سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت کی تبدیلی وتغیر بالکل علماء کے[1] ہاتھ میں ہے۔

حکایت: مجھے ایک بڑھیا کا واقعہ یاد آتا ہے کہ جب وہ حج کو گئیں اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے لگی تو دو تین پھیرے کر کے مطوف سے کہنے لگی کہ اب تو مجھ سے نہیں ہو سکتے خدا کے لئے اب تو مجھے معاف کر دو تو جیسے وہ بڑھیا سمجھتی تھی کہ مطوف کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائیں گے۔اسی طرح یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں۔

حکایت: ایک رئیس والی ملک ایک بڑے حاکم سے ملنے گئے یہ رئیس بہت دبلے ہو رہے تھے اس حاکم نے پوچھا کہ آپ اس قدر دبلے کیوں ہو رہے ہیں انہوں نے کہا کہ آج کل رمضان کا مہینہ ہے روزہ رکھنے کیوجہ سے دبلا ہو رہا ہوں کہنے لگا کہ آپ اپنے پادریوں سے کمیٹی کرا کے ان کو فروری کے مہینے میں کیوں نہیں کرا لیتے۔انہوں نے کہا کہ جناب اس قسم کے اختیارات آپ ہی کی کمیٹی کو ہیں۔ہمارے علماء کی کمیٹی کو ایسے اختیارات نہیں ہیں۔ غرض پہلے تو غیر قومیں اس قسم کی درخواستیں پیش کرتی تھیں مگر افسوس ہے کہ اب مسلمان ہی اس قسم کی درخواستیں پیش کرنے لگے ہیں بلکہ یہاں تک ستم کیا ہے کہ لوگ درخواست سے گزر کر رائے دینے لگے ہیں کہ ضرور ایسا کرنا چاہیے۔

حکایت: میں ایک مرتبہ لاہور گیا تو بہت سے خیر خواہان قوم نے یہ تجویز کیا کہ اس وقت سود کے مسئلہ پر گفتگو کرنی چاہیے۔چنانچہ ان کی خواہش پر گفتگو کی گئی لیکن جلسہ گفتگو کا خاص تھا یعنی صرف علماء تھے۔سب لوگ نہایت مشتاق تھے کہ دیکھئے کیا تجویز ہوتا ہے

---

[1] یہ عیسائیوں کی تعلیم کا اثر ہے کہ ان کے یہاں پادریوں سے گناہ کا اقرار معافی اور ان کی متفقہ تجویز مذہب بن جاتی ہے۔جو عقل ونقل سے بالکل لغو ہے۔مذہب تو صرف خدا رسول کے احکام کا نام ہے علماء کے اختیار میں کیا ہے اور اگر کسی نے کچھ کہہ بھی دیا تو وہ مذہب کیسے ہو سکتا۔اس کی تجویز خدا اور رسول کا حکم کیسے بن سکتی ہے۔

حالانکہ وہاں اس کے سوا اور کیا تجویز ہوسکتا تھا جو کہ تیرہ سو برس سے چلا آ رہا ہے۔ اس واسطے کہ اہل علم میں کس کی وہ ہمت ہوسکتی تھی جو کہ آج کل کے نوجوان ہمت کرتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے ایک رسالہ میں آیت حرم الربوا[1] (اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کر دیا ہے) میں یہ تحریف کی ہے کہ ربوا کو بضم الراء کہا ہے اور اس کے معنی اچکنے کے لئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے سیدھی بات تو یہ تھی کہ زنا ہی کہہ دیتے کیونکہ زنا عربی کا لفظ تو ہے۔ ربا تو عربی کا لغت بھی نہیں۔ بلکہ ربودن سے فارسی کا لغت ہے رہا رسم خط کا اشکال سو بابضم الرا بھی واؤ سے نہیں ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے

حکایت: مشہور ہے کہ ایک شخص اپنی ماں کو کچھ نہ دیتا تھا اس نے جا کر ایک عالم سے شکایت کی۔ انہوں نے لڑکے کو بلا کر سبب پوچھا کہنے لگا کہ اگر قرآن شریف میں ماں کا حق کہیں نکل آئے تو میں ضرور دوں گا چونکہ یہ بالکل جاہل تھا۔ اس لئے ان کو فکر ہوئی کہ کوئی ایسی سبیل ہو کہ اس کی سمجھ میں آ جائے۔ آخر کہنے لگے تو نے کچھ قرآن بھی پڑھا ہے۔ اس نے کہا کہ دو چار سورتیں پڑھی ہیں کہنے لگے کہ تبت[1] یدا ابی لھب[2] پڑھی ہے اس نے کہا ہاں جب اس نے تبت پڑھی اور اس میں مَا كَسَبَ[3]

پڑھا تو کہنے لگے کہ دیکھ اس میں تو لکھا ہے کہ ماں کا سب یعنی ماں کا سب کچھ ہے۔ تیرا کچھ بھی نہیں لڑکے نے کہا مولوی صاحب اب دیا کروں گا تو انہوں نے تو ایک ثابت شدہ مسئلہ کو اس جاہل کے ذہن نشین کرنے کے لئے محض ظرافت کے طور پر ایک اردو کے جملے کو قرآن کا جزو کہا تھا لیکن اس ظالم نے قرآن میں صریح تحریف کی کہ ربوا کو حلال کرنے کیلئے اس کی حرمت کو قرآن سے اڑانا چاہا غرض ہر شخص قرآن اور احکام شریعت کے متعلق ایک نئی رائے اور تجویز رکھتا ہے۔ گویا قرآن ایک بچوں کا کھیل ہے۔ کہ ہر کہ آید[3] عمارے نوساخت آج کل کی اصلاح ایسی ہے جیسے کہ

حکایت: ایک بڑھیا نے بادشاہی باز کی کہ وہ اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گیا تھا اصلاح کی تھی۔ یعنی جب اس نے دیکھا کہ اس کے ناخن بہت بڑھ رہے ہیں اور چونچ بھی ٹیڑھی

---

[1] ہلاک ہو گئے۔ دونوں ہاتھ ابولہب کے یعنی یہ سورۃ [2] اور وہ جو اس نے کمایا [3] جو کوئی آیا اس نے ایک نئی عمارت بنالی۔

ہے تو بہت کڑھی اور کہنے لگی تو کس بے رحم کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا جس نے نہ تیرے ناخن کی خبر لی نہ تیری چونچ کو درست کیا تو کس طرح کھاتا ہوگا کس طرح چلتا ہوگا اور یہ کہہ کر اس کے ناخن اور چونچ سب قینچی سے کاٹ دیئے تو جیسے اس نے بازشاہی کی اصلاح کی تھی ایسے ہی یہ لوگ بھی قرآن میں اصلاح کرتے ہیں۔ آخر جب وہ مجلس ختم ہوئی اور وہ مضمون شائع ہوا تو ان لوگوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے کہ افسوس اب تک بھی علماء کو ہوش نہیں آیا کہ اتنی بڑی ضرورت ہے اور یہ لوگ ابھی تک اس کو ناجائز ہی کہتے ہیں۔ میں نے ایک بیان میں کہا ظالمو اگر تم کو اپنی عاقبت ہی خراب کرنا ہے تو حلال کہہ کر ابدالآباد[1] کے لئے تو برباد نہ ہو۔ تمہاری مخترعہ[2] ضرورتیں تو اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہیں کہ حرام سمجھو[3]۔ اور مبتلا رہو اور خدا تعالیٰ سے معافی چاہتے رہو۔ اپنی حرکت پر نادم رہو۔

دین میں اپنی رائے سے تسہیل کرنے والوں کی غلطی

دین میں تسہیل کی غرض سے اپنی رائے سے کام نہ لیجئے دین مکمل ہے اور سہل بھی ہے چنانچہ اس مقام[4] پر اصلاح کی ترتیب کس قدر سہل ہماری فطرت کے موافق رکھی ہے کہ اوّل[5] علم کی طرف اشارہ کیا پھر عمل کی طرف[6] سو اس آیت میں ان ہی دو چیزوں یعنی علم و عمل کو بیان کیا گیا ہے اور چونکہ علم کے دو شعبے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا اس لئے گو اس آیت کی مدلول تین چیزیں ہوئیں۔ الفاظ اور معانی اور عمل اور ہم کو ان تینوں کا حاصل کرنا ضروری ہوا اب دیکھئے کہ ہم نے ان تینوں جزوں کے ساتھ کیا معاملہ کر رکھا ہے سو عمل تو بالکل ہی مفقود ہے۔ اور علم کا جو طریقہ ہے وہ منقود ہے اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ علیم بھی مفقود ہے۔ لیکن خیر تھوڑا بہت مشغلہ ہے گو دنیا ہی کے لئے ہو اور جن لوگوں کو تحقیق ہے وہ کچھ تھوڑا بہت عمل پر بھی متوجہ ہیں۔

---

[1] ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیونکہ قرآنی حرام کو حلال کہنے والا کافر اور ہمیشہ کے لئے دوزخی ہو جاتا ہے۔
[2] گھڑی ہوئی خود ساختہ [3] اس سے گناہ تو ہوگا مگر ایمان تو رہ جائے گا۔ [4] یعنی آیت ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلو علیھم ایٰتک و یعلمھم الکتٰب والحکمۃ و یزکیھم انک انت العزیز الحکیم میں (اے ہمارے رب ان میں ایک پیغمبر انہی میں کا بھیج دیجئے جو ان پر آپ کی آیتیں تلاوت کرے آپ کی کتاب اور حکمت سکھائے اور بری عادتوں سے پاک کر دے بیشک آپ ہی سب پر غالب اور بڑے حکمت والے ہیں۔ [5] تلاوت آیات اور تعلیم کتاب و حکمت [6] بری عادتوں سے پاک کرنے سے [7] گم

اسلام سے بعد کا پہلا زینہ دنیا کو اختیار کرنا ہے

دین اسلام سے بعد کا پہلا زینہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دین کو چھوڑ کر صرف دنیا کے حاصل کرنے پر متوجہ ہو رہے ہیں اور تحصیل دین کو مخل[1] دنیا سمجھ رہے ہیں اور واقعی حقیقت ہے کہ دنیائے حلال دین کے ساتھ سایہ کی طرح ہے اگر کوئی سایہ کو پکڑنا چاہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ اصل چیز کو حاصل کرے تو دنیا بھی جبھی حاصل ہو سکتی ہے کہ جب دین کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا ہو آج افسوس ہے کہ فلسفہ و حقیقت شناسی کی اتنی بڑی ترقی ہے لیکن لوگ دنیا کی حقیقت میں ذرا غور نہیں کرتے۔ محض مال اور جاہ[2] کی طلب کو اصل مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ امر دیکھنے کے قابل ہے کہ مال کیوں مقصود ہے اور جاہ کیوں مطلوب ہے۔

دنیا سے اصل مقصد کیا ہے اور اس کی کتنی ضرورت ہے

سو مال تو جلب[3] منفعت کے لئے مطلوب ہے اور جاہ دفع[4] مضرت کے لئے یعنی ہم کو بڑائی کی اتنی ضرورت ہے کہ ظالموں کی دست برد سے محفوظ رہیں دیکھئے سقے چمار وغیرہ بیگار میں پکڑے جاتے ہیں لیکن جو معزز لوگ ہیں وہ نہیں پکڑے جاتے کیونکہ وہ ذی جاہ ہوتے ہیں۔ اور جاہ ایک قدرتی قلعہ ہے تو یہ دونوں چیزیں جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے ہیں پس مال اس قدر کافی ہے کہ جس سے ہم منافع حاصل کر سکیں اب لوگوں نے نفس مال کو معبود مطلق بنا رکھا ہے تو کتنی بڑی فلسفی غلطی ہے۔

اہل اللہ کو پریشانی مطلق نہیں ہے

صاحبو اصل مقصود محض دین ہے جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو دوسرے مقاصد خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ خدا کے کام میں لگے ہیں ان میں کوئی بھی پریشانی میں[5] مبتلا نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ اس قدر آسائش میں ہیں کہ اہل دنیا کو بھی اتنی آسائش نصیب نہیں ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اول ایک بڑے سے بڑے دنیا دار

---

[1] خلل پیدا کرنیوالا [2] عزت [3] فائدہ حاصل کرنے کیلئے [4] نقصان و تکلیف دور کرنے کیلئے
[5] ان کے دلوں کو سکون حاصل ہے اور مقصود مال و دولت سے دل کا سکون ہی ہوتا ہے وہ صرف انہی کو میسر ہے

کے پاس ایک مہینہ رہیے اس کے بعد اہل اللہ میں سے کسی کے پاس ایک مہینہ بھر رہ کر دیکھئے۔ پھر دونوں کی حالت کا موازنہ کیجئے آپ کو صاف معلوم ہوگا وہ دنیا دار طرح طرح کے افکار میں مبتلا ہے اور یہ دین دار پریشانی سے محفوظ و مامون ہے یہ تو مال کی غایت تھی۔

اہل اللہ دنیاداروں سے جاہ کے اعتبار سے بھی زیادہ ہیں

رہی جاہ اس میں بھی اہل اللہ اہل دنیا سے زیادہ بڑے ہوئے ہیں عزت جس چیز کا نام ہے وہ انہی حضرات کو نصیب ہے کیونکہ عزت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو عزت زبان سے اور ایک دل سے اہل دنیا کی جو کچھ عزت ہوتی ہے وہ محض زبان اور ہاتھ پیر سے ہوتی ہے یعنی لوگ ظاہر میں ان کی عزت کرتے ہیں دل میں کسی قسم کی وقعت ان کی نہیں ہوتی اور اہل اللہ کی عزت دل سے ہوتی ہے دوسرے اہل دنیا اور اہل اللہ میں اس سے بھی زیادہ ایک فرق ہے اور وہ ایک تمدنی مسئلہ ہے یعنی معزز وہ شخص کہلائے گا جو اپنی قوم میں معزز ہو ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مجموع مرکب[1] میں قوم وہ جماعت ہے جس کے آحاد[2] زیادہ ہوں جیسے کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گیہوں کا ڈھیر وہ کہلائے گا جس میں گیہوں زیادہ ہوں اس پر قیاس کر کے اب میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں میں زیادہ افراد کن لوگوں کے ہیں؟ غرباء کے یا امراء کے ظاہر ہے کہ غرباء مسلمانوں میں زیادہ ہیں۔ تو مسلمانوں کی قوم غرباء کی جماعت کا نام ہوگا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غرباء میں زیادہ عزت کس کی ہے۔ اہل اللہ کی یا اہل دنیا کی ہر شخص جانتا ہے کہ اہل اللہ کی غرباء میں عزت زیادہ ہے تو قوم کے نزدیک معزز اہل اللہ ہوئے تو اس تمدنی مسئلہ سے ثابت ہو گیا کہ مال اور جاہ سے جو امر مقصود ہے وہ اہل اللہ ہی کو حاصل ہے۔

دنیا اور دین کے جامع ہونے کی حقیقت

بعض لوگ ایسے ہیں کہ دنیا کو تمام[3] مقصود نہیں کہتے لیکن دین اور دنیا دونوں کا جامع بننا چاہتے ہیں۔ اور اس کو بہت بڑی خوبی اور کمال سمجھتے ہیں مگر یہ جمع ایسا ہوتا ہے جیسے کہ ایک

---

[1] مختلف چیزوں سے مل کر جو مجموعہ بنا ہوا ہے۔ [2] افراد [3] پورا

شخص سارے زنانے کپڑے پہن کر ان کے ساتھ ایک ٹوپی بھی پہن[1] لے ظاہر ہے کہ جو شخص اس کو دیکھے گا ایک مسخری عورت کہے گا جو لوگ جامع بن رہے ہیں ان کو دیکھ لیجئے کہ غالب ان کے اوپر دنیا ہی ہے مسلمان کے جامع ہونے کے معنی تو یہ ہونے چاہئیں کہ اس پر دین غالب ہو اور حسب ضرورت دنیا بھی لیتا ہو۔

دینی خدمت کے لئے چند افراد کے خاص ہونے کی ضرورت

غرض مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان میں سب کے سب دیندار ہوں اور چونکہ معاش کی بھی ضرورت ہے اس لئے کچھ افراد اس میں بھی لگیں اور کچھ افراد ایسے بھی ہونے چاہئیں کہ وہ محض خادم ہوں کیونکہ اگر سب کے سب تحصیل معاش ہی میں پڑ جائیں تو دین کا سلسلہ آگے کو نہیں چل سکتا۔ مثلاً سررشتہ تعلیم ہی کو لیا جائے کہ اگر اس میں کوئی نہ جائے تو ساری نوکریاں جاتی رہیں گی۔ اسی طرح دین کے کام میں بھی اگر کوئی نہ لگے تو یہ کام بند ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک جماعت تو محض خادمان دین کی ہو یہ لوگ اس کے سوا کوئی کام نہ کریں اور میں اس کی ایک نظیر کہتا ہوں کہ قانونی حکم ہے کہ جو شخص ملازم سرکار ہو وہ دوسرا کام نہیں[2] کر سکتا چنانچہ اگر کسی نے کیا تو اس کو یا ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور یا اس دوسرے کام کے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا علیٰ[3] ہذا سید صاحب کو دیکھئے کہ ان کو دنیا کی دھن تھی تو اس میں کیا حالت تھی کہ اپنی زندگی اور آسائش سب اس میں صرف کر دی میں کوئی چیز نہیں ہوں لیکن یہ حالت ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ لکھتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی پنسل کاغذ ساتھ لے کر سوتا ہوں اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جو کچھ یاد آتا ہے اس کو لکھتا ہوں تو اگر ایسے شخص کو کوئی دوسرا کام دے دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بھی خراب ہوگا اور وہ بھی ایک شاعر کی حکایت مشہور ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مصرعہ سوجھا فوراً نماز توڑ دی اور اس مصرعے کو لکھا اگرچہ اس کی یہ حرکت پسندیدہ[4] نہ تھی لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ جب

---

[1] اسی طرح دنیا کی ساری ناجائز باتیں کر کے ایک دو دین کی بات لیتا ہے [2] دو کاموں میں لگ کر کوئی بھی پورا انجام نہیں پاتا۔ ہر ایک ادھورا رہ جاتا اسی طرح دین والے کسی اور کام میں لگیں گے تو ان کا دین اور علم دین ادھورا رہ جائے گا۔ اب وہ پہلے سے قوی انہیں نہ پہلی سی مختصر دنیاداری ہے کہ دونوں کام ہو جائیں۔ [3] اسی طرح [4] جائز

کسی کام کی دھن ہوتی ہے تو کیا حالت ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ایک جماعت کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین کے کام کے سوا اور کوئی کام نہ کرے اور اس جماعت پر یہ الزام بھی بالکل خلاف انصاف ہے کہ قوم کے محتاج ہیں البتہ اگر وہ تم سے مانگیں تو ان کو جو چاہو سو کہو۔ سو بحمد اللہ ان کا تو یہ مذاق ہے۔

حکایت: ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو کہنے لگے کہ ہم خدا کے مہمان ہیں اور مہمانی تین دن کی ہوا کرتی ہے۔ ان[1] یوماً عندربک کالف سنة مما تعدون حضرات واللہ اس وقت بھی ایسے خدا کے بندے موجود ہیں کہ لوگ ان کو دیتے ہیں اور وہ نظر بھی نہیں کرتے[2] اور ان کی وہ حالت ہے۔

دلا[3] رائے کہ داری دل در و بند ۔۔۔ دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

وہ ایک ہی ذات میں ایسے منہمک ہیں کہ دوسرے کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا۔

حکایت: شاہ نیمروز نے ایک بزرگ کو لکھا (دیکھئے اس حکایت سے معلوم ہو گا کہ دینے والے درخواست کرتے ہیں اور لینے والے صاف انکار کر دیتے ہیں) کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنا آدھا ملک نیمروز آپ کے حوالے کر دوں آپ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

چوں[4] چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم

انگہ[5] کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیمروز بہ یک جونمی خرم

غور کیجئے کہ ادھر سے اصرار ہے اور ادھر سے سوکھا جواب کہ ہم کو کوئی ضرورت نہیں اور اس میں تصنع نہیں تھا ورنہ اثر کیوں ہوتا۔

اہل اللہ طفیل خوار نہیں ہیں

اور اس حالت سے کوئی اہل اللہ کو طفیل خوار نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ سرکاری لوگ ہیں۔

---

[1] بیشک ایک دن تمہارے رب کے یہاں ان ایک ہزار سال کے برابر ہے جن کو تم گنتے ہو۔

[2] خود حضرت مولانا تھانویؒ بھی اس کا نمونہ تھے۔ [3] تم جو محبوب رکھتے ہو بس دل اس میں ہی لگا رکھو۔ پھر دوسرے سارے جہاں سے آنکھ بند کر لو۔ [4] بادشاہ سنجر کے سیاہ چھتر کی طرح میرے نصیبہ کا منہ سیاہ ہو جائے گا اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ہوس ہو۔ [5] جب سے میں نے آدھی رات کے ملک کی خبر پائی ہے میں آدھے دن (نیمروز) والے ملک کو ایک جو کے دانہ کے بدلہ بھی نہیں خرید سکتا۔

دیکھئے گورنر جنرل کو کثیر التعداد رقم ہر مہینہ ملتی ہے حالانکہ بظاہر ان کو کوئی ایسا بڑا کام نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن محض اس لئے کہ ان کا کام دماغی کام ہے۔ تو حضرات اہل اللہ پر جو گزرتی ہے اور جو دماغ سوزی ان کو کرنی پڑتی ہے اگر آپ پر وہ گزرے تو چند روز میں جنون ہو جائے اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اہل اللہ پر اپاہج ہونے کا الزام بھی بالکل غلط ہے۔ وہ ہرگز اپاہج نہیں ہوتے ہاں وہ بدن کے اعتبار سے اپاہج ہیں۔ سو یہ فخر ہے ان کی یہ شان ارشاد خداوندی میں مذکور ہے[1]

احضروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض تو یہ عدم استطاعت مایہ فخر ہے نیز یہ خود کہتے ہیں کہ

ما[2] اگر قلاش دگر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

یہ اگر طفیلی ہیں تو اسی کے طفیلی ہیں اور ان کا جسم گو معطل ہے لیکن ان کی روح ایک بہت بڑے کام میں ہے ان کی روح نے اس بار گراں کو اٹھایا ہے جس کے اٹھانے کی پہاڑ بھی تاب نہیں لا سکے اور زمین آسمان سے بھی نہیں اٹھ سکا۔ چنانچہ ارشاد ہے

لو[3] انزلنا ھذا القراٰن علیٰ جبل لرایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ اور دوسری جگہ ارشاد ہے انا[4] عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض و الجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان تو جس کی روح اتنا بڑا بار گراں اٹھائے ہوئے ہو اپاہج کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے

---

[1] جو خدا کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں اور زمین میں سفر کی طاقت نہیں رکھتے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے کاموں میں محبوس کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کے کاروبار میں نہیں لگ سکتے اور دین کا کام سب مسلمانوں کے لئے ہے کہ سب کا دین سنبھالتے ہیں۔ سب کو لازم ہے کہ ان کی دنیوی ضرورت پوری کریں۔ جیسے ڈاکٹر صحت کو اور وکیل اس کے حق سنبھالنے میں اور سب ان کو دیتے ہیں کوئی ان کو اپاہج نہیں کہتا حالانکہ وہ کوئی کاروبار نہیں کرتے تو کیا دین سنبھالنا صحت اور مالی حق سنبھالنے سے کم سمجھ رکھا ہے۔ [2] ہم اگر مفلس ہیں اور اگر ویرانے ہیں تو اس ساقی اور اس پیمانہ کے مست ہیں [3] اور اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو خدا کے خوف سے عاجز اور پھٹتا ہوا دیکھتے۔ [4] بیشک ہم نے امانت (اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کی ذمہ داری) کو سب آسمانوں۔ زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو اس کے اٹھانے سے انکاری ہو گئے اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

ای[1] ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیدا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

آپ کو کیا خبر ان پر کیا گزرتا ہے۔ صاحبو! وہ اس مشقت میں ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

فلعلک[2] باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین

غور کیجئے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی جو یہ لفظ فرمایا گیا۔

دین کی حفاظت علی[3] العموم سب کے ذمہ ہے

دیکھئے اگر جائیداد کئی آدمیوں میں مشترک ہو کہ ایک کے اس میں آٹھ آنہ ہوں دوسرے کے چار آنہ تیسرے کے دو آنہ چوتھے کا ایک آنہ اور کوئی ظالم اس جائیداد پر دست برد کرے تو کیا ایک آنہ کا شریک خاموش ہو کر بیٹھے گا۔ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ مشترک چیز کی حفاظت تمام شرکاء کو چاہیے اسی طرح قرآن شریف مسلمانوں کی مشترک جائیداد ہے۔ اس کی حفاظت بھی سب کو کرنی چاہیے اور اگر کہیے کہ مشترک نہیں تو مہربانی کر کے یہ لکھ کر کے دے دیجئے کہ ہم اس کو شائع کر دیں پھر تم لوگوں سے ہم ہرگز اس کی حفاظت کا خطاب نہ کریں گے۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی بھی نہ کرے گا اور جب یہ گوارا نہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ بھی ضروری ہے۔

ہر مقصود میں دو جزو ہونا ایک علمی اور ایک عملی اور سلوک میں شیخ کی ضرورت

ہر مقصود میں خواہ وہ ادنیٰ درجہ کا ہو یا اعلیٰ درجہ کا دو جزو ہوتے ہیں ایک جزو علمی اور ایک

---

[1] اے وہ شخص کہ تیرے پاؤں میں کوئی کانٹا بھی لگ کر نہیں ٹوٹا تو کیا جان سکتا ہے ان شیروں کا حال جو بلاؤں کی تلواریں سر پر کھا رہے ہیں۔ [2] تو شاید آپ اپنی جان نکال دیں گے۔ اس میں کہ لوگ کیوں ایمان نہیں لے آتے۔ [3] عام طور سے سب مسلمانوں کے ذمہ ہے اپنی اپنی طاقت اور قابلیت کے موافق سب کو حفاظت کی کوشش کرنا لازمی ہے۔ صرف علماء کے ہی ذمہ نہیں سب کے ذمہ ہے کوئی دن رات اس میں کھپانے سے کوئی پیسہ سے کوئی دوسری امدادوں سے کوئی صرف پڑھنے پڑھانے سے کوئی تبلیغ و اشاعت یا اس کے انتظامات سے جیسے بن پڑے حفاظت کرے۔ خصوصاً آج کل کو ہر طرف سے دین کو نیست و نابود کرنے کی کوشش ہے۔

جز وعملی مثلاً اگر ہم کوئی دنیاوی کام کرنا چاہیں تو اول ہمیں اس کا علم ہوگا پھر اس کے بعد ہم اس پر عمل کریں گے یا جیسے میں نے پہلے بیان میں عرض کیا تھا کہ طبیب اس کو کہیں گے جس کو علم ادویات بھی ہو اور ان کا استعمال بھی جانتا ہو اسی طرح ہر مقصود کے اندر یہی دو جزو ہیں تو دین بھی چونکہ مقاصد[1] علیہ سے ہے اس لئے اس میں بھی یہ دو جزو معتبر ہوں گے اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ علوم میں ایک مرتبہ[2] دال کا ہوتا ہے اور ایک مرتبہ[3] مدلول کا سو جس طرح تقسیم[4] الی الجزئین ہر مقصود میں ہوتی ہے کچھ دین کی تخصیص نہیں اسی طرح دال مدلول کا مرتبہ بھی ہر مقصود علمی میں ثابت ہوگا اس میں دین کی تخصیص نہ ہوگی مثلاً طب کے الفاظ کہ وہ دال ہیں یعنی مقصود پر ان کے بغیر ان معانی کا سمجھنا مشکل ہے۔ پس الفاظ دال ہوئے معانی مدلول ہوئے۔ یہاں سے الفاظ کے دال[5] علی المعانی اور کافی فی الدلالۃ ہونے کے متعلق ایک عجیب کام کی بات یاد آئی۔ وہ اہل باطن کے لئے بہت مناسب ہے بعض اہل باطن یہ سمجھتے ہیں کہ سلوک طے کرنے کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں اور اس خیال کی وجہ سے اگر کسی کو تجویز کرتے بھی ہیں تو پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں بالخصوص اگر قلب میں کچھ حرکت و حرارت یا عبادت میں کسی قسم کی لذت آنے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہم کامل ہو گئے حالانکہ تکمیل اس کو کہتے ہیں جسے اہل فن کہہ دیں۔ بچہ ایک دو کتاب پڑھ کر سمجھتا ہے کہ میں عالم ہو گیا حالانکہ ابھی علم سے اس کو مناسبت بھی نہیں ہوتی۔ ہاں جب اہل علم یہ تجویز کر دیں کہ اب یہ عالم ہو گیا ہے اس وقت کہا جائے گا کہ اس کو کمال[6] فی العلم ہو گیا۔ ان لوگوں کی بعینہ وہ حالت ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ ایک بندر کے ہاتھ ایک ہلدی کی گرہ آ گئی تھی کہنے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں تو جیسے وہ بندر ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بنا تھا۔ ایسے ہی یہ لوگ بھی اپنے خیال میں ذرا سی قلب حرارت وغیرہ کو دیکھ کر اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے۔ بہر حال تکمیل سے مراد وہ ہے کہ جس کو اہل فن تکمیل سمجھیں تو اگر قبل تکمیل شیخ کی وفات ہو جائے تو دوسرے سے

---

۱ بہت بلند ۲ دلالت یعنی ظاہر کرنے والے جیسے الفاظ ۳ ظاہر کئے ہوئے جیسے معانی
۴ اور جزوں کی طرف تقسیم ۵ الفاظ کے معانی و مضامین پر دلالت کرنے یعنی ان کو ظاہر کرنے اور ظاہر کرنے میں کافی ہونے کے متعلق ۶ علم میں پورا ہونا۔

رجوع نہیں کرتے بالخصوص اگر کشف قبور بھی ہونے لگے کہ اس صورت میں تو اپنے کمال میں شبہ بھی نہیں رہتا کیونکہ کشف قبور کے لئے نسبت فنا کا حاصل ہونا ضروری ہے تو جب صاحب نسبت بھی ہو گئے تو پھر کیا کسر رہی حالانکہ کشف قبور کوئی کمال نہیں ہے نہ مطلق نسبت کا حصول دلیل کمال ہے۔ کشف قبور کے نسبت فنا پر موقوف ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ۔

حکایت: ایک بزرگ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے اس شخص نے کہا مثلاً میں ہوں فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کتنا بڑا مسئلہ اور کس طرح دو جملوں میں حل کر دیا۔ یہ بات اہل علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ ان کو جواب میں سائل کے تابع ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ وہ جس طرز سے جواب چاہیں اس کو ضروری سمجھا جاوے۔ بلکہ ان کی مصلحت پر نظر کرنی چاہیے اور جو طرز جواب کا ان کے لئے مصلحت ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ گو وہ ان کی رائے کے خلاف ہو یہ ضروری نہیں کہ جس راہ سائل لے چلے اسی راہ چلیں جس طرح اس حکایت میں سائل نے تو چاہا کہ پوری تحقیق مسئلے کی بیان کی جائے اور محقق مجیب نے اس کو بیمار سمجھ کر اس کی حالت کے مناسب جواب دے دیا کہ تم پورے مسئلے کو کیا کرو گے اپنا تعلق مسئلے سے جس قدر ہے اس کو سمجھ لو کہ تم کو قبور سے نفع نہیں ہو سکتا۔ سائلین تو یہ چاہتے ہیں کہ جس راہ پر ہم چلیں اس راہ پر اگر چلیں تو ہم جانیں گے کہ ہمارے سوال کا جواب ہوا اور نہ سمجھیں گے کہ جواب نہیں ہوا۔ مجیبوں نے جب دیکھا کہ ان کی یہ حالت ہے جس چال انہوں نے چلایا اسی چال انہوں نے چلنا اختیار کیا۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہوئی کہ سائلین کے امراض میں ترقی ہوتی گئی اور شبہات ترقی پذیر ہوتے گئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے طبیب کے پاس کوئی مریض جائے کہ اس کو مرض دق بھی ہو اور زکام بھی ہو اور جا کر حکیم سے فرمائش کرے کہ اول زکام کا علاج کر دیجئے تو اگر طبیب زکام کے علاج میں ایک مدت مدید صرف کرے تو وہ خائن ہے اس کو چاہیے کہ مریض کو رائے دے کہ ہرگز ایسا نہ کرو۔ اول دق کی خبر لو۔ اگر مریض اس تجویز پر یہ کہے کہ حکیم صاحب کچھ نہیں جانتے تو طبیب اس وقت کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کے جہل پر رحم کرے گا اور پھر

بھی اپنی ہی تجویز اور اس کی مصلحت پر عمل کرے گا۔ اور اگر اس نے مریض کا اتباع نہ کیا تو وہ اس کی مصلحت پر عمل کرے گا اور اگر اس نے مریض کا اتباع کیا تو وہ خود غرض ہوا اسی طرح محقق پر واجب ہے کہ جواب مصلحت کے موافق دے نہ کہ سائل کی مرضی کے موافق سوال میں جتنا ناشائستہ جزو ہو اس کو نکال دے۔ اگر سارا ہی ناشائستہ ہو تو جواب ہی نہ دے اور اگر جواب دے تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا جواب دے بلکہ جتنا مناسب ہو اتنا جواب دے مجھے یاد آیا کہ۔

حکایت: مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سود لینا کیوں ناجائز ہے تو ان کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مدلل جواب دے دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا ان کی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں ناجائز ہے۔ یہ اس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں۔ یہ تھا جواب اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے وہ صحیح ہوتے اتفاق سے وہ شخص ایک مرتبہ مجھ سے ملے وہ تو مجھے پہچانتے تھے لیکن میں نہ پہچانتا تھا۔ کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھے نہ پہچانا ہوگا۔ میں نے کہا کہ بیشک میں نے نہیں پہچانا تھا۔ کہنے لگے میں وہی شخص ہوں جس کے پاس سے اس قسم کا سوال جناب کے پاس آیا تھا۔ اور اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس قسم کا جواب کیوں دیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جواب کو ابھی تک نہیں سمجھتے تو میں نے ان کی سمجھ کے موافق اس استفسار کا دوسرا جواب دیا میں نے کہا کہ آپ ایک عہدہ دار ہیں۔ آپ کو ہر قسم کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے کیا آپ سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں یا احباب کے ساتھ دوسری قسم کا برتاؤ ہے اور اجانب کے ساتھ دوسری قسم کا کہنے لگے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے علیحدہ برتاؤ ہوتا ہے میں نے کہا کہ جب یہ ہے تو افتاء کا بھی ایک محکمہ ہے اس میں بھی اسی طرح کسی کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کسی کو دوسری قسم کا چونکہ آپ کی حالت سے واقف نہ تھا اس لئے میں نے آپ کو ضابطہ کا جواب دیا اور اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی اب ان شاء اللہ اس قسم کا جواب نہ آئے گا۔ لیکن ملاقات کا اثر جیسا مجھ پر ہوگا۔ آپ پر بھی ہوگا۔ آپ کے

لہ اور ان کا جواب دینا مناسب ہوتا۔

پاس سے اس قسم کا لغو سوال کبھی نہ آئے گا۔ غرض اس وقت یہ ایسی آفت ہے کہ مجیب سائل کے تابع ہو جاتے ہیں مگر ان محقق کا جواب نہایت ہی نفیس تھا کہ اگر فیض لینے والا تو ہے تو نہیں ہوتا مقصود یہ ہے کہ قبور سے جو فیض ہوتا ہے تو صاحب نسبت[1] فناء کو ہوتا ہے۔

قبور سے فیض حاصل کر سکنے پر بھی شیخ سے استغناء[2] نہیں ہوتا

طالب اگر صاحب کشف بھی ہو جائے تب بھی اس کو شیخ سے استغنا جائز نہیں کیونکہ اس میں کفایت نہیں ہوتی وجہ یہ ہے کہ فیض کی دو قسمیں ہیں ایک یہ دلالت لفظیہ[3] یعنی تعلیم و تلقین ایک غیر لفظیہ یعنی تقویت نسبت افادہ اور استفادہ میں لفظیہ بہت مفید اور ممد ہے۔ پس صرف قبور سے استفادہ پر بس کرنا غلطی ہے کیونکہ قبور سے اتنا فیض ہوتا ہے کہ حالت موجودہ میں ترقی ہوتی ہے اور بس بخلاف زندہ کے کہ اگر کوئی شبہ ہو تو پیش کر کے حل کر سکتا ہے۔ خوب مشبع[4] طور سے تو اس کی برابر ہرگز فیض قبور نہیں ہو سکتا۔

علوم دینیہ سے بے التفاتی اور عمل میں کوتاہی کی شکایت اور مضرت

یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت کتنی بے التفاتی دین سے ہو رہی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ مضر ہے یا نہیں تو یوں سمجھئے کہ جس حکومت کے ماتحت کوئی شخص رہتا ہے اس کو اس حکومت کے قوانین جاننے کی ضرورت ہے اور قوانین ہوتے ہیں دو قسم کے ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے لیکن اگر ان کو نہ بھی سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں[1] اس لئے کہ ہار جانا خسارہ ہے جرم نہیں ہے دوسرے وہ قوانین ہیں کہ ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے ان کا سیکھنا واجب ہوتا ہے۔ خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر تو اب میں یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں۔ اور

---

[1] سب کو نہیں ہوتا اب لوگوں نے نقالی کر رکھی ہے جو عام طور سے دیکھی جاتی ہے۔

[2] بے پروائی اور ضرورت نہ رہنا۔ [3] الفاظ کے ذریعہ دوسرے تک معانی کو پہنچانا

[4] پیٹ بھر کے یعنی پوری تسلی سے

دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خداتعالیٰ کے کچھ قوانین ہیں یا نہیں۔ اگر ہم اس کی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحب قوانین نہ ہوتا تو چنداں فکر نہ تھی اور جبکہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدون قوانین سیکھے چارہ نہیں۔ اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا ان کی مخالفت جرم اور بغاوت[۱] بھی ہے۔ سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن اس سے بھرا پڑا ہے کہیں احل اللہ البیع و حرم الربوا[۲] ہے کہیں لا تقربوا الزنا[۳] ہے غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ نے ہماری معاشرت اور معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدم اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے۔ پھر کیا شبہ رہ گیا اب تو صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ قوانین[۴] شریعت کا سیکھنا اشد ضروری ہے۔

قوانین خداوندی کو لوگ صرف نماز روزہ میں منحصر سمجھتے ہیں بلکہ بعضے تو نماز روزے کی بھی حاجت نہیں سمجھتے

آج کل لوگ قوانین خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے نماز روزہ ہی میں کون سا اہتمام کیا ہے۔ افسوس کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوئی تھی۔ مگر چونکہ زمانہ ترقی کا ہے ہر چیز کو ترقی ہونی چاہیے اس کو بھی یہاں تک ترقی ہوئی کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اب نماز ہی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ تہذیب اخلاق کے لئے مقرر ہوئی تھی اور تہذیب اخلاق دوسرے طرق سے ہو جاتی ہے لہٰذا نماز کی ضرورت نہ رہی تو اس زمانہ کی تہذیب کے تہذیب ہونے ہی میں کلام ہے اور اگر مان بھی لیا جاوے تو اس کی پائیداری میں کلام ہو گا اور یقیناً وہ بالکل ناکافی ہے تو اگر تہذیب نفس ہی نماز روزہ کی علت ہوتی تب بھی ہم کو نہ چھوڑنا چاہیے تھا کیونکہ ہم کو تو تہذیب بھی حاصل نہیں۔ بالخصوص جبکہ نماز روزہ سے غرض بھی دوسری ہو کہ یہ ثابت ہو کہ یہ کسی کا غلام ہو کہ اس کے حکم پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اگر کہو کہ بعض

۱؎ اوران کا کوئی نہ کوئی جاننے والا ہونا یقیناً ضروری ہے۔ وکیل ہو یا مختار ہاں سب کا جاننا ضروری نہیں ہوتا۔
۲؎ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ۳؎ زنا کے قریب مت جاؤ۔ ۴؎ جن کے خلاف کرنے سے عذاب ہو گا اس لئے ہر شخص کو سیکھنا ضروری ہے باقی اور علم ایسا ہے کہ صرف کوئی نہ کوئی جاننے والا ہونا ضروری ہے۔

نصوص کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے میں شہوت کا انکسار ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حکمت[1] ہے۔ علت نہیں ہے۔ وجوب تو محض خدا کے حکم سے ہوا اب اس پر یہ حکمتیں مرتب ہو گئیں۔

ہمارا منصب احکام کی علت سے سوال کرنے کا نہیں ہے

اور اگر کوئی علت ہو بھی تو جب موجب[2] نے خود اس کو متعین نہیں فرمایا تو ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اسے متعین کرنے لگیں۔

حکایت: کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ معراج میں خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ

اکنوں[3] کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

حقیقت میں ہمارا کیا منصب ہے کہ ہم احکام کی علل دریافت کریں ہمارا تو یہ مذہب ہونا چاہیے کہ

؎ زبان[4] تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

حق تعالیٰ سے علاوہ ان کے حاکم ہونے کے ہم کو ان سے محبت کا بھی علاقہ ہے

دیکھئے خدا تعالیٰ کے تو بہت سے حقوق ہیں حاکم ہونے کا بھی محبوب ہونے کا بھی تو فرض کیجئے اگر کسی بازاری عورت سے پوری محبت ہو جائے اور وہ بے ڈھنگے ہی حکم کرے تو ان کو نہایت خوشی سے پورا کرو گے یا نہیں تو اگر خدا تعالیٰ کی طلب ہی نہیں تب تو ایسے لوگوں سے گفتگو ہی نہیں اور اگر طلب ہے تو یہ حالت ہونی چاہیے کہ

زندہ[5] کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

---

[1] جو فائدہ کسی کام کے ہو جانے سے حاصل ہوتا ہے وہ حکمت ہے اور جس کی وجہ سے حکم کا وجود ہے اس کے نہ ہونے سے حکم ہی نہ رہے وہ علت ہے اس لئے یہ علت نہیں۔ [2] واجب کرنے والے نے [3] اب کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے یہ پوچھ لے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا۔ [4] ہمارا کام تو آپ کے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ رکھنا ہے آپ کے کام میں علتیں گھڑنا نہیں۔ [5] زندہ کریں تو آپ کا انعام ہے اور اگر مار ڈالیں تو آپ پر فدا ہو جاؤں گا۔ بس جان آپ پر فریفتہ ہے۔ جو کچھ کریں آپ کی خوشی۔

آج کل لوگوں کی ظاہری حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے کچھ بھی علاقہ نہیں اگر محبت ہوتی تو کیا اتنا بھی نہ کیا جاتا ایک بازاری عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں کہ۔

عشق[1] مولائے کے کم از لیلے بود گوئے گشتن بہراو اولے بود

بہرحال محبت کی رو سے دیکھیئے یا حکومت کی رو سے ہر طرح سر تسلیم خم کر دینا چاہیے اور محبت تو ایسی چیز ہے کہ اس میں لوگوں نے اپنی جانیں دے دی ہیں۔

حکایت: ایک وکیل صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بزرگ صاحب حال جن کو لوگ مسخرا سمجھا کرتے تھے حج کے لئے گئے جب خانہ کعبہ کے سامنے پہنچے تو مطوف کی زبان سے نکلا کہ یہ کعبہ ہے اس وقت ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا۔

چو[2] رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر کہ مباد بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

یہ کہتے ہی ایک چیخ ماری اور جان بحق ہو گئے۔

حکایت: حضرت نجم الدین کبریٰؒ کے سامنے کسی نے یہ پڑھ دیا کہ جاں[3] بدہ و جاں بدہ و جاں بدہ۔ آپ نے فرمایا کہ محبوب جاں طلب کر رہا ہے مگر افسوس کوئی جان دینے والا نہیں اور پھر فرمایا کہ جاں[4] دادم و جاں دادم و جاں دادم اور یہ کہتے ہی جان نکل گئی۔

دین کے تیسرے جزو یعنی عمل کا بیان

بس اب تیسری چیز جز کسی[5] میں عمل ہے اور اگر وہ نہ ہو تو علم کچھ بھی نہیں تو عمل کی تقسیم یہ ہے کہ ایک تو اعمال ظاہری ہیں اور ایک اعمال باطنی[6] اس وقت جو لوگ عمل کرتے بھی ہیں وہ صرف اعمال ظاہری پر متوجہ ہیں ورنہ باطن کی یہ حالت ہے کہ

---

[1] اللہ تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہوسکتا ہے۔ ان کے واسطے ہی گیند کی طرح لڑھکتے رہنا بہتر ہوگا۔
[2] جب تم محبوب کے کوچہ میں پہنچ جاؤ تو یہ بیقرار جان اس کے سپرد کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسری بار تم اس آرزو کے ساتھ نہ پہنچ سکو۔ [3] جان دیدو، جان دیدو، جان دیدو۔ [4] میں نے جان دے دی، جان دے دی، جان دے دی۔ [5] بری عادتوں سے پاک کرتے ہیں۔ [6] دل کے عمل باقی ظاہر کے ہیں۔

از[1] بروں چوں گور کافر پر حلل   وندروں قہر خدائے عز و جل

از[2] بروں طعنہ زنی بر با یزید   وز درونت ننگ می دارد یزید

کیا معنی کہ باطن اکثر لوگوں کا درست نہیں۔ باطن کی درستی ایک تصحیح عقائد ہے جس کو کم وبیش حاصل بھی کیا جاتا ہے دوسرے تہذیب اخلاق جس کو تصوف کہتے ہیں اور وہ بالکل متروک ہے جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو بے التفاتی اہل دنیا کی۔ دوسرے بے عنوانی منتسبین الی التصوف[3] کی یعنی آج کل رسوم کا نام تصوف رکھ چھوڑا ہے حقیقت تصوف کی ہے تعمیر الظاہر والباطن[4] ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال وافعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ ہے کہ قلب کی حالت درست ہو یعنی ایک تو اخلاق باطنی درست ہوں توکل ہو شکر ہو۔ رزائل[5] کو دور کیا ہو جیسے حب دنیا وغیرہ یہ ہے تصوف تو اس وقت لکھے پڑھے بھی صرف ظاہر کو لئے ہوئے ہیں اور جنہوں نے باطن کو لیا انہوں نے ظاہر کو چھوڑ دیا تو گویا تقسیم کرلیا ہے کہ جو ظاہر کو لیں وہ باطن کو چھوڑ دیں اور جو باطن کو لیں وہ ظاہر کو چھوڑ دیں اور بعض نے دونوں کو چھوڑ دیا وہ نہ نماز روزہ کریں نہ تصفیہ باطن بلکہ حب دنیا وحب جاہ میں غرق ہیں۔ اور یہ تینوں قسم کے لوگ تصوف سے[6] بمراحل دور ہیں۔ غرض تصوف اصلاح ظاہر و باطن کا نام ہے نہ کہ رسوم کا بلکہ احوال[7] متعارفہ کا نام بھی نہیں، یہ احوال اگر نہ بھی ہوں تو نسبت مع اللہ پیدا ہو سکتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں سہولت ہو اور دوام ذکر پر توفیق ہو۔

رہے رسوم کہ قبر پر کپڑے چڑھانا۔ عرس کرنا۔ کپڑے رنگین پہننا سماع سننا سو اس کو کوئی تعلق تصوف سے نہیں ہے احوال اگرچہ کبھی مقامات پر مترتب ہو جاتے ہیں لیکن وہ تصوف کے اجزاء یا اس کے لوازم سے نہیں اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر میں کبھی ان کو وجد وغیرہ ہونے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود حاصل ہو گیا اور اگر نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ

---

[1] باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح ہیں کہ حلون والی ہے اور اندر خدا کا قہر وغضب ہے۔ [2] باہر سے تو تم حضرت بایزید بسطامی پر طعن کرتے اور پاکباز بنتے ہو اور اندر میں تم سے یزید بھی عار محسوس کرتا ہے۔
[3] تصوف کی طرف منسوب ہونے والوں یعنی ناقص پیروں کی [4] ظاہر و باطن کو شرع کے موافق بنانا۔
[5] بری عادتیں جیسے اسباب پر نظر غرور ناشکری بخل وغیرہ [6] منزلوں [7] دلوں پر عام طور سے جو حالات طاری ہوتے ہیں۔

کچھ فائدہ ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر سے مقصود یہ نہیں ہے بلکہ مقصود حقیقی یہ ہے کہ حکم ہے کہ فاذکرونی اذکرکم[1] جس کا ظہور آخرت میں ہوگا اور عاجل[2] مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر سے نسبت مع اللہ ہو جائے اور اس سے سہولت فی الطاعۃ ہو تو یہ ایک غلطی تو متصوفین[3] کو ہوئی۔ دوسری غلطی منکرین کو ہوئی کہ انہوں نے صوفیہ کو خشک دماغ بتایا حالانکہ وجد وغیرہ کا سبب یہ نہیں ہے اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی اس میں تھوڑا دخل احوال طبعیہ کو بھی ہوتا ہے لیکن ہمیشہ اور ہر حالت کو ایسا سمجھنا سخت غلطی ہے۔ غرض ان کو عین تصوف سمجھنا بھی غلطی ہے اور بالکل مباین[4] خارج سمجھنا بھی غلطی ہے۔ فیصلہ یہ ہے کہ داخل تو نہیں مگر متعلق ہے اور ایک درستی قلب کی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں جس کا ضروری ہونا ظاہر ہے اور عمل ظاہری کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہے۔

قرب الٰہی سے مراد

قال اللہ تعالٰی[5] و ما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفٰی الا من اٰمن و عمل صالحاً فاولٰئک لھم جزاء الضعف بما عملوا وھم فی الغرفات اٰمنون (القرآن) یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے اس میں خدا تعالٰی نے اپنے بندوں کو ایک بڑی دولت کا پتہ اور اس کے حصول کا طریقہ بتایا ہے اور جو غلطیاں ان سے واقع ہوگئی ہیں ان پر تنبیہ فرمائی ہے اس آیت کے ترجمہ سے اس دولت کا پتہ چل جائے گا مگر اول مجملاً اس کا پتہ بتلاتا ہوں کیونکہ بہت کم لوگ اس کو دولت سمجھتے ہیں اور اہل دنیا تو کیا سمجھتے اکثر اہل دین بھی اس پر نظر بہت کم کرتے ہیں اور وہ دولت قرب خداوندی ہے اور وہی اس آیت میں مذکور ہے اور اس قرب کی حقیقت عنقریب معلوم ہوگی اس لئے کہ وہاں قرب جسمانی تو ہے نہیں کہ فاصلہ کم ہو جائے کیونکہ یہ خواص جسم سے ہے۔ باقی جو چیزیں

---

[1] تو تم میرا ذکر کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ [2] جلدی کا یعنی دنیا میں کا۔ [3] تصوف کا دعویٰ کرنے والوں کو [4] سخت مخالفت [5] اور نہیں ہیں تمہارے مال اور نہ اولادیں کہ جو تم کو ہم سے خوب قریب کردیں۔ سوائے اس کے جو ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کئے تو یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے واسطے دوگنا ثواب ہے ان عملوں کے سبب جو انہوں نے کئے ہیں اور یہ جنت کے بالا خانوں میں امن والے ہوں گے۔

مادی نہیں ہیں اگر چہ حادث اور ممکن ہوں ان میں قرب متصور نہیں ہے تو جو ذات پاک امکان اور حدوث سے بھی منزہ[1] ہے۔ اس میں[2] یہ قرب کیونکر متصور ہو سکتا ہے۔

جہلا صوفیہ کی قرب کے معنی سمجھنے میں غلطی

اور یہاں سے ان عوام الناس کی غلطی معلوم ہوگی جو خواص کی صورت میں ہیں۔ اور خواص سے علماء و امراء مراد نہیں کیونکہ یہ لوگ تو ایسی غلطیوں سے محفوظ ہیں۔ بلکہ مشائخ اور صوفیہ مراد ہیں تو جو لوگ ان حضرات کی صورت بنائے ہوئے ہیں اور حقیقت میں وہ عامی ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ قرب خداوندی قرب جسمانی ہے اور اس کا پتہ ان کی مثالوں سے چلتا ہے۔ اگر محققین سے اس قسم کی کوئی مثال منقول بھی ہو تو ہم اس میں تاویل کریں گے۔ لیکن یہ عوام اس قسم کے اقوال میں تاویل بھی نہیں کرتے بلکہ ان کے ظاہری متبادر[3] معنی مراد لیتے ہیں اور اس قسم کے اقوال بولنے والے بعض تو وہ ہیں کہ خدا کو دریا اور اپنے کو موج کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور بعض لوگ قطرہ اور دریا کی تشبیہ دیتے ہیں۔ تو اگر تشبیہات کسی معتبر[4] کلام میں پائی جائیں گی تو ہم اس کی تاویل کریں گے۔

علی الاطلاق[5] تشبیہ کا انکار کرنا غلو مذموم ہے

کیونکہ محض تشبیہ پر انکار کرنا تو غلو ہے قرآن شریف میں خود تشبیہ موجود ہے[6]

اللہ نور السموٰت و الارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانھا کوکب. الایۃ

اس میں تصریح ہے کہ نور خداوندی کی صفت ایسی ہے جیسے کہ ایک طاقچہ ہو کہ اس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک شیشہ میں اور اس چراغ کی یہ حالت ہو جیسے کہ ایک درخشاں

---

[1] بری و پاک اس سے پہلے معدوم ہو پھر موجود ہو جائے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ ہے۔ [2] جسمانی قرب جو دو جسموں میں ہی ہو سکتا تھا۔ [3] عام ذہنوں میں آنے والے [4] یعنی ایسے بزرگ کے کلام میں جن کی بزرگی احتیاط اور علم مانی ہوئی چیزیں ہوں۔ [5] ہر قسم کی [6] اللہ تعالیٰ ہی تمام آسمانوں اور زمین کو روشن کرنے والے ہیں ان کے روشن کرنے کی مثال یہ ہے جیسے ایک طاقچہ ہو اس میں ایک چراغ ہو اور چراغ ایک شیشہ میں ہو گویا وہ چراغ ایک چمکتا ستارہ ہے۔ آخر آیت تک۔

ستارہ الیٰ[1] آخر الآیۃ پس جب قرآن میں خود تصریح تشبیہ کی ہے تو اگر مطلق تشبیہ مذموم ہوتی تو قرآن میں یہ تشبیہ کیوں مذکور ہوتی اور یہ اس واسطے میں نے ذکر کیا کہ آج کل بعض متشدد[2] دین بہت غلو کرنے لگے ہیں کہ محض ظاہری الفاظ دیکھ کر معنی میں غور نہ کر کے کفر و بدعت کا فتویٰ لگا دیتے ہیں حالانکہ ارشاد خداوندی ہے۔ لا تغلوا[3] فی دینکم غیر الحق کہ حق سے آگے نہ بڑھو۔ کہ یہ غلو[4] فی الدین ہے۔ مثلاً جس چیز کی نظیر قرآن میں موجود ہو اس کو علی الاطلاق حرام کہہ دیا جائے۔

تشبیہ کی حقیقت

ہاں وجہ شبہ متعین کرنی چاہیے تو سمجھ لو کہ تشبیہ میں مشارکت ہوتی ہے دو چیزوں کی کسی خاص امر میں مثلاً کسی کے چہرہ کو چاند سا کہیں تو مطلب[5] یہ ہوتا ہے کہ جس میں یہ اور چاند شریک ہیں یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چہرہ بھی اسی قدر بڑا جسم ہے جس قدر چاند یا چاند میں بھی آنکھ ناک، کان خدوخال موجود ہیں یا جیسے چاند کے ہاتھ پیر نہیں اس شخص کی بھی نہیں علیٰ[6] ہذا خدا تعالیٰ نے جو تشبیہ دی ہے کہ کمال نورانیت میں اس کے مشابہ ہے اگر چہ یہ بھی ظاہر ہے کہ دونوں کمال ایک درجہ کے نہیں جس طرح کلی[7] مشکک کے افراد مختلف ہوتے ہیں برابر نہیں مگر کوئی امر مشترک اس میں ضرور ہوتا ہے مثلاً شدت[8] ضیاء اور مشبہ[9] بہ کا اکمل ہونا بھی ضروری نہیں البتہ اوضح[10] یا اشہر ہونا ضروری ہے تو اسی طرح سے اگر کسی محقق کے کلام میں خدا کو دریا

---

[1] آیت کے ختم تک [2] سختی کرنے والے [3] اپنے دین کے بارہ میں غلو نہ کرو (حد سے نہ بڑھو) سوائے حق بات کے [4] دین میں غلو کرنا اور حق سے بڑھنا ہے۔ [5] چمک دمک [6] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پوری طرح روشن کرنے میں تشبیہ دی۔ [7] وہ عالم مفہوم جو بہت چیزوں پر مگر کم زیادہ اور زیادہ سے زیادہ ہو کر صادق ہو اور جن پر وہ صادق ہے یعنی افراد مختلف ہوں گے جسے سیاہ کا مفہوم ہلکی اور سخت سب پر ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا پوری طرح روشن کرنا بے انتہا اعلیٰ اور چراغ کا بہت کم ہے۔ [8] خوب روشنی [9] جس سے تشبیہ دی جائے یہ ایک شبہ کا جواب ہے شبہ یہ تھا کہ جس سے تشبیہ دی جاتی ہے وہ وجہ شبہ یعنی صفت مشترکہ میں زیادہ کامل ہوتا ہے چہرہ کو چاند سے تشبیہ دیتے ہیں چاند چمک میں زیادہ کامل ہے تو کیا یہ چراغ روشن کرنے میں نعوذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کامل تھا جو اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ [10] زیادہ واضح یا زیادہ مشہور تو جواب یہ ہوا کہ جس سے تشبیہ دی جاتی ہے اس کا کامل ہونا ضروری نہیں بلکہ زیادہ واضح یا زیادہ مشہور ہونا ضروری ہے تو لوگوں کی نظر میں چراغ واضح تھا۔

اور اپنے کو قطرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہو تو وہ کسی خاص امر میں ہو گی جیسا کہ مغربیؒ نے کہا ہے۔

زدریا[1] موج گونا گوں برآمد ز بے رنگی بہ رنگ چوں برآمد

افسوس ہے کہ یہ حالت ہے کہ جنہوں نے ایک پارہ قرآن کا بھی نہیں پڑھا وہ ان اشعار کو پڑھتے اور سنتے ہیں اور ان پر وجد کرتے ہیں حالانکہ خاک بھی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ سمجھتے ہیں تو یہی کہ خدا پھیلا ہوا ہے۔ اور[2] ہم اس سے نکلے ہیں اور یہ سمجھ کر اپنا دین برباد کرتے ہیں۔ ایسے اشعار کا ان کے سامنے پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔

خلاف قاعدہ شریعت کے عبادت بھی گناہ ہے

اور اس عدم جواز کے حکم سے کوئی تعجب نہ کرے دیکھئے حکماء امت نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے حج کو ناجائز کہہ دیا ہے مثلاً ایک ایسا شخص کہ جس کے پاس زادراہ بھی نہ ہو بیوی بچوں کے دینے کو بھی کچھ نہ ہو اس کے لئے سفر حج کو بالکل ناجائز کہا جاوے گا اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دیکھو عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا نصاً[3] ناجائز ہے۔ حالانکہ نماز کتنی بڑی عبادت ہے۔ علی ھذا[4] عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہے بات یہ ہے کہ ہر عبادت میں کچھ قیود وجوب[5] کے ہوتے ہیں اور کچھ شرائط[6] جواز کے ہوتے ہیں تو حج میں استطاعت[7] وجوب حج کی شرط ہے اور اہل وعیال کا حق ضائع نہ ہونا جواز حج کی شرط ہے۔ اس کو حضرت مسعود بکؒ خوب فرماتے ہیں اور واقعی حضرت کا کلام بدون علم ظاہری کے سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمانے کا ہر شخص مخاطب ہے مگر واقع میں مخاطب ایسے ہی لوگ ہیں سو فرماتے ہیں۔

---

[1] دریا میں سے رنگا رنگ موجیں نکلی ہیں تو دریا بے رنگ ہونے کے بعد کیسے کیسے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے یعنی حق تعالیٰ کی قدرت نے جو ہر محتاجی سے پاک ہے کیسی کیسی وجوہات پابند جسامت وصورت وقول وعرض ورنگارنگ بنائی ہے۔ [2] اور یہ دونوں باتیں کفر کی ہیں پھیلنے والا جسم کہنا اور اس سے نکلنا کہنا لم یلد اور ولم یکن له کفوا احد اور لیس کمثله شيء کے خلاف اور کفر ہے۔ [3] حدیث سے [4] ایسے ہی حدیث شریف ہے۔ [5] واجب ہونے کی قید میں اور شرطیں کہ وہ نہ ہوں تو وہ عبادت فرض وواجب ہی نہیں۔ [6] جائز ہونے کی کہ ان کے نہ ہونے میں ادا کرنا جائز نہیں گو وہ فرض یا واجب ہو چکی ہے۔ [7] وہاں پہنچنے کی طاقت مالی وجانی وغیرہ۔

آ[1] ے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جاست بیائید بیائید

یعنی تمہارے لئے محبوب اسی جگہ ہے کیونکہ مقصود رضائے حق ہے تو اگر بحالت مذکورہ بالا مکہ جاوے گا تو خلاف رضائے حق ہوگا۔اس لئے خدا نہ ملے گا اس لئے کہ محض سفر مکہ سے خدا تعالیٰ نہیں[2] ملتا مثلاً اگر کوئی نفل حج کر کے بیوی کا حق ضائع کر دے تو خدا تعالیٰ کب راضی ہو سکتے ہیں۔تو معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں حج کرنا بھی ناجائز ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے سامنے کعبہ کی حالت بیان کرنا جس سے وہ مغلوب[3] الشوق ہو کر سفر میں چلا جاوے جائز نہیں۔دیکھو ظاہر نظر میں یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آتی لیکن واقع میں بہت صحیح فرمایا اس واسطے کہ حالات سن کر سفر کا شوق پیدا ہوگا اور بوجہ عدم استطاعت کے یہ سفر معصیت ہوگا تو اس کا جو سبب ہے وہ بھی معصیت ہوگا واقعی اول اول جس نے امام غزالیؒ کا یہ قول سنا ہوگا اس نے امام کو کافر[4] کہا ہوگا حالانکہ امام بالکل ٹھیک لکھ رہے ہیں کہ جب سفر معصیت ہے اور تذکرہ اس کا سبب ہے تو تذکرہ بھی معصیت ہوگا۔غرض کیسی ہی عبادت ہو وہ کسی نہ کسی وقت ناجائز ہو جاتی ہے ایک اور مثال یاد آئی نیک کام میں چندہ دینا عبادت ہے لیکن بعض اوقات یہ بھی جائز نہیں چنانچہ[5] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کا چندہ لینے سے اس لئے انکار فرمایا کہ وہ اس واقعہ سے پہلے خود سوال کر چکا تھا تو اس چندہ دینے کا مال یہ ہوتا کہ جب اپنے پاس کچھ نہ رہتا تو پھر سوال کرتا۔خوب سمجھ لو بس شریعت جو کچھ حکم کرے وہ کرو جہاں شریعت پڑھنے کی اجازت دے پڑھو اور جہاں روکے رک جاؤ۔

مسلمانوں کی اصلی شان عبدیت ہے

بالکل مسلمان کی وہ حالت ہونی چاہیے جیسے ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کھایا کرتے ہو کہنے لگا جو کچھ آپ کھلا دیں گے وہی میری غذا ہے اور بزبان حال یہ کہا

---

[1] اے حج کو گئی ہوئی جماعت (جو حقوق ضائع کر کے گئی ہے) تم لوگ کہاں ہو کہاں ہو۔محبوب تو اسی جگہ ہے آؤ۔آؤ یعنی اس کی رضا تمہارے لئے اس وقت یہاں ہے وہاں نہیں۔ [2] گو فرض ادا ہو جائے گا مگر ترک حقوق کا گناہ ہوگا۔ [3] جس پر شوق غالب ہو جائے۔ [4] کہ کعبہ شریف کی عظمت کے بیان سے روکتے ہیں اور عظمت کی مخالفت کرتے ہیں۔ [5] ابوداؤد

زندہ[1] کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو ۔۔۔ جان شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

جب غلام کی شان آقا کے سامنے یہ ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے سامنے بندہ کی یہ شان بھی نہ ہو۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے سامنے ایسا ہو جائے جیسے مردہ بدست زندہ اور آپ کے احکام جیسے کبھی منصوص ہوتے ہیں۔ اسی طرح غیر[2] منصوص اور مستنبط بھی ہوتے ہیں اور یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے احکام ہیں۔ اور فقہ اور حدیث میں یہی فرق ہے کہ حقیقت ایک ہے اور[3] لباس جدا جدا ہے جیسے کسی نے کہا ہے۔

بہر[4] رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ۔۔۔ من انداز قدت رامی شناسم

عاشق کی یہ شان ہوتی ہے کہ محبوب جس جوڑہ میں بھی آوے وہ پہچان لیتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ عاشق نہیں۔ تو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ہیں ان کو حدیث وفقہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشادات نظر آتے ہیں بہر حال شریعت کے احکام یہ ہیں اور یہ واجب العمل اور متبوع ہیں تو جب حج کو جانا بعض کو ناجائز ہے تو یہاں سے قیاس کر کے دیکھ لو کہ جب بعض اوقات عبادت ناجائز ہو جاتی ہے تو ایسے اشعار[5] کا گو وہ صحیح ہوں ذکر کرنا ان لوگوں کے سامنے جب کہ ان میں کوئی مفسدہ ہو اگر ناجائز ہو جائے تو کیا عجب ہے اسی لئے حدیث میں ہے کلموا[6] الناس علی قدر عقولھم ایک اور حدیث میں ہے کہ جب کسی کے سامنے اس کی عقل سے بڑھ کر کلام کیا گیا وہ اس کے لئے فتنہ ہو گیا۔

مضامین[7] غامضہ کو دیکھنا اور سننا عوام کو ممنوع[8] ہے

تو اب جو ایسے اشعار عوام کے سامنے پڑھے جاتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے

---

[1] اگر زندہ کریں آپ کا انعام ہے۔ مار ڈالیں تو آپ پر فدا ہو جاؤں غرض جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ کی مرضی ہے۔ [2] جو صاف نہ ہو اور قرآن وحدیث کے حکم کی کوئی علت ہو جو اس میں پائی جاتی ہو اس لئے اس کو قرآن وحدیث کے حکم میں اس علت کے پائے جانے سے داخل کریں یہ استنباط ہے اس طرح جو حکم لیا جائیگا وہ بھی حضورؐ ہی کا حکم ہوگا [3] اصل حکم اللہ رسول کا ہے مگر ایک جگہ صاف ہے اور ایک جگہ علت کی شرکت سے [4] تم جس رنگ کا لباس چاہے پہن لو میں تو تمہارے قد کا انداز ہی پہچان لیتا ہوں۔ [5] جن میں اللہ تعالیٰ کو مخلوق جیسا بیان کر رکھا ہو اور تاویل سے یا باریک معنی سے وہ صحیح بھی ہوں ان کو کم سمجھ کے سامنے پڑھنا۔ [6] لوگوں سے ان کی عقل کے موافق بات کیا کرو۔ [7] باریک اور گہرے [8] وہ صحیح مفہوم تک نہیں پہنچتے تو گمراہ ہو جاتے ہیں۔

اگر چہ وہ حافظ اور مغربی ہی کے ہوں تو یہ عوام کے لئے فتنہ ہوں گے یا نہیں ان حضرات کے کلام کے صحیح ہونے میں کلام نہیں جو کچھ انہوں نے کہا صحیح ہے لیکن ان کے سمجھنے کے لئے فہم صحیح اور طبیعت سلیم درکار ہے مولانا ایسے ہی نازک مضامین کی نسبت فرماتے ہیں۔

نکتہا[1] چوں تیغ پولا دست تیز   گر نداری تو سپر واپس گریز

کہ بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سپر سے مراد فہم ہے۔ یعنی اگر فہم نہ ہو تو دور رہو آگے فرماتے ہیں۔

پیش[2] ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ رانبود حیا

کہ اس کے سامنے بدون سپر مت آ کیونکہ ایمان اگر اس کے سامنے پڑے گا یہ اس کو قطع کر دے گا اور اسی واسطے ابن العربی نے کہا ہے

یحرم[3] النظر فی کتبنا رہا یہ شبہ کہ جب کتاب کے دیکھنے کی اجازت نہیں تو پھر لکھا تھا کیوں یہ شبہ اکثر بڑے لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے۔ تو وجہ یہ ہے کہ وہ حالات جو ان پر طاری ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی طاری ہو سکتے ہیں تو انہوں نے اپنے سے پچھلے لوگوں کے لئے جن پر وہ حالات طاری ہوں اپنے اقوال و احوال کو مدون کیا ہے تا کہ پچھلوں کے پاس معیار رہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ہماری طاعت قبول ہے یا مردود۔ اور جب پہلوں کے حالات مدون ہیں تو نہایت آسان ہے کہ اس پر منطبق کر کے دیکھ لو اگر مطابق ہو تو صحیح ورنہ باطل تو خلاصہ یہ ہوا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے جیسوں کے لئے لکھا ہے۔ عوام الناس کے لئے اس کو دیکھنے سے منع کر دیا بلکہ وہ اخفاء کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ ان کے سامنے ان مضامین کا اگر کوئی انکار بھی کرتا ہے تب بھی ان کو جوش نہیں آتا اور وہ بیان نہیں کرتے بلکہ یوں کہتے ہیں ۔

بامدعی[4] مگوئید اسرا عشق و مستی   بگزارتا بمیرد دررنج خود پرستی

---

[1] بہت سے نکتے فولادی تلوار کی طرح تیز ہیں اگر تم ڈھال نہیں رکھتے تو ان سے دور بھاگ جاؤ۔
[2] اس کاٹ دینے والے ہیرے کے سامنے بغیر ڈھال اور بچاؤ کے مت آؤ کیونکہ تلوار کو کاٹ ڈالنے میں شرم نہیں ہوا کرتی۔ [3] (کم سمجھ لوگوں کو) ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہے۔ [4] دعویدار کے سامنے عشق و مستی کے راز مت کہو اس کو چھوڑ دو کہ وہ خود کو کچھ سمجھنے کی فکر ہی میں مر جائے۔

رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اعلان کرے اور ولی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اخفا کرے اس لئے ان کو کبھی ہیجان بھی نہیں ہوتا البتہ اپنے خواص سے بیان کرتے ہیں تو کوئی کلام غیر اہل کے سامنے بیان مت کرو۔

احوال[1] و اسرار[2] کا اخفاء عوام سے ضروری ہے

تصوف کے اجزاء بہت سے ہیں۔ منجملہ ان کے احوال بھی ہیں ان کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے خاص معاملات ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کے ظاہر کرنے سے اپنا باطنی[3] نقصان ہوتا ہے نیز ایک جزو اس میں سے علم مکاشفہ اور اسرار بھی ہیں۔ ان کو بھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے اور بہت سی غلط فہمیاں سننے والوں سے ہو جاتی ہیں جن سے ان کا بہت نقصان ہو جاتا ہے اور عوام کے نہ سمجھنے کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ دیکھو اگر کسی شخص نے کبھی آم نہ دیکھا ہو اور اس کے سامنے آم کی کیفیت بیان کی جاوے تو کیسی ہی جامع[4] مانع حقیقۃ بیان کرو لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے

پرسید[5] یکے کہ عاشق چیست   گفتم کہ چوما شوی بدانی

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور وجدانیہ وجدان ہی سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور وجدان محض سننے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی واسطے محققین اجانب پر کبھی نظر نہیں کرتے اب بے احتیاطی ہو گئی ہے کہ عام مجالس میں اس قسم کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا میں ایسے لوگوں سے بہت ملا ہوں کہ ان الفاظ کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔

حکایت: ایک ایسا ہی شخص مجھ سے ملا اور کہنے لگا کہ تصور شیخ جائز ہے یا نہیں میں جائز کہنے کو تھا۔ بشرائط مگر میرے ذہن میں آیا کہ شاید یہ تصور شیخ کے معنی غلط سمجھ رہا ہو۔ اس لئے

---

[1] ذکر و شغل سے دل کے جو عجیب عجیب حالات ہوتے ہیں۔ [2] کائنات عالم کی جو اگلی پچھلی باتیں اور راز بذریعہ کشف معلوم ہو جایا کرتے ہیں۔ [3] بعض دفعہ وہ جاتی رہتی ہیں۔ [4] ایسی تعریف جو ہر قسم کے آم پر صادق ہو اور دوسری کسی چیز پر نہ ہو سکے۔ [5] ایک شخص نے پوچھا کہ عاشق ہونا کیا چیز ہے۔ میں نے کہا کہ ہم جیسے ہو تو جان جاؤ گے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ تصور شیخ کے کیا معنی ہیں کہنے لگا کہ خدا کو بشکل شیخ سمجھنا۔ انا لله.
حالانکہ قرآن شریف میں تصریح ہے لیس[1] کمثله شیء اور یہ جو بعض آیات میں ید[2] الله فوق ایدیهم وغیرہ آیا ہے وہاں یدوغیرہ سے یہ مراد نہیں کہ ہم جیسے ہاتھ پیر ہیں بلکہ جو اس[3] کے مناسب ہوں ہم اس کی حقیقت دریافت نہیں کر سکتے۔ ہماری مثال عدم احاطہ حقیقت میں ایسی ہے جیسے ایک پانی کا کیڑا انسان کی مصنوعات ریل اور تار وغیرہ کو دیکھے اور ان کی ناتمام حقیقت دریافت کر کے اندازہ کرے کہ جس نے یہ بتایا ہوگا وہ اس قسم کا ہوگا کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کی حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس مثال سے بھی بالاتر ہیں۔ لیکن تقریب فہم کے لئے اس مثال کے ضمن میں اس کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

ای[4] برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم — وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر[5] تمام گشت وبپایاں رسید عمر — ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

حق تعالیٰ کی کنہ[6] کا ادراک طاقت بشریہ سے خارج ہے

غرض خدا تعالیٰ کو کیا پہچان سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم[7] اعلمنا بالله تھے۔ جیسا کہ خود ارشاد فرمایا ہے۔ انی[8] اعلمکم بالله آپ بھی اس سے اپنا عجز ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ[9] لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک یہاں تو منتہاء وثنا یہ ہے کہ

خاموشی[10] از ثنائی تو حد ثنائے تست

اور یہی خاموشی حاصل ہے۔ حدیث مذکورہ کا حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اس عجز کو

---

[1] ان کے مشابہ تو کوئی بھی چیز نہیں۔ [2] اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ [3] جو اللہ تعالیٰ کی شان کے موافق ہوں حقیقت معلوم نہیں اور یہ متقدمین کا مذہب ہے۔ راجح وقوی ہے اور متاخرین کوئی مجازی معنی مقام کے مناسب لیتے ہیں مثلاً ید سے قوت [4] اے وہ ذات جو خیال وگمان ووہم سے اور جو کچھ لوگوں نے بیان کیا جو ہم نے اب تک سنا اور پڑھا ہے سب سے بہت بالا ہے۔ [5] سب تحریریں اور کتابیں ختم ہو گئیں اور عمر اخیر کو پہنچ گئی مگر ہم ویسے ہی آپ کی تعریف وتوصیف کے ابتدائی مرحلہ میں رہے ہیں۔ [6] حقیقت کو معلوم کر لینا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ [7] اللہ تعالیٰ کو ہم سب سے بہت زیادہ جاننے والے بخاری

[8] بیشک میں تم سب سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ جاننے والا ہوں۔ [9] میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا بس آپ ایسے ہیں جیسا کہ خود آپ نے اپنی تعریف بیان کی ہے۔ [10] آپ کی تعریف سے خاموش ہو جانا ہی آپ کی تعریف کی حد ہے یعنی ہمارے بس میں ہے ہی نہیں۔

عجیب عنوان سے فرماتے ہیں کہ

خدا[1] در انتظار حمد ما نیست — محمد چشم بر راہ ثنا نیست

خدا[2] مدح آفرین مصطفیٰ بس — محمد حامد حمد خدا بس

خدا کی طرف سے حضورؐ کی تعریف اور حضور ﷺ کی طرف سے خدا کی تعریف کافی ہے آگے فرماتے ہیں۔

مناجاتے[3] اگر خواہی بیاں کرد — بہ بیتے ہم قناعت می تواں کرد

محمد[4] از تو می خواہم خدارا — الٰہی از تو حب مصطفیٰ را

حقیقت میں بے مثل مضمون ہے باقی کوئی یہ نہ کہے کہ حضورؐ تو فرماتے ہیں[5] **لا احصی ثنــاء علیک** اور مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا ثنا کرنا کافی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ کفایت ہمارے اعتبار سے ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ کو کما حقہ کوئی نہیں پہچان سکتا۔

دور[6] بینان بارگاہ الست — جز ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

یعنی اتنا معلوم ہوا کہ موجود ہے باقی یہ کہ کیا ہے اور کیسا ہے اس کے لئے بس یہ سمجھئے کہ

اندریں[7] رہ ہر چہ می آید بدست — حیرت اندر حیرت اندر حیرت ست

شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

چہ[8] شبہا نشستم دریں سیر گم — کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

محیط[9] است علم ملک بر بسیط — قیاس تو بر وے نگرد و محیط

۱؎ اللہ تعالیٰ ہماری حمد کے انتظار میں نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری تعریف کی راہ پر آنکھ لگائے ہوئے نہیں ۲؎ بس خدا تعالیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کو وجود بخشنے والے ہی کافی ہیں اور حضور حق تعالیٰ کی ثناء کرنے والے ہی کافی ہیں۔ ۳؎ اگر تم کوئی مناجات بیان کرنا چاہتے ہو تو صرف ایک شعر پر بھی قناعت کی جاسکتی ہے۔ ۴؎ اے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ سے تو خدا کو چاہتا ہوں (ان تک پہنچا دیجئے) اے اللہ آپ سے حضورؐ کی محبت مانگتا ہوں۔ ۵؎ میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ۶؎ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کی بارگاہ کے دور تک کی نظر رکھنے والے اس کے سوا کھوج نہیں لگا سکے کہ بس وہ ہیں۔ ۷؎ اس راہ میں جو کچھ ہاتھ آسکتا ہے حیرت در حیرت در حیرت ہی ہے۔ یعنی حقیقت کے ادراک کرسکنے کی قابلیت ہی انسان میں نہیں۔ ۸؎ کتنی ہی راتوں میں میں اس بات کی دماغی سیر میں گم بیٹھا رہا یہاں تک کہ حیرت نے میری آستین پکڑی کہ اٹھ۔ ۹؎ اس سارے لمبے چوڑے جہاں کو اللہ تعالیٰ کا علم گھیرے ہوئے ہے۔ مگر تمہاری عقل اس کا احاطہ نہیں کرسکتی یعنی جب ایک صفت کا بھی ادراک نہیں کرسکتے تو ذات کا کیسے کرسکتے ہو۔

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار که پیدا نشد تختہ برکنار

(اس بھنور میں تو ہزاروں کشتیاں ڈوب ڈوب گئی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا ایک تختہ تک بھی کنارہ پر ظاہر نہیں ہوسکا)

کون احاطہ کر سکتا ہے خدا تعالیٰ کے کمالات کا ہاں ہم ایمان لاتے ہیں کہ ہم اس سے آگے رائے سے کام نہیں کر سکتے۔ دیکھو افعال تک کا تو پتہ لگ ہی نہیں سکتا تو صفات کا کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہاں تو اقرار عجز کی بالکل وہ حالت ہونا چاہیے جیسے کہ

حکایت: ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ شب معراج میں کیا کیا گفتگو خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی انہوں نے جواب میں فرمایا کہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کس کا دماغ ہے کہ باغ والے سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

حقیقت میں کس کی مجال ہے اور جو کچھ کہہ دیتے ہیں وہ اوچھے ہیں کہ اچھلتے ہیں ورنہ اہل کمال کا یہی مشرب ہے جو میں نے بیان کیا۔ اسی طرح اسرار خداوندی کا بھی جو متعلق اکوان[1] کے ہیں احاطہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی نسبت عارف شیرازی کہتے ہیں۔

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو که کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

مطرب اور شراب کی یعنی ظاہری و باطنی عملوں کی باتیں کرو زمانہ کے راز کم کم تلاش کرو کیونکہ کوئی بھی عقل سے اس معمی کو نہیں کھول سکا ہے نہ کھول سکتا ہے)

جب راز دہر کے پیچھے پڑنے سے منع کرتے ہیں تو راز حق کی تو کیا انتہا ہے۔

حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر شفقت کی وجہ سے غیر ضروری علوم میں پڑنے سے روک دیا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر شفیق تھے کہ جس چیز کو بے سود

---

[1] موجودات سے تعلق والے

دیکھا اور فلاحِ دین یا دنیا میں اس کی حاجت نہ دیکھی اس کی گفتگو کرنے سے منع کر دیا اور ایسے دقائق وغوامض[1] پر چونکہ نجات موقوف نہیں اس لئے اس کی حاجت نہیں۔ پس اس میں کلام کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ اضاعتِ عمر ہے اور احتمالِ ضرر ہے۔

حکایت: صحابہ کرام ایک مرتبہ مسئلہ قدر میں کچھ گفتگو کر رہے تھے کہ حضور ﷺ تشریف لے آئے اور سنا تو فرمایا کہ تم لوگ کیا گفتگو کر رہے ہو معلوم ہوا تو عتاب فرمایا کہ اس میں گفتگو کرتے ہو۔ کیا میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں اور فرمایا کہ جو اس میں گفتگو کرے گا اس سے باز پرس ہوگی۔ کیوں اس میں گفتگو کی۔ اور ایک لطیف معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سوال ہوگا۔ ذرا ہم بھی سنیں تم نے اس بارہ میں کیا تحقیق کی ہے۔ اس سے وہ شخص دم بخود رہ جائے گا اور عجز کی وجہ سے کچھ جواب نہ دے سکے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اس قسم کے علوم میں گفتگو کرنے سے ممانعت کی طرف اشارہ کر دیا۔

علمِ[2] اسرار وہبی ہے دلائل سے حل نہیں ہوتا
کمال کے بعد قیل وقال[3] کی حاجت نہیں رہتی

کیونکہ یہ علم وہبی[4] ہے دلائل سے حل نہیں ہو سکتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان امور کے اظہار کی حاجت تو ہے نہیں جیسا اوپر بیان ہوا اور الفاظ وضع ہوئے ہیں۔ حاجت کی چیزوں پر دلالت کرنے کے لئے سوان مفہومات کے لئے الفاظ موضوع نہیں ہیں تو اگر ان مضامین کو الفاظ سے تعبیر کیا جاوے گا تو وہ تشبیہات ہوں گی اور وہ بالکل ناکافی ہیں۔ تشبیہات کے ناکافی ہونے کی مثال کے لئے ایک قصہ عرض کرتا ہوں۔

حکایت: مشہور ہے کہ ایک اندھے مادرزاد کی دعوت اس کے کسی شاگرد نے کی حافظ جی نے پوچھا کیا پکاؤ گے شاگرد نے کہا کہ کھیر پکاؤں گا کہنے لگے کھیر کیسی ہوتی ہے۔ شاگرد نے کہا کہ سفید کہنے لگے کہ سفید کس کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ جیسے بگلا۔ حافظ نے کہا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ شاگرد نے ہاتھ سے اس کی ہیئت بتائی۔ حافظ جی نے اس کو ٹٹول کر

---

[1] باریک اور گہرے علوم [2] اللہ تعالیٰ کے راز ان کا علم حق تعالیٰ کا بلاواسطہ عطیہ ہوتا ہے کامل ہو جانے کے بعد لفظوں سے بتانے سیکھنے کی حاجت نہیں رہتی۔ [3] عطاء الٰہی

دیکھا اور کہنے لگے کہ بھائی یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے۔ حلق میں کیسے اترے گی۔ اب غور کیجئے کہ کھیر جو اتنی ٹیڑھی ہو گئی اس کا کیا سبب ہوا یہی کہ اس کو تشبیہات میں بیان کیا تو اس اندھے مادرزاد کو اگر ساری دنیا بھی سمجھا دینے کی کوشش کرتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ ہاں سمجھانے کی یہ صورت ہے کہ انگلی[1] لے کر اس کے منہ میں دیدی جاوے کہ ہونٹ چاٹتا رہے اور لیجئے اگر کسی نابالغ بچہ کو لذت مجامعت سمجھانا چاہیں تو عمر ختم ہو جائے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی البتہ جب وہ بالغ ہو جاوے گا تو خود بغیر سمجھائے سمجھ میں آ جاوے گی۔ اسی طرح کملاء[2] کے سامنے نا اہل لوگ مثل اطفال نابالغ کے ہیں بڑے بڑے حکماء ارسطو افلاطون ان کے سامنے ایسے ہیں جیسے بچے تو ایسوں کے سامنے یہ مضامین بیان کرنا بچے کے سامنے لذت مجامعت بیان کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

خلق[3] اطفالند جز مرد خدا   نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

جو شخص نفسانی خواہشات سے چھوٹ گیا وہی بالغ ہے اور باقی اس کے مقابلہ میں سب نابالغ تو ان کے سامنے جو کچھ بیان کیا جاوے گا وہ تشبیہات سے بیان کیا جاوے گا اور تشبیہات میں غلطیاں واقع ہوں گی لہٰذا اسرار وجدانیہ کسی کے سامنے نہ بیان کرنے چاہئیں۔

محض عبارات تصوف کو یاد کر کے تصوف کا دعویٰ کرنے کی مذمت اور صدق کی ضرورت

آج کل افسوس ہے کہ لوگوں نے اس جمع عبارات کا نام تصوف رکھ لیا ہے اور اکثر اس قسم کے اسرار کہنے والے خود رسمی[4] لوگ ہوتے ہیں اسی کو کہتے ہیں۔

حرف[5] درویشاں بدزدو مرد و دل   تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں

کہ چند الفاظ سنے سنائے یاد کر لئے اور انہیں کو چند مجالس میں گاتے پھرے اور اگر کوئی

---

[1] کھیر لگی ہوئی انگلی [2] کامل بزرگ [3] سارے آدمی نابالغ بچے ہیں سوائے اللہ والے کے اور کوئی بھی بالغ نہیں سوائے اس کے جو خواہشات سے چھوٹ چکا ہے۔ [4] نقل کرنے والے بناوٹی [5] کمینہ آدمی درویشوں کے لفظوں کو چرا لیتا ہے تاکہ جاہلوں کے سامنے ان کا منتر پڑھ دے۔ یعنی درویشوں کے تو لفظوں میں بھی عشق کی آگ ہوتی ہے۔ وہ ان کو لوگوں کے سامنے کہہ دیتا ہے جن کا اثر ہوتا ہے جاہل لوگ خود اس کو صاحب اثر سمجھ کر معتقد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اور باریک باریک نکتے بھی ہیں جو آج کل بناوٹی پیروں اور شاعروں کا دستور ہے۔

آگے پوچھ بیٹھے تو خاک بھی نہیں۔صاحبو محض ملفوظات کے یاد کر لینے کا نام تصوف نہیں ہے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ملفوظات کے یاد کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس کی سعی کرو کہ تم بھی ایسے ہو جاؤ کہ تمہاری زبان سے وہی باتیں نکلنے لگیں جو ان کے منہ سے نکلیں اور وہ حالت بنا لو کہ

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید واوستا

(تم خود اپنے اندر حضرات انبیاء علیہم السلام کے جیسے علوم پاؤ گے بغیر کسی کتاب وتکراری اور استاد کے یعنی ذکر کی کثرت پر دل میں غیب سے علوم وارد ہونے لگیں گے)

اور اگر یہ نہ ہو تو محض دعویٰ اور تصنع سے کیا ہوتا ہے۔مولانا فرماتے ہیں

گہہ گہے آہے دروغے میزنی از برائے مسکہ دوغے میزنی

(کبھی کبھی تم تو جھوٹ سے آہ یا نعرہ لگا لیتے ہو۔مکھن کیلئے چھاچھ کو (جس میں مکھن نہیں رہا ہے) بلوتے ہو)

خلق راگیرم کہ بفریبی تمام درغلط اندازی تاہر خاص و عام

(میں فرض کرتا ہوں کہ تم ساری مخلوق کو دھوکہ دے لو گے۔ ہر خاص و عام کو غلط فہمی میں ڈال لو گے)

کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزدیروحیلہ کے رواست

(تم سب کام جب مخلوق کے ساتھ ٹھیک لا سکتے ہو تو خدا کے ساتھ مکاری اور دھوکہ کب ٹھیک ہو سکتا ہے)

کارہا اور است باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن

(اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو کام ٹھیک ہی رکھنا چاہیے۔صدق وخلوص کا جھنڈا بلند رکھنا چاہیے)

حکایت: امام صاحب کا واقعہ ہے کہ آپ چلے جا رہے تھے ایک شخص نے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہ ہیں۔ یہ پانچ سو رکعتیں روزانہ پڑھتے ہیں آپ اس کو سن کر رونے لگے اور اسی روز سے اتنا ہی عمل شروع کر دیا کیونکہ جانتے تھے کہ مخلوق تو دھوکہ میں آ سکتی ہے لیکن خالق کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں چل سکتا۔

طلب شہرت کا مذموم ہونا

آج یہ حالت ہے کہ لوگ اپنی نسبت تقویٰ وطہارت کے مشہور ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوراس کے لئے تدابیر کی جاتی ہیں۔

حکایت: ایک شخص کلکتہ میں گیا اوراس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے چند گرگے[1] اس غرض کے لئے چھوڑ دیئے کہ اس کو مشہور کریں بہر حال علم میں خواہ حال وقال میں مکر کرنا سخت غلطی ہے۔

لایعنی[2] اُمور سے بچنے کا محمود ہونا

غرض جو حال[3] یا سر ہے بدوں حصول سمجھ میں نہیں آتا اور جو سمجھ میں نہ آوے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ نہ دوسرے کو بتلانا چاہیے۔ تعلیم اسی چیز کی دینی چاہیے کہ جس کی ضرورت ہے ورنہ محض مجلس گرم کرنے کے لئے بے ضرورت باتیں یا محتمل الضرر[4] مسائل کو ہرگز بیان نہ کرنا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدر کے بارہ میں گفتگو کرنے کی ممانعت سے سبق لینا چاہیے۔ دیکھو بچے کے سامنے کتنے ہی نفیس کھانے ہوں لیکن جب کافی مقدار پیٹ میں پہنچ جاتی ہے تو شفیق ماں کھانے سے روک دیتی ہے بچہ ضد کرتا ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتی اس کی نظر مصلحت اور فائدہ پر ہوتی ہے اسی طرح ہم کو چاہیے کہ جن امور کو ہمارے لئے غیر ضروری یا مضر قرار دیا ہے ان کے درپے نہ ہوں اوراپنا یہ مذہب رکھیں۔

بدرد وصاف ترا حکم نیست دم درکش ۔۔۔ کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف ست

(تم کو تلچھٹ اور صاف کا حکم نہیں۔ بس دم لگالو یعنی پی جاؤ کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ ہمارے پیالہ میں ڈال دیا ہے بالکل کرم ہی کرم ہے۔)

قبولیت دعا میں تاخیر کسی مصلحت سے ہوتی ہے

اوراسی کی نظیر ہے کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو تنگ دل نہ ہو کیونکہ کبھی کبھی دیر لگانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندہ کا گریہ وزاری پسند ہوتا ہے بزرگوں نے اس کی مثال لکھی

---

[1] بھیڑیئے کے بچے یعنی لوٹ کھسوٹ کے ایجنٹ [2] بے ضرورت و بے فائدہ [3] دل کے حالات اور اللہ تعالیٰ کے راز [4] جن سے ضرر کا احتمال ہو

ہے کہ جیسے کوئی حسین عورت کسی سے سوال کرے تو وہ ٹالتا ہے تاکہ اس کو مکرر سوال کی نوبت آئے اور اس کے ذریعہ سے اس سے خطاب کا موقع مل جاوے اور دیکھئے آپ اپنے بچے کے لئے کوئی چیز لاتے ہیں مگر اس کو دق کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچہ رونے لگتا ہے اور آپ کو اس کا رونا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب جن لوگوں کی دعاء قبول ہو جاتی ہے وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی وہ سخت نالاں رہتے ہیں حالانکہ نہ قبولیت دعا مقبول ہونے کی علامت ہے نہ عدم قبولیت مردود ہونے کی علامت ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کی اسی حالت کی شکایت فرماتے ہیں۔ فاما[1] الانسان اذا ما ابتله ربه فاکرمه و نعمه فیقول ربی اکرمن و اما اذا ابتله فقدر علیه رزقه فیقول ربی اهانن آگے فرماتے ہیں کلا[2] یعنی جب خدا تعالیٰ انسان کو فراغت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے میرا بڑا اکرام کیا اور جب رزق تنگ کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے ذلیل کیا اور خدا تعالیٰ مجھے چاہتے نہیں ارشاد ہوتا ہے کہ ہرگز نہیں یعنی یہ بات نہیں ہے کہ رزق کی فراغت دلیل اکرام ہو اور عسرت دلیل اہانت ہو تو اسی طرح اگر دعا بھی قبول نہ ہو وہ دلیل عدم قبولیت اور مردودیت کی نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ دیتے ہیں۔ تشریعاً[3] بھی اور تکویناً بھی۔ غرض جو علم نہ دیا اس کا نہ دینا ہی نعمت ہے جیسا حضور ﷺ نے قدر میں گفتگو کرنے سے ممانعت فرما دی اسی حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو امور غامضہ[4] ہیں ان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکتی ان میں گفتگو نہ کرنی چاہیے۔

حقیقت قرب الٰہی اور اس کو مقصود نہ سمجھنے کی شکایت

قرب کے معنی یہ نہیں کہ جو دریا اور قطرہ میں سمجھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ کو لغوی[5] معنی پر محمول کرنا غلطی ہے بلکہ مراد اس قرب سے جو اس آیت میں مذکور ہے رضا ہے یعنی حق تعالیٰ کا راضی ہونا مراد ہے کیونکہ قرب کے مختلف درجہ ہیں۔ ایک تو قرب[6] علمی ہے اور یہ خدا تعالیٰ

---

[1] ترجمہ آگے ہے [2] ہرگز نہیں [3] شریعت کے حکموں میں بھی جو انسان کے اختیار میں ہیں اور تکوینی یعنی وجود عالم کے ان احکام میں بھی جو انسانی اختیار سے باہر ہیں [4] باریک [5] کہ پاس ہونے کے معنی لے لو جس میں جسم اور مکان کی محتاجی لازم آتی ہے۔ [6] کہ علم الٰہی ہر شے کی ہر حالت سے تعلق رکھتا ہے۔

کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ و نحن اقرب الیہ منکم و لکن لا تبصرون (اور ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے) اور ارشاد ہے۔ و نحن اقرب الیہ من حبل الورید (اور ہم اس کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں) اور ایک قرب رضاء کا اور وہ بعض کو حاصل ہے اور اس آیت میں قرب رضاء مراد ہے قرب علم مراد نہیں کیونکہ وہ مومن و صالح کے ساتھ خاص نہیں اور یہ قرب رضاء بڑی دولت ہے مگر اس کو اہل دنیا تو کیا مقصود سمجھتے بہت سے اہل دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے۔

طریق تحصیل قرب حق

پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے و ما اموالکم[۱] الآیہ[۲] یعنی مال اور اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ ذریعہ قرب نہیں ہو سکتے بلکہ ایمان اور عمل صالح اس کے ذرائع ہیں اور ظاہر ہے کہ ایمان اور عمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو کیونکہ ناقص پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور وہ ذریعہ رضاء کا کیسے بن سکتا ہے۔

ایمان و عمل صالح کا درجہ کمال[۳] علم و عمل دائم و حال پر موقوف ہے

اور اس کا کامل ہونا موقوف ہے تین چیزوں پر علم و عمل دائم و حال اور دین کے یہی تین شعبے ہیں۔ سو اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہوگی اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع کا نفع کیا ہوگا اور اگر عمل ہے تو اگرچہ بظاہر عمل ہونا کافی معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ اس میں خلوص اور بقاء[۴] کی امید نہیں اور حال سے مراد ملکہ[۵] ہے اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کسی سے محبت ہو جاوے اور اسکو کھلاؤ پلاؤ تو ایک تو یہ حالت ہے دوسرے یہ کہ اس کی محبت میں بے چینی ہونے لگے پہلی حالت عمل ہے اور دوسری حالت

---

[۱] اور نہیں ہیں تمہارے مال اور اولاد میں کہ تم کو ہم سے خوب قریب کر دیں سوائے اس کے جو ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کئے تو یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے واسطے دوگنا ثواب ہے۔ ان عملوں کے سبب جو انہوں نے کئے ہیں اور وہ جنت کے بالا خانوں میں امن والے ہوں گے۔ [۲] آیت کے آخر تک [۳] یعنی پورا پورا ہونا بغیر ہمیشگی کے عمل کے اور دل کی خاص کیفیت و حالت کے نہیں ہوتا۔ [۴] صرف خدا تعالیٰ کے لئے بغیر ریا وغیرہ کے ہونے کی اور پائیداری و ہمیشگی کی [۵] وہ کیفیت جو دل میں گڑی ہوئی ہو جو ہمیشہ رہنے والی ہو۔

حال ہے اور پہلی حالت یعنی نرا عمل بدون حال کے پائیدار نہیں۔ اور حال ہو جانے کے بعد پائیدار ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کرتا ہے۔ اگر ایک وقت چھوٹ بھی جاوے تو کچھ زیادہ قلق نہیں ہوتا اور ایک دوسرے کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک وقت بھی نماز چھوٹ جاوے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسرا صاحب حال ہے اسی کو کہتے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گرز باغ دل خلالے کم بود

(اللہ کے رستہ والے سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے)

اور اس کا پیدا کرنا گو واجب[1] نہیں کیونکہ اگر تکلف[2] سے بھی کرتا رہے لیکن اخلاص ہو کہ عبادت سے کوئی دوسری غرض نہ ہو تو خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے کچھ کمی اس میں نہیں لیکن ہے خطرناک حالت کیونکہ قلب میں تقاضا نہیں تو خدا جانے کہاں گاڑی اٹک جاوے اور کہاں پہنچ کر عمل کا خاتمہ ہو جاوے اس لئے ضروری ہے کہ حال کو بھی پیدا کرے اسی کو کہا ہے۔

خمارہ قلندر سزادار بمن نمائی　　　کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے میرے محبوب میرے لئے تو قلندری راستہ ہی ہو جائے اگر آپ جلوہ دکھا دیں کیونکہ میں تو ہمیشہ کے عمل کے راستہ کو دور کا اور لمبا راستہ دیکھ رہا ہوں۔ یعنی جلوہ ہو تو محبت کا جوش ہو پھر یہ سب راستہ منٹوں میں طے ہو جائے جو دور دراز معلوم ہو رہا ہے)

دراز و دور کے معنی یہی ہیں کہ عمل ہو اور حال نہ ہو تو راستہ قطع تو ہو جائے گا لیکن بڑی دشواری اور مشکل سے قطع ہو گا اور اسی معنی میں مولانا نے فرمایا ہے۔

قال را بگذار و مرد حال شو!

باتیں بنانا چھوڑ دو دل کی حالت و کیفیت کے مرد بن جاؤ

آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ پیش[3] مرد کاملے پامال شو' یعنی یہ حالت لکھنے پڑھنے

---

[1] اس ہمیشہ رہنے والی دلی کیفیت و حالت کا پیدا کرنا جو تصوف سے بھی ہوتی ہے گو واجب شرعی تو نہیں کہ نہ کرنے سے گناہ ہو مگر عمل کی پائیداری کے لئے اور عمل بند ہو جانے کے خطرہ سے بچنے کے لئے ضروری ہے اور سہولت سے اعمال ہونے کے لئے مفید ہے۔ اس کو بدعت یا برا سمجھنے والے محروم رہ جاتے ہیں۔ [2] مشقت سے بھی نیک عمل کرتا ہے۔ [3] کسی مرد کامل یعنی حقیقی پیر کے سامنے پامال و فنا ہو جاؤ۔

سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ محض صحبت سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ ملکہ[۱] ہے اور ملکہ صحبت سے ہوتا ہے اگر کوئی شخص[۲] ارر نگ چین لے کر خط کی مشق کرے تو کبھی وہ ملکہ پیدا نہ ہوگا۔ مثلاً جو کہ منشی شمس[۳] الدین کی خدمت اور صحبت سے پیدا ہوگا۔ اسی طرح حال باطنی کی بھی کیفیت ہے تو علم اور عمل اور حال ان تینوں چیزوں کی ضرورت ہوئی۔ اگر ان میں ایک بھی نہیں تو کچھ بھی نہیں اور یہی دین ہے اسی حال کی تعلیم اس آیت میں بھی ہے۔ الم[۴] یان للذین امنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ مطلب یہ ہے کہ اس طرف جلد توجہ کروایسا نہ ہو کہ ایک زمانہ گزر جانے سے قلب میں قساوت[۵] پیدا ہو جاوے۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حال کی تاکید بھی کسی درجہ میں قرآن سے ثابت ہے۔ غرض ارادہ اور قصد تو ضروری ہے اور حال مصلحت ہے کہ اس سے تسہیل ہو جاتی ہے۔

کمال اطاعت کی خاصیت

اور یہی وہ شان ہے جس کو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

کان[۶] خلقه القران جبکہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے تو آپ نے یہ جواب دیا کہ قرآن آپ کا امر طبعی بن گیا تھا آپ کا جی اسی چیز کو چاہتا تھا جس کو خدا چاہے جس شخص کی یہ حالت ہوگی وہ ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی راجع[۷] نہ ہوگا نہ واقف[۸] ہوگا بلکہ برابر ترقی کرتا چلا جائے گا۔ کیونکہ اول تو قلب میں ایک چیز محرک ہے دوسرے اس حالت کی برکت سے یہ محبّ ہونے کے ساتھ محبوب بھی ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کی یہ حالت ہوتی ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں حضرت علیؓ کے لئے اللھم[۹] ادر الحق معه حیث دار کہ یہ جس طرف جائیں تو حق بھی اسی طرف جائے اور ظاہر تو یہ تھا کہ آپ یہ دعا دیتے کہ ادره مع الحق (حق کو اس کے ساتھ گھومتا ہوا کردے)

۱؎ دل میں جم جانے والی کیفیت ہے عارضی نہیں۔ ۲؎ خوشخطی سیکھنے کی ایک کتاب کا نام ہے۔ ۳؎ ایک خوشنویس کا نام جو بہت مشہور ماہر گزرے ہیں۔ ۴؎ کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کے واسطے اس بات کا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لئے عاجزی والے ہو جائیں۔ ۵؎ دل کی سختی ہے۔ ۶؎ آپ علیہ السلام کی عادت مبارکہ قرآن ہی تھی۔ یعنی ہر قرآنی حکم عادت بن گیا تھا ۷؎ پھر جانے والا پہلی حالت پر لوٹ جانے والا ۸؎ رک جانے والا کہ آگے ترقی نہ کرے۔ ۹؎ اے اللہ حق کو اس کے ساتھ گھومتا ہوا کردے جہاں جہاں ہو گھومے۔

(اس کو حق کے ساتھ گھومتا ہوا کر دے) لیکن آپ نے بجائے اس کے یہ فرمایا ادر الحق معه اور یہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی بات فرمائی اور بہت بڑی دعا دی اور یہ بتلا دیا کہ ان کی محبوبیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے معاملات یومیہ میں غلطی بھی ہو تو اسباب ایسے جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ حق واقعی ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر دو شخصوں میں لڑائی ہو جائے اور ایک ایسے ہی محبوب حق اپنے اجتہاد سے ان میں سے کسی ایک طرف ہو جاویں جو کہ واقع میں حق پر نہ ہو تو خدا تعالیٰ حق کو اس کے ساتھ اس طرح کر دیتے ہیں کہ وہ شخص تائب ہو کر حق پر ہو جائے اور ان کو اس کی طرف رائے سے پھرنا نہ پڑے یا اگر انہیں کو خود کسی مقابلہ میں غلطی ہو جائے تو خدا تعالیٰ حق کو ان کے ساتھ اس طرح کر دیتے ہیں کہ ان کا مقابلہ جو ابھی تک مظلوم تھا انتقام لینے میں حد جائز سے آگے نکل جاوے پس انتقام کی وجہ سے ان کا ظلم عفو ہو جائے گا اور مقابل کی اعتداء[1] کی وجہ سے اب یہ مظلوم ہو جاویں گے اور حق ان کے ساتھ ہو جاوے گا۔ الحمد للہ یہ بالکل نئی بات ہے اور اس تفصیل سے آج ہی ذہن میں آئی ہے اور اس کی ایک نظیر حدیث میں صاف آئی ہے فرماتے ہیں۔ رب[2] اشعث الخبر لایؤیه له مدفوع باالابواب لو اقسم علی الله لابره یعنی بہت سے ایسے پراگندہ مو غبار آلودہ خستہ حال لوگ ہیں کہ کوئی ان کی پروا بھی نہیں کرتا مگر حالت ان کی یہ ہے کہ اگر کسی امر کے متعلق قسم کھا بیٹھیں کہ یوں ہوگا تو خدا تعالیٰ اسی طرح کر دیتے ہیں۔ تو یہ مضمون بھی اسی کے قریب ہے کہ واقعہ ان کی قسم کے موافق بدل جاتا ہے۔

حکایت: میں نے ایک سیاح سے سنا ہے کہ کسی مقام پر ایک ایسی چیز دیکھی کہ اس کا ایک حصہ پتھر ہے اور ایک لکڑی ہے ایک کنکر ایک غیر معلوم الجنس اور لوگوں نے اس کا یہ قصہ بیان کیا کہ اندھیرے میں کسی بزرگ کی ٹھوکر لگی تھی۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا ہے پتھر ہے یا لکڑی ہے یا کنکر یا کچھ اور تو اس میں ان سب چیزوں کا تھوڑا تھوڑا اجزو پیدا ہو گیا یعنی کچھ حصہ لکڑی ہو گیا کچھ پتھر اور کچھ کنکر اور کچھ غیر معلوم الجنس

بزرگوں کے حسب خواہش کام ہو جانے سے حق تعالیٰ کا ان کے کہنے میں ہونا لازم نہیں آتا

مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ میاں ان کے کہنے میں ہیں ہرگز نہیں بلکہ یہ حضرات خود

---

[1] زیادتی [2] بخاری ج ۱

حق تعالیٰ کے کہنے میں ہیں اور یہ اسی کی برکت ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ کبھی کبھی ان کے کہنے کے خلاف بھی کر دیتے ہیں۔ اور کسی کا تو کیا منہ ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں کیں۔ ان میں سے دو قبول ہوئیں اور ایک نامنظور ہوئی سو اس سے سمجھ لیجئے کہ جب حضورؐ کی دو دعائیں منظور اور ایک نامنظور ہوئی تو اور کون ہوگا جس کا کہنا ہو جاوے اور میں اس مضمون کو کہتا بھی نہ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض آپؐ فرماتے ہیں۔

اللھم[1] **ادر الحق معه' حیث دار** اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے اور غالب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ ہوتے ہیں اور خداوند تعالیٰ ان کے ذہن میں ادراک[2] پیدا کر دیتے ہیں کہ خلاف حق چلتے ہی نہیں غرض ان کو مرتبہ محبوبیت کا عطا ہوتا ہے وہ خلاف نہیں کرتے یہ وجہ ہوتی ہے صاحب حال کی ترقی و استقامت کی۔

خلاصہ طریق قرب

پس علم و عمل و حال کا جمع کرنا یہ طریقہ ہے قرب و رضاء کا جو کہ بہت بڑی دولت ہے کیونکہ دولت کا مقصود راحت قلب ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی کہ اس کا محبوب حقیقی اس سے راضی ہو اور قرب ہو یہ راحت کسی کو بھی نصیب نہیں بلکہ اس دولت میں تو اگر کچھ محنت بھی ہوتی تو اس پر بھی راضی ہوتے۔

اہل اللہ کو کلفت و مصیبت میں بھی بوجہ قرب ورضاء حق کے راحت ہوتی ہے

چنانچہ کبھی ایسی حالت[3] ابتلاء اگر پیش آتی ہے تو قانع ہوتا ہے اس وقت ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

---

[1] یہ حدیث و ترجمہ پچھلے مضمون نمبر ۱۶۸ میں گزرا ہے۔ [2] علم اور عقل سے اونچی بات نہیں پولیس والوں کو ڈاکو کی پہچان شاعروں کو کلام کی عمدگی اور برائی کی تاجروں کو گاہکوں کی پہچان اس کی ایک چھوٹی سی نظیر ہے۔
[3] امتحان کے لئے

دما دم شراب الم درکشند   اگر تلخ بینند دم درکشند!

(رنج کی شراب پے در پے پیتے رہتے ہیں اگر کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو سانس کھینچ لیتے ہیں اور صبر کرتے ہیں)

لوگ جس کو کلفت سمجھتے ہیں وہ اس کو راحت سمجھتا ہے مجنوں کو اس کے اقارب خانہ کعبہ میں لے گئے اور کہا کہ کہہ اللھم ارحمنی من لیلی و حبھا (اے اللہ مجھ پر لیلیٰ اور اس کی محبت سے رحم فرما کہ وہ جاتی رہے) تو وہ کہتا ہے اللھم زدنی حب لیلیٰ (اے اللہ مجھ کو لیلیٰ کی محبت زیادہ کر دے)

الھی تبت من کل المعاصی   الیک فقد تکثرت الذنوب

(اے میرے معبود میں نے سب گناہوں سے آپ کی بارگاہ میں توبہ کر لی کیونکہ گناہ تو بہت ہی ہو گئے ہیں)

فاما من ھوی لیلیٰ و ترکی   زیارتھا فانی لا اتوب

(لیکن لیلیٰ کی محبت اور اس کے دیدار کا ترک کرنا تو میں اس سے توبہ نہیں کر سکتا)

غور کرو کہ عورت کی محبت میں یہ حالت تھی اب مولانا کا قول سنو فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہراو اولےٰ بود

(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہو سکتا ہے اس کے عشق میں گیند کی طرح لڑھکتا ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔)

یعنی خدا تعالیٰ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہے ہرگز نہیں تو اب غور کیجئے کہ وہ کیسی لذت کی ہو گی۔ پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا قرب بڑی دولت ہے۔

جو لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں در حقیقت مصیبت میں وہ ہیں

اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ بیٹھتے ہیں وہ بڑی مصیبت میں ہیں گو ان کے پاس اموال و اولاد بھی ہو اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انما یریداللہ ان یعذبھم بھا فی الدنیا وتزھق انفسھم و ھم کٰفرون

(اللہ تعالیٰ یہی ارادہ کرتے ہیں کہ ان کافرلوگوں کو مال اور اولاد کے ذریعہ دنیا میں بھی عذاب دیدیں اور کافر رہنے میں ان کی روحیں مشکل سے نکلیں)

حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جنہوں نے دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے وہ کس قدر مصیبت میں ہیں۔ عیش کے ذرائع سوچتے اور جمع کرتے ساری عمر گزر گئی اور کھانے پینے کو وہی چار چپاتیاں اور تین کپڑے ہی ملے جو کہ سب کو ہی ملتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اس قدر انہماک کے بعد بھی ذرائع عیش نصیب نہ ہوئے اور غضب یہ کہ آج تک بھی اس کا احساس نہیں ہوا اب تک بھی وہی ترقی[1] کی تعلیم دی جاتی ہے اور اگر پورا عیش حاصل بھی ہو گیا تو یہ کیا عیش ہے کہ خوب کھالیا اگر یہی عیش ہے تو بیل کو سب سے زیادہ عیش میسر ہے کہ اس کو نہ گذشتہ کل کی یاد نہ آئندہ کل کی فکر اس کی برابر سلطان بھی عیش میں نہیں غرض محض بے فکری سے کھالینا کوئی عیش نہیں۔

عیش حقیقی کی حقیقت

عیش یہ ہے کہ نہ ماضی کی فکر ہے نہ مستقبل کا اندیشہ بس وہ ابن الحال[2] ہے کہ جو اس پر گزرتا ہے سب کو خوشی سے برداشت کرتا ہے اور اس کو نعمت سمجھتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں[3] صوفی ابن الحال باشد اے رفیق یعنی جو حالت اس پر طاری ہو وہ اسی میں راضی ہے اور یہ کہتا ہے۔

ہرچہ از دوست میرسد نیکو ست

(دوست سے جو کچھ ملتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہے)

اگر طیش[4] بھی ہو تو عیش ہے اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے اگر ایک مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو کہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے۔ نہ بات کی ہمت ہو نہ سلام کی جرأت اور اسی حال میں محبوب اس پر رحم کرے اور اس کو سینہ سے لگالے اور خوب دبادے کہ اس کا دم نکلنے لگے اور اسی حالت میں اس کا کوئی رقیب آجاوے اس کو دیکھ کر محبوب دریافت کرے کہ اگر تم کو تکلیف ہو رہی ہو تو تم کو چھوڑ کر اس کو دبانے لگوں تو اس وقت کیا کہے گا کیا یہ تکلیف اس کو محسوس ہوگی

---

[1] آخرت سے غافل رہ کر دنیا میں کھپ جانے کی [2] دل کی کیفیت و حالت والا [3] صوفی تو اے میرے ساتھی حال والا ہی ہوتا ہے۔ [4] غصہ اور تکلیف دینا بھی ہو تو محبت میں وہ بھی لطف و کیف ہی ہے۔

اور کیا اس کی وجہ سے وہ محبوب کے علیحدہ ہونے پر راضی ہوگا کبھی نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا۔

نہ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو ہم دوستوں کا سر سلامت رہے تا کہ انہی پر تو اپنا خنجر آزمائے) اور یہ کہے گا۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے   یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

تو جب آدمی کی محبت میں یہ حالت ہے تو حق تعالیٰ کی محبت میں کیا عالم ہوگا۔ بقول شیخ سعدیؒ

عجب داری از سالکان طریق   کہ باشد در بحر معنے غریق

(تم طریقت کے سالکوں یعنی اللہ کے راستہ میں لگے ہودن سے تعجب کرتے ہو کہ وہ معنی و مقصود کے سمندر میں غرق ہیں)

اور ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی طرف کی ناگوار شے بھی میرے واسطے خوشی کا سبب ہے کیونکہ دل ہی دل دکھانے والے دوست پر فدا ہے)

اور وہ یوں کہتے ہیں۔

پس زبون و سوسہ باشی دلا   گر طلب را باز دانی از بلا!

(اے دل پھر تو تو وسوسوں کا بیوقوف بنایا ہوا ہو جائے گا اگر تو محبوب کی طلب کو مصیبت سے الگ جانتا ہے)

یعنی اگر طلب میں اور بلا میں فرق کیا تو تم طالب خدا نہیں بلکہ تم طالب مخلوق ہوا ایک[1] مخلوق کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کو لیا ہے جس نے اس کی حقیقت سمجھ لی اس کی برابر کوئی دولت مند نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑی دولت ہے۔

مذکورہ عیش والوں کا ترحم[2] بے عیشوں پر

جو اس سے محروم ہو وہ محروم بھی ہے۔ مرحوم[3] بھی ہے محروم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور مرحوم

---

[1] مصیبت کو چھوڑ کر راحت کو لیا۔ [2] رحم دلی [3] قابل رحم

اس لئے کہ اہل اللہ کو اس پر رحم آتا ہے۔ ہاں اگر باغی ہو تو اس پر ان کو رحم نہیں آتا لیکن اگر باغی[1] نہ ہو بلکہ گنہگار ہو تو ان حضرات کو اس پر بہت رحم آتا ہے اور وہ اس کو ذلیل نہیں سمجھتے کیونکہ جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے۔

گنہ آمرز رندان قدح خوار بطاعت گیر پیران ریا کار

(پیالے پی جانے والے رندوں کے گناہوں کو بخشنے والے اور ریا والے پیروں کی عبادت پر گرفت کرنے والے ہیں)

کسی نے خوب کہا ہے

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رنداں بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غفلت میں نہ چلو کیونکہ بڑے بڑے مردوں کی سواری کی بھی اس جنگل کے پتھریلے میدانوں میں کوچیں کاٹ ڈالی ہیں۔ اور ناامید بھی نہ ہو جاؤ کیونکہ شراب عشق پینے والے رندلوگ اچانک ایک نعرے سے بھی منزل پر پہنچ گئے ہیں)

دوسرے کہتے ہیں۔

گناہ آئینہ عفو و رحمت ست اے شیخ مبیں بچشم حقارت گناہگاراں را

(اے صوفی صاحب گناہ تو معافی و رحمت الٰہی کا ایک آئینہ ہے (کہ عفو و رحمت اسی میں نظر آتی ہے) تو تحقیر کی نظر سے گناہگاروں کو نہ دیکھا کرو)

یعنی حقیر نہ سمجھو البتہ قابل رحم سمجھو اور وہ برتاؤ کرو جیسے کہ تمہارا بیٹا بیمار ہو جاوے اور اس کے ساتھ تم برتاؤ کرتے ہو۔ دیکھو اگر وہ تم پر ہگ بھی دے تو تم کو غصہ نہیں آتا بلکہ رحم آتا ہے تو مسلمان وہ ہے کہ مسلمان کی حالت پر آنسو بہائے نہ یہ کہ ان کو ذلیل و حقیر سمجھے اور برا بھلا کہے۔

تا یار کرا خواہد و میلش بہ کہ باشد

(اس وقت کہ محبوب کس کو چاہتا ہے اور کس کی طرف اس کی رغبت ہوتی ہے)

اور اگر اصلاح کی امید نہ رہے تو خدا کے سپرد کر دو اور دعاء کر دیو یہ ہے اسلامی شان آج کل ذرا سی بات میں وہابیت اور بدعت کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ صاحبو کس کی بدعت کس کی

---

[1] کافر

وہابیت حضورؐ کے احکام میں بعض مختلف فیہ بھی ہیں۔ کوئی کسی طرف گیا کوئی کسی طرف تو اس کے لئے لڑتے کیوں ہو اور اگر کوئی مسئلہ متعین[1] الصواب ہے اور اس میں کسی کو لغزش ہے تو اس کے لئے دعا خیر کرو خوب کہا ہے۔

گر ایں مدعی دوست بشناختے   بہ پیکار دشمن نہ پرداختے!

(اگر یہ معرفت الٰہی کا دعویدار خدا کو پہچان لیتا تو اپنے دشمن سے بھی لڑنے میں مشغول نہ ہوتا)

دیکھو اگر مجلس میں محبوب بھی ہو اور اس نے اجازت دیدی ہو کہ میری طرف دیکھو اور یہ اس کی طرف دیکھنے میں مشغول ہو کہ اتنے میں ایک شخص آ کر اس کی انگلی کو چھو دے اب بتاؤ کہ وہ کیا کرے گا کیا محبوب کی طرف سے نظر ہٹا کر اس شخص کو دیکھنے لگے گا یا اس سے الجھنا شروع کر دے گا۔ اگر ایسا کیا تو محبوب سے حرماں[2] ہوگا اور یہ توجہ اور استغراق[3] اسی وقت ہوگا کہ دوست کو پہچانے اسی کو کہتے ہیں۔

گر ایں مدعی دوست بشناختے   بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

کہ اگر ادھر متوجہ ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔

حکایت: حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم سے کوئی مناظرہ کرے تو تم کبھی مناظرہ[4] نہ کرو اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔ عوام[5] میں سے جس کو بیعت کرتا ہوں اس سے یہ بھی کہتا ہوں کہ بدعت کو چھوڑ و لیکن بدعتی لوگوں سے مت لڑو۔ خدا تعالیٰ تم سے یہ نہ پوچھے گا کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا اور قرآن شریف سے بھی اس[6] مشرب کی تائید ہوتی ہے فرماتے ہیں۔ **ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر الخ** (اور ہو تم میں سے ایک جماعت جو نیکی کی طرف دعوت دے اچھے کاموں کا حکم کیا کرے برے کاموں سے روکا کرے) لفظ منکم[7] سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کام کے لائق نہیں ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے ان کا کہنا لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے

---

[1] جس میں حق ہونا ایک ہی صورت میں معین ہو [2] محرومی [3] غرق ہو جانا یعنی محبوب میں لگ کر بیخود ہو جانا [4] بغیر سخت ضرورت کے [5] گو اہل علم کو وقت ضرورت تردید کی اجازت ہے [6] طریقہ [7] تم میں سے ایک جماعت

غرض یہ طعن و تشنیع کا شیوہ مناسب نہیں اپنے کام میں لگے رہو اگر کوئی برا ہو تو اس پر رحم کرو اور اس کے لئے دعا کرو۔ چنانچہ اہل اللہ دنیا داروں پر رحم ہی کرتے ہیں کہ یہ بیچارے حمال[1] ہیں لدے ہوئے ہیں ہانپے جا رہے ہیں۔

حضرت شبلیؒ کی یہ حالت تھی کہ جب کسی کو دیکھتے تو کہتے[2] **الحمد للہ الذی عافانی مما ابتلاک بہ و فضلنی علیٰ کثیر ممن خلق تفضیلاً** یہ دعا حدیث میں ہے۔ حضورؐ نے تعلیم فرمایا ہے کہ جب کسی بیمار کو دیکھو تو یہ دعا پڑھو تو دنیا کی محبت سے زیادہ کون سی بیماری ہوگی کہ قلب کی بیماری ہے اور قلب کی بیماری سب سے بدتر ہے جیسا ارشاد ہے کہ **فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاً** (ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور زیادہ کر دیا ہے) حضرت شبلیؒ اس کو سمجھے اور انہوں نے مرض کی حقیقت معلوم کی غرض دنیا دار بیمار ہیں اور اس بیماری سے بچا رہنا خدا کی نعمت ہے جو قابل شکر ہے۔

حکایت: اکبر پور کا واقعہ ہے کہ ایک خان صاحب نے ایک جلاہے سے براہ تمسخر پوچھا کہ میاں جی کیا کر رہے ہیں کہنے لگا خدا کا شکر کر رہا ہوں کہ مجھ کو خان صاحب نہ بنایا کسی غریب پر ظلم کرتا اور دوزخ میں جاتا خان صاحب چپ ہی تو رہ گئے۔ حقیقت میں خدا کی یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ گناہ کا سامان ہی نہ دے۔

آنکس کہ توانگرت نمی گرداند   او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو مالک تم کو مالدار نہیں بنا دیتا ہے وہ تمہاری مصلحت کو تم سے زیادہ جانتا ہے)

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ واقعی رحم کے قابل ہیں کہ ایک بڑی مصیبت میں پھنسے ہیں۔

عیش دنیا کو عیش سمجھنا بے حسی ہے

مگر ان کو خبر بھی نہیں ان کی وہ حالت ہے جیسے

حکایت: ایک سرحدی وحشی[3] ہندوستان میں آیا تھا۔ کسی حلوائی کی دوکان پر حلوا رکھا دیکھا قیمت پاس نہ تھی آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھا گئے حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع

---

[1] بوجھ اٹھانے والے [2] سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے مجھ کو اس بیماری سے صحت و عافیت بخشی جس میں تم کو مبتلا کر رکھا ہے اور اپنی مخلوق میں سے بہت پر مجھ کو بہت کچھ فضیلت دی ہے۔ [3] جاہل و ناواقف کم عقل

دی حاکم نے یہ سزا مقرر کی کہ ان کا منہ کالا کر کے جوتیوں کا ہار گلے میں ڈال دیا جائے اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر[۱] کی جاوے اور بہت سے لڑکے ساتھ کر دیئے جائیں کہ وہ ڈھول بجاتے پیچھے پیچھے چلیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب یہ حلوا خور صاحب اپنے گھر گئے تو وہاں کے لوگوں نے پوچھا کہ آغا[۲] ہندوستان چگونہ ملک ست کہنے لگا۔ ہندوستان[۳] خوب ملک است حلوا خوردن مفت ست فوج طفلاں مفت ست سواری خر مفت ست ڈم ڈم مفت ست ہندوستان خوب ملک ست بس دنیا کے حشم وخدم پر ناز کرنا ایسا ہے جیسا اس نے سواری خر اور فوج طفلاں پر ناز کیا تھا۔ صاحبو یہ بے حسی ہے واللہ اگر حس صحیح ہو تو یہ سب عذاب نظر آنے لگے حکومت دنیوی کی نسبت حدیث میں ہے کہ جس کی دس آدمیوں پر بھی حکومت ہو گی قیامت میں اس کو مشکیں کس کر لایا جاوے گا اگر چہ اس کے بعد چھوٹ ہی جاوے آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے یہ جواب ملتا ہے کہ ہم میں اگر صاحب حکومت نہ ہوں گے تو قوم تباہ ہو جائے گی ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم میں حاکم ہوں لیکن کون شخص ہو اس کا فیصلہ خود حدیث میں موجود ہے۔ حضور فرماتے ہیں القضاۃ ثلثۃ اثنان فی النار وواحد فی الجنۃ (حاکم لوگ تین گروہ ہیں دو گروہ دوزخ میں جائیں گے اور ایک جنت میں) اور اس واحد کو عالم باعمل بتلایا ہے تو حکومت ضروری ہے لیکن حکومت کے لئے عالم باعمل ہونا چاہیے۔ ورنہ بدون علم کے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور امتحان علم کا یہ ہے کہ ان کے سامنے جتنے واقعات ومقدمات پیش ہوں ان میں اپنی رائے لکھیں اور اس کے بعد اہل علم سے ان کا حکم دریافت کریں پھر دونوں میں موازنہ کریں واللہ زمین وآسمان کا فرق نکلے گا دوسری اس میں ایک اور شرط ہے کہ حکومت کی خود درخواست نہ کرے کیونکہ جو درخواست کرے گا وہ خود غرض ہو گا اور نفسیات سے کام کرلے گا اس کو لوگوں کی مصلحت پر ہرگز نظر نہ ہو گی۔ بلکہ اپنی مصلحت پر نظر

---

[۱] مشہور کرنا یعنی گھمایا جائے۔ [۲] جناب ہندوستان کیسا ملک ہے۔ [۳] ہندوستان بہت اچھا ملک ہے حلوا کھانا مفت ہے بچوں کی فوج مفت ہے۔ گدھے کی سواری مفت ہے ڈم ڈم یعنی ڈھول مفت ہے۔ ہندوستان بہت اچھا ملک ہے۔

ہوگی اوراس سے جتنی خرابیاں پیدا ہوں وہ کم ہیں۔

حکایت: حضرت عثمانؓ نے ابن عمرؓ سے قضاء کا عہدہ قبول کرنے کے لئے کہا انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اگر تم منظور نہیں کرتے تو اپنے انکار کی کسی کو خبر مت کرنا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ سب ہی انکار کر دیں اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سلف صالحین حکومت کو کیسا سمجھتے تھے اور حقیقت میں ایسا ہی شخص کام کر سکے گا۔ آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ دنیا کے لوگ حقیقت میں بڑی تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہیں اور دولت حقیقی دوسری چیز ہے۔

اس عیش حقیقی کی تحصیل کا طریق کہ ایمان واعمال ومعاملات واخلاق کی درستی ہے

خدا تعالیٰ اس آیت میں اس دولت کو بتلاتے ہیں اور اس کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اور مروج طریقہ کو روکتے ہیں اور فرماتے ہیں تمہارے مال اور اولاد اس قابل نہیں کہ تم کو ہم سے قریب کریں۔ البتہ ایمان اور عمل صالح اس کا ذریعہ ہے جیسا بیان ہوا اور اس میں آج کل کے اہل مذاق جدید کا بھی جواب ہو گیا یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترقی دنیا سے ہمارا مقصود ترقی دین ہے تو خدا تعالیٰ نے بتلا دیا کہ ترقی دین کی یہ صورت نہیں کہ بہت سامان سمیٹ لو ہم اس آیت کا ترجمہ کئے دیتے ہیں اگر تین پانچ کرنا ہے تو خدا تعالیٰ سے کرو اور پوچھو کہ یہ کیوں فرمایا آجکل یہ بھی ایک عجیب عادت ہوگئی ہے کہ لوگ ہر بات کا ذمہ دار مولویوں کو بناتے ہیں۔ صاحبو مولوی تو صرف منادی کرنے والے ہیں وجہ منادی کرنے والے سے نہیں پوچھی جاتی کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ اس امر کا ذمہ دار نہیں پھر کیا وجہ کہ مولویوں کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اگر وہ کچھ بتلا دیں تو ان کا احسان ہے باقی ان کے ذمہ کچھ نہیں غرض مال اور اولاد ذریعہ قرب نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ ذریعہ قرب ہیں۔ سو بعضے لوگ تو ہم میں سے ایسے ہیں کہ وہ ایمان ہی کو بگاڑ بیٹھے ہیں۔ اگر چہ ان کے اعمال کسی درجہ میں اچھے ہیں لیکن عقیدے بالکل ہی تباہ ہیں بہت سے لوگ پیروں سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں کہ خدا سے بھی اتنا علاقہ نہیں رکھتے وہ ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسا ایک سر چڑھا

سرشتہ دار ہو کہ جو کچھ کہہ دے گا اسی پر دستخط ہو جاویں گے۔اور ان کے نام پر کہیں ہنسلی چڑھاتے ہیں کہیں منتیں مانتے ہیں بعض نے تعزیوں کو اس قدر ضروری سمجھ رکھا ہے کہ ان کا سارا دین وایمان وہی ہے۔ایک شخص کہنے لگے کہ جب سے میں نے گیارہویں شریف چھوڑ دی ہے اس وقت سے مجھ پر آفتیں اترنے لگیں۔استغفر اللہ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بزرگوں کو ایصال ثواب نہ کرو مطلب یہ ہے کہ اپنا عقیدہ مت خراب کرو بلکہ اس نیت سے ایصال ثواب کرو کہ انہوں نے ہمارے ساتھ دینی احسان کیا تھا ہم ان کو ثواب پہنچائیں۔ باقی یہ بات کہ ان سے ہمیں مال یا اولاد ملے گی یہ کچھ نہ ہونا چاہیے اور غور کر کے دیکھو کہ ایسی نیت سے ایصال ثواب کرنا کیسی بے ادبی[1] ہے۔دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی شخص مٹھائی لے کر آوے اور پیش کرنے کے بعد کہے کہ جناب سے مجھے فلاں کام ہے تو تمہارے دل پر کیا اثر ہوگا ظاہر ہے کہ جو کچھ خوشی اس مٹھائی لانے سے تم کو ہوئی ہوگی وہ سب خاک میں مل جائے گی اور سمجھو گے کہ یہ سب خوشامد اسی غرض کے لئے تھی دوسرے جب وہ حضرات اپنی زندگی میں اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی نہ رکھتے تھے تو اب مرنے کے بعد کیوں ان کو دلچسپی ہوگی تو ایمان کی درستی جب ہوگی کہ اس قسم کی ساری باتوں سے توبہ کرو۔

دوسری چیز عمل صالح ہے اس کے متعلق یہ حال ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ عقائد کی درستی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ جب عمل نہیں تو یہ درستی کیا کرے گی۔ اور جو لوگ عمل کو ضروری بھی سمجھتے ہیں تو صرف دیانات' نماز' روزہ وغیرہ کو باقی معاملات بالکل ہی خراب ہیں۔میں نے بہت سے متقی ایسے دیکھے ہیں کہ ان کے معاملات نہایت ہی گندر گند ہیں۔خدا جانے کیسا تقویٰ ہے کہ وہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں گویا بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ بس ایک دفعہ کر کے عمر بھر کی چھٹی ہوگئی۔بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کے معاملات بھی اچھے ہیں لیکن اخلاق نہایت خراب ہیں نہ خدا کی محبت نہ خوف نہ توکل نہ صبر نہ شکر نہ توحید بلکہ ان کے بجائے تکبر' ریا عجب' حسد' کینہ وغیرہ سے پر ہیں یہ حال ہے کہ

از بروں چوں گور کافر پرحلل ! دندروں قہر خدائے عز وجل

---

[1] بلکہ ایک رشوت کی صورت میں آئی ہے۔

(باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح جو حلوں سے بھری ہے اور اندر خدا تعالیٰ کا عذاب)

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ می دارد یزید

(باہر سے تو تم حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعنہ کرتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت سے یزید بھی شرم رکھتا ہے)

تو عمل صالح میں یہ اخلاق باطنی بھی آ گئے۔

اخلاق کی درستی ہی تصوف ہے

یہی ہے وہ چیز جس کو تصوف کہتے ہیں اسی کی نسبت فرماتے ہیں **الا ان اولیاء الله لا خوف علیهم ولا هم یحزنون الذین اٰمنوا و کانوا یتقون** (سن لو کہ اللہ کے ولیوں پر نہ خوف ہوتا ہے نہ وہ فکر کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور متقی ہو گئے) اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ تصوف نہیں بلکہ غیر معمولی چیز ہے تو سمجھو کہ اہل فن کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی تصوف ہے حواشی قشریہ میں ہے۔ **التصوف تعمیر الظاهر والباطن** (تصوف تو ظاہر اور باطن دونوں کو سنوار لیتا ہے) اور باطن کے متعلق دو چیزیں ہیں۔ ایک عقیدہ دوسرے اخلاق ان سب کی اصلاح بھی قرآن میں ہے۔ مگر صوفیہ نے ان کو تصوف سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے تو تصوف کی حقیقت یہ ہے اور ثمرہ اس کا یہ ہے کہ **تقربکم عند نا زلفی الحمد لله** (تم کو ہم سے بہت قرب دیں گے) اس وقت دو غلطیاں رفع ہوئیں ایک تو یہ کہ تصوف کی حقیقت کو غلط سمجھے ہوئے تھے۔ یعنی تصوف میں تین چیزیں ہیں۔ ایک تو ایمان اور عمل صالح کہ یہ عین تصوف ہیں ایک وہ کہ ان کو تصوف سے کچھ بھی علاقہ نہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مباحات دوسرے ممنوعات جیسے یہ عقیدہ کہ طریقت میں سب کچھ مباح ہو جاتا ہے یا یہ کہ میرے پیر کو سب کچھ خبر ہے۔

حکایت: جیسے چند روز ہوئے ایک پیر صاحب نے کہا کہ میرے سپرد پولیس کا کام ہے اور ہر جمعرات کو سب اولیاء پیراں کلیر میں جمع ہوتے ہیں اور اشرف علی بھی وہاں آتا ہے وہ سمجھتے تھے کہ میں سن کر خوش ہوں گا مگر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں ان کو یقینی کاذب سمجھنے لگا تو

گویا خدائی کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کے اختیار میں کچھ سمجھنا بھی ایسا ہی ہے یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ معاصی لعینہ[1] ہیں۔ دوسری وہ چیزیں کہ وہ معصیت لغیرہ[2] ہیں۔ جیسے سماع کا سننا کہ اگر کسی کا مجبوری کی وجہ سے سن لینا منقول ہے تو یہ وہ حجت نہیں اور بلا عذر نا جائز ہے اور اب تو اس کی حالت نہایت گند در گند ہو گئی ہے اور واقع میں یہ سب اعمال فقیہہ[3] ہیں ان کو تصوف سے کچھ علاقہ نہیں اور بعض وہ اعمال ہیں کہ ان کو تصوف سے علاقہ تو ہے مگر وہ عین تصوف نہیں جیسے احوال[4] کہ کثرت ذکر سے کبھی مرتب ہو جاتے ہیں تو مقصود کے متعلق چار چیزیں ہوئیں۔ ایمان اور اعمال اور اخلاق اور حالات کہ ان کو تصوف سے تعلق ہے بعض کو عینیت[5] کا اور بعض کو ترتب[6] و مناسبت کا جیسے احوال کہ اگر ہوں تو اچھا ہے اور نہ ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔

شیخ کامل کی پہچان

یہیں سے شیخ کامل کی پہچان بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اس کے اندر ایک تو ایمان خالص ہونے کی ضرورت ہے دوسرے اعمال صالحہ کی تیسرے اخلاق کی کہ اس میں صبر و شکر ہو دنیا سے اس کو نفرت ہو کہ اس کی صحبت سے بھی دنیا سے جی ہٹ جاوے اور ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی طرف عوام کم متوجہ ہوں اور اہل علم و فہم زیادہ متوجہ ہوں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش پر اہل دنیا زیادہ ہجوم کریں معلوم کر لینا چاہیے کہ یہ خود بھی دنیا دار ہے کیونکہ **الجنس یمیل الی الجنس** (ہم جنس اپنے ہم جنس کی طرف جھکتا ہے) اور جس کی طرف صلحاء زیادہ متوجہ ہوں وہ ہادی ہونے کے لائق ہے جب ایسا شخص مل جاوے تو اس کی صحبت اختیار کرو اور جس کو یہ سب حاصل ہو جائیں ان کے لئے آگے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **اولئک لھم جزآء الضعف بما عملوا وھم فی الغرفات اٰمنون** (یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دوگنا ثواب ہے ان کے عملوں کی وجہ سے اور وہ جنت کے

---

[1] خود اپنی ذات سے گناہ ہو۔ [2] دوسری خرابیوں کی وجہ سے گناہ ہو [3] اللہ رسول کے جو احکام زبان ہاتھ ناک وغیرہ ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ چیزیں ظاہر سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ گو تصوف بغیر ظاہر کو سنوارے نہیں ہو سکتا اس لئے یہ بھی تصوف کے لئے ضروری ہیں مگر دراصل دل والے حکموں میں سے نہیں۔

[4] دل کی کیفیت اور حالتیں [5] بعینہ اور خود ذات تصوف ہونے کا جیسے ایمان عمل اور اخلاق

[6] اعمال تصوف پر مرتب ہونے اور مناسبت رکھنے کا جیسے حالات۔

بالا خانوں میں امن والے ہیں) یعنی ان کو اس سے امن ہوگا کہ ان کو بعد ہو چونکہ آج کل صوفی گمراہ کرتے پھرتے ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تصوف کی حقیقت اور کاملین کی علامات کو بیان کردوں تا کہ لوگ ان کے پھندے سے بچ سکیں۔

ہر مسلمان کو حق تعالیٰ سے غلام اور عاشق ہونیکا تعلق رکھنا چاہیے

خدا تعالیٰ سے جو ہمارا تعلق ہے وہ آقا اور نوکر کا سا نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق خدا سے سید اور غلام اور محبّ اور محبوب کا سا ہے۔ پس ہم کو ان ہی دو تعلقوں کو غلبہ دینا چاہیے کہ اپنے کو مملوک اور اس کو مالک اور اپنے کو محبّ اور اس کو محبوب سمجھیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو محبّ نہیں بنتے کہ ہم پر حقوق واجب ہیں تو میں کہوں گا کہ حضرات اب آپ کیا محبّ بنیں گے۔ محبّ تو آپ اس دن ہو چکے جس دن مسلمان کہلائے کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ الشیئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ کہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے اپنے لوازم کے ساتھ ہوتی ہے اور اسلام کے لوازم سے ہے محبّ ہونا فرماتے ہیں۔ والذین اٰمنوا اشد حباً للّٰہ (اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت محبت والے ہیں) اور اشد محبت ہی کا نام عشق ہے۔ پس آپ تو عاشق خدا ہو چکے اور اگر کہیے کہ ہم کو تو اپنا عشق معلوم بھی نہیں پھر ہم کیونکر عاشق ہوئے تو سمجھئے کہ کسی وصف کے حاصل ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا علم یا اس کی طرف التفات بھی ہو دیکھئے اگر ایک شخص مرے اور دس ہزار کی جائیداد چھوڑ جائے یا بنک میں دس ہزار روپیہ چھوڑے اور ایک نابالغ لڑکا وارث چھوڑے تو باپ کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے کے لئے وصف[1] ملکیت ثابت ہو لیکن اس لڑکے کو خبر بھی نہیں تو ہماری بھی یہی حالت ہے کہ ہم کو عشق ہے اگرچہ خبر نہیں اور اس کی طرف التفات نہیں۔ گو وہ حالت ہے کہ

یک سبد نانے ترا برفرق سر   تو ہمی جوئی لب نان دربدر

کہ ایک ٹوکرا بھرا ہوا روٹیوں کا سر پر رکھا ہوا ہے اور بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

اس تعلق کے انکشاف[1] کا طریقہ

اور طریقہ خبر ہونے کا یہ ہے

---

[1] مالک ہوجانے کی صفت

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزموں رایک زمانے خاکباش

(برسوں تک تو تم دلوں کو زخمی کرنے والے پتھر بنے رہے ہو آزمانے کے لئے ہی کچھ مدت کے لئے خاک بن جاؤ)

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ　　خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سر سبز و شاداب ہو سکتا ہے۔ مٹی بن جاؤ تا کہ رنگا رنگ پھول اگ سکیں)

کہ آزمانے ہی کے لئے ایک تھوڑی مدت خاک ہو جاؤ تو آپ اگر اپنی دولت کی خیر چاہتے ہیں تو اپنے ادراک[1] سے خبر لیجئے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ آنکھ ہو مثلاً اگر ایک نابینا مادر زاد رنگ کی حقیقت پوچھے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ رنگ تو تمہارے کپڑے ہی میں موجود ہے مگر اس کے لئے صرف ہاتھ کافی نہیں نہ محض سن لینے سے اس کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے اگر اس کو دریافت کرنا چاہو تو اول آنکھ پیدا کرو اسی طرح جو لوگ قرآن میں تاویلیں کرتے ہیں وہ اپنی رائے سے قرآن کے معنی بیان کرتے ہیں تو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہاتھ سے رنگ کا دریافت کرنا جس طرح محض ہاتھ سے رنگ دریافت نہیں ہو سکتا اسی طرح محض رائے سے قرآن کے مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

برہوا تاویل قرآں می کنی　　پست کثر شد از تو معنی سنی

(تم تو اپنی خواہشات پر قرآن کی تاویل کر رہے ہو تمہاری وجہ سے تو قرآنی عمدہ معنے پست اور ٹیڑھے ہو گئے)

چوں ندارد جاں تو قندیلہا　　بہر بینش می کنی تاویلہا

(جب تمہاری جان انوار الٰہی کی قندیلیں نہیں رکھتی تھی تو اب تم ان معنی کے دیکھنے کیلئے تاویلیں ہی کرو گے)

کردہ تاویل لفظ بکررا　　خویش را تاویل کن نے ذکر را

(تم نے اچھوتے لفظ کی تاویل کر ڈالی مگر تم اپنے میں تاویل کرو۔ ذکر الٰہی میں تاویل نہ کرو)

صاحبو اپنے اندر تصرف[1] کرو کلام اللہ میں تصرف[1] نہ کرو اپنی آنکھیں کھولو اور اس سے حجاب اٹھاؤ پھر دیکھو تم کو کیا کنز مکنون[2] نظر آتا ہے۔

---

[1] خبر ہونا [2] علمی و احساسی قوت

حب دنیا کا حجاب حقیقت ہونا

اور وہ حجاب حب دنیا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ مال و جاہ کی محبت بہت بڑا حجاب ہے اسی کی محبت تھی کہ بنی اسرائیل کے علماء باوجودیکہ ان کو آپ کا نبی ہونا معلوم تھا لیکن ایمان نہ لائے تھے جانتے تھے پر مانتے نہ تھے۔ یعرفونہ‘کمایعرفون ابناء ھم (یہ لوگ رسول اللہ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) لیکن باوجود اتنی معرفت کے ان کو حقیقت نظر نہ آتی تھی کیونکہ حب مال و جاہ کا حجاب آنکھوں پر پڑا ہوا تھا اور جب حقیقت معلوم نہیں ہوتی تو دل میں وقعت اور عظمت نہیں ہوتی۔ دیکھئے اگر کوئی آگ میں کو دے تو اگر چہ کہا جاوے گا کہ یہ آگ کو جانتا تھا لیکن یہ نہ کہا جائے گا کہ آگ کی حقیقت اس کی نظر میں تھی اور جتنے جرائم اس قسم کے لوگ کرتے ہیں اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کو اصلی حقیقت اس چیز کی معلوم نہیں ہوتی۔ اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی کنوئیں میں گر جاتے ہیں لیکن گرنے کے بعد جب ان کو کنوئیں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اس وقت کوئی ان سے پوچھے کہ کنوئیں میں گرنے کی بابت اب آپ کا کیا فتویٰ ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب نے کسی بات پر طیش میں آ کر سنکھیا کھا لیا۔ کھا تو گئے لیکن کھانے کے بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو آنکھیں کھلیں پھر یہ حالت تھی کہ لوگوں سے التجائیں کرتے تھے کہ کسی طرح مجھے اس سے نجات دلواؤ تو بنی اسرائیل کو اگر چہ معرفت تھی لیکن آپ کی حقیقت ان سے مخفی تھی۔ اس لئے کہ حجاب مرتفع نہ ہوئے تھے۔ اور ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد ۔۔۔ صد حجاب از دل بسوئی دیدہ شد

(جب غرض آ گئی تو ہنر چھپ گیا سینکڑوں حجاب دل سے آنکھ تک آ گئے)

حب دنیا کے ازالہ کی ترغیب اور اس کا طریقہ

پس آپ ان حجابوں کو دور کر دیجئے حقیقت بالکل قریب ہے بلکہ حقیقت الحقائق جل

۱؎ ردوبدل کہ دل میں انوار و برکات پیدا کرد۔ ۲؎ ردوبدل یعنی تحریف ۳؎ چھپا خزانہ

وعلیٰ نحن اقرب الیه من حبل الورید (ہم اس کی طرف شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں)

حکایت: حضرت بایزید بسطامیؒ نے خدا تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا کہ یا رب دلنی علیٰ اقرب طرق الیک کہ اے خدا مجھے آپ تک پہنچنے کا وہ راستہ بتلا دیجئے جو سب سے زیادہ قریب کا ہو۔ سبحان اللہ کیسے سچے رہبر تھے کہ ہمارے لئے کتنا سہل راستہ تحقیق کر گئے۔ یہ آج کل جو لوگ آسانی سے منزلیں طے کرتے چلے جا رہے ہیں انہیں حضرات کا طفیل ہے۔ غرض خواب میں عرض کیا اے خدا مجھے قریب کا راستہ بتلا دیجئے۔ ارشاد ہوا کہ یا ابا یزید دع نفسک و تعال

کہ پندار[1] اور خود بینی چھوڑ دو پھر راستہ سیدھا ہے بے خطر چلے آؤ اس مضمون کو عارف شیرازیؒ نے ترجمہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

میان[2] عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست   تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

حقیقت میں سچ کہا ہے صاحبو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس دولت حب خداوندی ضرور ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بدیہی ثبوت بھی ہے کہ ہم لوگ اپنے خیال میں جس کو دین سمجھتے ہیں اگر کسی کو اس کے خلاف دیکھتے ہیں تو ہم کو اس پر کس قدر طیش آتا ہے کہ اس کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں اور دل کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ آخر یہ نفرت اور وحشت کیوں ہے اس لئے کہ وہ طریق جس کو ہم دین سمجھتے ہیں ہمارا محبوب ہے کیونکہ وہ ہمارے خیال میں خدائی راستہ ہے جو کہ خدا نے ہم کو بتلایا ہے۔ پس ہماری محبت کی ایسی مثال ہے جیسے کہ راکھ کے نیچے چنگاری دبی ہوتی ہے کہ اگر اس کو چھیڑا اور کریدا نہ جائے تو وہ نظر بھی نہیں آتی لیکن وہی چنگاری جب راکھ سے باہر نکلتی ہے تو شہر کے شہر جلا دینے کو کافی ہوتی ہے۔

---

[1] اپنے کو کچھ سمجھنا اور اپنے کو دیکھنا [2] عاشق و معشوق یعنی انسان و خدا کے درمیان کوئی بھی چیز حائل نہیں۔ حافظ تم خود ہی اپنے لئے حجاب و رکاوٹ بن رہے ہو بس درمیان سے نکل جاؤ یعنی خود کو نیست کر دو خواہشات اور اپنے کو کچھ سمجھنا فنا کر دو۔

مسلمان کو جس شے سے بھی محبت ہوتی ہے وہ حب حق ہی کا ظل[۱] ہے

اور اگر کسی کو اب بھی شک رہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر براہ راست خدا سے محبت معلوم نہیں ہوتی تو اس شخص کو کسی سے تو محبت ہوگی۔ کم از کم اپنی جان سے تو ہی محبت ہوگی ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محبت کسی نہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے علم و فضل و حسن صورت، حسن سیرت اور تیسرا مقدمہ یہ ہے اور مسلم ہے کہ ہر کمال[۲] ظل کمال خداوندی ہے تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہو واقع میں کمال خداوندی کا عاشق ہے اور یہی معنی ہیں محبت خدا کے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ دیکھی اور اس کی وجہ سے وہ دیوار کا عاشق ہو گیا اس صورت میں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شخص واقع میں دیوار کا عاشق نہیں آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا تھا یعنی نور اور وہ کمال واقع میں آفتاب کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے اور اس سے وہ نور زائل ہو جائے تو عشق بھی زائل ہو جاتا ہے۔ اسی کو کہا ہے

عشق بامردہ نہ باشد پائیدار ۔۔۔ عشق را با حی و باقیوم دار

(مر جانے والے کے ساتھ عشق کرنا پائیدار نہیں ہوسکتا۔ عشق تو اس ذات سے رکھو جو ہمیشہ زندہ اور سب نظام والی ہے)

عشق ہائے کز پئے رنگے بود ۔۔۔ عشق نبود عاقبت ننگے بود

(یہ جو عشق رنگ روپ کی وجہ سے ہوتے ہیں حقیقت میں عشق ہی نہیں انجام کار شرم و عار ہوتے ہیں)

عاشقی بامردگاں پائندہ نیست ۔۔۔ زانکہ مردہ سوے ما آئندہ نیست

(مر جانے والوں کے ساتھ عشق کرنا دیر تک رہنے والا ہی نہیں کیونکہ مردہ پھر ہمارے پاس آنے والا نہیں)

---

[۱] سایہ یا پرتو [۲] یعنی اصل کمالات تو صرف حق تعالیٰ کے ہی ہیں۔ انہی کا پرتو کچھ کچھ کسی کسی کو عطا ہوا ہے تو اس پرتو پر عشق اصل پر ہی عشق ہے گو اصل کی خبر نہ ہو یا اس کی طرف توجہ نہ ہو اور اسی کو اصل سمجھ کر دھوکہ میں مبتلا ہو

جس میں جو کمال ہے وہ کمال حق ہی کا ظل ہے

علیٰ ہذا جس چیز کا بھی جو کمال ہے وہ واقع میں کمال خداوندی کا ظل ہے خود اس کا ذاتی نہیں دیکھئے۔ ہر چیز ہر کمال کے ساتھ اگر ایک وقت متصف ہے تو دوسرے[1] وقت اس سے خالی بھی ہے تو اس خلو[2] کی یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک وہ کمال خدا تعالیٰ کی جانب سے عطا نہیں ہوا۔ اسی طرح جب اس کے ساتھ اتصاف ہوتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ ادھر سے فیضان ہو گیا اسی لئے بزرگ لکھتے ہیں۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے ہی حسن کو آپ نے خوبصورتوں کے چہرے سے ظاہر کر دیا ہے لہٰذا آپ نے عاشقوں کی نظر میں ہر جگہ سے اپنے کو ہی جلوہ دیا ہے)

اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو حسینوں کے ساتھ اتحاد ذاتی ہے یا اس نے ان میں حلول کیا ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو ایمان کے بالکل خلاف ہے اور کفر ہے اور کوئی عامی بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اگر ذرا سمجھ سے کام لے چہ جائیکہ کسی صاحب[3] دل کے کلام کے یہ معنی ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ذات مجتمع الصفات[4] کے مظہر ہیں اور اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل کی اس موقع پر ضرورت نہیں یہ فن کا مستقل مسئلہ ہے غرض جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ عشق کمال سے ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گئی کہ عشق کمال سے ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہر کمال واقع میں کمال خداوندی ہے اگر چہ وہ دوسرے کے اندر نظر آئے تو یہ بات بلا شک ثابت ہو گئی کہ ہر عاشق خدا کا عاشق ہے۔

محبّ کے ذمہ محبوب کے جو حقوق ہوتے ہیں ہم کو حق تعالیٰ سے اسی طرح کا تعلق رکھنا چاہیے اور اس کی نوعیت

اس کے معلوم کر لینے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا

---

[1] اگر اس کی ذات ہی کی وجہ سے ہوتا تو جب تک ذات رہتی برابر رہتا۔ [2] خالی ہونا۔ [3] جس کے دل میں اللہ کے ساتھ کی نسبت قائم ہو [4] تمام صفتوں کو جمع رکھنے والی ذات کی صفتوں کے ظاہر ہونے کی جگہ ہیں۔

ہے اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت اور وقعت ہوتی ہے کیا اگر کسی عاشق کو اس کا معشوق حکم کرے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے وقت چلچلاتے ہوئے دوپہر میں چار کوس تک برہنہ پا چلتے ہوئے ریت پر چلنے کا حکم کرے تو وہ عاشق انکار کرے گا یا اس سے اس حکم کے مصالح پوچھے گا۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی مدعی عشق اپنے معشوق کے حکم پر لم اور[1] کیف کرے تو کیا اس کو اس دعوے میں سچا کہا جائے گا۔ کبھی نہیں ظاہر ہے کہ اگر اس کو سچا عشق ہو گا تو اس کے بلانے پر دوڑا ہوا آئے گا۔ بلکہ اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہ رکے گا۔ اور کہے گا کہ مجھ میں امتثال[2] کی وہ حرارت بھری ہے کہ یہ روک اس کے سامنے کچھ بھی نہیں غرض کسی قسم کے کسی امر و نہی میں اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا۔ لوگ اس کی حرکات پر اس کو دیوانہ بتلائیں گے۔ پاگل کہیں گے مگر اس کو ان خطابوں سے ذرا عار نہ ہوگی بلکہ وہ نہایت خوش ہوگا اور کہے گا کہ

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر گمنام ہیں اگر دیوانے ہیں تو اسی ساقی کے اور اسی کے پیمانہ مست ہیں)

جس طرح آج کل کے عقلاء علماء دین کو نیم وحشی وغیرہ وغیرہ خطاب دیتے ہیں لیکن وہ نہایت مسرور ہیں اس واسطے کہ ان کا یہ مذہب ہے کہ

عذل العواذل حول قلبی التائه　　　و ھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

کہ ملامت گر کی ملامت تو قلب کے باہر ہے اس کے اردگرد چکرا کر رہ گئی ہے اور محبت سویدائے[3] قلب تک پہنچ کر جاگزیں ہو چکی ہے الحاصل جب معلوم ہوا کہ عاشق کو معشوق کے ساتھ یہ برتاؤ چاہیے اور ہم خدا کے عاشق ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو ہم کو بھی اس کے ساتھ یہی برتاؤ رکھنا چاہیے اور اس کے احکام کے امتثال[4] میں بے چوں و چرا گردن جھکا دینی چاہیے۔

حکایت: مولانا محمد یعقوب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالب[5] علمی کو چوں و چرا

---

[1] کیوں اور کیسے　[2] حکم کی تعمیل کے جوش کی آگ　[3] دل کے اندر کا سیاہ نقطہ　[4] تعمیل میں بغیر کیوں اور کیسے کے　[5] ہر وہ طالب علم کہ کیسے ہے اور کیوں ہے نہ کرے اور ہر وہ درویش کہ کیسے ہے اور کیوں ہے کرے دونوں کا چراگاہ میں بھیج دینا چاہیے یعنی وہ جانور ہیں آدمی نہیں۔

نکند و ہر درویشے کہ چون و چرا کند ہر دورادر چراگاہ باید فرست۔

وجہ یہ ہے کہ طالب علم تعلیم کے وقت طلب فن میں ہے اور حصول فن کے لئے لازمی ہے کہ سوالات کرے اور قیل وقال سے مسئلہ کی تہہ تک پہنچے اور سالک سلوک طے کرتے وقت عمل میں مشغول ہے اس کے لئے جرح وقدح[1] موجب حرماں اور سبب ہلاکت ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک حکیم کے مطب میں کچھ مریض بھی علاج کرانے کو آئیں اور کچھ لوگ طلب فن کے لئے درسیات طب پڑھنے بھی آئیں۔ پس اگر ان طالبین فن میں سے کوئی شخص درس کے وقت بالکل خاموش بیٹھا رہے اور کسی قسم کا سوال نہ کرے تو وہ طبیب اس کو نالائق کہہ کر درس سے اٹھا دے گا۔ لیکن کوئی مریض نسخہ لکھواتے وقت کسی قسم کا چون و چرا کرے اور ادویہ یا ان کے اوزان کی حکمت دریافت کرنے لگے تو اس کے ساتھ بھی وہی[2] برتاؤ ہوگا۔ غرض طالب علم کا گڑبڑ کرنا اور حکمت و مصلحت دریافت کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع نہیں اور عوام کا چون و چرا کرنا برا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع ہے لیکن یہ مرض کچھ ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص احکام کی حکمتیں دریافت کرنے کے درپے ہے۔ اور اپنے کو حکمتیں سمجھنے کے قابل سمجھتا ہے۔

حکایت: ایک شخص نے جو کہ پٹواری گری کرتے تھے۔ میرے پاس ایک مسئلہ فرائض کا بھیجا۔ صورت مسئلہ یہ تھی کہ ایک شخص مرا اور اس نے ایک بھتیجا اور ایک بھتیجی چھوڑی میں نے جواب دیا کہ بھتیجے کو حصہ پہنچے گا اور بھتیجی محروم ہوگی۔ کہنے لگے کہ آخر اس کی کیا وجہ بھتیجی بھی تو اس بھتیجے کی بہن ہے اس کو کیوں نہیں ملے گا۔ میں نے کہا کہ جناب آپ پٹواری گری کرتے ہیں اس کو چھوڑیئے اور آ کر درسیات شروع کیجئے تین چار برس تک عربی کی کتابیں پڑھیئے اس کے بعد پھر دریافت کیجئے تو بتلا دیں گے۔ راز اس میں وہی ہے کہ طالب علم طالب فن ہوتا ہے اور عوام محض عمل کے لئے مسئلہ دریافت کرتے ہیں[3] ان کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ حکم مسئلہ کا معلوم ہو جاوے وبس۔ دوسرے ایک راز اس میں

---

[1] محرومی کا ذریعہ [2] نکال دے گا۔ [3] دوسری بات یہ بھی ہے کہ بہت سی مصلحتیں علوم اور اصلاحات سے سمجھ میں آ سکتی ہیں اور عام آدمی ان سے خالی ہوتا اور اگر وہ تمام ضروری علمی و اصلاحی باتیں بھی بیان کر دی جائیں تو وہ ایک دم سے نہ ذہن میں آ سکتی ہیں نہ جم سکتی ہیں وہ تو رفتہ رفتہ علوم حاصل کرنے سے ہی حاصل ہوتی اور جم جاتی ہیں۔

یہ بھی ہے کہ طالب علم کو یہ تمیز ہوتی ہے کہ کون سی بات دریافت کرنے کے قابل ہے اور کون سی نہیں اس لئے وہ جو کچھ دریافت کرتا ہے سمجھ بوجھ کر کام کی بات پوچھتا ہے برخلاف عوام کے کہ ان کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔

حکایت: ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی میں نے بطور نظیر کے ان سے کہا کہ اول تو یہ بتلایئے کہ آپ کی ناک[1] چہرہ پر کیوں لگائی گئی۔ کمر پر کیوں نہ لگائی گئی۔ جب اس ترتیب کے وجوہ اور مصالح سب آپ کو معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اوقات نماز کی تعیین کے مصالح دریافت کیجئے گا۔ غرض جس کو فن سے مناسبت نہیں ہوتی اس کا بولنا ہمیشہ بے موقع ہوتا ہے۔ اور اس لئے وہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

حکایت: ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ بیٹھے ہوئے کچھ بیان فرما رہے تھے۔ اور لوگ لکھ رہے تھے اور پوچھ بھی رہے تھے۔ ان ہی میں ایک شخص بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی تم بھی کچھ پوچھو عرض کیا اب پوچھوں گا بیان میں آپ نے فرمایا کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار میں دیر نہ کرے اس شخص نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ بولوں امام صاحب نے فرمایا کہو تو کیا کہتا ہے کہ اگر کسی روز آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کریں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تمہارا خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔

حکایت: اسی طرح مشہور ہے کہ ایک دلہن بالکل بولتی ہی نہ تھی اس کی ساس نے اس سے کہا کہ دلہن تم بھی بولا کرو۔ تم خاموش کیوں رہتی ہو۔ دلہن نے کہا کہ بہت اچھا اب بولوں گی چنانچہ ایک روز بولی ساس کو خطاب کر کے کہنے لگی کہ اماں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر تمہارا لڑکا مر گیا تو میرا نکاح کسی دوسرے سے بھی کر دو گی۔ ساس نے کہا کہ دلہن بس تم خاموش ہی رہا کرو۔ تمہارے لئے وہی بہتر ہے۔ تو دیکھئے تمیز نہ ہونے کی وجہ سے بات بھی پوچھی تو کیسی خوبصورت کہ ساس کا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔

---

[1] یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کو تکوینی یعنی بندہ کے اختیار کے بغیر کیا جاتا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ مگر شرعی یعنی جو بندہ کے اختیار کرنے کا ہے تو ایک حکم کی وجہ کی فکر ہے اور ایک کی نہیں معلوم ہوتا ہے نفس کی چالاکی ہے وہ کام کو ٹالنے کی راہ ڈھونڈتا ہے یہ خطرناک بات ہے۔

احکام شریعت کے امتثال[1] میں ہماری حالت بالکل عاشق کی طرح ہونی چاہیے

صاحبو شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہونا چاہیے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک[2] کا مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔

حکایت: مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے۔ اس نے کہا کہ جو آپ مقرر کریں۔ پھر آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے۔ غلام نے کہا کہ جو آپ کھلائیں۔ اسی طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ پہنائیں وہی لباس ہے۔ تو صاحبو کیا خدا سے جو علاقہ ہے وہ غلامی نہیں ہے۔ بلکہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خدا کے ساتھ ہم کو حقیقی غلامی حاصل ہے۔ دیکھو انسانی غلامی سے انسان ایک وقت نکل بھی سکتا ہے۔ یعنی جبکہ آقا غلام کو آزاد کر دے برخلاف ہماری غلامی کے کہ یہ طوق ہماری گردن سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا ہے کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی یہی صورت ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے اور یہ غیر ممکن ہے تو ہماری آزادی بھی غیر ممکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری آزادی محال عقلی ہے اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلام ہیں۔ تو ہم کو غلامی ہی کا برتاؤ بھی کرنا چاہیے اور کسی کے حکم کے امتثال میں گرانی نہ ہونی چاہیے۔ اور میں کہتا ہوں کہ احکام کے دشوار معلوم ہونے سے ان میں کسی قسم کا شبہ کرنا تو بالکل لغو ہے کیونکہ احکام کا نفس پر گراں گزرنا یہی تو دلیل ہے اس حکم کے خداوندی حکم ہونے کی کیونکہ جو حکم نفس کے موافق ہو اس کو تو نفس خود ہی اپنے لئے تجویز کر لیتا ہے اس میں کسی دوسرے کے حکم کرنے کی کیا ضرورت۔ تو خدا کی جانب سے تو وہی احکام مقرر ہوں گے جو کہ نفس پر گراں ہوں تا کہ خدا تعالیٰ دیکھیں کہ جو کچھ کرتے ہو اس سے اپنے نفس کا خوش کرنا منظور ہے یا خدا کا اور اس خوش کرنے میں بھی ہماری ہی مصلحت ہے نہ کہ خدا کی۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم　　بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

(میں نے اسلئے مخلوق کو پیدا نہیں کیا کہ اپنا کوئی نفع کروں بلکہ اسلئے کہ اپنے بندوں پر خوب سخاوت کروں)

---

[1] تعمیل کرنے میں [2] غلام

اتنا وسیع نظام عالم ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے اور ہمیں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ ہر طرح ہماری ہی مصلحتوں پر نظر ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہماری مصالح حال کی بھی جن کو ہم نے اختراع[1] کر کے مصلحت کا لقب دیا ہے ان احکام میں رعایت ہو لہٰذا ہم کو بھی یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ فی الحال[2] ہماری کیا مصلحت ہے بلکہ اگر مصالح حال پر نظر ہوتی تو احکام بتلانے کی ہی کیا ضرورت تھی جب ہم نے مصالح کو اختراع کیا ان کے مناسب تجاویز بھی سوچ سکتے تھے۔

احکام شرعیہ کو حقیقت نہ جاننے کے سبب بظاہر نفس کو گراں معلوم ہوں لیکن واقع میں خیر وہی ہے

غرض احکام کی سختی وسوسہ کا سبب ہوتی ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سختی ہی ان احکام کے من اللہ[3] ہونے کی دلیل ہے دیکھئے جب بچہ کا دودھ چھوڑاتے ہیں تو کیسی کچھ مصیبت ہوتی ہے کتنی تکلیف بچہ کو پہنچتی ہے اور دودھ پینے کے لئے کیا کچھ ضد یں کرتا ہے لیکن اس کی ایک نہیں سنی جاتی بلکہ کبھی ایلوا لگا کر کبھی کسی دوسری تدبیر سے اس کو دودھ پینے سے روکا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماں باپ بچہ سے زیادہ اس کی مصلحتوں کو جانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس وقت اس کی مرضی کے موافق کیا گیا تو جوان ہو کر تباہ ہو گا اور ساری عمر اسی بلا میں مبتلا رہے گا۔ بعینہ یہی حالت انسان کے نفس کی ہے ارشاد ہے۔

لو اتبع الحق اھواء ھم لفسدت السمٰوٰت و الارض و من فیھن کہ اگر حق ان کی خواہش کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان سب خراب اور برباد ہو جائیں۔ بس ہمارے لئے یہی شفقت ہے کہ ہماری ایک نہ سنی جائے جس طرح بچہ کی رائے کو نہیں سنا جاتا اور محض اس وجہ سے کہ جوان ہو کر جو اجزائے بدن حرارت سے تحلیل[4] ہوتی ہیں ان کے لئے صرف دودھ[5] بدل تحلیل نہیں ہو سکتا بچہ کی ضد کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بچے اور اس کے ماں باپ کا علم باوجود متفاوت ہونے کے پھر بھی کسی درجہ میں متقارب[6] ہے کیونکہ دونوں

---

[1] گھڑ کے تجویز کر کے [2] اس وقت یعنی دنیا میں اور آخرت میں تو ثواب اور جنت اور خوشنودی ہے ہی [3] اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ [4] گھل گھل جاتے ہیں [5] گھل جانے والے جزوں کا بدلہ [6] قریب قریب ہے کہ دونوں انسانی محدود علم رکھتے ہیں گو ایک کم بہت کم دوسرا زیادہ

متناہی[1] ہیں اور متناہیین[2] کا تقارب ظاہر ہی ہے۔ برخلاف بندے کے علم اور خدا کے علم کے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کے علم کو بھی خدا کے علم سے کوئی تناسب[3] نہیں ہے کیونکہ مجموعہ کائنات کا علم کیسا کچھ بھی ہو پھر بھی متناہی[4] تو ضرور ہوگا۔ برخلاف علم خداوندی کے کہ وہ غیر متناہی[5] ہے۔

خوب کہا ہے

اگر آفتاب ست یک ذرہ ایست　　　　وگرہفت دریاست یک قطرہ ایست

(اگر آفتاب بھی ہے تو ان کے آگے ایک ذرہ کے برابر اور اگر ساتوں سمندر کا مجموعہ ہے تو ایک قطرہ کے برابر)

چوسلطان عزت علم برکشد　　　　جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب عزت کا بادشاہ جھنڈا بلند کرتا ہے تو سارا جہان عدم کے گریبان میں سر ڈال لیتا ہے یعنی سارا جہان بھی ان کے آگے مثل نہ ہونے کے ہو جاتا ہے)

وحدۃ[6] الوجود کے معنی اور اس میں عوام کی غلطی اور اس کی اصلاح

اور یہی[7] وہ کیفیت ہے جس کو اہل فن نے وحدۃ الوجود کہا ہے جو معنی عوام میں مشہور ہیں۔ کہ میں خدا اور تو بھی خدا اور در و دیوار بھی خدا۔ یہ معنی بالکل غلط ہیں اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی بالکل ہی موجود نہیں یہ بھی بالکل غلط ہے۔ اور قرآن حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ ارشاد خداوندی ہے **اللّٰہ خالق کل شیء وھو علیٰ کلی شیء وکیل** (الآیۃ) (اللہ تعالیٰ ہی ہر موجود چیز کو پیدا کرنے والے ہیں وہی ہر ہر موجودہ کے ذمہ دار ہیں) حقیقت میں یہ مسئلہ حالی[8] ہے۔ قالی نہیں وہ حال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی

---

[1] محدود [2] دو محدودوں کا کچھ نہ کچھ قریب قریب ہونا۔ [3] مناسبت اور قریب ہونا نہیں ساری مخلوق کا سارا علم بھی محدود ہی ہے۔ ان کا نامحدود [4] محدود [5] نامحدود یعنی بے حد و بے انتہا اس لئے قطرہ و سمندر کی نسبت نہیں ہو سکتی۔ [6] وجود کا ہونا یعنی یہ جو ہر ہر چیز کا وجود الگ الگ نظر آ رہا ہے حقیقت کی نظر میں وجود صرف ایک ہی ہے۔ [7] کہ ان کے سامنے ہر چیز مثل نہ ہونے کے ہے۔ [8] ایک حالت و کیفیت کی صورت ہے کہ جب صفات و ذات کا مشاہدہ ہوتا ہے کوئی اور نظر میں نہیں آتا تو کہہ دیتے ہیں کہ سوائے ان کے کسی کا وجود نہیں یعنی اور سب مثل نہ ہونے کے ہیں یہ نہیں کہ ہیں ہی نہیں لہٰذا صرف مجاز ہے۔ تحقیقی بات نہیں۔

ذات پیش نظر ہوتی ہے اس وقت دوسروں کا اور اپنا وجود کالعدم معلوم ہوتا ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص اگر کسی خیال میں منہمک ہو تو اس کو دوسری تمام چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا اگر کوئی اس کو آواز دیتا ہے تو وہ نہیں سنتا بلکہ بعض اوقات خاص خیالوں میں اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی سر کے پاس آ کر آواز دے تو مطلق خبر نہیں ہوتی اس کیفیت میں وہ شخص محاورے میں مجازاً کہہ سکتا ہے کہ لاموجود[1] الا الامر الفلانی لیکن ظاہر ہے کہ یہ کہنا واقع کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے اسی طرح وحدۃ الوجود بھی ایک اصطلاح ہے صوفیا کی کہ وہ اپنی اس قسم کی کیفیت وحدۃ الوجود کے عنوان سے مجازاً تعبیر کرتے ہیں جس طرح قرآن وحدیث کے محاورات میں مجاز کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح اصطلاح تصوف سے بھی ہے کیونکہ وہ بھی قرآن وحدیث ہی سے مستنبط ہے تو خلاصہ وحدۃ الوجود کا یہ نکلا کہ وجودات[2] متکثرہ گویا نہیں ہیں پس حکم وحدۃ[3] مجازاً ہوا اسی کو ان اشعار میں حل کیا ہے۔

اگر آفتاب ست یک ذرہ نیست ۔۔۔ وگرہفت دریاست یک قطرہ نیست

(اگر سورج ہے تو ان کے آگے ایک ذرہ کے برابر ہے اور اگر ساتوں سمندر ہیں تو ایک قطرہ کے برابر ہیں۔)

چو سلطان عزت علم برکشد ۔۔۔ جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب عزت کا بادشاہ جھنڈا بند کر دیتا ہے تو سارا جہان عدم کے گریبان میں سر ڈال دیتا ہے)

بلکہ ان اشعار ہی میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ موجودات کچھ ہیں۔ ضرور کیونکہ ذرہ اور دریا کے ساتھ است[4] کا حکم کیا گیا ہے۔ باقی آگے جو کہا ہے کہ ''جہاں[5] سر بجیب عدم درکشد'' اس سے بھی یہی مراد ہے کہ اس کا وجود کالعدم[6] ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ صاف عنوان سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں۔

---

[1] سوائے فلاں چیز کے اور کچھ موجود نہیں۔ [2] بہت سے وجودات اور ہر ہر چیز کا وجود [3] ایک ہونے کا حقیقت میں نہیں مجازی کہنے سے ہے کہ ان کے سامنے گویا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ [4] میں کہا گیا ہے تو کچھ ہیں [5] سارا جہان عدم کے گریبان میں سر ڈال لیتا ہے۔ [6] مثل نہ ہونے کے کہ وجود ہے تو مگر مثل نہ ہونے کے ہے۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید
خجل شد جو پہنائے دریا بدید

(برسات کے مہینہ کے بادل سے ایک قطرہ ٹپکا جب سمندر کی چوڑائی دیکھی تو شرمندہ ہوگیا)

کہ ایک قطرہ ابر سے[1] انا کذا وانا کذا کہتا ہوا چلا مگر دریا کی وسعت دیکھ کر شرمندہ ہو گیا۔ اور باوجود یہ کہ اپنے اندر نورانیت اور شفافی سب کچھ پایا تھا لیکن کہتا ہے۔

کہ جائیکہ اوہست من نیستم
گراوہست حقا کہ من نیستم

(کہ جہاں وہ ہے میں تو نہیں۔ اگر وہ ہے تو حق یہ ہے کہ میں تو بالکل کہتا ہوں کہ میں نہیں ہوں)

اس کے بعد شیخ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمترند
کہ باہستیش نام ہستی برند

(یہ سب جو کچھ ہے ان کے سامنے اس سے بہت ہی کم ہے کہ ان کے وجود کے سامنے اپنے وجود کا نام بھی لے لیں)

اگر چہ سب موجود ہیں لیکن ذات باری کے سامنے سب کی ہستی ہیچ ہے۔ زیادہ وضوح کے لئے اس کو ایک اور مثال میں سمجھو مثلاً کسی گاؤں میں جہاں سب جاہل ہوں ایک شخص قل[2] ھو اللہ کا حافظ ہو اور تمام گاؤں کے لوگ اس کو حافظ کہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی گاؤں میں کوئی ماہر قاری آ جائے جس کو علاوہ حفظ قرآن شریف ومشق کے سبعہ میں بھی مہارت ہو اور اس قاری کے سامنے کوئی شخص اس قل ھو اللہ کے حافظ کو حافظ کہہ کر پکارے تو اندازہ کیجئے کہ اس کی کیا حالت ہوگی۔ شرم سے گڑ جائے گا۔ اور اپنے کو قاری کے سامنے ہیچ تصور کرے گا۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے ہر شخص کے تمام دعاوی[3] انانیت اس وقت تک ہیں کہ جب تک اپنے اوپر نظر ہے۔ جس وقت کسی اپنے سے بڑے پر نظر پڑے اس وقت معلوم ہو کہ ہمارے کمالات کیا وقعت رکھتے ہیں۔ ایک اور حکایت لکھی ہے کہ

ایک گاؤں کا چوہدری اپنے بیٹے کے ساتھ چلا جا رہا تھا راستہ میں بادشاہ کا لشکر پڑا دیکھا اس کی صولت اور حشمت دیکھ کر ڈر گیا اور آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ لڑکے نے کہا ابا آپ کیوں ڈرتے ہیں اگر بادشاہ ہے تو کیا ہوا آپ بھی اپنے گاؤں کے چوہدری ہیں

---

[1] میں ایسا میں ویسا ہوں۔ [2] سورت کا۔ [3] میں یہ ہوں میں وہ ہوں کے دعوے

جواب دیا کہ بھائی اگر چہ چوہدری ہوں لیکن میری حکومت صرف اسی قطعہ گاؤں تک ہے اور وہ بھی جبکہ مجھ سے کوئی بڑا وہاں موجود نہ ہو یہ بادشاہ ہے اس کی حکومت سارے ملک پر ہے۔ میں اس کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں اس پر شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

تو اے غافل از حق چناں درد ہی ۔۔۔ کہ برخویشتن منصبے مے نہی

(اے حق تعالیٰ سے غفلت کرنے والے تو بھی اس گاؤں میں ایسا ہی ہے کہ اپنے اوپر کوئی نہ کوئی عہدہ ومنصب قائم کئے ہوئے یعنی جب ہوش آئیں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب کچھ بھی نہیں)

تحصیلدار اسی وقت تحصیلدار ہے کہ گورنر کے سامنے نہ ہو لیکن اس کے سامنے آنے کے بعد اس کی تحصیلداری ہیچ ہے۔ اگر گورنر کے سامنے کوئی اس کو حضور کہہ دے تو عرق عرق ہو جائے گا۔ بس یہی حالت وحدۃ الوجود[1] کی ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ جس وقت حضور[2] خداوندی ہوتا ہے۔ اپنی تعظیم سے بلکہ اپنے کو موجود کہنے سے شرم آتی ہے اور جس قدر حضور میں ترقی ہوگی اس کیفیت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ چنانچہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جو سب سے زیادہ اعلم باللہ ہیں چنانچہ ارشاد ہے[3] **انا اعلمکم باللہ**

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی اور اس کا راز اور صحابہ کا ادب

آپ کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے کہ باوجود آپ کے سرور عالم ہونے کے کس قدر سادگی آپ کے ہر ہر انداز میں تھی۔ بیٹھنے میں بھی آپ نے کوئی ممتاز جگہ نہیں بنائی۔ حتیٰ کہ لوگ زیارت کو آتے تو صحابہ سے دریافت کرتے۔ **من محمد فیکم** (تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون سے ہیں) صحابہ جواب دیتے کہ **ھذا الابیض المتکی** یہ جو گورے گورے سہارا لگائے بیٹھے ہیں اور سہارا لگانے کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ حضور کوئی گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھے تھے۔ عربی محاورہ میں ہاتھ پر سہارا لگانے کو بھی اتکا[4] کہا جاتا ہے یہ ضروری نہیں کہ تکیہ وغیرہ ہی ہو چلنے میں یہ

۱؎ کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے مشاہدہ کے وقت صرف وہی ایک وجود معلوم ہوتا ہے اور ہر چیز کا وجود گو وجود تو ہے مگر ان کے سامنے مثل نہ ہونے کے معلوم ہوتا ہے۔ ۲؎ بارگاہ ذات وصفات کے حضوری
۳؎ میں تم سب سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ جاننے والا ہوں۔ ۴؎ سہارا لگانا

حالت تھی کہ ہمیشہ ملے جلے چلتے تھے۔آ خر کیا وجہ تھی کہ باوجود یہ کہ آپ کی شان یہ ہے کہ ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(مختصر بات یہ ہے کہ بس اللہ کے بعد آپ ہی بزرگ ہیں)

بات یہ تھی کہ حضور ﷺ کو ذات باری کی عظمت ہمیشہ پیش نظر تھی غرض آپ کے کسی انداز سے بھی امتیاز اور بڑائی کی شان نمایاں نہیں ہوتی اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ جب حضورؐ مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ کے لوگ حضورؐ کو پہچان نہیں سکے حضرت صدیق اکبر سے مصافحہ کرتے تھے کیونکہ ان کے کچھ بال پک گئے تھے۔حضرت صدیق اکبر کا ادب دیکھئے کہ برابر خود ہی مصافحہ کرتے رہے اور حضور کو تکلیف نہیں ہونے دی۔اسی طرح دوسرے صحابہ بھی خاموش دم بخود بیٹھے رہے کیونکہ سب حکیم تھے۔اگر آج کل کوئی شیخ مجلس کے سوا غلطی سے کسی دوسرے سے مصافحہ کرلے تو جملہ حاضرین غل مچانا شروع کردیں۔اور جس سے مصافحہ کرلیا ہے تو اس کی تو ایسی بری گت بنے کہ الامان حتیٰ کہ جب دھوپ آئی اور حضورؐ کے جسد[1] مبارک پر شعائیں پڑنے لگیں تو حضرت صدیق اکبرؓ کپڑا تان کر کھڑے ہو گئے اس وقت حاضرین نے پہچانا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں۔اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہے۔انی اکل کما یاکل العبد کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکڑو[2] بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔صاحبو! یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔اس کی قدر اس وقت ہوگی کہ جب اپنے اوپر یہ کیفیت غالب ہو اور یہی راز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کھانا کھانے میں کوئی لقمہ گر جائے تو مٹی صاف کر کے کھالو۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا جلدی جلدی تناول فرمایا کرتے۔آج اس کو سخت عیب سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح کھاتا ہے کہ گویا کبھی اس کو کھانے کو نہیں ملا وجہ یہ ہے کہ جو چیز حضور ﷺ کو پیش نظر تھی ہم اس سے محروم ہیں۔صاحبو میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی والی ملک کسی معمولی سے آدمی کو بلا کر حلوا کھانے کو دے اور کہے میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ تو ذرا غور

---

[1] جسم [2] کامل حضوری پر تو بندہ کا آقا کے سامنے بیٹھ کر کھانا ہے بہت سکڑ کر نعمت کے ادب اور انتہائی عزت سے ہوگا۔اس طریقہ کو برا سمجھنے سے ایمان کا خطرہ ہے احتیاط کیجئے۔

کیجئے کہ یہ شخص کس طرح کھائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہر لقمہ کا انداز یہ ہوگا کہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ بڑی رغبت اور شوق سے کھا رہا ہے۔ اور یہی انداز اس وقت محبوب ہے اس کو طمع[1] کہنا ہرگز درست نہیں اور اگر فرض کرو کہ یہ طمع ہی ہے تو سمجھ لو کہ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(جب بادشاہ دین ہم سے طمع ولالچ ہی چاہیں تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ہوگی)

ہر عیب کہ سلطان بہ پسند و ہنر ست

(جو عیب بھی کہ بادشاہ اس کو پسند کرلے وہی ہنر ہے)

اور اگر کھاتے ہوئے کوئی لقمہ اس کے ہاتھ سے گر جائے تو یہ کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کو اٹھائے گا اور صاف کر کے کھا جائے گا۔ علیٰ ہذا یہ بھی سوچا کہ بادشاہ کے سامنے کس انداز سے بیٹھ کر کھائے گا۔ کیا اسی طرح جیسے اپنے گھر میں بیٹھ کر کھاتا تھا۔ کبھی نہیں بلکہ نہایت ادب سے بیٹھ کر کھائے گا۔ تو جب شاہان دنیا کے سامنے ان تینوں باتوں کا لحاظ ضروری ہے تو کیا خداوند عزوجل وعلا کے سامنے ضروری نہیں۔ آج کل کی تہذیب نری لفاظی رہ گئی ہے۔ جس میں اصل حقیقت کا نام و نشان بھی نہیں ہے بہتر ہے کہ اس میں ہ کی جگہ عین بدل دیا جائے کہ اسم[2] بھی مسمی کے مطابق پڑے۔

ظاہری افعال کا اثر بھی باطن پر پہنچتا ہے

اور صاحبو حضورؐ نے کھانے کے اداب کی تعلیم جو فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح باطنی حالات کا اثر ظاہری اعضا پر پڑتا ہے یوں ہی ظاہری ہیئت کا اثر بھی انسان کی اندرونی حالت تک پہنچتا ہے اگر ظاہری ہیئت پر رعونت[3] تکبر برستا ہے تو دل تک بھی اس کا چھینٹا ضرور پہنچے گا اور یہ ملکہ[4] بد دل میں ضرور پیدا ہونا شروع ہوگا۔ اور اگر ظاہری حالت منکسرانہ ہے تو دل میں بھی انکسار خشوع[5] تذلل کے آثار نمایاں ہوں گے اور سبب اس کا یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے ظاہر کو اتباع سنت سے آراستہ کیا اور راہ سنت پر گامزن ہوا اس نے کسی قدر

۱؎ لالچ ۲؎ نام بھی نام والی چیز کے موافق ہو جائے۔ تہذیب کی جگہ تعذیب وعذاب دینا ہو کیونکہ یہ تہذیب جدید تکلیف دینے والی ہی ہے۔ ۳؎ غرور ۴؎ بری عادت جو دل میں گڑی ہوئی ہے۔ ۵؎ عاجزی اور ناچیز ہونا۔

قرب کا قصد کیا اور وعدہ ہے کہ من تقرب الی شبراً تقربت الیه ذراعاً و من تقرب الی ذراعاً تقربت الیه باعاً (جو میری طرف ایک بالشت قریب آئے گا میں اس کی طرف ایک ہاتھ آؤں گا۔ اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب ہوگا میں اس کی طرف چار ہاتھ قریب ہوں گا) کہ جو میری طرف تھوڑا سا بھی بڑھتا ہے میں اس کی طرف بہت سا بڑھ جاتا ہوں اور ظاہر ہے کہ خدا کا قرب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ قرب باطنی میسر ہو جائے تو لازم آ گیا کہ درستی ظاہر سے قرب باطنی نصیب ہوتا ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے لوگ اگر دنیا سے پانی ڈھونڈتے ہیں تو پانی دنیا میں پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے)

وہ پانی ہے کہ پیاسے کو ڈھونڈنے نہیں ملتا بلکہ وہ خود پیاسے تک پہنچتا ہے یہ شرط ہے کہ پیاس ہو ورنہ خدا پر بار نہیں ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کو سر مڑھیں۔ ارشاد ہے انلزمکموها و انتم لها کٰرهون یعنی کیا ہم رحمت کو تمہارے سر مڑھ دیں باوجود یہ کہ تمہارے دلوں میں اس سے کراہت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو اس قدر خشوع و خضوع بڑھا ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ذات خداوندی حضور ﷺ کو ہر وقت پیش نظر تھی۔

عبدیت[1] و نیز عقلی مصلحت کا بھی یہی مقتضا ہے کہ علل[2] سے سوال نہ کیا جائے

اور جب یہ ہے تو ہم کو بھی سن کر بس یہی چاہئے کہ ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

(زبان کو آپ کی ذات صفات کے اقرار سے تازہ رکھتا ہے اور آپ کے کاموں کی وجہوں کو نکالنا نہیں ہے)

اور قطع نظر اس کے کہ یہ مقتضاء عبدیت کا ہے ہمارے لئے مصلحت عقلاً بھی یہی ہے اور اگر واقعی یہ کاوش ہمارے لئے مضر نہ ہوتی تو حضور ہم کو اجازت دیتے ممانعت نہ

---

[1] بالکل بندہ ہونے کا [2] علتوں اور حکمتوں کی وجہوں کا

فرماتے۔ حالانکہ حضور نے صاف ممانعت فرمائی۔ دیکھئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ حضور علیہ کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور جن کی فطرتیں بالکل سلیم تھیں۔ جب ان حضرات نے مسئلہ قدر[۱] میں گفتگو کی تو حضورؐ نے بالکل روک دیا اور بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ اگلی قومیں اسی کھود کرید کی بدولت ہلاک ہوئیں۔

احکام شرعیہ میں کھود کرید کرنے کے مضر ہونے کا راز

اور مضر ہونے کا سبب یہ ہے کہ جس طرح بہت سے امور استدلال سے حل ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں کہ ان میں استدلال کا گزر نہیں ان کے لئے مشاہدہ اور معائنہ کی ضرورت ہے اور وہ ہم کو نصیب نہیں تو ایسی باتوں میں لم کیف (کیوں' کیسا) کرنے کا بدیہی نتیجہ ہے کہ ہم تباہ ہوں اور خسر الدنیا والاخرۃ (دنیا اور آخرت میں ٹوٹے میں رہا) ہماری حالت ہو مجھے اس کے مناسب ایک حکایت یاد آئی۔

حکایت: مشہور ہے کہ ایک لڑکے نے اپنے نابینا استاد کی دعوت کی اور کہا کہ میں آپ کو کھیر کھلاؤں گا استاد صاحب نے چونکہ کھیر نہ کبھی دیکھی تھی نہ ابھی تک کھانے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے لڑکے سے پوچھا کہ بھائی کھیر کیسی ہوتی ہے لڑکے نے جواب دیا کہ کھیر سفید ہوتی ہے استاد نے کہا کہ سفید کس کو کہتے ہیں۔ اس نے کہا جیسے بگلہ مگر استاد صاحب نے کبھی بگلہ بھی نہ دیکھا تھا اس لئے اس کی بابت بھی پوچھا اس نے ہاتھ سے بگلے کی ہیئت بتائی۔ استاد صاحب نے ہاتھ سے مس (چھوکے) کرکے دیکھا تو فرمانے لگے بھائی یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے۔ کیسے کھاؤں گا تو جیسے اس نابینا کے سمجھنے کی غلطی کی وجہ یہی تھی کہ معائنہ[۲] کی چیز کو بیان سے سمجھنا چاہتا تھا یہی حالت ہماری بھی ہے۔

اسرار[۳] احکام پر اطلاع کا حقیقی طریقہ

ہاں اگر سمجھنا چاہو تو اول قلب میں نور پیدا کرو خود بخود یہ کیفیات پیدا ہوں گی اور ہر چیز کی سینکڑوں حکمتیں نظر آنے لگیں گی۔ دیکھو اگر کوئی معمولی شخص کسی والی ملک سے کہے کہ

۱۔ تقدیر کے مسئلہ کی باریکیوں میں۔ ۲۔ دیکھی جانے والی ۳۔ شریعت کے حکموں کے رازوں پر

مجھے اپنے خزانے کے جواہرات دکھا دو تو اس کی سخت غلطی ہے اور کبھی یہ شخص کامیاب نہیں ہو سکتا البتہ کامیابی کی یہ صورت ہے کہ پہلے صاحب جواہرات سے ایک خاص تعلق پیدا کرے اور اس کے خواص میں داخل ہو جائے اس کے بعد بغیر درخواست ہی کبھی وہ مہربان ہو گا تو خود دکھلا دے گا اسی کو کہتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید وا وستا

(اپنے اندر انبیاءؑ کے جیسے علوم دیکھ لو گے۔ بغیر کتاب کے بغیر تکراری کے بغیر استاد کے)

علم چوں برتن زنی مارے بود علم چوں بردل زنی یارے بود

(علم کو جب تم بدن پر اثر ڈالنے والا کرو گے تو ایک سانپ بن جائے گا اور علم کو جب دل پر اثر ڈالنے والا بناؤ گے تو مددگار بن جائے گا)

تو دل پر مؤثر بناؤ اس کے بعد دیکھو کن علوم کا انکشاف ہوتا ہے اب لوگ چاہتے ہیں کہ ساری باتیں استاد کے سامنے بیٹھ کر حل کر لیں۔ حالانکہ یہ محض فضل خداوندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی جب کہ خدا تعالیٰ چاہیں کہ فضل اسی[1] خاص طریقہ سے ہو۔

بعض کے لئے اسرار پر اطلاع نہ ہونا ہی خیر اور مصلحت ہے اور اسی طرح احوال کا نہ ہونا بھی

کیونکہ کبھی کسی خاص شخص کے بارے میں یہی فضل ہوتا ہے کہ اس کو اسرار پر مطلع نہ کیا جائے جیسا کہ بعض کے لئے مطلع ہونا فضل ہوتا ہے۔

اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو جو کچھ اسرار معلوم ہونے لگتے ہیں تو ان کو ناز ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض بعض اپنے کو اکابر کے برابر سمجھنے لگتے ہیں لہٰذا اس کے لئے یہی[2] مناسب ہے جب ہر ایک کے لئے مصلحت جدا ہے تو خود کچھ بھی تجویز نہ کرو۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی نہ کیا کرو کیونکہ ہمارا آقا تو خود بندگی والوں کی پرورش کا طریقہ جانتا ہے۔ جو مناسب ہو گا عطا کریگا)

---

[1] پڑھنے پڑھانے سے [2] نہ معلوم ہونا

اسی واسطے یہ مذہب ہے کہ بلا اختیار جو وارد[1] بھی ہو اسی میں خوش رہو۔ اور خود ہرگز کسی خاص وارد کی خواہش نہ کرے گویا یہ مذہب ہونا چاہیے کہ۔

بدر و دصاف ترا حکم نیست دم درکش   کہ انچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

(تلچھٹ اور صاف دیکھنے کا تم کو حکم نہیں بس پی جاؤ کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ پیالے میں ڈال دیا ہے وہ لطف ہی لطف ہے)

اگر درد[2] پلائیں تب بھی اسی ذوق سے پینا چاہیے جس طرح مے صاف پی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی کوئی حکمت ضرور ہے۔

مگر ہم کو عبدیت کی حیثیت سے کسی مصلحت کی بھی طلب نہ چاہیے

بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر خلاف مصلحت بھی ملتا تب بھی ہم کو دم مارنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم کو اس نیت کی بھی مجال نہیں کہ[3] یہ ہمارے لئے مصلحت ہے کیونکہ آخر ہم ہیں کیا چیز کچھ بھی نہیں جو کچھ ملے جتنا ملے جس طرح ملے سب ان کا احسان ہے۔

حکایت: مشہور ہے کہ حضرت لقمان نے کسی شخص کے ہاں باغبانی کی نوکری کی ایک روز وہ باغ میں آیا اور ان سے کہا کہ ایک ککڑی لے کر آؤ آپ ایک ککڑی لائے آقا نے اس کو چھیل کر اس کی قاشیں کیں اور اول ایک قاش حضرت لقمان علیہ السلام کو دی آپ لے کر کھا گئے۔ اس کے بعد جو آقا نے کھائی تو معلوم ہوا کہ بالکل کڑوی ہے اس نے حضرت لقمان سے کہا کہ تم نے یہ تلخ ککڑی کھالی کیوں نہیں کہا یہ تلخ ہے۔ حضرت لقمان فرماتے ہیں کہ جس ہاتھ سے ہزاروں شیریں چیزیں کھائیں اگر ایک دفعہ تلخ بھی مل جائے تو شکایت نہیں کرنی چاہیے۔

آں راکہ بجائے تست ہردم کرمے   عذرش بزار گہے بہ بینی ستمے

(جس شخص کے ہر وقت تم پر کرم ہی کرم ہیں تو تم اسکا عذر قرار دو۔ اگر کبھی کوئی تکلیف دیکھو)

پس اگر کبھی ہماری مصلحت کے خلاف بھی ادھر سے برتاؤ ہو تو بھی ہمارے ادب میں فرق نہ آنا چاہیے۔ صاحبو عاشق تو ہر حالت میں عاشق ہی رہتا ہے۔ کیا لوگوں کے خیال

---

[1] دل پر جو کیفیت و حالت وارد ہو۔ [2] تلچھٹ اور گاد۔ [3] جو کچھ ملتا ہے مصلحت ہے یہ بھی خیال کرنے کا واقع میں تو حق نہیں۔

میں خدا سے برادری کا سا تعلق ہے کہ اس سے کاوش کی جاوے۔ دیکھئے عشاق کو تو جان جان کر ستایا جاتا ہے۔ مگر وہ یہی کہتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من — دل فدائے یار دل رنجان من

(تمہاری طرف سے ناپسند چیز بھی میری جان کے لئے پسند ہی پسند ہے دل دکھانے والے محبوب پر دل فدا ہو چکا ہے)

غرض جو شخص اپنی تربیت چاہتا ہے اور اس کو اسرار شریعت پر مطلع ہونے کی ہوس ہے تو اپنے اندر یہ کیفیت[1] پیدا کرے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

اصلاح باطن بدرجہ کمال نہ ہونے پر قدر ضروری کو تو نہ چھوڑے

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب کیا ہم جنید بغدادی بن جائیں میں کہتا ہوں کہ صاحب آپ جنید بغدادیؒ نہ بنیں لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ بالکل نکمے رہیں۔ غور کیجئے آپ جنید بغدادی کی برابر تو کسی بات میں بھی نہیں مثلاً ایک نماز ہی ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں جنید بغدادی کی برابر نماز پڑھتا ہوں ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ ایک رات قیام کی نیت کی ہے تو نیت باندھ کر ساری رات کھڑے ہی گزار دی ایک رات رکوع کے لئے تجویز کی ہے تو تمام رات رکوع[2] ہی میں ختم ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ افسوس رات بہت جلد ختم ہو جاتی ہے دل نہیں بھرتا یہ حالت تھی کہ ؎

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو — گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

بس جب کسی حالت میں بھی ہم ان کے برابر نہیں لیکن پھر بھی ہم کسی بات کو چھوڑ نہیں دیتے نماز بھی پڑھتے ہیں۔ روزہ بھی رکھتے ہیں مثل مشہور ہے کہ گندم[3] اگر بہم نرسد جو غنیمت است تو جب ساری چیزیں ہم میں ادنیٰ درجہ کی ہیں تو یہ حالت بھی ادنیٰ درجہ کی سہی۔

اہل اللہ سے تعلق کی ضرورت

اور اس کا طریق یہی ہے کہ کسی صاحب باطن سے تعلق پیدا کیا جائے اگر صحبت ممکن

---

[1] نور ہی نور [2] رات ختم ہونے کے قریب پہنچی ہوگی۔ تب باقی نماز پوری کر دی۔ شوق کی شدت میں یوں بے خودی ہوتی ہے۔ [3] اگر گندم نہ مل سکے تو جو بھی غنیمت ہے۔

ہوتو بہت ہی خوش قسمتی کی بات ہے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہوتو کم از کم مراسلت (خط و کتابت) تو ضرور رکھنی چاہیے۔ اوران پر اپنا پورا حال ظاہر کر کے علاج کی تدبیر دریافت کیجئے۔

اپنی رائے سے کوئی کام نہیں ہوتا دینی ہو یا دنیوی

صاحبو اگر اپنی رائے سے کوئی شخص اپنی اصلاح کی تدبیر سوچ کر چار گھنٹے اس میں مشغول رہنے کے لئے مقرر کر لے تو اس میں وہ بات حاصل نہ ہوگی جو کسی ماہر کی تجویز پر نصف گھنٹہ عمل کرنے میں حاصل ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں بخار میں مبتلا ہوا ایک طبیب سے رجوع کیا انہوں نے نسخہ تجویز کر دیا جس کے استعمال سے چند روز میں فائدہ ہو گیا۔ میں نے اس نسخہ کو مفید دیکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھا۔ اتفاق سے دوسرے برس پھر کچھ شکایت ہوئی تو میں نے اسی نسخہ کو منگا کر استعمال کیا لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد آخر پھر اسی طبیب سے رجوع کیا اوران کی تجویز کردہ نسخہ سے صحت ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اول حکیم صاحب کی زبان میں یا قلم میں کوئی خاص اثر رکھا تھا کہ صحت اس پر موقوف تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ نسخہ کی تجویز میں جس طرح مریض کے مزاج کی رعایت کی جاتی ہے زمان اور مکان کی رعایت بھی کی جاتی ہے یعنی ایام ربیع میں ایک نسخہ تجویز کیا جاتا ہے تو ایام خریف میں دوسرا۔ کیونکہ دونوں موسموں کے مزاج بالکل الگ الگ ہیں۔ اسی طرح سرد ملک میں جو دوا مفید ہوگی گرم ملک میں اس کا مفید ہونا ضروری نہیں ہے تو جیسے بدن کے امراض میں محض اپنی تدبیر اور رائے مرض کے زوال کے لئے کافی نہیں ہے یوں ہی نفسانی امراض میں محض اپنی تدبیر اور رائے مرض کے زوال کے لئے کافی نہیں ہے۔ یوں ہی نفسانی امراض میں بھی ہوتا ہے اور کہتا ہوں کہ اہل اللہ کی زبان میں بھی اثر ہے۔

اہل اللہ سے تعلق رکھنے کے متعلق وساوس کا رفع

اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے کو جو کہتا ہوں کہ کوئی شخص میری اس تقریر سے یہ نہ سمجھے کہ میں نوکری کرنے یا تجارت میں لگنے کو منع کرتا ہوں اور ترک تعلقات کی رائے دیتا ہوں۔ ہرگز نہیں بلکہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی اہل دل سے وابستگی پیدا کیجئے صاحبو یہ حضرات

نہایت ذی عقل ہوتے ہیں ان کو دین کی عقل کے ساتھ دنیا کی بھی عقل کامل ہوتی ہے ان کی نسبت یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ وہ اس وابستگی کے بعد تم کو تمہارے اہل وعیال سے چھڑا دیں گے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ سے جب کوئی خادم عرض کرتا کہ حضور جی چاہتا ہے کہ ملازمت چھوڑ دوں تو فرماتے کہ بھائی ایسا نہ کیجیو۔ نوکری بھی کرو اور خدا کی یاد میں بھی لگے رہو اور وجہ اس کی ممانعت کی یہ تھی کہ جانتے تھے کہ قلب میں قوت[1] توکل ہے نہیں ظاہری سہارے کو چھوڑ کر خدا جانے کن مصیبتوں میں پھنس جائے اور حالت کیا سے کیا ہو جائے۔ اکثروں کو ایسے واقعات پیش آئے کہ انہوں نے معاش کی تنگی کی وجہ سے نصرانیت یا یہودیت کو اختیار کیا۔ بعض کے دل میں خدا کی شکایت پیدا ہوگئی اور وہ یوں دین سے برباد ہو گئے تو اگر اپنی نوکری پر لگے رہیں گے تو زیادہ سے زیادہ کسی معصیت ہی میں مبتلا ہوں گے۔ کفر وشرک سے تو بچے رہیں گے۔ پس یہ حضرات چونکہ چہار طرف نظر رکھتے ہیں اس لئے باقاعدہ من[2] ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما کبھی ضعفا کو ترک تعلقات کی رائے نہیں دیتے اور جن لوگوں کو گوشہ نشینی اور ترک تعلقات کا حکم انہوں نے کیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن کو انہوں نے پورے طور سے جانچ لیا ہے اور دیکھ چکے ہیں کہ ان کی قوت توکل کامل ہے ایسوں کے لئے نہ ترک تعلق کی ترغیب مضر نہ اس پر عمل کرنا نقصان دہ تو اہل اللہ سے تعلق پیدا کرتے ہوئے اس کا بالکل خوف نہ کیجئے وہ ان شاء اللہ آپ کے قصد ترک پر بھی نہ چھوڑ[3]نے دیں گے۔

اپنی عقل رہبری کے لئے کافی نہیں

غرض یہ ہے کہ نری عقل سے اسرار کو دریافت کرنے کی فکر بے سود ہے اس کی تمنا ہے تو خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرو دیکھو تجربہ کاروں کا قول ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

---

[1] اللہ پر بھروسہ اعلیٰ درجہ کی قوت جس میں سب ذریعے اور اسباب ترک کئے جاتے ہیں وہ ایسی قوت پر ہیں کہ خواہ کچھ بھی گزرے دل میں کسی برے خیال کا واہمہ بھی نہ ہو سکے بغیر ایسی قوت کے توکل کا یہ درجہ جائز نہیں پھر وہی درجہ واجب ہے جو سب پر واجب ہے کہ ذرائع حاصل کریں اور پھر خدا پر بھروسہ کریں۔ [2] جو شخص دو مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے تو وہ ہلکی کو اختیار کرے [3] جب اعلیٰ توکل کی قوت نہ پائیں گے

کہ اول ہم نے عقل سے کام لیا وہ تھوڑی دور چلی مگر تھک کر رہ گئی آخر اس کو چھوڑا اور دیوانگی اور عشق کا دامن پکڑا اس نے منتہا[1] تک پہنچا دیا اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقل بالکل بیکار ہے عقل کار آمد ضرور ہے لیکن ایک حد تک کام دیتی ہے۔ اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے۔ عقل کی حالت گھوڑے کی سی ہے دیکھو اگر کسی کا محبوب ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہو اور یہ عاشق اس کے پاس پہنچنا چاہے اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلے تو ظاہر ہے کہ گھوڑا دامن کوہ تک پہنچ کر عاجز ہو جائے گا آگے جہاں سے پہاڑی زینہ شروع ہوا ہے وہاں گھوڑا نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ عاشق آگے بھی جانا چاہے تو اس کی کیا صورت ہے بجز اس کے کہ ع وزانجا[2] بیال محبت پری یعنی عشق کا جوش اپنے اندر پیدا کرے اور راہ طے کرتا چلا جائے غرض عقل سے کام لینا چاہیے لیکن صرف اس قدر کہ فلاں شخص مقتدا بنانے کے قابل ہے اور فلاں شخص نہیں۔ مریض کو عقل سے کام لینا ہے لیکن محض انتخاب معالج میں کیونکہ ایسا نہ کرے گا تو کثرت[3] مدعین طبابت سے وہی حالت ہوگی کہ ۔

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

(میرا خواب بہت بہت تعبیروں کی وجہ سے پریشان ہو گیا۔ حل نہ ہو سکا)

مگر انتخاب کے بعد پھر چوں و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جس راستہ معالج ڈال دے اس پر بے خوف و خطر چلا جائے۔ ورنہ اگر وہاں بھی این[4] چون ست وآں چراست سے کام لیا تو ایک قدم بھی نہ سرک سکے گا اور صدہا الجھنیں پیش آئیں گی اس لئے کہ معمولی عقل کبھی ایک فتوے پر قائم نہیں رہتی۔ صبح کچھ رائے دیتی ہے شام کو کچھ اور دن کو کچھ۔ بعضوں کو دیکھا ہے کہ آج اہل سنت و جماعت میں داخل ہیں۔ کل تشیع پر مائل ہیں۔ صبح کو قدری[5] ہیں۔ شام نہیں ہوئی کہ جبری بن گئے۔ یہ انقلاب اور تبدیلیاں اسی باعث ہیں کہ عقل ایک ٹھکانے نہیں رہنے دیتی۔ در[6] بدر خاک بسر پھراتی ہے گویا اس کی یہ حالت ہے۔

---

۱ آخر ۲ اور وہاں سے محبت کے پروں کے ذریعہ پرواز کرو۔ ۳ طبیب ہونے کے دعوے داروں کی بہتات کی وجہ سے۔ ۴ یہ کیسے ہے اور وہ کیوں ہے۔ ۵ جو انسان کی خودی کی ہر کام پر قدرت مانتے ہیں اور اس کو اپنے افعال کا پیدا کرنے والا مانتے ہیں اور جبری وہ جو انسان کو مجبور محض کہتے ہیں ۶ ہر ہر در پر سر پر خاک ڈالے

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری　　　　ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(میں اس پرانے خدا سے جسے تم رکھتے ہو بیزار ہوں میرے واسطے تو ہر دن ایک دوسرا تازہ خدا ہے۔)

حکایت: ابن العربی کا ایک خط اپنی کشکول میں علامہ بہاؤ الدین عاملی نے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک معاصر عالم کو لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک روز بیٹھے رو رہے تھے آپ کے کسی شاگرد نے وجہ پوچھی تو آپ نے وجہ بیان کی کہ میں اتنے سال سے ایک دعوے کو دلیل عقلی سے صحیح سمجھے ہوئے تھا آج ایک مقدمہ اس دلیل کا مخدوش ثابت ہوا تو میں اس لئے رو رہا ہوں کہ اتنے زمانے تک جہل میں مبتلا رہا۔ اور اب بھی اطمینان نہیں کہ جواب ثابت ہوا وہ بھی صحیح ہے اس کے بعد لکھتے ہیں کہ تم نے اپنے علم ظاہری کی قوت دیکھی اب چاہیے کہ دوسرا علم حاصل کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خلوت اور دوام ذکر اختیار کرو بس اس قسم کا مضمون لکھا ہے امام رازی اتنے تبحر[1] کے بعد جبکہ ان کو کچھ حقیقت شناسی کا ذائقہ نصیب ہوا اس وقت یوں کہتے ہیں۔

نہایۃ[2] اقدام العقول عقال　　و غایۃ سعی العالمین ضلال

و لم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　سوی ان جمعنا فیہ قیل یقال

(عقلوں کے قدموں کی انتہا صرف ایک باندھنے کی رسی ہے اور تمام جہانوں کی کوششوں کا اخیر گمراہی ہے اور ساری عمر کی بحث سے ہم کو اس کے سوا کچھ فائدہ نہ ملا کہ بس ہم نے یہ جمع کر لیا یہ کہا گیا ہے اور یہ جواب دیا)

کہ ساری عمر کے مباحث اور علوم کا نتیجہ جو اخیر میں کھلا تو یہ تھا کہ قیل کنا و قال فلان کذا (ایسے کہا گیا اور فلاں نے ایسے جواب دیا)

شیخ کامل کی علامات اور اس کے انتخاب کا طریقہ

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ انتخاب جو کیا جائے تو کس معیار

---

[1] علم کا دریا ہونے کے باوجود

پر کیا جائے کیونکہ آج کل عوام الناس نے عجیب وغریب معیار تراش رکھے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کا دربار نہایت عالی ہو۔ لوگوں کی آمد و رفت اس کی طرف زیادہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا بزرگ ہے۔ خصوصاً اگر امراء اور رؤساء کی جماعت بھی ادھر مائل ہو تب تو گویا ان کی بزرگی پر رجسٹری ہو گئی۔ حالانکہ میں نے ایک نہایت کامل اور ماہر فن جامع شریعت و طریقت شیخ سے سنا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس درویش کے پاس زیادہ تر دنیاداروں کا ہجوم ہو اور علماء و صلحاء کا ہجوم کم ہو تو تم ادھر متوجہ نہ ہو کیونکہ دنیاداروں کا گرنا اور دینداروں کا پرہیز اس درویش کے نقص کی دلیل ہے اس لئے الجنس یمیل الی الجنس (ہر جنس اپنے ہم جنس پر جھکتی ہے) کبوتر با کبوتر باز با باز[1] تو وہ درویش بھی دنیادار ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک معیار بزرگی اس کے علاوہ ایک اور دوسرا امر ہے وہ اس سے ذرا دقیق[2] ہے وہ یہ ہے کہ اکثر کم سمجھ یوں سمجھتے ہیں کہ جس شخص میں کشف و کرامات زیادہ ہو خوارق[3] کا صدور اس سے زیادہ ہوتا ہو وہ سب سے بڑا بزرگ ہے حالانکہ یہ معیار بھی بالکل لغو ہے کیونکہ کشف و کرامات کا صدور کثرت ریاضت و مشاقی وصحت قوائے جسمانی ونفسانی پر موقوف ہے۔ جس میں سب باتیں جمع ہوں گی اسے کشف ہونے لگے گا اگرچہ وہ کافر ہی ہو۔ ایسے واقعات بکثرت سننے میں آئے اور نہ بھی سنتے تب بھی یہ بات ظاہر تھی دیکھو دجال جو کہ مدعی الوہیت[4] ہو گا کیسے کیسے شعبدے اس سے ظہور پذیر ہوں گے۔ بارش تک کر کے دکھا دے گا۔ زمین کے خزانے اس کے ہمراہ چلیں گے پس ظاہر ہوا کہ خوارق کا صدور بھی صحیح معیار نہیں اب صحیح معیار دریافت کرنے کے لئے اول یہ سمجھو کہ انسان کے لئے سب سے بڑا کمال اس کی وہ حالت ہے جس کے لئے اس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ کشف و کرامت کے لئے انسان کو دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو دنیا میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی عالم ارواح میں اس پر بہت کچھ منکشف تھا۔ نیز مرنے کے بعد کافر تک کو بہت سے مغیبات منکشف ہو جائیں گے ارشاد ہے۔ وبدالهم[5] من الله مالم یکونوا یحتسبون

---

[1] کبوتر کبوتر کیساتھ اور باز باز کے ساتھ اڑتا ہے۔ [2] باریک [3] معمول و عادت کے برخلاف کام جو دوسرے لوگوں سے نہ ہو سکے۔ [4] خدا کا دعویدار [5] اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وہ باتیں ظاہر ہو گئیں جن کا وہ گمان بھی نہ کر سکتے تھے۔

حق تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں صرف عبدیت ہی کے لئے بھیجا ہے

پس معلوم ہوا کہ دنیا میں اس کو کسی دوسری بات کے حاصل کرنے کو بھیجا گیا ہے اور وہ حالت عبدیت ہے۔ یعنی دنیا میں انسان کو تو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ امتثال اوامر ونواہی کر کے عبدیت حاصل کرے کیونکہ جب تک اس عالم میں نہ آیا تھا تو محض روح تھا۔ اور روح بوجہ مجرد ہونے کے نہ قیام پر قادر تھی نہ قعود پر نہ رکوع پر نہ سجود پر تو روح کو اس عالم میں وہ ترقی کرنا جو ان عبادات[1] خاصہ پر موقوف ہے ممکن نہ تھا۔ اور یہ صفت عبدیت[2] بکمالہا اس میں پیدا نہ ہوتی اور جب صفت عبدیت مطلوب ہے تو جس کو اس[3] سے تعلق ہو وہ مطلوب ہو گا۔ اسی معیار کی نسبت مولانا روم علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں۔

کار مرداں روشنی و گرمی ست　　　کاردوناں حیلہ و بے شرمی ست

(اللہ کے مردوں کا کام تو روشنی اور گرمی ہے اور کمینوں کا کام مکاری و بے شرمی)

دو چیزیں اس شعر میں علامت کے طور پر بیان فرمائی ہیں ایک روشنی دوسرے گرمی روشنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں سے بیٹھے ہوئے کلکتہ اور بمبئی نظر آنے لگے بلکہ یہ معنی ہیں کہ دل میں عرفان اور علم حقیقی پیدا ہو جائے اور گرمی سے مراد محبت ہے حاصل یہ ہوا کہ جس کو محبوب حقیقی سے محبت ہو اور معرفت حاصل ہو وہ مرد ہے۔ لیکن محبت قلبی صفات میں سے ہے جس کا احساس نہیں ہو سکتا اس لئے اس کے کچھ لوازم[4] بیان کئے جاتے ہیں۔

محبت کے لوازم اور شیخ کامل کے صفات

سب جانتے ہیں کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے ایک تو اس کی یاد کسی وقت دل

---

[1] نماز روزہ حج زکوٰۃ تلاوت وغیرہ دوسرے نفس وشیطان سے مقابلہ کر کے کرتا ہے جو بے مقابلہ عبادت سے زیادہ سخت اور زیادہ افضل ہوتی ہے اور یہ مقابلہ وہیں ہو سکتا تھا جہاں ان کی بدیاں ہو سکتی تھیں۔ اس کے لئے دنیا ہے آخرت نہیں۔ [2] پوری طرح بندہ ہونے کی صفت [3] جس جس بات کو پورا بندہ ہونے سے [4] لازمی باتیں جن سے ان کا ہونا معلوم ہو سکے

سے نہیں اترتی سوتے ہوئے خواب بھی دیکھتا ہے تو محبوب ہی نظر آتا ہے۔ اور دوسرے اس کے حکم کو گوشِ قبول[1] سے سنتا اور نہایت شوق سے آمادہ امتثال[2] رہتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوا کرتی ہے جس کی جانب پوری توجہ اور التفات نہ ہو اور جو چیز ہر وقت دل پر متولی[3] ہو اس میں بھول کا ہونا عادۃً[4] ممکن نہیں۔ اسی طرح نافرمانی اس کے حکم کی ہوتی ہے جس کی وقعت اور محبت دل میں نہ ہو جب ہر دم کی یاد اور کامل اطاعت علامت محبت سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قابلِ انتخاب وہ ہے جس کو روشنی علم و معرفت اور گرمی یعنی محبت خداوندی حاصل ہو تو خلاصہ مقتدا[5] کی صفات کا یہ نکلا کہ اس کو بقدر ضرورت علم دین ہوا گرچہ وہ اصطلاحی مولوی نہ ہو دوسرے یہ کہ اس کو کسی شیخ کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہو کیونکہ گرمی امر مکتسب[6] نہیں بلکہ موہوب[7] امر ہے اور عادۃ اللہ[8] ہے کہ وہ اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے اور اس کی ہدایت کے بموجب عمل کرے اور یہی وہ چیز ہے جو سینہ بسینہ[9] چلی آتی ہے۔ نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے نہ مؤرخ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ دنیا میں اس کے ماسوا بھی اکثر کام ایسے ہیں جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ مثلاً باورچی گری کا کام درزی کا کام کہ اگر کوئی ساری خوانِ[10] نعمت حفظ کر لے مگر جب تک کسی کامل استاد کے پاس نہ رہے تو اس کو باورچی گری نہیں آ سکتی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب میں دیکھ کر کرتا اچکن وغیرہ کی کاٹ تراش بالکل ازبر کر لے تو اس کو درزی کا کام نہیں آ سکتا۔ تصوف کے سینہ بسینہ ہونے کے یہی معنی ہیں نہ یہ کہ اس کے مسئلے سینہ بسینہ ہیں۔ کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں مدون ہیں بلکہ وہی ایک نسبت ہے جس کو گرمی سے تعبیر کیا ہے کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے ایک صفت یہ ہے کہ وہ باعمل ہو یہ تو علامات کامل ہونے کے ہیں۔

---

[1] قبول کرنے کے کان سے [2] تعمیل پر تیار [3] مسلط اور غالب [4] جیسے عادت و معمول ہے۔
[5] جس کی پیروی کی جائے یعنی پیر [6] کوشش سے حاصل کی ہوئی۔ [7] بلا کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی چیز۔ [8] اللہ تعالیٰ کا معمول [9] ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں بلا واسطہ تعلیم وغیرہ کے۔
[10] ایک کتاب کا نام ہے جس میں کھانے بنانے کی ترکیبیں ہیں

شیخ کے مکمل[1] ہونے کی علامات

اور مکمل ہونے کی علامات دوسری ہیں اور وہ بھی نہایت ضروری ہیں کیونکہ مریض کو اپنے مرض کو دور کرنے کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ خود بھی تندرست ہو اور طبیب بھی ہو تو اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دل میں ایک سکون اور راحت پیدا ہو اور خدا تعالیٰ کی محبت بڑھے۔ دنیا کی محبت کم ہو۔ اگر چہ یہ باتیں فوراً نہ پیدا ہوں بلکہ کچھ دنوں کے بعد ہوں دوسرے اگر اس سے اپنا مرض بیان کیا جاوے تو جواب سے تسلی نہ ہو معلوم ہو کہ ہمارے مرض کو بالکل سمجھ گیا۔ خوب کہا ہے

وعدہ[2] اہل کرم گنج بود۔ پس جب ایسا شخص میسر ہو جاوے تو ضرور ہے کہ اس کی صحبت اختیار کی جائے۔ اگر چہ اس سے بیعت نہ ہو کیونکہ بیعت ہونا چنداں ضروری نہیں ہے۔

بیعت موقوف[3] علیہ سلوک[4] نہیں لیکن بیکار بھی نہیں

لیکن یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ بیعت بالکل بے سود ہے ایک صاحب کہنے لگے کہ بیعت بالکل بیکار ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہی کام کرے میں نے کہا کہ صاحب آپ نے کبھی علاج کرایا ہے کہ نہیں کہنے لگے کہ بے شک ضرورت کے وقت علاج کرایا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کسی ایک طبیب سے رجوع کیا ہے یا اس طرح کہ آج ایک سے کل دوسرے سے پرسوں تیسرے سے کہنے لگے کہ کسی ایک طبیب کی طرف جس پر اطمینان ہوا رجوع کیا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس میں آپ نے کیا مصلحت دیکھی کہنے لگے کہ روز روز نئے طبیب بدلنے سے کسی ایک کو بھی توجہ اور شفقت مریض پر نہیں ہوئی کیونکہ کوئی ایک بھی اس کو اپنا مریض نہیں سمجھتا میں نے کہا کہ بس یہی حکمت اور نفع ہے بیعت ہونے کے بعد مرشد مرید کو اپنا سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے

---

[1] کامل بنانے والا یعنی اوپر جو علامتیں بتائی ہیں وہ تو خود اس کے کامل ہونے کی تھیں اب وہ ہیں جو دوسروں کو کامل بنا سکنے کی ہیں۔ [2] سخاوت والوں کا وعدہ خود ایک خزانہ ہوتا ہے۔ [3] جس پر کوئی چیز موقوف ہو کہ بغیر اس کے نہ ہو سکے۔ [4] اللہ تک پہنچنے کا اختیاری راستہ طے کرنا یعنی یہ راستہ بیعت پر موقوف نہیں۔ مگر بیعت بیکار بھی نہیں اس سے اور فائدہ ہے۔

کہ یوں کہتا ہے۔ ؎ من غم تو میخورم تو غم مخور (میں تیرا غم کھاتا اور اس کی تدبیریں کرتا ہوں تو غم نہ کھا فکر میں نہ پڑ) مرید کو ہر وقت یہ تسلی رہتی ہے کہ میرا ایک شفیق میرے ساتھ موجود ہے اور مرشد کو یہ لاج ہوتی ہے کہ یہ میرا شخص ہے یہ مصلحت ہے بیعت میں ہاں اگر نرے نذرانہ کی بیعت ہو تو کسی درجہ میں بھی مفید نہیں۔ آج کل یہ حالت ہے کہ بعضے فخر کرتے ہیں کہ میرے ایک لاکھ مرید ہیں۔ معاذ اللہ[1] گویا ایک فوج جمع کی ہے غرض اگر اس قسم کی پیری مریدی نہ ہو تو اس میں بہت نفع ہے۔

نسبت[2] مع اللہ کی فضیلت

نسبت مع اللہ ایسی چیز ہے کہ جب یہ دل میں جگہ کر لیتی ہے تو خس[3] و خاشاک ماسوا سب بہہ جاتے ہیں بس نہ کوئی شبہہ باقی رہتا ہے نہ مزاحم[4] ؎

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق تو وہ آگ کا شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو معشوق کے سوا جو کچھ ہو سب پھونک دیتا ہے)

اور اس کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ

تیغ لا در قتل غیر حق براند درنگر آخر کہ بعد لا چو ماند

(جب لا (یعنی نہیں) کی تلوار حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز کے قتل میں چلا ڈالی تو پھر دیکھو آخر لا کے بعد کیا رہ گیا ہے)

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(الا اللہ رہ گیا اور باقی سب جاتا رہا۔ اے شرکت غیر کو پٹرول کی طرح جلا دینے والے عشق مرحبا مرحبا)

توجب یہ تمام وساوس منقطع ہو جائیں گے تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور معلوم ہو جائیگا کہ

---

[1] اللہ کی پناہ نہ اتنے لوگوں کے حالات سن سکتا ہے نہ تدبیر بتا سکتا ہے۔ نہ راہ پر چلا سکتا ہے۔ بس رب یا نام نمود کے لئے ہے۔ یہ دنیا لینے کے لئے مریدوں کا کام کچھ نہ بن سکا۔ ایسوں کے مرید کورے ہی رہتے ہیں [2] اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت کہ ہر وقت دل میں اللہ ہی اللہ قائم رہے۔ [3] کوڑا کرکٹ [4] دفع کرنے والا۔

ہم کو خدا تعالیٰ سے کیا تعلق ہے۔ اس کے بعد کوئی حکم ناگوار نہ گزرے گا کیونکہ عاشق کو کوئی حکم محبوب کا ناگوار نہیں ہوتا بلکہ یوں چاہے گا کہ کسی طرح ہر وقت ادھر سے کچھ ارشاد ہوتا رہے۔

حکایت: ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک طبیب پر عاشق ہو گیا تھا۔ آخر بیمار پڑا لوگ اس طبیب کو علاج کے لئے لائے تو یوں تمنا کرتا تھا کہ مجھے کبھی شفا نہ ہوتا کہ اسی بہانہ سے روزانہ طبیب میرے پاس چلا تو آیا کرے۔ صاحبو واقعی یہ آگ بہت غضب کی چیز ہے۔ کہ عاشق تو عاشق معشوق کو متوجہ کر دیتی ہے ؎

عشق را نازم کہ یوسفؑ را بباز ار آورد ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد

(میں عشق پر ناز کرتا ہوں کہ وہ یوسف علیہ السلام تک کو بازار میں لے آتا ہے اور ہر شہر صنعا کی طرح ایک زاہد کو زنار کے نیچے لے آتا ہے کہ زنار والی کے پیچھے لگ کر زنار (مینو) باندھ لیا گیا تھا)

دیکھئے اس مریض کا مرض ہی تھا کہ جس نے طبیب کو بھی کھینچ ہی لیا۔ آج کل کے عقلاء اس کو نہ سمجھیں گے کیونکہ یہ محض ذوقی و وجدانی امر ہے چند ہی روز ہوئے کہ سفر الٰہ آباد پیش آیا۔ میرے ہمراہ ایک دوست بھی تھے وہ چونکہ شاعر بھی ہیں ایک موقعہ پر اپنے کچھ اشعار پڑھ رہے تھے کہ ان میں یہ شعر بھی پڑھا ؎

کیا بیٹھا ہے سینہ پر زانو کو دھرے قاتل ہاں پھیر بھی دے خنجر کیوں دیر لگائی ہے

اس مجمع میں ایک مولوی صاحب تھے جن کی کتابیں عربی کی سب تمام تھیں لیکن شعر سے بالکل مناسبت نہ تھی۔ انہوں نے جو یہ شعر سنا تو نہایت تعجب سے کہا کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے یہ تو بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ تو محبوب حقیقی نے کسی کے گلے پر خنجر پھیرا نہ ان شاعر کے مرشد نے کبھی ایسا کیا البتہ طمانچہ شاید کبھی کسی کو مار دیا ہو لیکن سینہ پر زانو رکھ کر تو کبھی نہ بیٹھے۔ غرض ان کو ہر چند سمجھایا گیا لیکن آخیر تک ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا وہ اس کو برابر غلط ہی کہتے رہے۔ اور لوگ ہنسا کئے تو دیکھئے شعر سے مناسبت[1] نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک صاف شعر کو نہ سمجھ سکے تو اسی طرح جن لوگوں کو یہ نسبت حاصل نہیں ہے ان کی سمجھ نہ

---

[1] حالانکہ شعر میں مجازات کنایات اور تشبیہات ہیں۔ خود گھٹنہ اور خنجر کہاں مراد ہے۔

آئے گا کہ کیا بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسے لوگوں کو اہل محبت پر طعن کرنا ہرگز زیبا نہیں۔ غرض محبت ایک عجیب چیز ہے ذرا غور کر لیجئے کہ اگر ایک مردار عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو کیا حال ہوتا ہے کہ اس کے درشت[1] اور ناز یبا کلمات بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بے جا فرمائش بھی پوری کی جاتی ہے اور دل پر ناگواری نہیں ہوتی۔

توبہ کی ترغیب اور اس کی حقیقت

یایھا الذین اٰمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحاً عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیئا تکم الخ (اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو خالص توبہ (یعنی دل سے متوجہ ہو جاؤ) قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے سارے گناہوں کا کفارہ کر دے) مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو توبہ کا حکم کرتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ اسی کو توبہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے یہی توبہ کی حقیقت اور صرف لفظ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں کیونکہ صرف زبانی وہی توبہ ہے جس کو کہتے ہیں ۔

سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما

(ہاتھ پر تسبیح منہ پر توبہ دل گناہ کے شوق سے بھرا ہوا تو گناہ کو بھی ہمارے استغفار پر ہنسی آتی ہے)

تو حقیقت توبہ کی یہ ہوئی کہ دل سے توجہ ہو تو فرماتے ہیں

(چونکہ توبہ کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لئے اب میں توبہ ہی کا لفظ کہوں گا) اے ایمان والے بندو توبہ کرو۔ خدا کی طرف خالص توبہ۔ یہ حاصل ہے اس جملہ کا

گناہ کی حقیقت اور گناہ سے بے خبری کی شکایت

گناہ کا خلاصہ یہ ہے خدا کی نافرمانی کرنا تو اول یہ معلوم کرو کہ خدا نے کس کس بات کا ہم کو حکم کیا ہے۔ پھر دیکھو کہ ہم ان میں سے کتنے حکموں پر عمل کرتے ہیں۔ اور کتنے نواہی[2] سے اجتناب نہیں کرتے اور یہ اس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت کا علم سیکھا جائے۔ کیونکہ

---

[1] سخت اور مناسب [2] ممنوع باتیں۔

یہ اس پر موقوف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مقام پر توبہ کا حکم ہے اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور گناہ کا علم دین کے جاننے سے ہوتا ہے کہ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گناہ کس قدر ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو کہ ہم سے گناہ نہ ہوتے ہوں۔ مثلاً دل ہی ہے کہ اس کے گناہوں کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اس کے بہت سے گناہ ہیں۔ مثلاً کسی شخص کو بنظر حقارت دیکھا یہ بھی گناہ ہے جس کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔

حکایت: حضرت جنید بغدادی کی حکایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو سوال کرتے دیکھا جو کہ صحیح وتندرست تھا۔ آپ نے دل میں فرمایا کہ یہ شخص صحیح سالم ہے اور پھر سوال کرتا ہے۔ رات کو آپ نے خواب دیکھا کہ ایک شخص آپ کے پاس مردار لایا اور کہا کہ اس کو کھایئے انہوں نے کہا کہ یہ تو مردہ ہے کیونکر کھاؤں اس شخص نے جواب دیا کہ آج صبح تم نے اپنے بھائی[1] کا گوشت کھایا ہے تو اس کے کھانے میں کیوں تامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے غیبت نہیں کی اس نے جواب دیا کہ گو زبان سے غیبت نہیں کی لیکن دل میں اس کو حقیر تو سمجھا اور دل ہی سے تو سب کچھ ہوتا ہے۔ آخر جنیدؒ بہت گھبرائے اور اس فقیر کے پاس پہنچے وہ کوئی کامل شخص تھا۔ ان کو دیکھتے ہی کہا **وھو الذی یقبل التوبہ عن عبادہ** (اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول فرماتے ہیں) سو ان گناہوں کی طرف کبھی ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی گناہ ہیں۔ اسی طرح بعض جوارح[2] کے ایسے گناہ ہیں کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ نہایت بے تکلف کیا جاتا ہے جیسے زبان

گناہ کی علامت اور اسکی اجمالی فہرست بالخصوص رسوم کا گناہ ہونا

صاحبو گناہ کی علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہو دیکھ لیجئے کہ ان گناہوں پر کیا وعیدیں[3] ہیں۔ غیبت پر کیا وعید ہے۔ تکبر پر کیا وعید ہے۔ اسی طرح بلا تحقیق کسی واقعہ پر حکم کر دینا اس پر کیا وعید ہے شادی اور غمی میں اس قدر رسومات خلاف شریعت ہوتی ہیں جن کی کوئی حد نہیں اکثر لوگ شادی میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ناچ نہ کرایا اور

---

[1] قرآن مجید میں غیبت کرنے کو مردہ بھائی کا گوشت کھانا فرمایا ہے۔ [2] دل کے سوا باقی اعضا زبان ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ۔ [3] سزائیں۔

گانا نہ ہوا تو بس کوئی رسم ہم نے نہیں کی شرعی نکاح ہو گیا۔ حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی رسمیں ایسی ہیں کہ وہ بدعت بلکہ بعض شرک ہیں۔ اگرچہ الحمدللہ ایسی رسموں میں سے اکثر چھوٹ گئی ہیں جیسے دولہا کو الو کا گوشت کھلانا یا دامن میں ہلدی باندھنا میانہ سے اتر کر چارپائی پر نہ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ کہ اس قسم کی اکثر رسمیں ترک ہو گئی ہیں لیکن ان کے ترک کے ساتھ ہی وہ رسمیں کہ جن میں فخر اور مباہات[1] ہے اور زیادہ ہو گئی ہیں کیونکہ بہ نسبت سابق کے اس وقت تمول[2] زیادہ ہوتا چلا جا رہا ہے پہلے لوگوں میں اس قدر تمول کہاں تھا۔ ایسا ساز و سامان کہاں تھا یہ رنگ برنگ کے کپڑے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ چنانچہ اب بھی جو لوگ پرانی وضع کے باقی ہیں ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی ہے اور آج کل کے نئے رنگینوں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک مقام پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ شادی میں ڈیڑھ ہزار کا صرف کپڑا ہی کپڑا دیا گیا۔ شاید اس کی تو ساری عمر میں بھی اس کپڑے کا نصف بھی اس کو پہننا نصیب نہ ہو کیونکہ اول تو اتنا کپڑا دوسرے عورتوں کا پہننا کہ ایک ایک کپڑے کو دس دس برس تک احتیاط سے رکھ کر پہنتی ہیں کیونکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اپنے گھر میں ایسی حالت میں رہیں گی کہ صورت دیکھ کر بھی نفرت پیدا ہو اور دوسری جگہ جائیں گی تو بن سنور کر خدا جانے دوسری جگہ کس کو دکھلانا منظور ہوتا ہے اور پھر اس کپڑے سے اس قدر مشغولی ان کے قلب کو ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ آج دھوپ دکھلائی جا رہی ہے اور کل صاف کیا جا رہا ہے۔ کپڑا جو کہ خادم تھا ان کا مخدوم ہو گیا۔ تعجب ہے کہ ان کا جی نہیں گھبراتا لیکن جب دوسرا کوئی کام نہیں تو آخر یہ بیچاری دن کس طرح کاٹیں اسی طرح شادی میں فضولیات ہوتے ہیں مثلاً کھانا کھلانا ہے کہ ساری برادری کو نوتا[3] جاتا ہے۔ مشورہ کرنا ہے کہ ایک ایک سے رائے کی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح کرنا چاہا اور یہ رائے ہوئی کہ اس خوشی میں ایک ہزار روپیہ کسی اسلامی مدرسہ میں دے دیں۔ ان بیچاروں سے یہ خطا ہوئی کہ برادری کو جمع کر کے رائے لی تمام برادری نے ان کو دق کیا اور کہا کہ ہمارا جو کچھ آپ نے کھایا ہے وہ واپس کیجئے۔ آخر مجبور ہو کر بیچاروں کو ساری رسمیں کرنا پڑیں۔ ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ اس رقم کے برباد

---

[1] ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے ہونا۔ [2] مالداری [3] دعوت دی جاتی ہے

کرنے سے آپ کا کیا نفع ہوا ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ صاحب اس میں کیا گناہ ہے کہ برادری کو کھلا دیا پلا دیا۔ صاحبو یہ عنوان تو بہت پیارا ہے مگر ذرا اس کی حقیقت کو تو دیکھو یہ ایسا ہی عنوان ہے جیسا کہ ایک چور نے کہا تھا ہم تو جو کچھ کھاتے ہیں حلال کر کے کھاتے ہیں۔ دیکھئے رات کو نیند برباد کرتے ہیں محنت کرتے ہیں جب کہیں کھانے کو نصیب ہوتا ہے۔ جیسا اس چور نے ایک نیا عنوان نکال کر چوری کو حلال کیا تھا۔ ایسی ہی ہماری حالت ہے کہ ایسا عنوان اختیار کرتے ہیں کہ گناہ بظاہر گناہ ہی نہ معلوم ہو کہ برادری کو کھلا دیا ادائے حق کیا۔ لڑکی کو دیا۔ صلہ رحمی[1] کی تو اس میں کیا حرج ہے میں کہتا ہوں کہ اگر لڑکی کے ساتھ صرف صلہ رحمی کرنی ہے تو کیا وجہ کہ برادری کو جمع کر کے انکو دکھلایا جاتا ہے اور اگر صلہ رحمی کے لئے برادری کو جمع کرنا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ پندرہ سولہ برس تک جو صلہ رحمی لڑکی کے ساتھ کی گئی ہے اس میں برادری کو جمع نہیں کیا گیا کہ صاحبو دیکھو رکھو آج لڑکی کے واسطے کپڑا لایا ہوں آج اس کے لئے حلوہ تیار کرایا ہے۔ معلوم ہوا کہ شادی کے موقع پر مقصود تفاخر[2] ہوتا ہے نہ کہ صلہ رحمی۔ دوسری علامت تفاخر مقصود ہونے کی یہ ہے کہ سامان دینے کے بعد اس طرف کان جھکتے ہیں کہ دیکھیں لوگ ہماری نسبت کیا کہہ رہے ہیں اگر کسی نے کہہ دیا کہ واقعی حوصلہ سے زیادہ کام کیا تو سمجھا جاتا ہے کہ بہت بڑی تعریف کی حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت بڑی ہجو ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہت بڑی حماقت کی اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کر دیا لیکن یہ تعریف کم نصیب ہوتی ہے اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ نیت بھی پوری نہیں ہوتی بلکہ جتنا بھی یہ زیادہ خرچ کرتا ہے۔ برادری زیادہ عیب نکالتی ہے اور ہمدردی بھی اگر کی جاتی ہے تو دل میں اس کے بگاڑنے کی فکر کی جاتی ہے۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے۔ بگھرہ وہاں ایک نو دولت تھے انہوں نے اپنے لڑکے کی شادی برادری کے لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے یہ شخص بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کو اپنے جیسا بنانا چاہیے۔ چنانچہ دو چار آدمیوں نے متفق ہو کر ان کو یہ رائے دی کہ اس شادی میں طائفہ[3] کو ضرور بلانا چاہیے اور کہا کہ میاں کی روز روز یہ موقع آتا

---

[1] قرابت کا حق ادا کیا [2] ایک دوسرے پر فخر کرنا [3] بازاری گانے والی عورتوں کی جماعت

ہے چنانچہ طائفہ کو بلایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ کما کر جمع کیا تھا سب کھو کر بیٹھ رہے۔ برادری نے جب دیکھا کہ یہ بھی ہماری طرح کنگال ہو گیا تو بہت خوش ہوئے۔ واقعی لوگوں کی وہ حالت ہے کہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھ نہیں سکتے کسی کبڑے سے پوچھا تھا کہ تیری کیا تمنا ہے۔ اس نے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں تاکہ میں بھی ان کو ہنسوں اور اگر اتفاق سے کسی نے ایسا سامان کر بھی لیا کہ اس میں کوئی عیب نہ نکل سکا تو کہتے ہیں کہ میاں اگر کیا تو کیا بڑی بات ہوئی جن کے پاس ہوا کرتا ہے کیا ہی کرتے ہیں۔ بتلائیے کہ جب برادری بھی خوش نہ ہوئی اور خرچ بھی ہوا تو کیا فائدہ ہوا۔

صاحبو کیا اس ساری کارروائی کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کھلا دینا پلا دینا ہے کیا یہ اسراف اور تفاخر نہیں ہے اور کیا تفاخر گناہ نہیں۔ قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت دیکھ لیجئے حدیث میں ہے۔ من لبس ثوب شهرة البسه الله ثوب الذل يوم القيامة (جو شخص شہرت کا کپڑا پہنے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں ذلت کا کپڑا پہنائیں گے) غور کیجئے کہ کپڑے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے جب اس میں یہ وعید ہے تو دوسری فضولیات جن میں زیادہ خرچ ہوتا ہے کیا ان میں یہ وعید نہ ہوگی۔ اسی طرح کے اور بہت گناہ ہیں جو سرسری سمجھے جاتے ہیں۔

توبہ کا ہر وقت ضروری ہونا اور اسکے موانع[1] کے ارتفاع کی تدبیر

غرض گناہوں کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان کی فہرست پیش نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم ہر وقت گناہ میں مبتلا ہیں ہم کو تو توبہ کی بھی ہر وقت ضرورت ہے اور توبہ کرنا ہر وقت واجب ہے۔ لہٰذا اس کا بیان کرنا بھی ضروری ہوا لیکن چونکہ نرے وجوب کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ اکثر موانع قوی ہوتے ہیں کہ ان کا ارتفاع کا ذریعہ نہ بتلانے سے طبیعت پر گرانی اور مایوسی ہوتی ہے اسی لئے موانع کا بتلانا اور ان کے ارتفاع کی تدابیر بتلانا بھی ضروری ہوا کہ کن کن چیزوں سے توبہ کرنی چاہیے تو نہ محض اجمال کافی ہے اور نہ زیادہ تفصیل کا وقت ہے۔ اسی لئے بیان[2] مواقع کے ساتھ چند کثیر الوقوع[3] گناہ بھی بتلاتا ہوں کہ

---

[1] رکاوٹوں کے اٹھ جانے کی [2] توبہ کے موقعوں کے بیان کے ساتھ [3] بہت واقع ہونے والے گناہ

ان سے اجتناب کیا جائے اور چونکہ وہ کثیر الوقوع ہیں جب ان سے اجتناب ہوگا تو ان شاء اللہ تعالیٰ سب گناہوں سے اجتناب ہو جائے گا دوسرے یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی ایک گناہ کو چھوڑتا ہے تو سب گناہ اس کے چھوٹ جاتے ہیں یعنی ایک گناہ کا ترک دوسرے کے ترک میں معین ہوتا ہے۔ تو گویا اب دو باتیں بیان کرنی رہ گئیں ایک تو مختصری فہرست گناہوں کی دوسرے توبہ کرنے کے لئے موانع اور ان کے ارتفاع کے ذرائع سو سمجھنا چاہیے کہ جب توبہ کا وجوب قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت تو اس کی طرف سے بے توجہ ہونے کے اسباب کا ارتفاع[1] واجب ہوگا۔ اسباب یہ ہیں کہ جن کو میں مع ان کے علاج کے بیان کرتا ہوں۔

اول مانع[2] توبہ سے علم دین نہ ہونا ہے

پہلا مانع سبب توبہ کا یہ ہے کہ ہم کو گناہوں کی تفصیل معلوم نہیں تو جب گناہ ہی کا علم نہ ہوگا اور توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے تو توبہ کیونکر ہوگی۔ افسوس ہے ہم لوگوں کو علم سے اس قدر اجنبیت ہوگئی کہ اگر کوئی عالم ہمارے سامنے ہمارے افعال کا گناہ ہونا بیان کرتا ہے تو سن کر تعجب ہوتا ہے۔ علم سے اجنبیت کے متعلق ایک حکایت یاد آئی۔

حکایت: ایک معتبر راوی سے معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی کے فاضل کو سفر میں پانی نہ ملا تو نماز کے وقت آپ نے تیمم کیا اور مٹی لے کر اس سے کلی بھی کی خدا جانے کیا کیا ہوگا۔ منہ میں مٹی لے کر اس کو تھوکا یا اور کوئی صورت نکالی ہوگی۔ ملاحظہ کیجئے کہ ناواقفی کس حد تک پہنچ گئی۔

سو اس کا علاج یہی ہے کہ علم دین پوری طرح سے حاصل کیا جائے اور کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم بہشتی زیور کے دسوں[3] حصے ہی پڑھ لیں۔ اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے کہ مرد تو علماء سے پڑھ لیں پھر جو کچھ پڑھا ہے عورتوں کو بھی پڑھا دیں۔

دوسرا مانع توبہ سے گناہ کو ہلکا سمجھنا اور اس کے اسباب

دوسرا مانع توبہ سے یہ ہے کہ بعض لوگ گناہ کا گناہ ہونا تو جانتے ہیں لیکن اس کو کوئی

۱؎ بے توجہ ہونے کے سببوں کا اٹھ جانا اور دور کرنا ۲؎ روکنے والا۔ ۳؎ بلکہ گیارہواں بھی اور تعلیم الدین

بڑی چیز نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایک ہلکی بات سمجھتے ہیں اور علامت اس کی یہ ہے کہ کبھی گناہ کر کے ان لوگوں کا جی برا نہیں ہوتا دوسرے تو یہ نہیں کرتے دیکھئے اگر اس شخص کو جو کہ شراب نہ پیتا ہو دھوکے میں کوئی شراب پلادے تو دل پر کتنا صدمہ ہوگا لیکن جن لوگوں کی عادت ہوگئی ہے اور عادت کی وجہ سے ان کو خفیف سمجھ لیا ہے جیسے غیبت کہ اس کے کرنے سے ذرا بھی دل برا نہیں ہوتا اور گناہ کے خفیف ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ اس گناہ کے کرنے سے ہم کو کیا سزا ملے گی اور کتنا عذاب ہوگا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ احادیث ترغیب[1] وترہیب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا جائے اور ایسے لوگ ان کو مطالعہ میں رکھا کریں لیکن ابواب[2] فقہ کے دیکھنے کی اجازت عوام کو نہ دی جائے۔

کیونکہ ایسے احکام مختلف[3] فیہا ہیں اگر عوام ان کو دیکھیں گے تو ان کو ضرر زیادہ ہوگا۔ اسی لئے صرف ترغیب وترہیب کی احادیث ان کو دی جائیں چنانچہ منذری کی ترغیب وترہیب بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس بارے میں اگر اس کا ترجمہ[4] ہوگیا تو اس کو دیکھیں اور اگر اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو تو کسی اہل علم کو چاہیے کہ اس کا ترجمہ کر دے۔ اور بہشتی زیور میں بھی میں نے حدیثوں کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس کا دیکھنا بھی بہت مفید ہے اس سے معلوم ہوگا کہ فلاں گناہ میں یہ عذاب ہوگا۔ اس لئے اس گناہ سے بچنا چاہیے۔ دوسرا سبب گناہ کے خفیف سمجھنے کا یہ ہے کہ گناہ کرتے کرتے ہماری عادت ثانیہ ہوگئی ہے کہ اس سے ذرا بھی طبیعت میلی نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف التفات بھی نہیں کیا جاتا کہ ہم نے فلاں گناہ کیا ہے چنانچہ بعض اوقات اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو تعجب سے پوچھا جایا کرتا ہے کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا جس کے پاداش میں ہم پر یہ مصیبت نازل کی گئی ہے۔ میں اس تعجب پر تعجب کرتا ہوں صاحبو کیا کوئی وقت بھی گناہ سے بچا ہے پھر اس کے کیا معنی کہ جانے کون سا گناہ ہوگیا بلکہ انصاف اور عقل کی رو سے تو یوں چاہیے کہ اگر ہم پر خدا تعالیٰ کا کوئی انعام ہو تو

---

[1] شوق دلانے والی اور عذاب سے ڈرانے والی حدیثیں [2] حدیث کی کتابوں میں جو بات عبادات کرنے کے متعلق ہیں کہ ان کو کس کس طرح کیا جائے بلکہ ان کی جگہ فقہ یعنی مسائل کی کتابیں، بہشتی زیور وغیرہ دکھلائیں۔
[3] اماموں کے اختلافی [4] کچھ کا ہو چکا ہے انوار الصلوٰۃ انوار الصوم وغیرہ ناموں سے ملتا ہے۔

تعجب کریں کہ ہم جیسے گنہگاروں سے کیا بھلائی بن پڑی ہوگی۔ جس پر یہ انعام ہوا ہے۔ عادت ایسی بری چیز ہے کہ اس کی بدولت معصیت کا معصیت ہونا بھی ذہن سے نکل جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ گناہ کی عادت چھوڑی جائے اور اپنے اوپر جبر کر کے گناہ کو ترک کیا جائے مثلاً غیبت کا گناہ ہے کہ اس میں علی العموم لوگ مبتلا ہیں اس کے چھوٹ جانے کا طریقہ ہے کہ ہمت کر کے ایک ہفتہ تک زبان کو غیبت کرنے سے اور کان کو غیبت سننے سے بند رکھا جاوے جب ایک ہفتہ اس طرح گزر جائے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ دیکھو گے کہ غیبت کرنا تو درکنار غیبت سننا بھی گوارا نہ ہوگا بلکہ ایسا معلوم ہوگا گویا کسی نے ایک پہاڑ تم پر رکھ دیا ہے ؎

بردل سالک ہزاراں غم بود   گر زباغ دل خلالے کم بود

(اللہ کے راستہ والے کے دل پر تو ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

تیسرا اور چوتھا مانع توبہ سے

ایک مانع توبہ کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کو بہت ہی بڑی چیز سمجھ لیتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اتنے بڑے گناہ کے مقابلہ میں توبہ سے کیا کام نکل سکے گا۔ علی ہذا البعض کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ اس قدر کثیر ہیں کہ ان کی معافی ممکن ہی نہیں۔ اگر چہ ہم کتنی ہی توبہ کریں ان دونوں غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی بارگاہ کو بندوں پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں عادت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بہت بڑے امر میں کسی کی نافرمانی کرے یا معمولی باتوں میں ہمیشہ نافرمانی کرے تو ان دونوں کے قصور کو معاف نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح گویا خدا کے کارخانے کو بھی سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ قیاس[1] مع الفارق ہے بندہ اول تو محتاج ہے اس کو اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی بھی ضرورت ہے دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بات رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرے بندہ[2] متاثر ہے کہ جب کسی نے اس کی مخالفت کی تو اس پر کچھ اثر ہوا اگر مکرر مخالفت ہوئی اس اثر اور انفعال[3] میں ترقی ہوئی اسی طرح ترقی

---

[1] یہ قیاس کرنا فرق کے ساتھ ہے۔ [2] اثر لینے والا [3] اثر قبول کرنا

ہوتے ہوتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ استعداد[1] موافقت سلب ہو جاتی ہے۔ اسی لئے یہ معاف نہیں کرسکتا۔ برخلاف خدا تعالیٰ کے کہ ان کا ہر فعل اختیاری ہے۔ وہاں تاثر[2] کا نام بھی نہیں۔ وہ عذاب بھی کرتے ہیں تو ارادہ محض سے کہ اس میں غیر اختیاری جوش کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس خیال فاسد سے توبہ کرے اور رحمت کی حدیثیں مطالعہ میں رکھے۔ یقین ہے کہ ان سے یہ مایوسی[3] مبدل بامید ہو جائے گی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے تمام روئے زمین کے برابر گناہ کئے۔ اور وہ توبہ کرے تو خدا تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرمادیں گے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدد گناہوں کا بڑھ جانا موجب[4] یاس نہ ہونا چاہیے رہی کیفاً[5] زیادتی اس کو یوں سمجھے کہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کفر ہے کہ اس کے برابر کوئی دوسرا گناہ نہیں ہے۔ پھر دیکھ لیجئے جس وقت حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم رونق افروز عالم ہوئے۔ دنیا کا کیا حال تھا۔ بجز معدودے چند فرقوں کے اور ان میں گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ ساری دنیا کفر وجہل سے پر تھی خصوصاً اور پھر اس میں بھی خاص کر قریش کہ انہوں نے تین سو ساٹھ بت اپنے لئے بنا رکھے تھے۔ یعنی ہر دن ایک نیا خدا بزعم[6] شان ان سے سر تسلیم خم کراتا تھا لیکن دیکھ لیجئے خدا تعالیٰ نے اس قبیلہ قریش سے فلک اسلام کے لئے کیسے نیر اکبر[7] پیدا کئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی قبیلے کے جن کے بارے ارشاد ہے **اذیقول لصاحبه لا تحزن** (جب آپ اپنے ساتھی سے کہتے تھے فکر نہ کرو یعنی ہجرت کے وقت غار ثور میں ساتھ تھے اور کفار کی طرف سے بے فکری کو حضور نے فرمایا) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس قبیلہ کے ہیں جن کے لئے حدیث ہے۔ **اشدهم فی امر الله عمر** (اللہ کے دین کے بارے میں سب سے سخت عمر ہیں) **وعلی هذا** (اور ایسے ہی دوسرے حضرات) غرض یہ سمجھنا کہ ہمارے گناہ معاف نہ ہوں گے۔ غلطی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بغیر توبہ کئے مر جاتا ہے۔

۱؎ اس کے موافق ہونے کی قابلیت نہیں رہتی۔ ۲؎ اثر لینے کا ۳؎ امید سے بدلی ہوئی ۴؎ نا امیدی کا سبب ۵؎ کیفیت وحیثیت میں ۶؎ خود ان کے گمان میں ۷؎ اسلام کے آسمان کے لئے کیسے کیسے آفتاب۔

پانچواں مانع توبہ سے پھر گناہ ہو جانے کا خوف ہے اور اس کا سبب

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ سے پھر گناہ ہو جائے گا اور جبکہ ہنوز صدور گناہ کا احتمال باقی ہے تو توبہ سے کیا فائدہ ہوگا۔ لہٰذا توبہ اس وقت کرنی چاہیے کہ اس کے بعد پھر گناہ نہ ہو صاحبو میں پوچھتا ہوں کہ زندگی کا کون سا حصہ ہے جس میں گناہ نہ ہونے کا یقین کر لیا ہے۔ جوانی میں اگر چالا کی عیاری نہیں ہوتی تو بدمستی لااُبالی[1] پن ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں اگر آوارگی بدمستی نہیں ہوتی تو حرص طول[2] امل حیل[3] سازی مکر و فریب حسد بغض غرض بیسیوں امراض باطنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو حاصل اس عذر کا یہ ہوا کہ مر کر توبہ کریں گے۔ مگر سمجھ لو کہ من مات فقد قامت قیامته (جو مر گیا اس کی ایک قیامت تو قائم ہو گئی) اور قیامت میں قبول توبہ ہے نہیں اور سبب مانع کے پیش آنے کا یہ ہوتا ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب توبہ کے بعد بھی گناہ کا صدور ہوا تو وہ توبہ ٹوٹ گئی حالانکہ یہ غلط خیال ہے بلکہ پچھلے گناہ جو معاف ہو چکے ہیں ان پر اب دار و گیر نہ ہوگی۔ اسی طرح جس جس گناہ سے توبہ کرتے جاؤ گے وہ محو ہوتا جائے گا لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بہت آسان ترکیب نکل آئی۔ بس آئندہ سے یہی کیا کریں گے۔ کہ خوب جی بھر کر گناہ کر لئے پھر توبہ کر لی کیونکہ جس توبہ کے وقت آئندہ گناہ کرنے کا بھی قصد ہو وہ توبہ مقبول نہیں۔ جیسا کہ میری پچھلی تقریر بابت حقیقتہ[4] توبہ سے معلوم ہوا ہوگا اور قبول توبہ کے مضمون میں یہ خیال کہ خوب گناہ کریں اسی کو پیدا ہوگا جو نہایت بلید[5] الطبع اور بالکل ہی گیا گزرا ہو ورنہ سلیم الطبع کو تو اس سے اطاعت کا زیادہ جوش پیدا ہوگا کہ اللہ اکبر جب بارگاہ خداوندی میں اس قدر رحم و کرم ہے تو ہم کو ہرگز مناسب نہیں کہ اس کی مخالفت کریں حاصل یہ کہ حدیث میں ہے ما اصر من استغفر یعنی جس شخص نے گناہ کے بعد توبہ کر لی وہ گناہ پر ہٹ کرنے والوں میں نہیں ہے اور فرماتے ہیں کلکم خطاون و خیر الخطائین التوابون کہ گنہگار تو سب ہیں مگر ان میں اچھے وہ ہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں پس اگر اتنی ہمت نہ ہو کہ گناہ چھوڑ دو تو توبہ کرنے

---

[1] بے پروائی [2] لمبی لمبی امیدیں [3] حیلے گھڑنے [4] توبہ کے تین جز ہیں گذشتہ پر شرم اس وقت معافی آئندہ کو نہ کرنے کا عہد [5] کند طبیعت کا

سے تو ہمت نہ ہارو بلکہ جو گناہ ہو جایا کرے اس سے توبہ کرلیا کرو اگر پھر ہو جائے پھر توبہ کرلو۔ دیکھو ایک شخص بیمار ہو جائے اور اس کو کوئی یہ رائے دے کہ علاج سے کیا فائدہ آخر پھر بھی احتمال ہے کہ بیمار ہو جاؤ گے تو وہ جواب دیتا ہے کہ میاں اگر پھر بیمار ہوں گے تو پھر علاج کر لیں گے آئندہ کی بیماری کے خوف سے موجودہ بیماری کا علاج کیوں نہ کریں تو جو فتویٰ آپ کی عقل نے جسمانی مرض میں دیا ہے وہ فتویٰ روحانی امراض میں کیوں نہیں ہوتا۔ اسی حدیث ما اصر میں ہے وان عاد فی الیوم سبعین مرۃ یعنی اگر چہ ستر دفعہ توبہ ٹوٹ جائے۔

چھٹا مانع توبہ سے یہ خیال ہے کہ حق تعالیٰ بخش دینگے

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ بندہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے اس کو ہمارے گناہ بخش دینے کیا مشکل ہیں۔ لیکن صاحبو یہ جواب ظاہری بیماریوں میں کیوں نہیں دیا جاتا اور امراض سمی[1] میں اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا۔ کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اس نے اس خیال سے کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ ہم کو ضرور تندرست کر دے گا امراض جسمانی کا علاج نہ کیا ہو یا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اس نے خدا کی رحمت پر بھروسہ کر کے زہر کھالیا ہو کبھی نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا یوں کہے کہ میاں خدا کی رحمت پر بھروسہ کر کے سنکھیا کھا جاؤ تو اس کو دیوانہ بتلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا کے غفور رحیم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سنکھیا کھاؤ تو ضرر نہ کرو بلکہ سنکھیا ضرر بھی کرے گا اور خدا غفور رحیم بھی رہے گا۔ اسی طرح گناہ کا ضرر ہوتا ہے لیکن اس سے خدا تعالیٰ کے غفور رحیم رہنے میں کوئی نقص[2] نہیں آتا۔

خدا تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کے صحیح معنی

صاحبو اس خبر سے کہ ہم غفور رحیم ہیں مقصود یہ ہے کہ جو گناہ تم سے ہو گئے ہیں ان کی وجہ سے پریشان خاطر مت ہو اور توبہ کو بیکار نہ سمجھو ہم ان سب کو معاف کر دیں گے۔ چنانچہ اس آیت قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان

---

[1] زہر کی بیماریوں میں [2] سنکھیا کھانا جرم مگر علاج پر اگر مصلحت ہو غفور رحیم شفا دے دیتے ہیں۔ ایسے ہی گناہ جرم مگر توبہ کے علاج سے غفور رحیم شفا دے دیتے ہیں۔ اگر علاج نہ کیا تو سنکھیا میں بھی موت کا گناہ میں بھی عذاب کا خطرہ ہوگا۔

اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم (آپ کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کر رکھی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دینگے بلاشبہ وہی بڑا بخشنے والے ہیں بڑے رحم کرنیوالے ہیں) کا شان نزول یہی ہے کہ جب حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول مکہ میں مبعوث ہوکر دعوت اسلام فرمائی تو لوگوں نے آ کر عرض کیا کہ ہم آپ پر ایمان تو لے آئیں لیکن جو گناہ ہم نے اس کے قبل کئے ہیں ان پر تو ہم کو ضرور سزا ہوگی بس جب دین آبائی بھی چھوڑا بدنامی بھی اٹھائی اور آخرت کا عذاب بھی باقی رہا تو ہم کو فائدہ ہی کیا ہوا اس پر آیت نازل ہوئی کہ تم لوگ پچھلے گناہوں کا اندیشہ نہ کرو ہم غفور رحیم ہیں سب پچھلے گناہ بھی معاف کر دیں گے اور اگلے بھی بس معلوم ہوا کہ مقصود آیت سے ان لوگوں کی ناامیدی کو دور کرنا ہے جو اسلام اور توبہ سے اس خیال پر رکتے تھے نہ کہ وہ مقصود جو کہ لوگوں نے سمجھا[1]۔

ساتواں مانع توبہ سے یہ خیال ہے کہ جو تقدیر میں ہے وہ ہوگا

ایک مانع یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں بلکہ زبان سے کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے جنت یا دوزخ وہ ضرور ہوکر رہے گا پھر نہ طاعت سے کچھ فائدہ اور نہ گناہ سے کوئی ضرر مگر تعجب ہے کہ یہ تقدیر دنیا کے کاموں میں مثلاً کھانا کھانا مال و دولت جمع کرنا ان میں کہاں چلی جاتی ہے ہم نے کسی کو نہ دیکھا کہ اس نے تقدیر کے بھروسہ پر کمانا چھوڑ دیا ہو یا کھانا نہ کھایا ہو یا کھیتی کرنی چھوڑ دی ہو اور اس میں تخم ریزی نہ کی ہو کہ اگر تقدیر میں ہے تو خود بخود سب کام ہو جائیں گے۔ اس موقعہ پر کہتے ہیں کہ صاحب تقدیر حق ہے لیکن تدبیر بھی تو کرنی چاہیے بدون تدبیر کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ افسوس یہاں تو تدبیر کی ضرورت اور دین کے کام میں تدبیر کی ضرورت نہیں حالانکہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی خدا تعالیٰ نے ایک حد تک ذمہ داری بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں **وما من دآبة فی الارض الاعلی اللہ رزقھا** (اور نہیں ہے کوئی زمین پر چلنے والا مگر اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق) اور **معاد** (آخرت)

---

[1] کہ بے توبہ سب بخش دیئے جائیں بلکہ توبہ سے بخشے جائیں گے غیر مسلم کی توبہ اسلام لے آنا ہے اور مسلمان کی توبہ دل سے توبہ واستغفار ہے

کے بارے میں ذرا بھی ذمہ داری نہیں فرمائی بلکہ صاف ارشاد ہے **لیس للانسان الا ماسعیٰ** (نہیں انسان کے لئے سوائے اس کے جو اس نے کوشش کی یعنی عمل کیا) اور **و من عمل صالحاً فلنفسه و من اسآء فعليها** (اور جو شخص نیک عمل کرے گا تو اپنے فائدہ کے لئے کریگا جو برا کام کرے گا تو وہ اس پر وبال ہوگا) کہ ہم بالکل وعدہ نہیں کرتے جو جیسا کرے گا بھرے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ارشاد فرمایا **ایطمع کل امرء منهم ان یدخل جنة نعیم کلا** (کیا لالچ رکھتا ہے ہر آدمی اس بات کا کہ وہ نعمتوں کی جنت میں ہی داخل کر دیا جائے گا۔ ہرگز نہیں) تو جب تک پاک نہ ہوگے ہرگز دخول جنت کے قابل نہ ہوگے۔

معاش کی تدبیر کرنا اور معاد کو تقدیر پر رکھنا سخت غلطی ہے

غرض معاش کو تدبیر پر رکھنا اور معاد کو تقدیر پر چھوڑنا سخت غلطی ہے بالخصوص جبکہ تحصیل معاد کی تدابیر خود خدا تعالیٰ ہی نے بتلائی ہوں اگر معاد کا حصول محض تقدیر سے ہوتا اور تدبیر کو اس میں دخل نہ ہوتا تو تدابیر بتلانے کی ضرورت کیا تھی اسی طرح اور بہت سے موانع ہیں گو یہاں سب مذکور نہیں ہوئے مگر اس مختصری فہرست سے تھوڑے سے غور کے بعد وہ بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

توبہ میں تاخیر نہ چاہیے اور تاخیر کی مضرت اور ایک شبہ کا جواب

پس جب موانع اور ان کے ازالہ کی تدابیر معلوم ہو گئیں تو جلدی سے ان موانع کو زائل کرنا چاہیے اور توبہ کر لینا چاہیے تاخیر نہ کرنا چاہیے کیونکہ تاخیر کی خاصیت یہ ہے کہ پھر اکثر توبہ میسر ہی نہیں ہوتی یہ حالت ہوتی چلی جاتی ہے کہ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم　　باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(میں ہر رات کہہ لیتا ہوں کہ کل اس محبت کو چھوڑ دوں گا پھر جب کل ہوتی ہے تو آج کو کل بنا لیتا ہوں)

کیونکہ توبہ ندامت کا نام ہے۔ اور ندامت کہتے ہیں جی برا ہونے اور قصور پر شرمندہ ہونے کو اور شرمندگی اس وقت ہوتی ہے کہ طبیعت پر اثر باقی رہے اور اثر تھوڑے دنوں کے بعد زائل ہو جاتا ہے تو جب دل سے مقدمہ[1] توبہ ہی نکل گیا تو توبہ کیونکر نصیب ہو سکے گی۔

---

[1] توبہ کی ابتدائی بات

غرض کبھی توبہ کرنے میں دیر نہ کرے بلکہ دن کے گناہوں سے رات آنے کے قبل توبہ کر لے اور رات کے گناہوں سے۔ دن ہونے سے پہلے اور اگر کہو کہ سب سے آخری جو توبہ ہو گی اس کے بعد کے گناہ تو پھر بھی بلا توبہ کے رہ جائیں گے تو مواخذہ ہر حال میں ہوا پھر روز کی توبہ کیا مفید ہوئی تو جواب یہ ہے کہ کیا وہ شخص جس پر دس برس کے گناہوں کا بار ہوا اور وہ شخص جس پر ایک دن کے گناہوں کا بار ہو برابر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص پر دس مقدمہ فوجداری کے ہو جائیں اور اس سے وکیل یوں کہے کہ اگر پیروی کی جائے تو امید ہے کہ نو مقدموں سے تم بری ہو جاؤ گے لیکن ایک مقدمہ میں باوجود پیروی کے بھی تم کو سزا ہو گی تو میں پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں کیا رائے قائم کی جائے گی آیا یہ کہ جب ایک میں سزا ہو گی تو پیروی کی کیا ضرورت ہے۔ بقیہ نو میں بھی ہونے دو۔ یا یہ کہ باوجود ایک میں یقین سزا ہونے کے دوسرے مقدمات کی اس لئے پیروی کی جائے گی کہ جس قدر بھی سزا کم ہو بہتر ہے ظاہر ہے کہ دوسری تجویز پر عمل ہو گا تو جو شخص پچاس برس کے گناہوں کی پوٹ لے گیا اور جو شخص ایک دن کے گناہ لے گیا کیا دونوں برابر ہیں۔ ہرگز نہیں[1]۔ اور اگر کہے کہ برابر ہیں تو میں کہتا ہوں کہ مقدمات کی پیروی میں دونوں کو برابر کیوں نہیں سمجھا گیا۔ اور نو مقدمات کی پیروی کیوں کی گئی۔

آٹھواں مانع توبہ سے یہ خیال ہے کہ گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتا مع جواب وطریقہ

بعض موانع ضروری اور بھی قابل ذکر ہیں چنانچہ ایک مانع خاص معصیت[2] اکتساب حرام سے توبہ کرنے کا یہ بھی ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتا کیونکہ ہم کھانے کمانے کی طرح طرح کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں ان میں حلال و حرام کی تمیز بہت مشکل ہے ہاں مولویوں کو گناہ چھوڑ دینا آسان ہے کیونکہ ان لوگوں کو مفت کا ملتا ہے

---

[1] اور جب یہ شخص برابر توبہ کرتا رہا اگر آخری بار اس کو توبہ کا موقع نہیں ملا تو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس کی توبہ کی عادت کی وجہ سے اس مجبوری کی حالت کو بھی مثل توبہ کے کر دیں گے جیسے بیماری کی مجبوری میں صحت کی عبادت کا ثواب ملتا ہے۔

[2] حرام کام کرنے کے گناہ سے

اس لئے یہ بآسانی گناہ چھوڑ سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو میں اس وقت ترک گناہ کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب گناہ ہو جایا کرے تو بہ کرلیا کرو تو گناہ کے نہ چھوٹنے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ توبہ بھی نہ ہو سکے۔ دوسرے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو کوئی ناجائز ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو ترک نہ کیا جا سکے اور یہ جو ہم کو ترک کرنا گراں معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اخراجات روز مرہ میں بعض ایسی چیزیں بڑھا لی کہ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم ان کو ضروری سمجھ رہے ہیں تو اس کا جواب وہی ہے جو کہ کسی شخص نے ایک ادھورے شاعر کو جس نے شعر میں تشدید آنے میں ضرورت کا عذر کیا تھا اس کو جواب دیا تھا کہ شعر گفتن[1] چہ ضرور تو اگر بضرورت[2] کثرت تعلقات گناہ ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ تکثیر تعلقات چہ ضرور اصل جواب تو یہی ہے لیکن یہ جواب ان لوگوں کے لئے ہے جو کہ عالی ہمت ہوں اور دین کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح نہ دیتے ہوں کم ہمتوں کے لئے دوسرا جواب بھی ہے مگر میں اس جواب کو زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کم فہم لوگ اس سے گناہ کی اجازت نہ سمجھ جائیں مگر حاشا وکلا گناہ کی اجازت دینا ہرگز مقصود نہیں بلکہ منظور تقلیل اثم ہے۔ حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ اگر ان کو نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی کام اٹکتا ہے اور بعض وہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہے مثلاً لباس خلاف وضع اسلامی پہننا اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی نقصان نہیں اسی طرح ٹخنوں کے نیچے پاجامے پہننا کہ ان کے ترک سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہے یا مثلاً عورتیں اس قدر باریک لباس پہنتی ہیں کہ اس میں پورے طور پر ستر نہیں ہوتا تو ان باتوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ رشوت وغیرہ میں تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بغیر ان کے ہمارے کام چلنے دشوار ہیں۔ لیکن ان معاصی بے لذت میں کیا نفع ہے اور ان کے ترک میں کیا نقصان ہے علی ہذا کسی مرد یا اجنبی عورت کو بری نظر سے دیکھنا کہ اس میں کچھ نفع نہیں

---

[1] شعر کہنا ہی کیا ضروری ہے مت کہو [2] تعلقات بڑھانے کی ضرورت سے گناہ ہو جاتے ہیں تو تعلقات بڑھانا ہی کیا ضروری ہیں نہ تعلقات زیادہ ہوں گے نہ لوگوں کی ریس ہوگی نہ شان بنانے کی فکر ہوگی نہ خرچ بڑھے گا۔

نہ اس کے ترک میں کوئی ضرر۔ اگر کہو کہ صاحب نہ دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے تو یہ بالکل غلط ہے بلکہ تکلیف دیکھنے میں ہوتی ہے کہ اول نظر پڑتے ہی قلب میں ایک سوزش پیدا ہوتی ہے اس کے بعد جب وہ نظر سے غائب ہو گیا تو اس سوزش میں ترقی شروع ہوئی حتیٰ کہ بعض لوگوں کا اس میں خاتمہ ہو گیا۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ نہ دیکھنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو تھوڑی سی تکلیف کا پھر وہ بھی چند دن کی برداشت کر لینا کیا دشوار ہے اور اگر یہی تسلیم کر لیا جائے کہ بہت سی تکلیف ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر ضرر کیا ہوا کیا اس تکلیف سے تنخواہ بند ہو گئی یا کھانا بند ہو گیا ہرگز نہیں اور خود یہ تکلیف وہمی کوئی معتد بہ[1] ضرر نہیں غرض ان معاصی کو تو فی الفور چھوڑ دیا جائے اور جن معاصی کو بزعم خود موقوف علیہ حوائج دنیویہ کا سمجھ رکھا ہے ان کو اگر ترک نہ کر سکیں تو روزانہ ندامت و استغفار اور یہ دعا کہ اے اللہ ہم کو اس سے نجات دے یہ تو ممکن ہے اتنا ہی کر لیا کرو۔ بے فکری اور بے پرواہی تو بہت بری چیز ہے۔

نواں مانع توبہ سے گناہ کی لذت ہے مع جواب

ایک مانع یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ گناہ کو لذیذ سمجھتے ہیں اور اسی لئے نہیں چھوڑ سکتے اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ مال پر نظر کرے اور سوچے کہ یہ ساری لذت ایک دن ناک کے راستے نکلے گی۔ دوسرے اہل فہم کے لئے اس کا یہ جواب ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ گناہ میں لذت ہوتی ہے۔ دیکھئے اگر عادت سے زیادہ مرچیں سالن میں ڈال دی جائیں تو اگرچہ ان میں لذت ہوگی لیکن اس لذت کے ساتھ سوزش ہوگی کہ اس کے سامنے لذت کا ادراک بھی نہ ہوگا۔ اور اگر کچھ ادراک ہو بھی تو لذت کا ادراک تو فوراً ہی ختم ہو جائے گا لیکن سوزش بہت دیر تک باقی رہے گی۔ اسی طرح گناہ کرنے میں گو کچھ لذت بھی ہو لیکن اس روحانی تکلیف و پریشانی کے مقابلہ میں جو کہ گناہ میں ہوتی ہے یہ لذت کچھ بھی نہیں۔ دوسرے اس لذت کا خاتمہ تو فوراً ہی ہو جاتا ہے اور اس روحانی تکلیف کا اثر مدت تک باقی رہتا ہے ہم کو التفات نہیں ورنہ معلوم ہو سکتا ہے کہ گناہ کر کے کس قدر کدورت اور طبعی[2] توحش پیدا ہوتا ہے فوراً ہی مرتکب[3] کی طبیعت

---

[1] شمار کے قابل [2] طبیعت کی وحشت [3] کرنے والے

یہ فتویٰ دیتی ہے کہ تم نے بہت برا کام کیا کبھی اس کو وہ مسرت نصیب نہیں ہوتی جو کہ نیکی کر کے مثلاً نماز پڑھ کر یا روزہ رکھ کر ہوتی ہے کہ قلب میں اطمینان اور ایک نور سا معلوم ہوتا ہے۔ برخلاف گناہ کے کہ اس کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سر پر جوتیاں ماردیں مگر افسوس ہے کہ ہم پھر بھی باز نہیں آتے گویا جوتیاں کھانے کی عادت ہوگئی ہے۔ جیسے چماروں کی عادت ہو جاتی ہے یا جیسے نمرود کی عادت ہوگئی تھی اور یہ تکلیف تو فی الحال ہوتی ہے۔ پھر اس کا ایک مآل (انجام) ہوتا ہے یعنی دنیا ہی میں کہ اس پر طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اکثر رزق سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کو بشرط غور معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ فلاں گناہ کی سزا ہے خوب کہا ہے ؎

ہر چہ برتو آید از ظلمات و غم　　آن زبیباکی و گستاخی ست ہم

(جو کچھ تم پر آتی ہیں تاریکیاں اور غم یہ بھی بیباکی اور گستاخی سے ہی ہے)

غم چو بینی زود استغفار کن　　غم بامرِ خالق آمد کارکن

(جب تم غم دیکھو فوراً استغفار کرو غم تو خدا کے ہی حکم سے کام کرتا ہوا آیا ہے استغفار سے گناہ اور گستاخی معاف ہوگی تو یہ سزا غم پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔)

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے **ان العبد یحرم الرزق بخطیئة یعملها** (بیشک انسان رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے کسی گناہ کی بدولت جو وہ کرتا ہے)

اور کھانے کو ملے بھی تو اس کی برکت جاتی رہتی ہے اس کا سہل طریقہ مشاہدے کا یہ ہے کہ آپ دو مہینے کی رخصت لے کر ان میں سے ایک مہینے تو کسی ایسے شخص کے پاس گزاریئے جو کہ نہایت متنعم اور آرام میں زندگی بسر کرتا ہو اور کسی گناہ سے نہ بچتا ہو اور دیکھئے کہ ان گناہوں کی بدولت اس کے قلب کی کیا کیفیت ہے آخر بات چیت سے اس کے انداز کا پتہ لگ ہی جائے گا خاص کر اس وقت میں جبکہ اس پر کوئی مصیبت آئے مثلاً بیمار ہو جائے یا کسی دشمن کی مخالفت کا اندیشہ ہو اس کے بعد کسی ایسے شخص کے پاس رہیے کہ اس کو اچھی طرح کھانے کو بھی میسر نہ آتا ہو مگر خدا کا مطیع اور فرمانبردار ہو اور اس کے قلب کی

کیفیت دیکھئے۔ خاص کر کسی مصیبت کے وقت اس کے بعد ان دونوں کی قلبی حالت کا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ سرور اصلی کس کے قلب میں ہے آپ پائیں گے کہ وہ فاقہ مست ہر وقت شاداں[1] وفرحاں ہے اور یہ متنعم ہر وقت غم والم میں مبتلا ہے اور یہ ایسا یقینی اور بین فرق ہے کہ جب چاہے اور جس کا جی چاہے امتحان کر دیکھئے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ یہ پریشانی کس چیز کی ہے اور وہ سرور کس چیز کا ہے ظاہر ہے کہ پریشانی نافرمانی کی اور سرور فرمانبرداری کا ہے بس نافرمانی میں لذت اور فرمانبرداری میں کلفت کہنا غلط ہوا بلکہ امر بالعکس[2] ہے قرآن شریف میں ارشاد ہے ولنحیینہ حیوۃ طیبۃً (اور ہم لوگوں کو زندگی دیں گے پاکیزہ زندگی)

یہ تو فرمانبردار کے لئے ارشاد ہوتا ہے فان لہ معیشۃ ضنکاً (تو اس کے لئے زندگی ہے تنگ) یہ نافرمان کیلئے غرض فرمانبرداری میں پوری راحت ہے اور راحت ہی کا نام عیش ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر ایک امیر کبیر کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس سے کہا جائے کہ تم اس پر راضی ہو کہ یہ تمام دولت اس غریب کو دے دو اور یہ تمہارے عوض پھانسی لے لے تو وہ یقیناً قبول کر[3] لے گا۔ اب بتلایئے کہ یہ قبول کیوں ہوا اس لئے کہ دولت کے بدلے میں ایک مصیبت سے نجات ہوئی اور راحت نصیب ہوئی غرض یہ کہنا کہ لذت کی وجہ سے گناہ نہیں چھوٹ سکتے غلط ہوا۔

دین کے پانچ اجزاء میں سے ہم لوگوں نے صرف ایک جزو لے لیا ہے

یہاں تک تو توبہ کے موانع اور ان کے علاج کا ذکر تھا اب ایک مختصر سی فہرست ان گناہوں کی جن میں سب مبتلا ہیں بیان کرنی باقی ہے۔ سو اول یہ سمجھئے کہ دین کے پانچ جز ہیں۔ پہلا جز و عبادات جیسے نماز روزہ زکوٰۃ حج وغیرہ دوسرے معاملات جیسے بیچنا خریدنا نوکر رکھنا رشوت لینا سود لینا روپے کے عوض پیسہ لینا یا گوٹہ ٹھپہ خریدنا وغیرہ تیسرے عقائد کہ

---

[1] خوش خوش [2] اس کا الٹا ہے۔ [3] ساری دولت کے بدلے راحت لی اور راحت ہی عیش ہے دولت عیش نہیں۔

خدا کو ایک جاننا اور اس کو قادر مطلق ماننا ستیلا وغیرہ کے توہمات کو باطل سمجھنا وغیرہ چوتھے معاشرت کہ آپس میں میل جول کس طرح رکھیں۔ جب ملیں مصافحہ وغیرہ پانچویں اخلاق یعنی ملکات[1] باطنہ کا درست کرنا، حسد، بغض، کینہ عداوت وغیرہ سے دل کو پاک کرنا تحمل، بردباری، وقار نرمی خوش کلامی اپنے اندر پیدا کرنا۔ یہ پانچ حصے دین کے ہیں۔ مگر ہمارے مسلمان بھائیوں نے دین کو صرف عبادات میں منحصر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ چار اجزا کو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک بہت سی نفلیں پڑھ لینا گلے میں تسبیح ڈال لینا۔ روزہ رکھ لینا بس اسی کا نام دین ہے۔ بعضے عبادات کے ساتھ تصحیح عقائد کو بھی دین سمجھتے ہیں۔ باقی معاملات اور معاشرت اور اخلاق کو کوئی شخص دین کا جزو نہیں سمجھتا۔ الا ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے دنیا کے حالات ہیں ان میں ہم جس طرح چاہیں کریں شریعت کو ان سے کوئی تعلق نہیں حالانکہ یہ سب شریعت ہی کے اجزاء ہیں[2]۔

الحمد اللہ الرفیق کا حصہ دوم تمام ہوا۔

---

[1] دل کے اندر جمی ہوئی دائمی عادات [2] کیونکہ شریعت دین مذہب ملت سب انہی احکام کا نام ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور حضورؐ یہ سب جز لے کر آئے ہیں سب پر خود عمل کیا اور عمل کو فرمایا ہے اس لئے سب کا مجموعہ ہی دین ہے۔ فقط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدا و مصلیا و مسلما

منکرات روزہ

بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کہ کچھ احکام اس کے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے اس کے تو بیان کی ضرورت نہیں اور ایسے ہی تراویح سنت مؤکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ اس کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں البتہ ضروری مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس مہینے میں کچھ منکرات بڑھا دیئے ہیں اور وجہ اس کی یا تو عدم علم ہے یا قصور علم یا جانتے بھی ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے میں ان چیزوں کو بھی حرام کر دیا جو پہلے حلال تھیں کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ سے حرام ہے اس میں اور شدت زیادہ ہو جائے گی۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے تو علت بیان کی۔ روزہ رکھنے کی **لعلکم تتقون** روزہ اس واسطے ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کر لے کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہوا اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا یا نہیں سو کچھ نہیں' دونوں حالتیں یکساں ہیں کسی باب میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اس کے بھی وقت بدل دیئے مقدار میں کچھ تغیر نہیں کیا۔ غرض یہ کہ شارع علیہ السلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اہل تحقیق تو کھانے تک میں کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینے میں بہ نسبت شعبان کے مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہو سکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے۔ اس سے کم کر دیا۔ بعض نے صرف بقدر[1] لا یموت کھا کر روزہ رکھا جب ہی تو کچھ اثر پایا ہمیشہ اچھی طرح کھایا ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل[2] میں بھی کمی کر دی مگر یہ بات مندوب[3] خاص کے لئے ہے یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا ہے مگر معاصی

---

[1] اس قدر کہ مر نہ جائیں [2] کھانا [3] مستحب

کو تو چھوڑو خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے معاصی کے واسطے تو جواز بھی نہیں ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں بلکہ بعضے تو عصیان میں اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح کی نماز اس مہینے میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔ بہتیروں کی تو قضا ہوتی ہے اور قضا نہ بھی ہو تو اس قدر تاخیر تو ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جائے خوش ہیں کہ ہم نے روزہ رکھ لیا۔ بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا روزہ کیا کفایت[1] کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف[2] ثواب کا وعدہ فرما دیا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حسنات باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بھی سیئات کے برابر نہیں ہوتیں چاہیے تو یہ تھا کہ حسنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی اس کو بھی جانے دیجئے برابر تو رہتی کہ پھر بھی حسنات سبقت[3] رحمتی علی غضبی کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اضعافاً[4] مضاعفہ ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوتیں بلکہ گناہ بڑھا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہونا ہے۔

ماہ رمضان کی عبادت کا اثر برکت اعمال پر تمام سال رہتا ہے

اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اگر ہمیشہ ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ معاصی کو گھٹا دیں تو رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے تجربہ سے ثابت ہوا کہ عبادت کا اثر اس کے بعد گیارہ مہینے تک رہتا ہے جو کوئی اس میں کوئی نیکی بتکلف[5] کر لیتا ہے اس کے بعد اس پر بآسانی قادر ہو جاتا ہے اور جو کوئی کسی گناہ سے اس میں اجتناب[6] کر لے تمام سال بآسانی اجتناب کر سکتا ہے اور اس مہینے میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کے قید ہو جانے کی وجہ سے اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینے میں وہ معصیت کرائے گا مگر ہاں کم اثر ہوگا کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا اس میں ایک مہینے کی مشقت گوارا کر لی جائے کوئی بات نہیں

---

[1] نماز کی طرف سے [2] دس گونا [3] میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے [4] کئی گونا کا کئی گونا
[5] تکلیف اٹھا کر [6] بچاؤ

غرض اس میں ہر عضو کو گناہ سے بچایا جاوے۔

بقیہ منکرات

ایک زبان ہی کے بیس گناہ ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے ایک ان میں سے کذب ہے۔ جس کو لوگوں نے شیر مادر[1] سمجھ رکھا ہے اور کذب وہ شے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں ذرا سا بھی لگاؤ کذب کا ہو جائے بس معصیت ہوگئی۔

حکایت: یہاں تک کہ ایک صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک بچہ سے بلانے کے طور پر یوں کہا کہ لے یہاں آؤ چیز دیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ آ جائے تو کیا چیز دوگی۔ انہوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں فرمایا اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔ حضرت کذب یہ چیز ہے خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں اگر اس سے احتراز نہ ہو سکے تو کذب مضر[2] سے تو بچنا چاہیے اور پھر روزہ میں۔ دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اس کے منہ پر کہہ دیں منہ پر عیب جوئی کرو گے تو بہت[3] اچھا کرو گے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے بلکہ اگر منہ پر برا کہو گے تو بدلا بھی پاؤ گے وہ شخص تمہیں برا کہہ لے گا یا اپنے اوپر سے اس الزام کو دفع کرے گا پیچھے برائی کرنا تو دھوکہ سے مارنا ہے یاد رکھو کہ دوسرے کا مال محترم[4] ہے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ آبرو ہے۔ چنانچہ جب آبرو پر آ بنتی ہے تو مال تو کیا چیز ہے جان تک کی پرواہ نہیں رہتی پھر آبروریزی کرنے والا کیسے حق العبد سے بری ہو سکتا ہے مگر غیبت ایسی رائج ہوئی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہوگئی یا نہیں۔ اس سے بچنے کی تدبیر تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا برا اصلاً ذکر ہی نہ کیا جاوے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا جاوے کسی کا تو شیطان دوسرے کی برائی تک پہنچا دیتا ہے۔ اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کر رہا ہوں اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم ہوگئی اور حضرت اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے دوسرے کی کیا پڑی۔ علاوہ بریں

---

[1] ماں کا دودھ [2] جو دوسروں کو ضرر پہنچائے۔ [3] یہ تو مسلمان کو تکلیف دینا ہوا جو حرام ہے [4] عزت والا

غیبت تو گناہ بے لذت بھی ہے اور دنیا میں بھی مضر ہے جب دوسرا آدمی سنے گا تو عداوت پیدا ہو جائے گی اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں۔ سب سے بچنا ضروری ہے۔ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزہ کے متعلق ہے افطار[1] علی الحرام ہے بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس مہینے میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہو گیا اور پھر دن بھر تو اسے لوگ چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں۔

غلطی ان لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ حلال رزق نہیں ملتا

اور دراصل بعض لوگوں نے خبط[2] میں ڈال دیا ہے یوں کہتے ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھائی جائے یا سبزی کھا کر یا گھاس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں وہ ایک بزرگ کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا کہ نامعلوم دوسرے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھر میں بلا اجازت چلی آئی کون سے دانے میں شامل ہوگئی ہو۔اگر یہ قصہ ہوا ہے تو وہ صاحب حال ہیں دوسروں کے لئے ان کا فعل حجت نہیں ہو سکتا قصداً اتنا مبالغہ کرنا تقویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں جب اتنے شبہ کو بھی حرام میں سمجھا جاوے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہوگا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس حراموں میں مبتلا ہو گئے اور حلال کو بالکل چھوڑ دیا۔ میں کہتا ہوں کیا کنز و ہدایہ بالکل لغو ہی ہیں۔ جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط[3] کیا۔صرف اتنا کافی تھا کہ الحلال لا یوجد[4] ہرگز نہیں جس پر کنز و ہدایہ فتویٰ دے دیں وہ حلال ہے میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں۔

حکایت: ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب ان کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی ان کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو قے ہو جایا کرتی تھی اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے ورنہ وہ کیا

---

[1] حرام پر روزہ کا کھولنا [2] گڑبڑ [3] تفصیلی بات [4] حلال کا وجود ہی نہیں

کھاتے تھے۔ اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں[1] ہو سکتی یا یہ کہ ہمیشہ قے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے۔ غرض دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں۔

منشا اس غلط خیال کا کہ حلال رزق نہیں ملتا

اور یہ فساد پیدا کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا جو جی میں آیا کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے عادی ہو گئے۔ اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا بس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ بھی حلال کو حرام ہی کہا کرتے ہیں ان کی تو غرض یہی ہے کہ مال نہ بڑھے اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے۔ حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے اور خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھا چاہیے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتا دیں یا حلال بتائیں تو ہماری خاطر سے ہی شاید کہہ دیں اور فی نفسہ حرام ہی ہوگا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح[2] کہے وہ عنداللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔ شیطان کے بہت سے جال ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے پھر بعض لوگ حرام و حلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب اس میں وسوسہ ہے تو چھوڑ ہی دو چاہے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں۔ نہیں اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے۔ اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے وہ کوئی ظالم نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ یہی چاہتے ہوں کہ تم کو دقت میں ڈالیں اور یہ خیال مت کرو کہ حلال موجود ہی نہیں پوچھ لو پھر جس سے وہ منع کریں اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو۔

نفس کی کم ہمتی کا عمدہ علاج

اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام وقت کے احکام ہیں انکو کس طرح

---

[1] قے ہو ہو جائے کیونکہ پھر تو وہ اس کے عادی ہوں گے [2] جائز بتائیں تو چونکہ وہ لوگ اسی چیز کو جائز بتاتے ہیں جو شریعت میں جائز ہو تو وہ اللہ کے نزدیک جائز ہی ہے۔

مانتا ہےاسکو حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو پھر دوسرے لوگ بھی ان شاءاللہ تم سے معارضہ نہ کرینگے۔

حکایت: میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنواتا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے ربوا[1] لازم آ جاتا ہے۔ اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کرا سے دیتا۔ دو ایک مرتبہ تو اس نے کہا کہ روپیہ دے دو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے۔ بس اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا تو لوگ سب مان جاتے ہیں آدمی پکا چاہیے اور اللہ میاں کی طرف سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی کو امر شاق کا حکم دیتا ہے تو اس پر ماموٗر[2] کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دل کو مضبوط کر واور اس پر عزم[3] کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھے نہ کریں گے۔ ہاں پوچھنے سے بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی اور اس میں آمدنی بھی کم ہو جاوے گی۔ تو خوب سمجھ لو اور تجربہ کر لو کہ اس میں کم ہی میں برکت ہو جاوے گی۔ اور اس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گیہوں لائے اور گھر پر آ کر دو من اترے۔ ممکن ایسا بھی ہے ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنواتے تھے اور ایک تھیلی میں روپے رکھتے تھے اور کام شروع کیا۔ جب ضرورت ہوتی اس میں ہی سے ہاتھ ڈال کر نکال لاتے یہاں تک کہ سب کام بن گیا حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا۔ تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں اور وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل جب تمہارے ہی صرف میں آئے۔ بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں مقدمات میں لاطائل[4] تکلفات میں ضائع نہ ہو جائے جو کچھ آئے تمہاری ہی ذات پر صرف ہونا چاہیے۔ گیہوں تھوڑا ہو اس سے بہتر کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو۔

رضاء حق عمل کا اصل ثمرہ ہے

اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و مافیہا سے بہتر

---

[1] سود لازم آتا ہے ادھار کی وجہ سے اور دوسری وجہ اور تھی جو پہلے تھی اب نہیں کہ پہلے روپیہ چاندی کا ہوتا تھا کمی زیادتی سود تھی۔ [2] جس کو حکم دیا گیا [3] پکا ارادہ [4] بے فائدہ مثلاً فیشن تفریحات نام کے کھیل

ہے۔ اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرت اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں

ع تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(تو ہی دل میں رہ اے وہ ذات کہ جس کے سوا کوئی پاک ہی نہیں)

دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان کی خوشنودی دیر پا نہیں ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور[1] ہیں۔ خیال کیجئے اس لفظ کو۔ ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جائے اور وہ اس کی نسبت منظوری و عدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن[2] کو حکم دے دے کہ رکھ لو تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جاویں گے اور سناتا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں۔

ہماری نماز کی مثال

ایک نماز ہی کو لے لیجئے اس وقت نظیر کے واسطے۔ کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے باتیں کرنے کو اور کرتے ہیں کس سے گاؤخر[3] سے یا یوں مثال دیجئے۔

کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی بلکہ یوں کہیے کہ زبردستی طلب کیا (ہم ایسے بھلے مانس تو کاہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو غنیمت سمجھیں) زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پابہ زنجیر ہو کر دربار میں پہنچے اور کام ہم سے کیا ہے کہ بادشاہ کو ان پر رحم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کر لے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہو جائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں۔

من نکردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

بائے من نکردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ اپنا کوئی فائدہ کروں بلکہ اس واسطے کہ بندوں پر سخاوت کروں)

---

[1] قدرداں [2] خزانچی [3] گائے گدھا سے کہ ان کا خیال آ رہا ہے۔

اللہ میاں کا کیا نفع ہے کہ ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے خیران حضرات نے کیا مکافات[1] کی اس بلانے کی کہ پہنچتے ہی تو منہ[2] پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اور کانوں میں انگلیاں دے لیں مگر بادشاہ تو کم ظرف نہیں ہے اس گستاخی پر نظر نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بے وقوف کی انگلیاں کانوں سے نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے۔ اور منہ اس کا ہماری طرف کر دو اور جلدی سے شفقت آمیز کلمات فرمانے لگے کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑ جائیں۔ دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا مگر یہ تو قسم کھا کر چلے ہیں کہ الٹا ہی کریں گے۔ چٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بڑھائیں مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑ جائے اس جگہ سے بھاگ اصطبل میں گھوڑے کے پاس جا چھپے۔ وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا گدھے کے پاس جا چھپے۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا کئے اور بادشاہ کے نوکر بلکہ خود بادشاہ اللہ اکبران کے پیچھے پھرا کیا مگر انہوں نے وہی کیا جو شامت[3] عمال سے ہونا تھا۔

ہماری نماز پر سزا نہ ہونا ہی غایت[4] درجہ کی رحمت ہے

اب فرمائیے کہ یہ شخص کس سزا کا مستحق ہے یا بادشاہ کو اس پر رحم آنا چاہیے۔ یہ تو اس قابل ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جرم میں اس کو لے لیا جائے اور کبھی دربار کی حاضری کی اجازت نہ ہو اب آپ اپنے معاملہ کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجئے کہ ادھر سے تو حاضری کی اجازت ہر وقت۔ یعنی نفل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو۔ (باستثنائے تھوڑے وقتوں کے) مگر ہمیں توفیق نہیں ہوئی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں۔ یہاں تک کہ پکڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی یعنی فرض نماز کا وقت آیا۔ نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے۔ برا بھلا وضو کیا اور باکراہ[5] نیت نماز کی کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے۔ کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں۔ صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں۔ دھوکا دینے کے واسطے آداب شاہی بجا لا رہے ہیں یعنی <u>سبحانک اللھم</u> پڑھا اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا۔

---

[1] بدلہ [2] دل کا منہ کان کی توجہ [3] گناہوں کی بدبختی [4] انتہا درجہ کی [5] زبردستی

چنانچہ **الحمد الله رب العالمین** پر جواب ملنا حدیثوں میں آیا ہے۔ ذرا سی بھنک کان میں پڑتے ہیں ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آ کر دم لیا۔ کبھی بیوی کے پاس کبھی بچوں کے پاس، کبھی مکان کبھی طویلہ میں پھرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کا جولانی[1] دینا ہے۔ غرض یہی مسخراپن کیا کئے۔ یہاں تک کہ بمشکل تمام دربار کی حاضری ختم تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی بادشاہ کی ہمکلامی سے بچ گئے۔ جانے وہ کاٹ کھاتا یا کیا کرتا (یہ خبر نہیں کہ کیا کرتا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے) صاحبو! اب ان گستاخیوں کی سزا وہی ہونی چاہیے تھی یا نہیں۔ جو مثال میں میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی نماز پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور حبس دوام کا روبکار جاری ہو جاتا۔ مگر سنئے کہ اللہ میاں سے کیا روبکار جاری ہوا۔ **و کان سعیکم مشکوراً** (اور تمہاری کوشش قدردانی کی ہوئی ہوگی) اس نے دربار میں اتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھی طرح انجام دیا۔ مر جانے کی بات ہے اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں اور جو وہاں[2] حاضر تھے انہوں نے بھی خوب دیکھا بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے اور فرماتے ہیں۔ **اولئک یبدل الله سیاتهم حسنات** (یہی لوگ ہیں جن کی بدیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیتے ہیں) گویا یہ بیوقوف ہے کتنی گستاخیاں کیں مگر ہم تو اس آنے کو حاضری ہی میں لکھے لیتے ہیں اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کی جاتی ہے۔ اب فرمایئے اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ پھر اسی وحشیانہ طریق سے دربار میں جاوے ہرگز نہیں بلکہ سر سے پیر تک خجالت کے پسینہ میں غرق ہو جائے گا۔ مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا معنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفا کاری کرتے ہیں مگر ادھر سے مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اس پر طرہ یہ کہ ان لنگڑے لولے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جا سکتا ہے بداعمالیوں) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے محرمات[3] کی طرف میلان ہے صاحبو! ذرا شرماؤ اور عمل کرو۔ اور حرام سے بچو خاص کر رمضان کے مہینے میں۔

---

[1] خیالات دوڑائے [2] یعنی فرشتے [3] حرام کام

تلاوت قرآن شریف کا مع اپنے حق کے ضروری ہونا

الذین اٰتینھم الکتاب یتلونہ حق تلاوتہ اولٰئک یؤمنون بہ و من یکفربہ فاولٰئک ھم الخسرون یہ آیت سورہ بقرہ کی ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا حق ہے تلاوت کا۔ ایمان والے یہی ہیں اور جو کتاب پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ والے ہیں۔ اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک[1] ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے اس آیت میں ہر چند کہ کتاب سے مراد توریت ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت کے قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے۔ محض کتاب ہونا نہیں ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت اور زیادہ قابل مدح ہوگی اور اسی آیت سے اس کی فضیلت بطریق اولیٰ ثابت ہوگئی۔ اس آیت سے قرآن مجید کے تلاوت کرنے کی اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ بات بدیہی[2] ہے کہ تلاوت بلا سیکھے ہوئے اور پڑھے ہوئے کیسے ہوسکتی ہے۔ سیکھنا اور پڑھنا اس کا موقوف[3] علیہ ہے اور مقدمہ[4] ضروری کا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آپ باورچی کو حکم دیں کہ کھانا پکا تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ہانڈی چولہے پر رکھ کر آنچ دے بلکہ بازار سے گوشت لا اور مصالح لا اور اناج لا اور پکانے کے برتن مہیا کر اور آگ جلا۔ تب ہانڈی کو آنچ دے چنانچہ کھانا پکانے کے حکم کے بعد باورچی کا ان سامانوں میں لگا رہنا آپ کے نزدیک اور کاموں کے نہ کرنے کا عذر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کاموں میں اس کا لگا رہنا پکانے ہی کے حکم کی تعمیل سمجھا جاتا ہے۔ اگر اناج مثلاً نہ ہو اور وہ بیٹھا رہے اور عین وقت پر عذر کرے تو یہ عذر اس کا آپ ہرگز نہ سنیں گے کہ حضور آپ نے مجھے صرف پکانے کا حکم دیا تھا یہ نہیں فرمایا تھا کہ اناج بھی منگانا اس کے عذر کے نہ سننے کی کیا وجہ ہے یہی کہ کسی چیز کا حکم ہے اس کے اسباب[5] ومقدمات کا بھی حکم ہے۔ الشیء اذا ثبت ثبت بلوازمہ (چیز جب موجود ہوتی ہے تو اپنی لازمی باتوں کے ساتھ ہوتی ہے)

---

[1] دونوں میں شریک بات [2] بالکل ظاہر [3] جس پر تلاوت موقوف کہ بدوں اس کے نہیں ہوسکتی
[4] جس پر کوئی ضروری چیز موقوف ہو وہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ [5] ذریعوں کا اور ان کا کہ جس پر یہ موقوف ہے

بنا بریں تلاوت کتاب کا مطلوب ہونا اس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے۔ جو فضیلت تلاوت کی ہوگی وہی فضیلت سیکھنے کی ہوگی اور جس قدر ضرورت تلاوت کی ہوگی اسی قدر ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا اور دیکھئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے صرف یتلونہ[1] نہیں فرمایا بلکہ حق[2] تلاوتہ کی قید بھی بڑھائی اور اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ایک تو یوں کہیں کہ یہ کام کرلاؤ اور ایک یہ کہ یہ کام خوب سوچ سمجھ کرلاؤ اور اس دوسرے لفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفس کام کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ وہ من کل الوجوہ[3] مکمل نہ ہو اس سے نفس امر کی اور زیادہ تاکید ہو جاتی ہے تو آیت میں نفس تلاوت کی اور زیادہ تاکید ہوگئی۔ پھر نفس تلاوت میں تشدید ہو جانے سے اس کے مقدمہ یعنی سیکھنے کے حکم میں بھی تشدید ہوگئی غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری بلکہ نہایت ضروری ہوا۔ پھر اتنا سیکھنا بھی کافی نہیں ہوگا کہ نفس تلاوت کا ذریعہ ہو بلکہ اتنا سیکھنا چاہیے کہ حقوق تلاوت ادا ہوں۔ اب سمجھئے کہ حق تلاوت کیا ہے ہمیشہ یاد رکھئے کہ جس چیز کی فضیلت بیان ہو اور جس چیز کی برائی بیان ہو۔ اس کی حقیقت سمجھ لینا چاہیے اگر وہ چیز اپنی حقیقت پر ہو تو قابل فضیلت یا برائی ہے ورنہ نہیں۔

حقیقت تلاوت

یہاں تلاوت کتاب اللہ کی فضیلت بیان ہوئی لہٰذا اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے اوراد[4] کا اور قصص[5] اور حکایات کا اور احکام کا اور جامع ہے تمام بھلائیوں کو قطع نظر تمام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضیٰ اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز بندوں کو اس تک رسائی بھی نہ ہوتی۔ کہاں وہ کلام مقدس کہاں ہم حقیر بندے۔ دیکھ لیجئے دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے دربار کی حاضری کے لئے لوگ کتنی کتنی کوششیں کرتے ہیں اور عمریں گزار دیتے ہیں تب کہیں سلام کرنے کا موقع ملتا ہے اور جس کو ایک دو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ اپنے آپ کو کتنا کچھ سمجھنے لگتا ہے اور تمام سلطنت بھر میں اس کی کیا عزت ہو جاتی ہے جب کلام شاہان دنیا کی یہ عزت ہے تو بادشاہ شاہان اور احکم

---

[1] تلاوت کرتے ہیں [2] جیسا حق ہے تلاوت کا [3] ہر طریقہ سے [4] وظیفے [5] قصے

احا مین ے کلام کی کیا کچھ عظمت ہونی چاہیے۔ شاہان دنیا کا کلام دو چار برس کی تمنا اور کوششوں کے بعد میسر ہوتا ہو تو کلام الٰہی اگر کچھ بھی نہیں تو دو چار برس کی محنت کے بعد تو نصیب ہونا چاہیے مگر نہیں۔ کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنی کتاب دیدی اور اذن[1] عام دے دیا کہ جس کا جس وقت جی چاہے ہم سے باتیں کرے پھر صرف اذن ہی نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو اب ہم بندے اپنی ذلت اور احکم الحاکمین کی عزت کو پیش نظر کر کے دیکھیں کہ یہ باتیں کرنے کی فرمائش کیا چیز ہے سوا اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ محض فضل ہے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے۔ اب اس آیت میں فرماتے ہیں کہ ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا یتلونہ حق تلاوتہ (تلاوت کرتے ہیں اس کی جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے) ترکیباً تو اخبار[2] ہے مگر مقصداً انشا ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ تلاوت کے حقوق ادا کریں۔

تلاوت کے ظاہری و باطنی حقوق اور قرآن کی تعلیم کی جامعیت

جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری قربان جایئے تعلیم شریعت کے کہ اعمال میں صرف بناوٹ نہیں سکھلائی بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے اور باطنی بھی اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا مثلاً ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا واخفض لھما جناح الذل کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو وضع میں قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں ان سے تذلل[3] برتو۔ کسی بات میں ان پر ترفع[4] مت کرو۔ یہ تو حق ظاہری ہے اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے ادا فرما دیا۔ یعنی من الرحمۃ یعنی ان کے سامنے نری ظاہری پستی پر اکتفا نہ کرو اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری پستی کا منشا رحمت ہو۔ رحمت رقت قلب کو کہتے ہیں یعنی ان کی خدمت دل سے کرو جیسا ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے۔ باطن کو بھی پست کرو دل کے

---

[1] عام اور سب کو اجازت [2] ترکیب میں تو جملہ خبریہ ہے مگر مقصود و معانی انشا اور حکم کے ہیں۔
[3] اپنے کو پست کرنا [4] بلندی حاصل کرنا

اندر خشوع[1] بھی ہو خضوع بھی ہو۔ قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی یہی خوبی ہے کلام اللہ کی تعلیم کی۔ کسی حکیم کی یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور اس پر بھی اکتفا نہیں کیا آگے فرماتے ہیں و قل رب ارحمهما کما ربیانی صغیراً (اور کہو اے میرے پروردگار ان پر ایسا رحم فرما جیسا انہوں نے مجھے چھوٹے پن میں پالا ہے) اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم والدین کو اور اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائے گا اور اس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو۔ ان کو بھی دل سے ادا کرو یہاں حکم ہے کہ ان حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع بھی نہ ہو۔ قل رب ارحمهما یعنی ان کے لئے دعا بھی کرو یہ بھی ایک حق باطنی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حق تین ہیں ظاہری اور باطنی اور ابطن[2] اور تینوں قسموں کے ادا کا حکم ہے۔ اسی طرح حق تلاوت بھی مختلف ہوتے ہیں میں اس کی ایک مثال دیئے دیتا ہوں جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔

تلاوت کی ایک مثال

فرض کیجئے کہ بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دے کر کہے کہ اس کو پڑھو تو اس کی حالت پڑھنے کے وقت یہ ہوگی کہ ہر ہر لفظ کو صاف صاف پڑھے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کے ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا ایک تو اس خیال سے کہ عبادت کا لہجہ بلامعنی سمجھے ہوئے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت پڑھنے والے کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں بلکہ حال قال سے یہی ثابت کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھیے۔

تلاوت قرآن شریف کے تین مرتبے ہیں

اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اس طرح کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ

---

[1] عاجزی وانکساری [2] بہت باطن اور چھپا

الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ نہیں کہ خیال کہیں ہے صرف طوطے کی طرح سے لفظ ادا کر دیئے یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا ہو گیا۔ غرض کل تین حق ہوئے۔ ایک حق ظاہری یعنی تلاوت دوسرا حق باطنی یعنی معنے سمجھ لینا تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ[۱] و بین اللہ ہے اور ان تینوں میں وجوداً[۲] سب سے مقدم حق ظاہری ہے اور مؤکد[۳] سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے۔ یعنی عمل ان دونوں میں حقیقت اور صورت کا فرق ہے۔ اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور ضروری دونوں ہیں۔ پس حقیقت بلاصورت کے باطل ہے اور صورت بلاحقیقت کے عاطل[۴] غرض ثابت ہوا کہ عمل بھی ایک حق ضروری ہے یہ نہیں کہ محض مرتبہ مستحب ہی میں ہے۔ دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرمادیا۔ اولیک یؤمنون بہ جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں یعنی کامل ایمان انہیں کا ہے۔ پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے۔ تو ضرور عمل بھی واجب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت کبریا[۵] کے لحاظ رکھنے سے کل مفاسد کی اصلاح ہو جاتی ہے

ولہ الکبریاء فی السمٰوات والارض وھو العزیز الحکیم (اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے بڑائی سب آسمانوں اور زمینوں میں اور وہی غلبہ والے اور حکمت والے ہیں)

اس آیت میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے خاص اپنی ایک صفت بیان فرمائی ہے اگر اس کو انسان نظر میں رکھے تو کل مفاسد اس سے الگ ہیں۔ خلاصہ اس کا معرفت تعلق انسانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ظاہر ہے کہ تعلق امر نسبتی[۶] ہے جو طرفین کو چاہتا ہے۔ ایک طرف حق تعالیٰ

---

[۱] اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان [۲] موجود ہونے کے اعتبار سے [۳] تاکیدی [۴] بے کار
[۵] عظمت اور بڑائی کی صفت [۶] دو چیزوں کا درمیانی تعلق

ایک طرف بندہ تو اس تعلق کے پہچاننے کا طریق دو[1] معرفتوں کا جمع کرنا ہے۔ معرفت حق تعالیٰ کی اور معرفت اپنے نفس کی اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ تلازم[2] بھی ہے۔ اگر حق تعالیٰ کو پہچان لیا جائے تو نفس کی پہچان ہو جائے گی۔ اور اگر نفس کا علم ہو جائے تو معرفت حق تعالیٰ ہو جائے گی۔ اس واسطے کہا گیا ہے۔ **من عرف نفسه فقد عرف ربه** (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو بھی پہچان لیا) اور پہلی[3] معرفت دوسری معرفت سے اس لئے اہم کہ نفس تو حاضر ہے اور اللہ غائب[4] اور غائب کا پہچاننا مشکل ہے حاضر سے۔ اس اہمیت کے سبب اس آیت میں اسی کی تعلیم کی گئی ہے کہ اس میں اپنی ایک صفت ذکر فرمائی کہ اس صفت سے پہچانیں۔ اور وہ صفت کبریا ہے۔ جو تمام صفات کے درجہ کمال کو شامل ہے اور معنی اس کے بڑائی ہیں۔ جس کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور جب یہ حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو دوسرے میں نہ ہونی چاہیے سو جب تک یہ معرفت محفوظ رہے گی[5] حاشا وکلا جو کوئی مفسدہ بھی ہونے پائے۔

کبر تمام عیوب حتیٰ کہ کفر وشرک کی بھی جڑ ہے

اور جب یہ معرفت نہ رہے گی اور بندہ صفت کبریا کو اپنے اندر لینا چاہے گا تو کچھ بھی مضرتیں اور عیوب پیدا ہوں کم ہیں۔ اور واقع میں یہی ایک صفت کبریا ہے کہ جڑ ہے تمام مفاسد کی حتیٰ کہ شرک کی دنیا میں جو کوئی بھی کافر ہوا ہے وہ کافر نہیں ہوا مگر اپنے نفس کے کبر سے ورنہ حق مخفی نہیں رہتا۔ **وجحدوا بها واستيقنتها الايه** (اور بنی اسرائیل نے انکار کر دیا آیات کا ظلم اور تکبر کی راہ سے حالانکہ یقین رکھا تھا ان کے دلوں نے) ظلم اور علو کو سبب فرمایا۔ جحد[6] کا علو اور کبر ہم معنی ہیں۔ ابو طالب کو ایمان سے کس نے روکا صرف عار نے یوں کہا کہ مرتے وقت ایمان لاؤں گا۔ تو قوم میری کہے گی ابو طالب دوزخ سے ڈر گیا۔ اس کی حقیقت یہی تو ہے کہ جو رفعت[7] قوم پر حاصل ہے وہ نہ رہے گی اس رفعت نے پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کام تمام ہی کر دیا اور کبر کا وجود کسی ایک گروہ میں نہیں بلکہ یہ وہ عام

---

[1] دونوں جانبوں کا پہچاننا ہے۔ [2] لازم ہونا۔ [3] اللہ تعالیٰ کی [4] نظروں سے اوجھل [5] ہرگز ہرگز
[6] انکار کا علو یعنی بڑائی سے ہونا اور تکبر ایک معنی میں ہیں [7] بلندی

مرض ہے کم و بیش ہر طبقہ کے لوگ اس میں مبتلا ہیں۔ اور دوسرے عیوب میں تو اکثر جاہل لوگ پھنسے ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتوں میں وہ عیب کم ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کے برے نتائج کو جانتے ہیں لیکن اس میں جاہل عالم سب کم و بیش مبتلا ہیں۔ مشرکین عرب تو جاہل تھے۔ اب اس گروہ کو دیکھئے جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا یعنی اہل کتاب ان کو بھی ایمان لانے میں جو حارج ہوا سو وہی کبر اس مختصر بیان سے بقدر کفایت اس کی توضیح ہوگئی کہ کفر و شرک کا مبنیٰ ہمیشہ کبر ہے۔ اب غور کر کے دیکھئے تو یہ بھی ثابت ہو جائے گا اور بہت سے معاصی کا منبی بھی کبر ہی ہے جو کفر و شرک سے نیچے ہیں۔ ایسے گناہ کبر سے اس طرح ہوتے ہیں کہ گنہگار اپنے برے عمل کو صرف اس عار کی وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ لوگ کہیں گے اتنے روز سے یہ احمق رہا اس کام کو ہمیشہ سے کیوں کرتا رہا جو اب چھوڑنا پڑا۔ اس شخص نے عیب حماقت سے اپنے نفس کو بچایا[1] یہی کبر بڑا مرض ہے۔

تکبر کا علاج

اور علاج بالضد ہوا کرتا ہے یہ مرض پیدا ہوا عدم معرفت کبریاء حق سے تو علاج معرفت کبریاء حق ہوگا۔ یعنی عظمت حق تعالیٰ کی۔ اس کو حق تعالیٰ نے آیت میں بلفظ حصرا[2] اپنے واسطے ثابت کیا ہے۔ ولہ الکبریا یعنی اسی کے واسطے ہے۔ عظمت بلاغت کے قائدے سے لہ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ نہیں فرمایا۔ ولہ الکبریا العظمیٰ کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریا کو دوسرے سے نفی کر دیا۔ اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ العظمۃ ازاری و الکبریاء ردائی فمن نازعنی فیھا قصمتہ یعنی عظمت میرا تہ بند ہے اور کبریا میری چادر ہے جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہ بند فرمانا کنایہ ہے خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دو صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں اس کو سزا دوں گا جب کبر حق[3] ہوا باری تعالیٰ کا تو

---

[1] اگر کبر نہ ہوتا اور عاجزی ہوتی تو اس کی پرواہ نہ کرتا۔ [2] صرف اور صرف کہہ کے [3] بڑائی

اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساواۃ ہوئی۔ باری تعالیٰ کے ساتھ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی مثلاً کھانا کہ جب تک اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک کہ سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے مگر کبر و معصیت ہے کہ اس کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر** یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد[1] ہے۔ **اخرجوا من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من ایمان** یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے۔ اسے دوزخ سے نکال لو۔ اسے پہلی حدیث سے ملائیے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں کہ ایک ذرہ بھر بھی کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں فرماتے ہیں کہ ایک ذرہ بھر بھی ایمان جس کے دل میں ہے جنت میں جائے گا۔ اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر بھی کبر جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر بھی ایمان نہیں ہوسکتا اور ذرہ بھر بھی ایمان جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہوسکتا ہے۔ دونوں بالکل نقیضین ہیں گو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر کبر نہ ہوگا۔ لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مضاد[2] ایمان کسی درجہ میں ہونا ثابت ہوا۔ اب سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت مصیبت ہے اور ہونا چاہیے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اس کی بھی اصل[3] ہے۔ اور کفر اس کی فرع تو مسلمان کو چاہیے غور کیا کرے کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔ مگر ہماری تو عادت ہوگئی ہے کہ سوچتے ہی نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ نہ دیندار ہمارے خالی ہیں کبر سے نہ دنیا دار خالی ہیں کبر سے۔ جو دیندار کہلاتے ہیں وہ دین کے پیرایہ میں اس میں گرفتار ہیں اور جو دنیادار ہیں ان کو خبر نہیں کہ کبر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ چنانچہ دیندار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم دنیاداروں سے اچھے ہیں۔ جتنی ترقی ان کو نماز پڑھنے سے ہوتی

---

[1] سخت حکم [2] ایمان کی ضد [3] جڑ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت دل میں نہ ہوئی اور اپنے کو کچھ سمجھا جبھی تو ان کی ذات یا صفات یا حکم کا انکار ہو کر کفر ہوا۔

ہے اس سے زیادہ تیزی اس پندار[1] سے ہوتا ہے۔ دین کے ساتھ ساتھ بدترین دنیا ان کے قلب میں جگہ پکڑے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز میں جب یہ خرابی ہے تو ان کو چاہیے کہ نماز چھوڑ دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ خرابی نماز میں جب پیدا ہوتی ہے جبکہ حق تعالیٰ کی عظمت قلب میں نہ ہو اور جب عظمت ہو تو دوسری طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی نماز سے آدمی بجائے اس کے کہ اتراوے الٹا شرمندہ ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بہت بڑے شہنشاہ کے حضور میں ایک نہایت ذلیل آدمی کوئی تحفہ بہت کم قیمت لے جائے دربار عظمت وشوکت دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی مختصر یہ ہے کہ اس ذلیل تحفہ کو پیش کرنے پر بھی اس کو قدرت نہ ہوگی ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور غنیمت سمجھے گا کہ کسی سزا کا حکم نہ ہو جائے۔ جلدی کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ ہماری نمازوں کی جو حقیقت ہے وہ خوب معلوم ہے پھر اس کو حق تعالیٰ جیسے احکم الحاکمین کے سامنے پیش کر کے ذرا شرم بھی نہ آنا اسی وجہ سے ہے کہ عظمت وجلال حق تعالیٰ سے ہم نے قطع نظر[2] کر لی ہے۔ اور اسی سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ دوسری طرف توجہ ہوئی اور اپنی نماز کو کچھ سمجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اس تقریر سے بخوبی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ نماز پڑھنے یا اور دین کے احکام بجالانے سے اگر دل میں کبر پیدا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اس عمل کو چھوڑ دیا جائے بلکہ جو سبب[3] ہے اس کو قطع کیا جائے۔

تکبر کا سبب اور اس کا عموم اور غموض[4]

سبب اس کبر کا تعمیل حکم دین نہیں ہے بلکہ عظمت الٰہی کا دل میں نہ ہونا ہے۔ سو اس کو پیدا کرنا چاہیے۔ اس سے تعمیل حکم بھی ہوگی اور وہ خرابی جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ بھی نہ رہے گی اس غلطی میں بہت سے لکھے پڑھے اور سمجھدار بھی مبتلا ہیں۔ خوب سمجھ لو غرض ہمارے دیندار بھی کبر میں مبتلا ہیں۔ اور دنیادار بھی دنیاداروں میں اس طرح کا کبر تو نہیں ہے جو دینداروں میں ہے ہاں دنیاداروں میں اور طریقے کبر کے ہیں وضع میں لباس میں

[1] خود کو کچھ سمجھنے سے [2] نظر ہٹالی کہ وہ سامنے نہ رہے تو یہ نماز بھی عبادت قابل قبول سمجھ لی۔ [3] دل میں حق کی عظمت اور جاہ وجلال کا نہ ہونا۔ [4] عام ہونا اور باریک ہونا

بیاہ شادی میں کبر میں سب گناہوں سے بڑھ کر ایک خرابی اور ہے وہ یہ کہ مسلمان خواہ کسی درجہ کا ہو مگر اس کے دل میں یہ بات ضروری ہے کہ جب کوئی گناہ ہو جائے کر تو گزرتا ہے کسی ضرورت سے لیکن کرنے کے بعد دل میں چوٹ ضرور لگتی ہے اور پشیمان ہوتا ہے مگر کبر کہ یہ گناہ ساری عمر دل میں رہتا ہے اور دل میں صدمہ نہیں[1] ہوتا۔

غیبت وحسد[2] وغیرہ جو کبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں ان کا چھوڑنا بھی معین[3] فی العلاج ہے

تو ہر اس عمل کو جو کبر کی فرع ہو چھوڑ دو۔ جیسے غیبت حسد وغیرہ غیبت کوئی جب ہی کرتا ہے کہ جب اپنے آپ کو اس سے اچھا سمجھتا ہے۔ جس کی غیبت کرتا ہے کسی مریض کو ہنستا وہی شخص ہے جو خود تندرست ہو اور اگر اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ مریض پائے تو کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے سے کم مریض کو ہنستا ہو۔ یہ اچھا سمجھنا ہی کبر ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جو آدمی جلتا ہے (جسے حسد کہتے ہیں) اس کی بنا بھی اس پر ہے کہ اس صاحب نعمت سے زیادہ اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل سمجھتا ہے یہ بھی اپنے نفس کی بڑائی ہے جسے کبر کہتے ہیں۔ غرض اکثر گناہوں کو ٹٹولو گے تو بنا کبر ہی پاؤ گے۔ لہٰذا سب کو چھوڑ دو حتیٰ کہ معاصی کی اصل[4] ہی دل سے نکل جائے کیونکہ بڑائی کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں تو جو شخص کبر کو نہیں چھوڑتا وہ نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا حق تھا اور کس کو دینا ہے تو اس نے نہ نفس کا حق پہچانا نہ حق تعالیٰ کا اس سے بڑھ کر جاہل کون ہوگا۔ یہ شخص معاصی سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا۔ جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے کیونکہ معاصی کی جڑ اس کے دل میں موجود ہے۔ ایک سے بچے گا دوسرے میں پڑ جائے گا۔

کبر کا نہایت مجرب اور کافی علاج

اس واسطے حق تعالیٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتا دیا کہ جب اس کو مستحضر[5] رکھا جائے تو

---

[1] نہ چوٹ لگتی ہے نہ اس کو برا سمجھتا ہے نہ شرمندگی اور توبہ ہوتی ہے اس لئے یہ سب سے زیادہ خطرناک ہوا۔
[2] دوسرے کے مال یا عزت کے جاتے رہنے کی خواہش اور غیبت ہر وہ بات ہے جو دوسرے کو ناگوار معلوم ہو خواہ اس میں ۰۰ ہو یا نہ ہو سامنے ہو یا پیچھے۔ [3] کبر کے علاج میں مدد دینے والا [4] کبر اور خود کو کچھ سمجھنا۔ [5] ذہن میں حاضر

یہ چھوٹا گناہ ہو نہ بڑا۔ وہ علاج یہ ہے کہ اپنی ایک صفت کو بیان فرمایا کہ جب خیال رکھو گے کہ یہ کسی دوسرے کے لئے کسی وقت اور کسی حالت میں ثابت نہ ہونے پائے تو گناہ تم سے خود بخود چھوٹتے جائیں گے۔ اور وہ صفت عظمت ہے۔ **ولہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض** (اور اللہ تعالیٰ کے ہی لئے ہے عظمت بڑائی سب آسمانوں اور زمینوں میں) یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفت کبریاء یعنی عظمت مختص ہوئی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا۔ تذلل[1] یہ اصل ہے تمام عبادات کی تو جس شخص نے صفت کبریا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بھی بڑھ کر کون عالم یا محقق ہو سکتا ہے۔ انہیں کی شان میں ہے۔ **واولئک ھم اولو الالباب** یعنی عقلمند لوگ یہی ہیں جب آدمی کے دل میں سے تمام گناہوں کی اصل[2] نکل گئی اور تمام عبادات کی جم گئی تو سبھی کچھ اس نے پالیا۔ اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اس کے ساتھ اور سمجھ لو کہ یہ اصل کلی بہت مختصر الفاظ میں سمجھائی گئی ہے مگر بعض اوقات بلا تفسیر کے اس پر عمل دشوار ہوتا ہے یعنی جب تک ہر ہر عمل کی نسبت معلوم نہ ہو کہ اس کا منشاء کبر کس طرح ہے۔ اس کا ترک آسان نہیں ہو سکتا۔

کتب دین کا مطالعہ بھی اعون[3] فی العلاج ہے

اس کے لئے سہل اور مفید تدبیر یہ ہے کہ کتابوں[4] کا مطالعہ کیا جائے بلکہ کسی سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے اور جو کوئی نہ پڑھ سکے وہ کسی عالم سے وقتاً فوقتاً سن لیا کرے۔ واقعات کو پوچھتا رہے اور وعظ سنا کرے اور عورتوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں ان کی ہانڈی چولہے کا ایک وقت ہے کتاب کے پڑھنے یا سننے کا بھی ایک وقت ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مستورات کو اس سے بالکل مس بھی نہیں مرد تو کبھی کوئی مسئلہ پوچھ بھی بیٹھتے ہیں مگر عورتوں کو نہ کہیں زبانی پوچھواتے دیکھا نہ کوئی تحریر کسی کی آتی ہے (الا ماشاء اللہ) حالانکہ بعض مسائل عورتوں کے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جواب دینا بھی ہر

---

[1] ان کے آگے خود کو ذلیل کر دینا [2] جڑ [3] کبر کے علاج میں بڑا مدد کرنے والا [4] دین کی خصوصاً حضرت تھانوی کے مطبوعہ مواعظ یا ملفوظات کا

ایک کا کام نہیں مثلاً پاکی اور ناپاکی کے مسائل کہ فقہ کی تمام بحثوں سے ادنیٰ[1] بحث یہ مشہور ہے صورتیں مشکل سے مشکل پیش آتی ہیں مگر اس پر عمل ہے کہ نہ پڑھی نہ قضا ہوئی۔ کچھ عورتیں تو شرم کے مارے نہیں پوچھتیں اور بعض جو کسی قدر پڑھی لکھی ہیں وہ کسی اردو کی کتاب میں دیکھ کر جو الٹا سیدھا سمجھ میں آیا کر گزرتی ہیں۔ حیف کی بات ہے کہ اگر کوئی مرض شرم کا ہو جاتا ہے تو اس کے علاج میں یہ نہیں کرتیں کہ بلا سے جان جاتی رہے مگر شرم نہ جائے۔ علاج کے لئے سوچ کر کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکال لیتی ہیں کہ شرم بھی نہ جائے اور علاج بھی ہو جائے۔ بی بیو کسی مسئلہ کا تحقیق کر لینا تو آج کل کچھ بھی بات نہیں تین[2] پیسے میں چاہے جہاں سے جواب منگا لو۔ اگر خود نہ کر سکو اپنے خاوند کی معرفت پوچھوا لو یا اور کسی بی بی کے ہاتھ سے لکھوا کر دریافت کر لو اگر نہ خود لکھ سکو نہ شوہر موجود ہو مگر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ جب ہو کہ جب دین کا خیال ہو۔ اس غفلت کو چھوڑو اور دین کو دنیا سے بھی زیادہ ضروری سمجھو دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت ختم نہ ہوگی۔ جو طریقہ میں نے بیان[3] کیا اس سے بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ گھر میں جب مسائل کا تذکرہ ہوگا بچوں کے کان میں پڑیں گے اور ساری عمر ان کو یاد رہیں گے۔ جو لوگ تمہارے تابع ہیں ان کی اصلاح ہوگی ان کی اصلاح بھی تمہارے ذمہ ضروری ہے۔ حدیث میں ہے **کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ** یعنی ہر بڑے کو چھوٹے کے لئے حضورؐ نے محافظ فرمایا کہ ہر ہر شخص کچھ نہ کچھ ذمہ دار ہے اور اس کی جواب دہی اس کے ذمہ ہے۔ اگر نوکرنی تمہاری نماز نہیں پڑھتی ہے تو وہ گنہگار ہے ہی مگر تم بھی اس کے ساتھ گنہگار ہو اور جواب دینا ہوگا کہ اسے نماز کیوں نہیں سکھائی تھی۔ بعض لوگوں نے اس کا جواب یہی اختیار کر لیا ہے کہ ہم نے بہتیری تاکید کی مگر وہ نماز پڑھتی ہی نہیں کیوں بیبیو اگر کھانے میں وہ نمک کم بیش کر دے تو تم کیا کرتی ہو۔ کیا ایک دو دفعہ سمجھا کر کہ نیک بخت نمک ٹھیک رکھا کر خاموش ہو رہتی ہو اور پھر نمک ویسا ہی کھا لیتی ہو جیسا اس نے ڈال دیا ہو۔ یہ تو کبھی بھی نہ کرو گی چاہے نوکرنی رہے یا نہ رہے اسے سمجھاؤ گی

---

[1] بہت باریک بہت تحقیق کے قابل [2] ایک جوابی لفافہ جس کی قیمت بدل گئی [3] کتابیں پڑھنا سننا اور خط سے مسئلے معلوم کر لینا

پھر مارو پیٹو گی اگر کسی طرح نہ مانے گی تو نکال باہر کرو گی۔ بیبیو دین کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا نمک کا جو نماز کے مقابلے میں بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ دین کا خود بھی خیال کرو اور جن پر[1] تمہارا قابو چل سکتا ہے ان کو بھی دیندار بناؤ۔ تمہاری کوشش سے جو کوئی دیندار بنے گا تمہیں بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ جہاں دنیا کے دس کاموں کا وقت ہے ایک دین کے کام کا بھی وقت نکال لو جو بی بی خود کتاب پڑھ سکیں وہ کتابوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کریں اور جو خود نہ پڑھ سکیں کسی اپنے رشتہ دار سے پڑھوا کر سنیں۔ علماء سے وعظ اپنے مکان میں کہلوایا کریں جو واقعات پیش آیا کریں ان کی پوچھ پاچھ کیا کریں۔ علماء سے ان کی بی بی کی معرفت یا خط کے ذریعہ سے جواب منگا لیا کریں۔ اس سے دین میں ایسی بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ رفتہ رفتہ ہر ہر عمل کی نسبت حکم معلوم ہو جائے گا۔ جب کسی چیز کی برائی معلوم ہو جاتی ہے تو کبھی نہ کبھی تو دل میں اس سے بچنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہی ہے اس صورت میں اگر ذرا سی بھی ہمت سے کام لو گے تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی اور اس میں شدہ شدہ تمام مفاسد کی جڑ یعنی کبر بھی قلب سے نکل جائے گا۔

اسی کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور تمام مفاسد کا علاج بتا دیا کہ اس ایک صفت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص مان لو۔ یہ صفت کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتی۔ وہ صفت کبریا ہے یہ ایک جڑ ہے جس کے ہزاروں شعبے ہیں۔ اجمالاً نہیں بلکہ تفصیلاً اس کے تمام شعبوں کو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص کر دو اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب متبحر[2] مولوی بن جاؤ۔ بلکہ جہاں تک موقعہ ملے غفلت نہ کرو جیسا روپیہ اور زیور کے جمع کرنے کا سب کو شوق ہے یہ یقینی بات ہے کہ تمام بیبیاں اپنا دل بھر کے زیور اور روپیہ نہیں پا سکتیں مگر غریب ہے تو امیر ہے تو ہر ہر بی بی کو کوشش ضرور ہے کہ زیور اور روپیہ مل جاوے جتنی کوشش سے ایک مقدار روپے کی مل سکتی ہے۔ اتنی کوشش سے بلکہ اس سے کم سے دین کی بہت بڑی مقدار مل سکتی ہے ہمت نہ ہارو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔ تم ایک حصہ کماؤ گی تو خدا تعالیٰ کی طرف سے دس حصے مرحمت ہوں گے۔

---

[1] اولاد یا نوکر خصوصاً جو بچے اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان کی فکر رکھنی ضروری ہے [2] بڑے ماہر

کبر پر وعید[1] اور توقف وقوع وعید سے دھوکہ نہ کھانا اور خائف رہنا

آ گے اس مضمون کو حق تعالیٰ نے وھو العزیز الحکیم (اور وہ ذات سب پر غالب اور حکمت والی ہے) سے[2] مؤکد کیا۔ ان لوگوں کے چونکانے کے لئے جو اس مفسدے سے کسی طرح بچتے ہی نہیں اور اپنے عیب پر ان کی نظر پڑتی ہی نہیں جب ان کو سمجھانے اور ان کی بھلائی سوجھانے سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں میں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ سے کہیں جا نہیں سکتے۔ جیسی چاہوں گا سزا دوں گا اور اگر کسی برے عمل پر فوراً سزا نہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت سے مہلت دیتا ہوں بعض لوگ رشوت لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں تو رشوت سزاوار ہے۔ صاحبو اس دھوکے میں نہ رہو۔ خدا کے غضب کو مت بھولو۔ اول تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اور اگر دنیا میں کسی حکمت اور مصلحت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو دار الجزاء[3] ہے ہی۔ وہاں کی سزائیں اور زیادہ سخت ہیں۔ وہاں کی سزا سے تو دنیا ہی کی سزا بھگت لینا اچھا ہے۔ وہاں کے اہوال[4] وآفات کو سوچتے رہنا چاہیے تصریح موجود ہے۔ والتنظر نفس ماقدمت لغد یعنی چاہیے کہ خیال رکھے ہر شخص کہ کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ اور اسی کے یاد دلانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ زوروا القبور و اکثروا ذکرھا ذم اللذات یعنی قبروں پر جایا کرو اور لذتوں کو مٹانے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔ اس سے عورتیں یہ فتویٰ نہ نکال لیں کہ قبرستان میں جانا جائز ہے۔ عورتوں کے پردے سے نکلنے میں بہت سی خرابیاں ہیں[5] مراد تذکرآ خرت و قیامت ہے۔ جس طرح بھی ہو (کسی معتبر کتاب میں قیامت کے حالات پڑھیں یا سنیں) اور یہ موت اور قیامت کی اجمالی حالت کافی نہیں کہ کوئی موت موت کی تسبیح پڑھا کرے۔ بلکہ موت کو یاد رکھنا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرے سوچ لے کہ بعد موت اس پر

---

[1] عذاب کی اطلاع اور عذاب کے واقع ہونے میں دیر ہونے سے [2] تاکیدی [3] سزا و انعام کا گھر [4] ہولناکیوں اور مصیبتوں کو [5] اس لئے درمیانی عمر تک کی عورت کو جائز نہیں اور جو روئے چلائے یا کوئی ناجائز بات کرے اس کو بڑھاپے میں بھی جائز نہیں۔

کوئی جواب دہی تو میرے ذمہ عائد نہ ہوگی ہمیشہ اس کا خیال کرو۔

حق تعالیٰ کا مطیعین[1] کے لئے دو بڑی دولتوں کا وعدہ فرمانا اوران کے حصول کا طریقہ بتلانا

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینه حیٰوۃ طیبةً و لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون

ترجمہ: آیت شریفہ کا یہ ہے کہ جو شخص عمل نیک کرے مرد یا عورت اور وہ مومن ہو پس بیشک ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرمادیں گے اور بے شک ہم ان کو ان کا اجر بدلہ میں دیں گے۔ بسبب ان کے اچھے اعمال کے۔

اس آیت شریف میں حق تعالیٰ نے اپنے مطیع بندوں کے لئے اطاعت پر دو[2] بڑی دولت کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔

دنیا میں کوئی شخص طلب سے خالی نہیں اور باوجود تعدد طرق[3] کے مطلوب سب کا شے واحد ہے

اول ایک مضمون بطور مقدمہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد آیت کریمہ کا مضمون بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا۔ دنیا میں جس قدر عقلاء ہیں کہ جن کے افعال کی غایت[4] ہوتی ہے۔ ان میں ہر ایک شخص ایک شے کا طالب ہے۔ کوئی مال کا طالب کوئی جاہ کا کوئی صحت کا کسی کو درویشی مطلوب ہے۔ کوئی علم کا دیوانہ ہے کسی کو تجارت میں لطف آ رہا ہے۔ کوئی اولاد کی دھن میں ہے۔ کوئی مکانات کی تعمیر کا شوق رکھتا ہے۔ کسی کو باغ لگانے کی حرص ہے۔ غرض کوئی ایسا نہیں جو طلب سے خالی ہو بعضے ان ہی میں خدا کے بھی طالب ہیں۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اشیاء[5] متعددہ مختلفہ کے طالب ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور نظر کو عمیق[6] کر

---

[1] فرمانبرداروں کے لئے [2] دنیا میں پاکیزہ زندگی بے فکری کی اور آخرت میں بہت بڑا ثواب ہے۔
[3] باوجود طریقے کئی ہونے کے مقصود سب کا ایک ہے۔ [4] وہ غرض جس کے لئے کام کیا جاتا ہے۔
[5] کئی اور الگ الگ چیزوں کے۔ [6] گہرا۔

کے دیکھا جائے تو فی الواقع ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شے ہے۔ صرف اختلاف اس کے تعیین طریق میں ہے۔ کسی نے سمجھا کہ وہ شے تجارت سے حاصل ہو گی وہ تجارت میں مشغول ہو گیا۔ کسی نے خیال کیا کہ علم سے اس کی تحصیل ہو گی۔ وہ علم کا طالب بن گیا۔ کسی نے اولاد میں اس مطلوب کو گمان کیا۔ وہ اولاد کا شیفتہ ہو گیا۔

آپ کو تعجب ہو گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کا مقصود جدا ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ اختلاف طرق میں ہے۔ اس لئے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے۔

سب کا مطلوب شے واحد[1] ہونے کی مثالیں اور اس شے واحد کی تعیین

ایک شخص کے پاس دس سائل آئے۔ ایک نے روٹی طلب کی۔ دوسرے نے چاول پختہ مانگے۔ تیسرے نے پیسہ مانگا۔ چوتھے نے روپیہ پانچویں نے غلہ چھٹے نے آٹا ساتویں نے کوڑیاں۔ آٹھویں نے چنے بھنے ہوئے۔ نویں نے کچے چاول دسویں نے حلوا۔ پس اس مثال میں بظاہر مطلوب ہر ایک کا جدا ہے لیکن درحقیقت مقصود واحد ہے طرق مختلف ہیں۔ مقصود پیٹ بھرنا ہے کسی نے سمجھا کہ پکانے کا کون قصہ کرے اس نے پکی ہوئی روٹی مانگی۔ کسی نے خیال کیا کہ کچی جنس ملے گی تو اپنی مرضی کے موافق پکا کر کھائیں گے۔ کسی نے یوں ہوس کی کہ روپیہ پیسہ ملے گا تو جنس بھی اپنی خواہش کے موافق خرید کر پکائیں گے۔ اس مثال سے آپ کو مختلف کا جمع کرنا آسان ہو گیا ہو گا۔ اسی طرح ان لوگوں کے مقصود کو دیکھنا چاہیے کہ ان کا مقصود کیا ہے۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو شے واحد مقصود ہے اور وہ لذت و راحت ہے۔ طرق کا اختلاف ہے کسی نے سمجھا کہ روپے کے حاصل ہونے میں مزہ ہے وہ اس کا طالب ہو گیا کسی نے سمجھا کہ جاہ میں مزہ ہے کسی نے اولاد میں لطف دیکھا کسی نے تجارت میں کسی کی سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مزے تو سب فانی ہیں مزہ اصلی تو آخرت میں ہے۔ الی غیر[2] ذالک من الطرق مگر حاصل سب کا ایک ہے کہ قلب کو چین ہو

---

[1] ایک چیز [2] ان کے سوا اور طریقوں تک

راحت ہو مسرت ہو انبساط ہو دوسری مثال اور لیجئے کہ تاجر مختلف اشیاء کی تجارت کرتے ہیں کوئی بساطی ہے کوئی بزاز ہے۔ کوئی بقال ہے اور کوئی لکھنو میں تجارت کرتا ہے۔ کوئی کلکتے میں کوئی بمبئی میں تو یہ سب ایک شے کے طالب ہیں وہ شے کیا ہے نفع مگر اس کے طرق مختلف ہیں کسی نے سمجھا کہ بزازی کی دکان میں نفع ہے کسی نے خیال کیا کہ بساط خانہ میں بہت نفع ہے۔ اس نے اسی کو اختیار کر لیا کسی نے سمجھا کہ لکھنو میں اچکن اچھی ہوتی ہے۔ وہ وہاں جا پہنچا کسی نے یہ خیال کیا کہ کلکتے میں تجارت سے بہت نفع ہوگا۔ وہ وہاں پہنچ گیا۔ چنانچہ اگر کسی تاجر سے کہا جاوے کہ تم کو جو نفع کلکتے میں ملے گا وہ ہی نفع تم کو ہم یہاں دیتے ہیں وہ ہرگز کلکتہ نہ جاوے گا کیونکہ مقصد اس کو حاصل ہو گیا۔ غرض یہ امر بالکل واضح ہو گیا ہو گا کہ بظاہر اشیاء مختلفہ کے طالب ہیں مگر حقیقتہً مطلوب ایک ہے۔

لذت وراحت کے حاصل کرنے میں رایوں کا اختلاف

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس مطلوب یعنی لذت وراحت کے حاصل کرنے میں رائیں مختلف ہیں۔ کسی کی رائے تجارت کی ہے کسی کی زراعت کی ہے اور گاہے آپس میں ایک دوسرے کو خاطی[1] بتاتے ہیں چنانچہ جو تجارت کرتا ہے وہ احیاناً[2] زراعت کرنے والے کو خطا پر بتاتا ہے۔ اور زراعت کرنے والا تاجر کو خاطی بتا رہا ہے اور ان ہی طالبین میں بچے بھی ہیں وہ بھی اس مطلوب یعنی لذت وراحت کے حاصل کرنے میں مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں۔ لڑکے کوئی گیند کھیلتا ہے کوئی کنکوا اڑاتا ہے کوئی ریتے کا مکان بناتا ہے ان کے مکان کو ہم بیہودہ شغل سمجھتے ہیں اور ہم جو قرض لے لے کر مکان بناتے ہیں اس کو بیہودہ نہیں سمجھتے وجہ یہ ہے کہ اپنے مکان کو پائیدار سمجھتے ہیں اور معتد بہ راحت کا آلہ۔

لذت وراحت کے درجے اور افراد

پس معلوم ہوا کہ اس مقصود کے باوجود اس کے کہ واحد ہے درجات مختلف ہیں ایک معتبر اور قابل شمار اور دوسرے غیر معتبر اور ناقابل شمار اور مجموعہ تقریر سے دو امر معلوم ہوئے

---

[1] خطا کار [2] کبھی کبھی

ایک یہ کہ مقصود کے طرق میں اختلاف ہے دوسرے یہ کہ اس مقصود یعنی لذت وراحت کے افراد بعض قابل شمار ہیں اور بعض نہیں ہیں۔

راحت کا کون فرد معتبر ہے اور یہ کہ اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہے

اب یہاں دو امر تنقیح طلب ہیں کہ مقصود یعنی لذت وراحت کا کون فرد حقیقتہً معتبر ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا طریقہ تحصیل کا کیا ہے۔ پس اس کا فیصلہ ایسا شخص کرسکتا ہے کہ جو حقائق اشیاء[1] اور آثار اشیاء سے من کل الوجوہ واقف ہو اور نیز وہ خود غرض نہ ہو۔ کیونکہ کسی کا علم اگر ناقص ہوگا یا کوئی خود غرض ہوگا تو وہ ہرگز ان دو امروں[2] کے متعلق فیصلہ نہیں کرسکتا تو اب دیکھنا چاہیے کہ جس میں یہ دو[3] صفتیں علی وجہ الکمال موجود ہوں وہ کون ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوق میں یہ دونوں صفتیں ناقص ہیں جو عالم نظر آتا ہے اس سے زیادہ اور عالم موجود ہے۔ **وفوق کل ذی علم علیم** (اور ہر جاننے والے کے اوپر ایک جاننے والا ہے) اور استغنا اور بے غرضی کی صفت میں بھی مخلوق ناقص ہے جس کو دیکھئے وہ خود غرض ہے۔ اگر کہا جاوے کہ بعضے ہمدردان قوم ایسے ہیں کہ دوسروں کو بلاغرض نفع پہنچاتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔ کہ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں بعضے ثواب کے طالب ہیں اور بعضوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچا کر ان کے دل کو ٹھنڈک اور راحت پہنچتی ہے۔ یہ راحت[4] وقرت قلب بھی ایک غرض ہے۔ اسی طرح ماں باپ اور جملہ اقربا جو کچھ کرتے ہیں سب اپنی شفائے قلب[5] کے واسطے کرتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ بعضے لوگ ایسے طور سے دیتے ہیں کہ نہ دینے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لینے والا کون ہے اور نہ لینے والے کو دینے والے کا حال معلوم ہوتا ہے اس میں کونسی غرض ہے جواب یہ ہے کہ یا تو اس کو ثواب مطلوب ہوگا اور اگر ثواب مطلوب نہ ہو تو نفس عطا سے اس کے دل کو حظ ہوگا یہ بھی ایک غرض مطلوب ہے

---

[1] تمام چیزوں کی حقیقتوں اور ان کے اثروں سے پوری طرح واقف ہو۔ [2] کون معتبر ہے اور کیا طریقہ ہے۔
[3] پورا واقف ہونا خود غرض نہ ہونا یہ دونوں کامل طریقہ پر ہوں۔ [4] دل کو راحت دینا اور ٹھنڈک پہنچانا'
[5] دل کو شفا دینا۔

بالجملہ مخلوق میں ایسا کوئی نہیں جو علم اور استغناء کی صفت علی وجہ الکمال سے موصوف ہو ایسی ذات پاک تو حق تعالیٰ کی ہی ہے۔ علم کی تو ان کے وہ شان ہے کہ عالم الغیب[1] و الشھادۃ ہیں۔ اور بے نیازی ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں۔

من نکردم خلق تا سودے کنم　　بلکہ تابر بندگان جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس واسطے پیدا نہیں کیا کہ میں کوئی فائدہ اٹھاؤں بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ خود مخلوق پر سخاوت کروں۔)

اور خدا تعالیٰ کو اپنا نفع مقصود ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ نفع جو ہم کو مقصود ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے اندر ایک نقصان[2] تھا اس نفع کے حاصل ہونے سے اس کی تکمیل ہو گئی اور حق تعالیٰ کی ذات خود کامل اکمل ہے اگر حق تعالیٰ کو بھی اپنا نفع مقصود ہو تو نعوذ باللہ ذات باری میں نقصان اور استکمال[3] بالغیر لازم آتا ہے۔ بہر حال نہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم ہے اور نہ کوئی ایسا بے غرض ہے لہٰذا ان دونوں مسئلوں کا فیصلہ حق تعالیٰ سے ہی کرانا چاہیے۔

راحت کے فرد معتبر کی تعیین اور اس کا طریق تحصیل

چنانچہ کلام اللہ کی ان آیات میں ان دونوں امروں کا فیصلہ کر دیا کہ بطور حاصل ارشاد ہے کہ اے بندو تم جو اپنے مقصود یعنی راحت کو مختلف چیزوں میں ڈھونڈتے ہو کوئی مال میں راحت ولذت کا طالب ہے کوئی بیوی بچوں میں اپنے مطلوب کو تلاش کرتا ہے کوئی جاہ میں کوئی مکانات میں مشغول ہے ہم تم کو راحت حقیقی کے تحصیل کا طریقہ بتاتے ہیں وہ یہ ہے من عمل صالحا الخ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو یعنی عقیدہ اس کا درست ہو ہم اس کو مزہ دار زندگی عطا فرماد ینگے اور ہم ان کو جزا دیں گے۔ بسبب احسن ان اعمال کے جو کیا کرتے تھے اس ترجمہ سے دونوں امر تنقیح طلب جو اوپر مذکور ہوئے معلوم ہو گئے یعنی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود معتبر کیا ہے اور اس کا طریق تحصیل کیا ہے۔ مقصود دو چیزیں ہیں حیات طیبہ اور اجر اور اس کا طریق بھی دو چیزوں کا حاصل کرنا ہے عمل صالح اور عقائد صحیحہ۔

---

[1] ہر حاضر و غائب کے جاننے والے [2] پیسے نہ تھے وہ مل گئے مزہ نہ تھا وہ مل گیا راحت نہ تھی وہ مل گئی۔
[3] غیر کی مدد سے کامل ہونا اور بغیر اس کے ناقص رہنا اور یہ محال ہے۔

لذت ومسرت کی تکمیل اجراخروی سے ہوگی

اور حیات طیبہ اور اجر کا حاصل ایک ہی ہے یعنی لذت اور مسرت کیونکہ حیات طیبہ جس کوفرمایا ہے۔ اس کی تکمیل اجراخروی سے ہوگی۔ اس لئے کہ جس حیات کے بعد اجر نہ ہو وہ حیات طیبہ نہیں اس لئے جب اس کو معلوم ہے کہ یہ آرام وراحت دنیا ہی میں ہے اور بعد اس حیات دنیوی کے پھر تکالیف کا سامنا ہے تو وہ حیات بھی مزیدار نہ ہوگی۔ کیونکہ خوف آئندہ مسرت موجودہ کا تباہ کن ہے۔ مثلاً کوئی شخص نہایت ہوادار، شاندار اور پرلطف کمرے میں ہے اور کھانے پینے کی اشیاء سب موجود ہیں اور آرام کے سب سامان مہیا ہیں لیکن اس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہے اور اس کو معلوم ہے کہ فلاں دن میرے لئے پھانسی کا حکم ہوگا تو اس کو یہ زندگی اور ظاہری[1] تمتع وبال جان ہوگا۔ اور ہر شے اس کو خار نظر آئے گی۔ اسی طرح دنیا کا حال ہے کہ یہاں خواہ کتنا ہی آرام ہو جب یہ معلوم ہو کہ یہ فانی ہے تو کیا لطف ہے۔

دنیا خواہ ملے یا نہ ملے ہر حالت میں پریشان کرنیوالی ہے

اور دنیا تو خواہ ملے یا نہ ملے ہر صورت میں پریشان کرنے والی ہے۔

اذا ادبرت کانت علی المرء حسرة   و ان اقبلت کانت کثیراً همو مها

اگر نہ ملے نہ ملنے کا افسوس اور حسرت رہتی ہے اور اگر ملے تو طرح طرح کے افکار اور ہموم ہوتے ہیں۔

حکایت: ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے یہاں خیریت ہے وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ خیریت ہوگی تمہارے یہاں۔ ہمارے ہاں تو بفضلہ تعالیٰ کچے بچے چھوٹے بڑے موجود ہیں۔ آج فلاں بیمار ہے۔ کل اس کو بخار ہے۔ کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے۔ جس کے یہاں کوئی نہ ہو اس کے یہاں خیریت ہوتی ہے۔ غرض دنیا میں پریشانی ہی پریشانی ہے۔ اگر حس صحیح ہے تو واقعی سخت مصیبت کی جگہ ہے کسی طرح چین نہیں۔ ایک مقصود اگر حاصل ہوتا ہے تو دوسرے کی فکر ہوتی ہے۔ مثلاً شادی بھی ہوگئی۔ مال و دولت

---

[1] لذت ومزہ

سب کچھ ہے اولاد نہیں ہے۔تو اولاد کا ہر وقت فکر ہے۔ کہ اولاد ہو یہی دھن ہے یہی فکر ہے۔ شب و روز اسی میں گزرتا ہے کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ سب جائیداد وقف کردوں کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی کو متبنٰی بناؤں خدا خدا کر کے اولاد ہوگئی اب شب و روز اسی دھن میں ہیں کہ کسی طرح یہ جلدی پرورش ہو جائے تو اس کے ختنے دھوم دھام سے ہوں اور اس کی شادی ہو۔ اللہ اللہ کر کے اولاد سیانی ہوگئی۔ اور شادی بھی ہوگئی اب رات دن یہی فکر ہے کہ اولاد نہیں ہے اسی غم میں گھلتے ہیں غرض ساری عمر عزیز اسی میں صرف ہو جاتی ہے اور کوئی وقت اللہ کی طرف مشغول ہونے کا میسر نہیں ہوتا۔

وما قضی احد منها لبانته لاینهی ارب الا الیٰ ارب

(اور دنیا سے کسی نے اپنی حاجت پوری نہیں کر پائی ہر ایک حاجت دوسری حاجت پر ہی جا پہنچتی ہے)

بخلاف اس شخص کے اس کے پاس کچھ نہ ہو وہ پھر بہ نسبت اس شخص کے راحت میں ہے اس کا تو یہ حال ہے۔

لنگلے زیرو لنگلے بالا نے غم دزد و نے غم کالا

(ایک چھوٹی سی لنگی (تہبند) نیچے ایک اوپر نہ چور کا غم نہ سامان کا)

حکایت: ایک رئیس تھے ان کے ایک بچہ تھا اتفاقاً وہ بیمار ہو گیا تمام جائیداد سامان ان کو تلخ معلوم ہوتا تھا۔ یہ حالت دنیا کی ہے سچ ہے۔

ع و ان اقبلت کانت کثیراً هموها

(اور جب دنیا آ دکمتی ہے تو اس کے فکر و افکار ہی بہت ہو جاتے ہیں)

حاصل تعیین مقصود و تعیین طرق

حاصل یہ ہے کہ اگر تمام نعمتیں بھی ہوں اور آخرت میں اس کے لئے کچھ نہ ہو تو سب ہیچ[1] ہے۔ اس لئے حیات طیبہ بھی اسی وقت ہوگی جبکہ اجر بھی ہو۔ اسی واسطے فلنحیینه[2] الخ کے ساتھ ولنجزینهم[3] الخ فرمایا حاصل دونوں کا حیات کاملہ ہوئی خلاصہ یہ ہوا کہ گویا حق تعالیٰ

---

[1] بنایا ہوا بینا [2] اور ہم اس کو پاکیزہ زندگی دیں گے۔ [3] اور اس کو ثواب دیں گے۔

بطور حاصل ارشاد فرمارہے ہیں کہ اے دنیا میں بھٹکنے والو تم میں سے ہر ایک جو مقصود معتدبہ[1] کا طالب ہے ہم بتاتے ہیں کہ مقصود معتدبہ حیات کاملہ ہے اور اس کے طرق میں جو تم غلطیاں کررہے ہو تو اس کے طریق کو بھی متعین کرتے ہیں وہ اطاعت اللہ ورسول کی ہے گویا تمام آیت کا حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا نتیجہ وثمرہ لطف دائم ہے یہ ایک دعویٰ ہے اور ایسا دعویٰ ہے کہ اگر ہم اس کا صرف مشاہدہ بھی نہ کرتے تو بھی ہم کو بلا تامل تصدیق کرنا چاہیے اس لئے کہ یہ ایسی ذات کا فیصلہ ہے کہ جس کا علم کامل ہے اور بیغرض اور مستغنی[2] بالذات ہے چہ جائیکہ اس کا صدق ہم کو کالشمس[3] فی نصف النہار نظر بھی آرہا ہے اور مشاہدہ روز بروز اس کو پختہ کرتا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس کو آئندہ چل کر واضح بیان کریں گے۔

آیت میں حیات طیبہ سے کیا مراد ہے

اس وقت فلنحیینہ حیوٰۃً طیبۃً (تو ہم اس کو دیں گے زندگی پاکیزہ) کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ کہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ حیات طیبہ سے کیا مراد ہے۔ دنیا کی حیات یا برزخ[4] کی۔ کیونکہ عالم تین ہیں۔ عالم آخرت' عالم دنیا' عالم برزخ اور آخرت کو گو مشاہدہ نہیں کیا مگر اہل ملت میں بلکہ حکماء فلاسفہ قدما میں بھی اس کے منکرین کم ہیں۔ حتیٰ کہ سوائے اہل اسلام کے اور لوگ بھی اس کے قائل ہیں۔ اس لئے اس کا کوئی نمونہ دنیا میں بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔

عالم برزخ کی تحقیق اور اس کے متعلق شبہات کا دفع مع مثال

بخلاف برزخ کے کہ اس کے منکرین بہت ہیں حتیٰ کہ اہل اسلام میں معتزلہ[5] نے اس کا انکار کیا ہے اور حدیثوں میں جو آیا ہے کہ جب آدمی مرتا ہے قبر میں دو فرشتے منکر نکیر آتے ہیں ان کا معاملہ آتے ہیں ان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے اگر بندہ مومن ہوتا ہے اس کے اس نہایت اچھی صورت میں آتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں وہ پسندیدہ جواب دیتا ہے۔ پھر اس کے لئے قبر کشادہ ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی ہے اس کو

---

[1] شمار کے قابل [2] ذات ہی بے نیاز [3] دوپہر کے سورج کی طرح [4] دنیا و آخرت کے درمیان کا عالم
[5] وہ باطل فرقہ جو نقل پر عقل کو ترجیح دیتا تھا جیسے آج کل بھی بعض لوگ ایسے بن رہے ہیں۔

ایک وسعت نظر آتی ہے۔اور اس کو کہا جاتا ہے نم کنومة العروس (بس سو جا دلہن کی طرح کا سونا) اور اگر وہ کافر ہوتا ہے اس کے پاس نہایت ہولناک صورت میں آتے ہیں اور جو سوال اس سے کیا جاتا ہے وہ جواب میں لا ادری یعنی میں نہیں جانتا کہتا ہے۔اس کے لئے قبر تنگ ہو جاتی ہے اور اس کو اس قدر دباتی ہے کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں۔گرزوں سے اس کو مارتے ہیں اور سانپ اور بچھو اس کو ڈستے ہیں۔غرض انواع انواع کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔معتزلہ اور ہمارے نو تعلیم یافتہ ان احادیث کا بالکل انکار کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ ہم تو قبر کو کھود کر دیکھتے ہیں نہ اس میں فرشتہ ہے نہ گرز ہے نہ وسعت ہے نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایک آدمی کو بھیڑیا کھا لے یا دو شیر کھالیویں تو وہاں کس طرح یہ سوال و جواب ہوں گے اور کیسے وہاں وسعت ہو گی اور وہاں سانپ' بچھو کہاں ہیں۔ہم تو صریحاً یہ دیکھتے ہیں کہ بھیڑیئے اور شیر کے پیٹ میں نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں نہ گرز ہیں۔بات یہ ہے ۔

جنگ ہفتا دو دو ملت ہمہ را عذر بنہ ‌ ‌ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(بہتر فرقوں کی جنگ کو معذوری سمجھ لو جب لوگ حقیقت کو نہ پا سکے تو انہوں نے غلط خیالات بنا لئے)

وجہ یہ کہ خود علم نہیں اور علماء کے اتباع سے عار آتی ہے حالانکہ سلامتی کی بات یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ جاننے والے کا دامن پکڑنا چاہیے کاش اگر ہم پوچھ لیتے تو پتہ لگ جاتا ان تمام شبہات کا منشا یہ ہے کہ قبر نام اس گڑھے کا رکھ لیا ہے حالانکہ قبر سے مراد احادیث میں یہ گڑھا نہیں ہے بلکہ مراد قبر سے عالم برزخ ہے۔اور عالم برزخ اس گڑھے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ برزخ اس حالت کا نام ہے جو آخرت اور دنیا کے درمیان کی حالت ہے۔اگر قبر میں دفن کر دیا وہی اس کا برزخ ہے اس سے وہاں ہی سوال جواب وعذاب وثواب ہو گا اور اگر بھیڑیئے وشیر نے کھا لیا اس کے لئے وہی برزخ ہے۔اور اگر جلا دیا تو جہاں جہاں اس کے اجزاء ہیں اس سے وہاں ہی یہ سب واقعات پیش آئیں گے لیکن چونکہ شریعت میں دفن کرنے کا حکم ہے اس لئے عالم برزخ کو قبر سے تعبیر فرمایا ہے حاصل یہ ہے کہ قبر کے متعلق

جس قدر شبہات ہیں وہ سب اس پر مبنی ہیں کہ قبر کی حقیقت نہیں سمجھتے ۔اسی استبعاد[1] کی وجہ سے چونکہ اس کا بکثرت انکار کیا جاتا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسی حکمت سے اس کا ایک نمونہ دنیا میں پیدا فرمایا ہے کیا ہے۔خواب یعنی سونا' سوتے ہوئے آدمی دیکھتا ہے کہ سانپ نے کاٹ لیا ہے دریا میں ڈوب گیا ہے کسی نے لٹھ مارا ہے اور اس کو الم محسوس ہو رہا ہے حالانکہ وہ نرم نرم بستر پر لیٹا ہوا ہے۔اگر گرمی ہے تو پنکھے ہو رہے ہیں خس کی ٹٹیاں لگ رہی ہیں یا دیکھتا ہے کہ وہ مسند پر سریر آرائے سلطنت ہو رہا ہے اور باندیاں اور غلام صف بہ صف دست بستہ کھڑے ہیں اور طرح طرح کے آرام راحت کے سامان ہیں حالانکہ وہ زمین پر لیٹا ہوا ہے نہ تکیہ ہے نہ بستر ہے نہ کوئی پرساں ہے بیمار ہیں سخت درد میں مبتلا ہیں یہ سونے والے اگر ان حکایات کو بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی دلیل عقلی کا ان واقعات پر مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی دلیل عقلی پوچھے بھی تو اس کو احمق بنایا جاتا ہے اور اس کو وہ سونے والا کہتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کبھی سوئے نہیں خدا کرے تم سوو تو تم کو یہ سب باتیں واضح ہو جائیں گی پس ہمارا بھی یہی جواب ہے کہ جب مرو گے معلوم ہو جائے گا بقول شخصے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　　گفتم کہ چو ما شوی بدانی

(کسی شخص نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہوتی ہے میں نے کہا کہ ہم جیسے ہو جاؤ گے تو جان لو گے)

غرضیکہ خواب برزخ کا پورا نمونہ ہے کہ جیسے ہم سونے والے کو دیکھتے ہیں کہ وہ آرام سے لیٹا ہے حالانکہ وہ سخت تکلیف کا مشاہدہ کر رہا ہے یا یہ کہ وہ تکلیف میں ہے۔اور خواب میں مزے لوٹ رہا ہے اسی طرح مردے کا حال ہے کہ اگر قبر کو کھود کر دیکھا جائے تو جس طرح دفن کر آئے تھے اسی طرح ہے لیکن وہاں کے واقعات اس پر سب گزر رہے ہیں لیکن اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بس معلوم ہو گیا کہ برزخ کے واقعات خواب جیسے ہیں جس طرح خواب کی کوئی اصل نہیں اسی طرح فی الواقع یہ بھی کوئی شے نہیں۔مردے کو یہ واقعات محض متخیل[2] ہوتے ہیں۔اس لئے کہ ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ خواب نمونہ ہے یعنی خواب

---

[1] دور کی بات سمجھنے سے　[2] خیال میں آنے والے

مشابہ برزخ کے ہے مماثل[1] انہیں کہا۔ عالم برزخ کے واقعات حقیقت رکھتے ہیں تحقیق اس کی یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ روح اس جسم سے تو مفارق ہو جاتی ہے اس لئے اس جسم کو تو عذاب ثواب تکلیف آرام کچھ نہیں ہوتا ہاں اس جسم سے روح کو تعلق قدیم کی وجہ سے ایک تعلق خاص ہوتا ہے جیسا کہ آدمی کو اپنے گھر سے یا کپڑے سے کہ وہ گھر اور کپڑا اس سے مفارق ہے لیکن اس سے تعلق ہے اور اسی تعلق کی بناء پر اگر مردے کے جسم کو کوئی مارے تو روح کو ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے پس اس جسم عنصری کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہتا مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عذاب وثواب کا مورد جسم ہی ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ برزخی ثواب وعقاب اور تمام برزخی واقعات اور سوال و جواب کے لئے روح کو ایک اور جسم عطا ہوتا ہے اور اس کو جسم مثالی کہتے ہیں[2]۔

یہ تکلیف وراحت سب اس کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جسم مثالی کی حقیقت یہ ہے کہ سوائے اس عالم ظاہر کے ایک اور عالم ہے کہ صوفیہ کو اس کا انکشاف ہے اور نیز اشارات کتاب وسنت سے بھی اس کا وجود معلوم ہوتا ہے اس عالم میں تمام اشیاء اور تمام اعمال و افعال کی صورتیں ہیں خواب میں جو کچھ آدمی دیکھتا ہے وہ بھی اسی عالم کی صورتیں دیکھتا ہے۔ مثلاً خواب میں دیکھتا ہے کہ میں کلکتے گیا ہوں اور وہاں کوٹھیاں بنگلے اور بازاروں کی سیر کر رہا ہوں تو یہ سب صورتیں چونکہ عالم مثال میں موجود ہیں اس لئے وہ خواب میں نظر آتی ہیں میں نے ایک رسالہ مسمی الفتوح فی احکام الروح لکھا ہے اس میں روح کے متعلق مفصل بحث لکھی ہے اس کے دیکھنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ سب شبہات جاتے رہیں گے۔

بہر حال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ ایک عالم اور ہے جس کا نام برزخ ہے۔ کل تین عالم ہوئے۔ عالم دنیا' عالم برزخ' عالم آخرت اس میں اختلاف ہے کہ حیات طیبہ سے مراد کون سی حیات ہے۔ حیات برزخیہ یا حیات دنیویہ میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہیں۔

---

[1] اس کی قسم کا ہو کر اس جیسا [2] وہ جسم مثالی اس جسم خاکی میں خاص طریقہ سے مخلوط ہوتا ہے۔ اس کا کسی طرح کا بھی کوئی جز خواہ کسی شکل میں اور کسی مقام میں ہو کسی جانور کے گوشت پوست میں یا راکھ میں یا ہوا یا پانی مٹی میں ہو اسی سے مخلوط ہوگا۔ عذاب دونوں کو یا صرف ایک کو ہوتا ہے اذیت روح کو ہوتی ہے۔

اور لنجزینھم (اور ضرور ہم ان کو جزا دیں گے) کو آخرت کے ساتھ خاص کیا جاوے۔ اس تقدیر پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کرے اور عقائد بھی اس کے صحیح ہوں اس کو ہم دنیا میں اور بعد مرنے کے برزخ میں مزید اور زندگی عطا فرماویں گے۔ اور آخرۃ میں بعد قیامت کے ان کے نیک اعمال کی وجہ سے اجر کی جزا دیں گے۔ اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حیات طیبہ سے مراد حیات دنیویہ ہو اور برزخ اور آخرت لنجزینھم میں داخل ہو کیونکہ برزخ میں جو کچھ ہوگا وہ بھی جزاء ہوگا۔

جو لوگ خدا تعالیٰ کے مطیع ہیں ان کے لیے حیات طیبہ دلائل اور مشاہدہ سے ثابت ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دو چیزوں کا وعدہ ہے اول حیات طیبہ دوسرے اجر مکمل[1] ہے۔ حیات طیبہ کا ان میں سے ایک کو یعنی حیات طیبہ کو تو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں بلکہ مشاہدہ کرا سکتے ہیں۔ دلیل تو یہ ہے کہ قاعدہ عقلی ہے کہ تجربہ سے جب ایک شخص کا صدق ثابت ہو جائے تو اس کو ہر امر میں صادق مانا جائے گا۔ ہر امر پر دلیل کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے گا۔ جب کہ حق تعالیٰ کے اخبار[2] کا صدہا ہزارہا جگہ صدق ہم نے مشاہدہ کر لیا تو یہ خبر بھی بلا تامل صادق ہے۔ مشاہدہ یہ کہ لوگ دو قسم کے ہیں مطیع اور غیر مطیع دیکھ لیجئے کہ ان میں سے راحت و آرام میں کون ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ غیر مطیعین طالبین دنیا ہر وقت پریشانی میں ہیں۔ کسی وقت ان کو چین نہیں۔ بخلاف مطیعین کے کہ وہ جس حالت میں ہیں راحت[3] میں ہیں۔

بعض احکام پر عمل کرنے والا مطیع نہیں

شاید ہر شخص کہے کہ میں مطیع ہوں اس لئے کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں بہت خوبصورت ہے کیونکہ اس کے رخسار ایسے ہیں سر ایسا ہے آنکھیں ایسی ہیں۔ ایک شخص دور سے دیکھنے آوے دیکھا تو میاں نکٹے ہیں تو ان کا سارا حسن

---

[1] تکمیل کرنے والا پورا کر دینے والا۔ [2] حق تعالیٰ کی خبروں کا لاکھوں جگہ سچا ہونا۔ [3] عیش ہو تو نعمت الٰہی کی قدر میں مت تنگی ہو تو آزمائش میں صابر اور تقدیر پر شاکر

وجمال اس ناک نہ ہونے سے کالعدم ہے۔اور عقلاء اس کو ہرگز حسین نہ سمجھیں گے ایسے ہی ہم لوگوں کا دین ہے کہ دو چار باتیں اسلام کی لے کر سمجھتے ہیں کہ ہم دیندار ہیں تو ایسے دینداروں کی نسبت یہ وعدہ نہیں ہے۔اگر کوئی پورا دیندار ہو ایمان اور عمل اس کا کامل ہو تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کو مزیدار زندگی عطا ہوتی ہے۔بلکہ کامل اطاعت[1] کے پاس تک پریشانی نہیں آتی۔

اطاعت[2] کاملہ یہ ہے کہ ظاہر و باطن دونوں درست ہوں

اطاعت کاملہ میں ایک جزو اور بھی قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اطاعت کاملہ کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ بس ظاہر درست کر لیں یعنی صوم وصلوٰۃ حج وزکوٰۃ ومعاملات کی پابندی کر لیں بس کامل فرمانبردار ہو گئے خواہ اخلاق کسی درجہ میں ہوں تو یاد رکھنا چاہیے کہ ایسا شخص بھی کامل دیندار نہیں ہے کامل دیندار وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن دونوں آراستہ ہوں واللہ ہم میں جو دیندار کہلاتے ہیں ان میں سے بہت لوگوں کی حالت یہ ہے السنتهم احلیٰ من السکر و قلوبهم قلوب الذئاب (زبانیں تو ان کی شکر سے زیادہ میٹھی ہیں اور دل ان کے بھیڑیوں کے سے دل ہیں حدیث) نماز کے بھی جماعت سے پابند ہیں روزے کا بھی اہتمام ہے داڑھی بھی بڑھائی ہے نیچا کرتہ ہے غرض تمام وضع شرعی سے آراستہ ہیں لیکن اخلاق کے اعتبار سے صفر ہے قلب میں کبر، عجب[3]، حقد غصب[4] وغیرہ کی بلائیں موجود ہیں۔

تواضع حقیقت میں یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس[5] کو سب سے کم سمجھے نہ صرف یہ کہ ہر ایک کے سامنے نرمی سے پیش آوے

اور بعضے ایسے ہیں کہ متکبر ہیں لیکن اپنے کو متواضع[6] سمجھتے ہیں حالانکہ وہ تواضع کی حقیقت ہی سے واقف نہیں جیسے ایک شخص کریما پڑھتے تھے اس میں تواضع کا بیان آیا استاد نے پوچھا کہ تواضع جانتے ہو کہ کیا شے ہے۔ کہنے لگے کہ تواضع یہی ہے کہ کوئی اپنے گھر آئے اس کو حقہ پان دیدیا اس کو کھانا کھلا دیا اس کی آؤ بھگت کر لی آج کل بڑے بڑے

---

[1] پوری فرمانبرداری کرنے والے [2] پوری فرمانبرداری [3] خود پسندی [4] کینہ [5] اپنی ذات یعنی خود کو [6] تواضع وانکساری والا

سمجھدار تواضع کی حقیقت اسی قدر سمجھے ہوئے ہیں اور جو اور زیادہ سمجھدار ہیں وہ جانتے ہیں کہ تواضع یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے نرمی سے پیش آوے۔

صاحبو! تواضع یہ نہیں ہے نہ ایسے شخص کو حقیقتاً متواضع کہتے ہیں۔ ایسے شخص کو متواضع کہنے کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی نقال کسی تحصیلدار کی نقل کرے۔ اس کو کوئی بے وقوف تحصیلدار سمجھنے لگے۔ تواضع حقیقت میں ایک صفت کا نام ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنے دل میں اپنے نفس کو سب سے کم سمجھے۔ یہ صفت دنیا میں بہت مفقود ہے۔ ایسے تو بہت نکلیں گے جو تقریراً اپنی مذمت کرتے ہیں۔

بعضے کہتے ہیں میں بڑا نالائق ہوں بڑا ناکارہ ہوں بعضے اپنے کو حقیر فقیر عاصی پر معاصی لکھتے ہیں لیکن جب وہ یہ کلمات فرمادیں اس وقت اگر کوئی کہہ دے کہ ہاں صاحب آپ بڑے نالائق ہیں پھر دیکھئے ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ سن کر تلملا ہی تو جائیں گے۔ وضعداری سے چاہے چپ ہو رہیں مگر دل میں تو یہ آئے گا کہ اس کو کھا جائیں۔ ہاں اگر دل میں ذرا بھی برا نہ مانیں اور کچھ تغیر نہ ہو تو واقعی متواضع ہیں یہ بڑا عمدہ امتحان ہے مگر ایسے کہاں ہیں آج کل تو ظاہری نیازمندی خشوع وخضوع سب کچھ ہے لیکن دل میں کچھ نہیں۔ بس یہ حالت ہے۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل   وندروں قہر خدائے عز و جل

(باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح ہیں کہ حلے ہی حلے ہیں اور اندر خدا تعالیٰ کا عذاب)

از بروں طعنہ زنی بربا یزید   وز درونت ننگ میدار و یزید

(باہر سے تو تم حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعن کرنے لگتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت سے یزید بھی شرما جاتا ہے)

جس دینداری کا خدا تعالیٰ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ بالکل جناب رسول اللہ ﷺ کے قدم بقدم ہو جاویں

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے لوگ کامل دیندار نہیں ہیں اس لئے کہ جیسا خدا تعالیٰ نے ان

---

[1] عاجزی وانکساری

سے دیندار ہونے کا مطالبہ فرمایا ہے ویسے نہیں بنے اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے اور میں دو لفظوں میں خلاصہ بتاتا ہوں اور میں کیا خود خدا تعالیٰ بتاتے ہیں اگر تفصیلاً بیان کیا جاوے کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے تو دفتر کے دفتر ختم ہو جاویں پھر بھی بیان ناتمام ہی رہے اس لئے گر کی بات عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ امور اختیاریہ میں ایسے بن جاؤ اور ایسے ہو کر آؤ جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا حق تعالیٰ نے ہمارے پاس ایک نمونہ بھیج دیا ہے اور گویا فرما دیا کہ تفصیلاً کہاں تک بیان کریں کہ یہ صفت پیدا کرو وہ صفت چھوڑ دو۔ ہم ایک نمونہ بھیجے دیتے ہیں ایسے بن جاؤ۔ اپنے اخلاق' عادات' کھانا پینا سونا بیٹھنا' اٹھنا' چلنا' پھرنا' وضع' طرز' انداز' چال ڈھال ایسا ہو جیسا ہمارے محبوب کا ہے۔ بس اب آپ غور کر لیجئے کہ اگر ایک صفت کی بھی کمی ہوئی تو ہم نمونہ کے موافق نہ ہوئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ درزی سے ہم کو اچکن سلوانا منظور ہے ہم نے نمونہ کے واسطے ایک اچکن بھیج دیا کہ ایسا سی لاؤ۔ اب بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آستین اس قدر ہوں سلائی اس طرح کی ہو۔ اس قدر نیچا ہو وہ سی کر لایا دیکھا تو اس کے مطابق ہے لیکن ایک آستین بڑھی ہوئی ہے تو اس درزی سے کہا جائے گا کہ ظالم تیرے پاس ہم نے نمونہ بھیج دیا تھا پھر بھی تو نے اس کے موافق نہ سیا اور اس اچکن کو ہرگز نمونہ کے موافق نہ کہا جائے گا۔ وہ اچکن اس درزی کے منہ پر ماریں گے اور اس کو سزا دیں گے تو صاحبو جب ہم حاکم حقیقی کے سامنے پیش کئے جاویں گے اور ہماری نماز ایسی نہ ہوگی جیسی کہ حضور ﷺ کی تھی۔ وضع' لباس' طرز انداز ایسا نہ ہوگا جیسا کہ حضورؐ کا تھا تو کچھ عجب نہیں کہ نکال دیئے جائیں۔ اللھم احفظنا واحشرنا فی زمرنبی صلی اللہ علیہ وسلم. (اے اللہ ہم کو سب برائیوں سے محفوظ رکھیئے اور ہمارا حشر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت میں فرما دیجئے)

حکایت: ایک حکایت بطور تمثیل کے یاد آئی کہ بادشاہ عالمگیرؒ جب صاحب تخت وتاج ہوئے تو تمام اہل حرفہ وصنعت کو موافق دستور شاہی انعام دیا گیا۔ بہروپئے بھی آئے لیکن عالمگیر ایک مولوی آدمی تھے۔ اس لئے ان کو دینا ناجائز سمجھا[1] لیکن صراحتہً ان کو ٹالنا

---

[1] دھوکہ اور جھوٹ پر دینا گناہ ہے

اور صاف جواب دینا مناسب نہ سمجھا یہ چاہا کہ کسی حیلہ لطیف سے ان کو ٹال دیا جائے کہا کہ جب ایسی شکل میں آؤ کہ ہم نہ پہچانیں تو انعام دیں گے۔ وہ مختلف شکلوں میں آئے مگر عالمگیرؒ نے پہچان لیا جب دکن کی مہم پیش آئی اور عالمگیرؒ نے دکن کا سفر کیا تو سفر میں عالمگیرؒ کا طریق یہ تھا کہ راستہ میں جس صاحب[1] کمال کو سنتے تھے اس سے جا کر ملتے تھے۔ دکن کے سفر میں بھی حسب عادۃ اہل کمال سے ملنے جاتے تھے۔ ایک مقام پر سنا کہ یہاں ایک درویش بڑے باکمال ہیں۔ اول وزیر کو ملنے کے لئے بھیجا وزیر نے ہر طرح ان کو جانچا وہ ہر بات میں پورے اترے آ کر عالمگیرؒ سے بہت تعریف کی اور کہا کہ ان کو تکلیف دینا بے ادبی ہے۔ آپ خود تشریف لے جا کر ان سے ملیے۔ عالمگیرؒ خود گئے اور مل کر بہت خوش ہوئے۔ عالمگیرؒ کو بعض مسائل تصوف میں کچھ شبہات تھے وہ پیش کئے۔ سب شبہات کے شافی جواب پائے بالکل اطمینان ہو گیا اور نہایت متاثر ہوئے اور ایک توڑہ[2] اشرفیوں کا پیش کیا۔ درویش نے ایک لات ماری اور کہا کہ مجھ کو بھی اپنی طرح دنیا دار سمجھتا ہے۔ عالمگیرؒ اور زیادہ متاثر ہوئے اور اس توڑہ کو اٹھا لیا اور وہاں سے چلے راہ میں وزیر سے دیر تک اس درویش کا ذکر مذکور رہا۔ جب لشکر میں پہنچے تو سامنے دیکھا کہ وہ بزرگ تشریف لا رہے ہیں۔ اور بادشاہ کو جھک کر سلام کیا اور انعام مانگا۔ عالمگیرؒ حیرت میں ہو گئے اور غور کر کے پہچانا اور اس کو کچھ انعام[3] دیا اور یہ پوچھا کہ میں نے اب تسلیم کر لیا کہ تو بڑا ہوشیار اور اپنے فن کا کامل ہے مگر یہ بتلا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت میں نے تجھ کو اس سے کہیں زیادہ دیا تھا اس کو تو نے رد کر دیا اور یہ روپیہ اس سے بہت کم ہے۔ یہ خوشی سے لے گیا۔ اس نے کہا کہ جو نقل میں نے کی تھی وہ لینا اس کے خلاف تھا۔ اس لئے نہیں لیا تو صاحبو ہم لوگ تو اس نقال سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ ہم سے تو نقل بھی دین کی نہیں ہوتی۔

بزرگی یہ ہے کہ ظاہراً بھی دیندار ہو اور باطناً بھی نہ کہ کشف[4] و کرامت

حاصل یہ ہے کہ دیندار کامل تو وہ ہے کہ ظاہراً بھی دیندار ہو اور باطناً بھی۔ کیونکہ

---

[1] اللہ والے کو [2] سونے کے سکوں کی ایک تھیلی [3] اس کی حرکت پر نہیں بلکہ وعدہ پر دیا تھا۔
[4] درمیان سے حجابات اٹھ کر کسی بات یا چیز کا ظاہر ہونا۔ کشف ہے اور ایسی باتوں یا فعلوں کا نبی کے کسی پیروکار متقی سے ظاہر ہو جانا جو دوسروں سے نہ ہو کرامت ہے۔

اعمال کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی ظاہری تو روزہ، نماز، حج زکوٰۃ وغیرہ اور باطنی انس، رضا، شوق، صبر قناعت وغیرہا ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں بد اخلاقیاں غضب، حقد، تکبر، بے صبری، حرص ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مشائخ[1] کے یہاں ملتی ہیں۔ اساتذہ کے یہاں تو ظاہر درست ہوتا ہے اور مشائخ کے یہاں یہ اخلاق درست ہوتے ہیں۔ اور اسی کا نام بزرگی ہے۔ آج کل تو درویشی اور بزرگی کشف و کرامت کو جانتے ہیں۔ مجھ کو ایک شیخ صاحب کے ارشاد پر تعجب ہوا کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا کہ میاں تم ذکر و شغل کرتے ہو کچھ نظر بھی آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ تو ہنس کر فرمایا کہ بھائی ثواب جمع کئے جاؤ۔ آہ افسوس ہے کہ ان شیخ نے ثواب کی کچھ بھی قدر نہ کی۔

میں تو اسی دن سے ان کی شخصیت[2] سے بھی بے اعتقاد ہو گیا۔ جو خدا تعالیٰ کی رضا کو چھوڑ کر کشف کو ڈھونڈے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے وزارت کو چھوڑ کر گھاس کھودنے لگے۔ اس لئے کہ کشف کا حاصل بعض غیر معلومہ[3] غیر مقصودہ اشیا کا معلوم ہو جانا ہے سو یہ کوئی کمال نہیں ہے کمال یہ ہے کہ ظاہر اور باطن موافق شریعت کے ہو۔ پس ایسے[4] شخص کے لئے میں دعویٰ کر کے کہتا ہوں کہ اس کو حیات طیبہ نصیب ہوگی اور کسی قسم کی پریشانی اس کو نہ ہوگی۔

حضرات اہل اللہ کو مصائب میں بھی پریشانی نہیں ہوتی بلکہ اور لطف آتا ہے

اگر کوئی کہے کہ ہم تو بچشم خود دیکھتے ہیں اور سنتے آئے ہیں کہ اکثر اولیاء اللہ اور بزرگان دین تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں پھر مزہ دار زندگی کہاں ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ بے شک مسلم ہے کہ ان حضرات کو بلا اور مصائب کا سامنا رہتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ لیکن ان کو ان مصائب میں بھی مزہ آتا ہے۔ اور جس کا نام پریشانی ہے وہ نہیں ہوتی۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور محبوب اس سے مدتوں سے نہ ملا ہو اور وہ اس

---

[1] سچے پیروں کی۔ [2] پیری [3] جو چیزیں مطلوب و مقصود نہیں اور معلوم نہ تھیں ان کا معلوم ہونا۔
[4] جو ظاہر و باطن کا جامع ہو۔

کی یاد میں گھلتا ہوا ایک روز دفعتہً محبوب آ پہنچا اور آ کر لپٹ گیا اور اس کو خوب دبایا اور اس قدر دبایا کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں لیکن اگر وہ سچا عاشق ہے تو واللہ اس کو اس قدر مسرت ہو گی کہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر اس کو سمجھے گا اور کہے گا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس کے واسطے تمام عمر کھو دی اور مال و دولت آبرو اس پر نثار کر دی۔ اگر محبوب کہے بھی کہ اگر تکلیف ہو تو چھوڑ دوں تو وہ کہے گا کہ خدا نہ کرے وہ دن کہ تم مجھ کو چھوڑ دو بلکہ یوں کہے گا

اسیرت نخواہد رہائی ز بند　　　　شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی تو قید سے چھوٹنا ہی نہیں چاہتا تیرا شکاری تیری کمند سے چھٹکارا ہی نہیں چاہتا)

اور اگر وہ کہے کہ میں اس رقیب کو جو پاس کھڑا ہے دبا لوں اور تم کو راحت دوں تو کہے گا ۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو ہم دوستوں کے سر سلامت رہیں کہ تو ان پر خنجر آزمائی کرے)

اور کہے گا

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرات اہل اللہ کو موت بھی محبوب ہوتی ہے

دیکھئے لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ مصیبت موت ہوتی ہے اور عشاق کے نزدیک وہی موت عجیب دولت ہے کہتے ہیں ۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم　　　　راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم

(میں تو اس دن خوش ہوں گا کہ اس اجڑے گھر سے چلا جاؤں گا روح کی راحت طلب کر لوں گا۔ محبوب کے لئے چل دوں گا)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　　　تا در میکدہ شادان و غزلخواں بردم

(میں نے منت مانی ہے کہ اگر سر میں یہ غم کسی دن بھی آ جائے گا تو میکدہ تک خوش خوش غزل پڑھتا جاؤں گا)

اور یہ تمنائیں تو ان حضرات کی موت آنے سے پہلے ہوتی ہیں لیکن عین موت کے

وقت بھی یہی ہوتا ہے ایک بزرگ وفات کے وقت کہتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وہ وقت آ گیا کہ میں ننگا ہو جاؤں جسم کو چھوڑ ڈالوں روح ہی روح ہو جاؤں)

ابن فارض کا جب انتقال کا وقت آیا تو آٹھوں جنتیں ان کے لئے مکشوف ہوئیں دیکھ کر منہ پھیر لیا اور فرمایا۔

ان کان منزلتی فی الحب عندکم ماتدرائیت فقد ضعیت ایامی

یعنی اگر میرا مرتبہ عشق میں آپ کے نزدیک یہی ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ میرا مقصود تو آپ کی ذات پاک ہے۔ اگر آپ نہ ملے تو جنت کو لے کر کیا کروں گا۔ اس کے بعد ان پر تجلی حق ہوئی اور اسی میں رحلت فرمائی۔ سبحان اللہ اب فرمایئے کہ جب موت سے بھی یہ حضرات پریشان و ہراساں نہیں ہوتے تو فقر و فاقہ میں افلاس و تنگی میں تو کیا پریشانی ہے۔

حکایت: حضرت بہلولؒ نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کس حال میں ہو فرمایا کہ ایسے شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ جو کچھ عالم میں ہو رہا ہے سب اسی کی مرضی کے موافق ہو رہا ہے۔ وہ کیسا کچھ مزے میں ہوگا۔ حضرت بہلول نے کہا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی مخلوق کے لئے ایسا کب ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے سب اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے یہ شان تو حق تعالیٰ ہی کی ہے انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے ارادہ کو ارادۃ اللہ میں فنا کر دیا ہو تو جو امر ارادہ الٰہیہ کے موافق ہوگا وہ اس کے ارادہ کے بھی موافق ہوگا۔

حاصل یہ کہ ہم اپنے نفس کو اپنی رائے کو حق تعالیٰ کی رضا میں فنا کر چکے ہیں جس حالت میں ہیں خوش ہیں۔

حضرات اہل اللہ کو پریشانی نہ ہونے کا راز

بات یہ ہے کہ پریشانی کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں۔ اول تو جس سے معاملہ ہو اس سے محبت نہ ہو۔ جب پریشانی ہوتی ہے اور اگر محبت ہو تو پریشانی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ مثلاً محبوب اگر یوں کہے کہ مجھ سے دو گھنٹہ دھوپ میں کھڑے ہو کر باتیں کرو اگر وہ کہے کہ نہیں تو

دعوئ محبت میں جھوٹا ہے اور اگر سچا ہے تو اس کی یہ حالت ہوگی۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　　جنت است آں گر چہ باشد قعر چاہ

(جہاں کہیں کوئی چاند جیسا یوسف چہرہ والا ہو وہ جگہ تو جنت ہے اگر چہ کنویں کی گہرائی ہو ۱۲)

دوسری وجہ پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ خلاف امید کوئی امر پیش آوے کہ سوچا کچھ اور ہو گیا کچھ مثلاً طاعون آیا ہم چاہتے تھے کہ تندرست رہیں مگر نہ رہے۔ چاہتے تھے کہ تجارت میں نفع ہو نہ ہوا۔ چاہتے تھے کہ اولاد ہو نہ آئی تو اس وقت پریشانی ہوگی اور جو شخص اپنی رائے کو فنا کر چکا ہو اور اپنے ارادے کو رضائے مولیٰ میں مٹا چکا ہو اس کو پریشانی کی یہ وجہ بھی نہ ستائے گی۔

حکایت: حضرت بہلول سے کسی نے کہا کہ اناج بہت گراں ہو گیا ہے فرمایا کہ کچھ پرواہ نہیں ہمارے ذمہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ذمہ ہے کہ ہم کو حسب وعدہ رزق دے۔

حکایت: ایک بزرگ نے اپنی توبہ اور رجوع[1] الی اللہ کا قصہ بیان کیا کہ ایک سال قحط بہت تھا۔ مخلوق بہت پریشان تھی۔ اسی حالت میں ایک غلام کو دیکھا کہ بے فکری سے گاتا ہوا خوش بخوش جا رہا ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ مخلوق تو پریشان ہو رہی ہے اور تو اس طرح بے فکر ہے۔ اس نے کہا کہ میں بے فکر کیوں نہ ہوں۔ میرے مالک کے یہاں دو گاؤں ہیں۔ اس وقت نفس کو ایک تازیانہ لگا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ ارے نفس جس کے مالک کے پاس دو گاؤں ہیں وہ تو بے فکر ہے اور تیرے مالک کے قبضہ میں آسمان زمین عرش کرسی ہے تو پریشان ہے۔ اسی وقت سے توجہ الی اللہ کی توفیق ہوئی۔ افسوس کہ اس وقت معاملہ بالعکس ہو گیا۔ دنیا کمانے اور شب و روز اسی دھن میں رہنے کو ترقی اور اولوالعزمی سمجھتے ہیں اور بے فکری اور توکل کو پستی کہتے ہیں۔

اور توکل کو پستی کہتے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ اپنے کو خیر خواہ اور بہی خواہ قوم کہتے ہیں۔ جو شخص رات دن ہوائے[2] نفسانی میں مبتلا ہو اور سوائے دنیا کمانے کے کوئی مشغلہ نہ ہو اس سے دوسرے کی خیر خواہی کیا ہو سکتی ہے۔ حقیقی خیر خواہ انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین** یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے دل کا لوٹ جانا　[2] نفسانی خواہشات لذتوں اور مزوں میں پڑا ہونا

آپ جو شب و روز ان کی فکر میں گھلتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی فکر میں کہ یہ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔ ان حضرات کا مشرب یہ ہے ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست ۔۔۔ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(طریقت مخلوق کی خدمت و اصلاح کے سوا کچھ نہیں تسبیح و جانماز اور گدڑی سے نہیں کہ وہ اپنے ہی لئے ہیں اور اصلاح سب کے لئے ہے)

شاہ اسحٰق صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ حضرت فلاں شخص کے نام ایک رقعہ لکھ دیجئے۔ اس سے میرا ایک کام ہے آپ کا رقعہ دیکھنے سے وہ کر دے گا۔ وہ شخص حضرت کا سخت مخالف تھا۔ حضرت نے رقعہ لکھ دیا اس نے جا کر اس شخص کو دیا۔ اس نے اس رقعہ کی بتی بنا کر دی اور کہا کہ شاہ صاحب سے کہو کہ اس کی بتی بنا کر فلاں جگہ رکھ لو۔ اس شخص نے اسی طرح آ کر یہ مقولہ شاہ صاحب کی خدمت میں نقل کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی کہ اگر اس فعل سے تیرا کام چلتا تو مجھے اس سے بھی دریغ نہ ہوتا۔ یہ جواب اس کو پہنچا وہ شخص یہ بات سن کر تڑپ گیا اور اس قدر متاثر ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں آ کر اس نے معذرت کی اور اس کو ہدایت ہو گئی۔ دس برس کے مجاہدہ میں بھی وہ بات نہ ہوتی جو شاہ صاحب کے ایک کلمہ میں ہو گئی۔ اب بتلایئے کہ ایسی نفع رسانی آج کس میں ہے۔ آج ترقی کا دم بھرنے والے اس کو پست ہمتی کہتے ہیں۔ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ دنیا اللہ کا گھر ہے اور ہم اس کے ضیف[1] ہیں اور ضیافت[2] بروئے حدیث تین دن ہے اور اللہ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کا ہے چنانچہ فرمایا ہے وان یوماً عند ربک کالف سنۃ مماتعدون (اور بے شک ایک دن تمہارے رب کے پاس مثل ایک ہزار سال کے ہے ان میں سے جن کو تم شمار کرتے ہو) تو تین ہزار برس تک تو دعوت ہے اس کے بعد پوچھنا۔

روپیہ کمانے کی ممانعت نہیں اس میں کھپ جانے کی ممانعت ہے

میرا[3] مطلب ان حکایات سے یہ نہیں ہے کہ روپیہ نہ کماؤ اور جاگیر گھر لٹا دو مقصود یہ ہے

---

[1] مہمان [2] مہمانی [3] یہ جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ مولوی لوگ ترقی سے روکتے ہیں یہ علماء اور دین سے نفرت پیدا کرنیوالی خطرناک بات ہے ایسا لفظ زبان سے بھی نہ نکالیے وہ تو دینی تنزل سے روکتے ہیں دینی ترقی کیساتھ مالی ترقی سے نہیں روکتے۔

کہ اس میں کھپ مت جاؤ۔ بلکہ ضرورت پر نظر رکھو اور ایسی خصائل حاصل کرو جیسی کہ بزرگوں میں تھیں اور مال جمع کرنے کی ممانعت نہیں کرتا بلکہ بعض بزرگ روپیہ بہت رکھتے تھے مگر وہ اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لئے جیسے خزانچی اور تحصیلدار ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھی اسی طرح سے روپیہ رکھتے ہیں اور بلا اذن اس میں سے خرچ نہیں کرتے۔ جیسے سلیمان علیہ السلام کو سلطنت دی گئی اور حضرت صدیق اکبرؓ کو خلافت ملی یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہی ملی لیکن حالت کیا تھی کہ جب مصر میں قحط پڑا تو یوسف علیہ السلام پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے۔

اہل اللہ کی خوش خوراکی وخوش لباسی بھی رضائے الٰہی کے لئے ہوتی ہے

اور اگر اہل اللہ میں کوئی خوش خوراک خوش لباس پایا جاوے تو وہ بھی باذن الٰہی ہے مثلاً ایک شخص ہے اس کو یہ ثابت ہوا کہ خلق کی ہدایت میرے متعلق ہے اور مواعظ وتقریر سے تدریس سے لوگوں کو ہدایت کرنا اس کا مشغلہ ہے سو اگر وہ گھی دودھ اغذیہ مقویہ کا استعمال چھوڑ دے تو دماغ میں خشکی آوے گی اور کچھ کام اس سے نہ ہو سکے گا اور اگر دماغ کی حفاظت کرے گا تو سب کام ہو سکیں گے۔

نفس کو کھلا پلا کر اس سے سرکاری کام لو

یہ نفس بطور مزدور کے ہے اور یہ دماغ سرکاری مشین ہے اگر اس کو مزدوری ملتی رہے اور مرمت ہوتی رہے تو کام دیتا رہے گا۔ پس وہ خدمت نفس کی اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ہمارا ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ سرکاری خدمت سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

(مجھے تو اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ اس نے آپ کا جمال دیکھا ہے میں اپنے پیروں کے بھی پاؤں پڑتا ہوں کہ آپ کے کوچہ میں پہنچے ہیں)

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(ہر وقت اپنے ہاتھ کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کیونکہ اسی نے آپ کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان لنفسک علیک حقاً ولزوجک علیک حقاً (بے شک تمہاری جان کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے) اور فرماتے ہیں المومن القوی خیر من المومن الضعیف (قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے یعنی ظاہر میں بھی قوی ہو اور دوسروں کی مدد کرے اور باطن میں بھی قوی ہو)

ہدایت خلق جن بزرگوں کے متعلق نہیں ہوتی ہے انہیں صرف اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے خلق کے برا بھلا کہنے کا ڈر نہیں ہوتا

اور بعضوں سے کچھ نفع خلق کا متعلق نہیں ہوتا ان کو اپنے ہی نفس کی اصلاح کی فکر ہوتی ہے۔ ان کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بہ مشیخت تراچہ کار　　　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تم تو عاشق ہو تمہیں پیر ہونے سے کیا کام دیوانگی اختیار کرو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

اور ایک کہتے ہیں ؎

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند　　　　آرے آرے میکند باخلق و عالم کار نیست

(لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بت پرستی (یعنی خلاف خلاف برا کام) کرتا ہے تو ہاں ہاں میں کرتا ہوں مجھے لوگوں سے اور دنیا سے کوئی کام نہیں یعنی میرا معاملہ اللہ سے ہے جس کو تم ظاہر سے برا سمجھتے ہو سمجھا کرو مجھے تمہاری پروا نہیں وہ ظاہر کا برا کام ہے درحقیقت اس کا باطن کچھ اور ہے)

تو یہ کسی قسم کی بدنامی سے نہیں ڈرتے

ہدایت خلق جن بزرگوں کے متعلق ہوتی ہے وہ بدگمانی کے موقع سے بھی بچتے ہیں

ایک وہ ہیں جو شبہ سے بھی بچتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف

تھے کہ حضرت صفیہؓ جو ازواج مطہرات سے ہیں تشریف لائیں جب واپس تشریف لے گئیں تو حضور ان کے پہنچانے کے لئے لب مسجد تک تشریف لائے کہ سامنے سے دو شخص آئے حضور نے فرمایا ذرا ٹھہرو اور پھر فرمایا انها صفية یعنی یہ صفیہ ہیں۔ یہ بات ان کو بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ توبہ توبہ کیا حضور کی نسبت ہم کچھ گمان کر سکتے تھے فرمایا کہ شیطان ابن آدم کے رگ و ریشہ میں بجائے خون کے دوڑتا ہے۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔

اہل اللہ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں

اولیاء اللہ مختلف رنگ کے ہوئے ہیں۔ سرکاری گلدستہ ہے اس میں گلاب بھی ہے چنبیلی بھی بیلا بھی اور خار بھی ہے۔

اہل اللہ کو غم ہوتا ہے پریشانی نہیں ہوتی

اگر کوئی کہے کہ ہم نے انبیاء کی حکایتیں سنی ہیں کہ ان کو غم ہوئے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام ایک مدت تک یوسف علیہ السلام کی جدائی میں مغموم رہے۔ ایوب علیہ السلام سخت مصائب میں مبتلا رہے۔ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے ایذا پہنچائی۔ جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو رنج و غم تو ہوا لیکن پریشانی نہیں ہوئی۔ غم اور شے ہے پریشانی اور چیز ہے۔ غم ہونا کمال کے منافی نہیں بلکہ عین کمال ہے۔ بعض بزرگوں کا حال آیا ہے کہ ان کے بیٹے کا انتقال ہوا اور وہ ہنس رہے تھے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو حضور محزون تھے۔ ظاہر ہے کہ کمال وہ ہے جو حضور کا فعل ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جو مغموم نہیں ہوئے انہوں نے تو صرف حق تعالیٰ کا حق ادا کیا اور جن کو غم ہوا انہوں نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور اللہ تعالیٰ کا بھی کاملین کو جو غم دیا جاتا ہے اس میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ صبر کی فضیلت حاصل کریں۔ اس لئے کہ صبر بدوں غم کے نہیں ہوتا اور دوسری حکمت یہ ہے کہ حزن سے تصفیہ ہوتا ہے قلب کا۔

غم حیات طیبہ کے منافی[1] نہیں

اگر کوئی کہے کہ جب حزن ہوا تو حیات طیبہ کہاں ہوئی بات یہ ہے کہ عین واقعہ رنج میں دو حیثیتیں ہیں۔ باعتبار مصیبت ہونے کے تو وہ الم رساں[2] ہے۔ اور باعتبار من[3] المحبوب ہونے کے وہ مرضی[4] ہے اوران حضرات کے ہر واقعہ کا من[5] اللہ ہونا ہر وقت پیش نظر رہتا ہے۔ اس لئے خواہ کسی طرح کی مصیبت پیش آوے وہ اس حیثیت سے پسندیدہ ہے اوران کے اطمینان قلب میں کسی طرح خلل انداز نہیں ہاں تکلیف پہنچنا امر آخر ہے۔

اس کی حقیقت جو بفضلہ تعالیٰ آج ہی سمجھ میں آئی ایک مثال کے ضمن میں یہ ہے کہ طیب[6] ہونے کے دو درجہ ہیں اول مزہ دار ہونا اور نافع ہونا۔ دوسرے صرف نافع ہونا مثلاً کہتے ہیں کہ یہ دوا طیب ہے تو معنے یہ ہیں کہ مزہ دار بھی ہے اور نافع بھی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دوا طیب ہے تو اس کا طیب ہونا یہ ہے کہ شفا ہو جاوے۔ امراض زائل ہو جاویں پس حزن مثل دوا کے ہے۔ دوا کا کڑوا ہونا گو طبع کے خلاف ہے لیکن گوارا ہے۔ کڑوی دوا بھی خوشی سے پی لی جاتی ہے اور تلخی برداشت کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی حصول لذت کے لئے ہے اس لئے کہ دوا سے صحت ہوگی اور صحت لذیذ ہے تو دوا بھی اس قاعدے سے لذیذ ہوگی اور اس میں بھی ایک گونہ مسرت ہو گی بشرطیکہ اس کا نافع ہونا پیش نظر ہو۔ بحمد اللہ اس تقریر سے سب شبہات رفع ہو گئے[7]۔

محبت سے تمام مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں اور محبت ہی اصل سبب ہے ترقی کا

خلاصہ یہ کہ ان حضرات کو خواہ مصیبت ہو رنج ہو فقر و فاقہ ہو ہر وقت خوش ہیں اور اصل میں خوش کرنے والی ان کو محبت ہے چونکہ ان کو حق جل وعلا شانہ سے محبت ہے۔ اس

---

[1] مخالف یعنی پاکیزہ زندگی اور غم جمع ہو سکتے ہیں۔ [2] تکلیف دینے والا [3] محبوب کی جانب سے [4] پسندیدہ [5] اللہ تعالیٰ کی طرف سے [6] پاکیزہ [7] کہ غم ہوتا ہے جیسے دوا کڑوی لگتی ہے پریشانی نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا سے صحت کی امید کی خوشی میں کڑواپن دب جاتا ہے تو محبوب کی طرف سے ہونے کی خوشی میں غم دب جاتا ہے پریشانی نہیں ہوتی ان پر مصیبتیں بھی آتی ہیں کیونکہ بیماریوں میں کڑوی دوا دی جاتی ہے قرب میں جو کمی رہ گئی ہے اس کی یہ دوا ہے کہ دونوں میں رنج تو طبیعت پر ہوتا ہے مگر اطمینان دل اور عقل کو ہے وغیرہ۔

لئے بقائے حق کے انتظار میں ان کو سب سہل ہے۔ دنیا میں دیکھ لیجئے اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو کہ فلاں وقت وہ ہم سے ملے گا تو اس وقت کے انتظار میں سب بلائیں اس کو سہل ہیں یہ انتظار کہ خدا تعالیٰ ہم سے خوش ہوں گے یا اس وقت ہم سے خوش ہیں اس کی ایسی خوشی ہوتی ہے کہ سب مصائب سہل ہو جاتے ہیں یہ سب محبت کی برکت ہے۔

خدا کی قسم یہی وہ شے ہے جس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم تمام امت میں ممتاز ہوئے اور یہی وہ دولت ہے جس کے سبب سے سلف رحمہم اللہ کے آج تذکرے لکھے جاتے ہیں اور اصل سبب ترقی کی یہی شے ہے۔ آج کل صحابہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یوں ترقی کی یوں کی اور اس امر میں ان کا اپنے نزدیک اقتدا کرتے ہیں اور اصل روح اور سبب ترقی سے مس تک نہیں اور نہ ترقی کی حقیقت سے واقف ہیں دنیا سمیٹنے کو اور جاہ مذموم کی تحصیل کا نام ترقی کر رکھا ہے۔ صحابہؓ نے جو فتوحات کی وہ سب للدین[1] تھی۔ دنیا ان کے پاس تک نہ تھی سو ایسی ترقی کو کون منع کرتا ہے۔

اہل اللہ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں

صحابہ اور نیز دیگر سلف صالحین میں بھی مختلف رنگ کے لوگ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے گھر تک نہیں بنایا۔ حضرت سلیمانؑ صاحب سلطنت ہوئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ مال جمع کرنے کو بالکل حرام فرمایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا تھا کہ اے ابوذر میں تمہارے لئے وہ پسند[2] کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ تم دو شخصوں کے درمیان کبھی فیصلہ مت کرنا اور نہ یتیم کے مال کے ولی بننا۔ اس لئے کہ میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں۔ یعنی تعلقات کی برداشت نہ ہوگی۔ یہ ابوبکر و عمرؓ کا ہی جگر تھا کہ مدینہ طیبہ میں چٹائی پر بیٹھے ہیں اور روم و شام و دمشق و فارس کا انتظام کر رہے ہیں۔ غرض انبیاء اور صحابہ اور اولیاء اللہ میں بھی ہر ایک کا جدا رنگ ہے اور ان کے لئے وہی رنگ مناسب ہے۔ بعضے روپیہ پیسے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ میاں کون جھگڑے میں پڑے۔ ہم سے حقوق ادا نہ ہوں گے۔ زکوٰۃ عشر قربانی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حقوق ہیں یہ بڑا قصہ ہے۔ ایسے

---

[1] صرف دین کے لئے [2] یعنی اگر میں ان حالات میں ہوں جن میں تم ہو تو اپنے لئے یہ پسند کرتا ہوں۔

لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہوتا ہے کہ ان کو کچھ نہیں دیتے اور ہمیشہ وہ مفلس رہتے ہیں جیسے حضرت ابراہیم ادھمؒ کہ سلطنت چھوڑ دی اور جیسے حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ کہ ہمیشہ فقر وفاقہ میں گزرتی تھی۔

ایک روز کا قصہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں ان کے پیرومرشد تشریف لائے۔ حضرت مکان پر تشریف نہ رکھتے تھے۔ بی بی تھیں انہوں نے تعظیم وتکریم سے پیر کو ٹھہرایا لیکن حسب عادت حضرت شاہ صاحب کے یہاں اس روز بھی کچھ کھانے پینے کو نہ تھا۔ بی بی نے پڑوس میں سے آٹا ادھار مانگنے کے لئے خادمہ کو بھیجا۔ پڑوسیوں نے ادھار بھی نہ دیا کہ ان کو ادھار دے کر کہاں سے لیں گے۔ پیر صاحب خادمہ کو برابر آتا جاتا دیکھ کر فراست[1] سے سمجھ گئے پوچھا کہ کس فکر میں ہو۔ بی بی نے سمجھا کہ ان سے کیا چھپانا۔ واقعی یہ حضرات خدا کے نائب ہوتے ہیں ان سے اپنا کوئی حال چھپانا نہ چاہیے بی بی نے صاف کہہ دیا کہ حضرت آج ہمارے یہاں کچھ نہیں ہے۔ پیر صاحب نے ایک روپیہ عطا فرمایا۔ آج کل کے پیر تو مریدوں کا ہی کھاتے ہیں کچھ خیال نہیں کرتے کہ ان کے یہاں کہاں سے آیا ہے اور کس طرح بیچارے لائے ہیں۔ القصہ پیر صاحب نے فرمایا کہ اس ایک روپیہ کا اناج لاؤ اور ہمارے پاس لانا چنانچہ غلہ حضرت پیرومرشد کے پاس لایا گیا۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر غلہ میں دبا دیا اور یہ فرمایا کہ اس تعویذ کو مت نکالنا۔ پیر صاحب تو رخصت ہوئے اب روزمرہ اس میں سے غلہ نکالا جاتا تھا اور وہ کم نہ ہوتا تھا۔ کئی روز ہو گئے کہ صبح شام کھانا آنے لگا یہ دیکھ کر حضرت شاہ ابوالمعالیؒ نے فرمایا کہ ہائیں یہ کیا بات ہے کئی روز ہوئے فقر وفاقہ نہیں ہے۔ بی بی نے فرمایا کہ پیر صاحب تعویذ دے گئے تھے۔ اس کی برکت ہے۔ فرمایا کہ ہمارا فاقہ اختیاری ہے اضطراری نہیں۔ اب یہ مقام بڑی کشاکشی تھا کہ پیر کا تعویذ اگر رکھا جائے تو اپنے مذاق کے خلاف اور اگر نہ رکھیں تو پیر کے تعویذ کی بے ادبی مگر سبحان اللہ ان حضرات کو حق تعالیٰ ایسا نور باطن عطا فرماتے ہیں کہ ان کا فہم نہایت صحیح اور عقل ان کی کامل ہو جاتی ہے فرمایا کہ اس تعویذ کا حق دار تو میرا سر ہے مٹکا نہیں ہے لاؤ وہ

---

[1] مومن کی دانائی جو نور خداوندی سے حاصل ہوتی ہے

تعویذ میں اپنے سر میں رکھوں گا تعویذ منگا کر سر میں رکھ لیا اور اناج فقراء کو تقسیم کر دیا۔ شام کو پھر فقر وفاقہ ہوا شکر حق تعالیٰ کا ادا کیا اور بعضوں کو جانتے ہیں کہ اگر نہ ملے گا تو پریشان ہوں گے اور یا جانتے ہیں کہ ان سے برداشت حقوق کی ہوگی ان کو خوب دیتے ہیں۔ غرض اولیاء اللہ کے مختلف طبقات ہیں مگر جس حال میں ہیں خوش ہیں ۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش   کہ انچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

(گاد کے اور صاف کے دیکھنے کا تم کو حکم نہیں بس پی جاؤ۔ کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ ہمارے پیالہ میں ڈال دیا ہے کرم ہی کرم ہے ہم کس قابل تھے)

اور کہتے ہیں ۔

تو بندگی چوگدایاں بشرط مزدمکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم غریبوں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی مت کرو کیونکہ ہمارا آقا تو غلام کی پرورش کرنا خود جانتا ہے)

قبض کی حالت میں فرماتے ہیں ۔

باغباں گر پنجروزی صحبت گل بایدش   بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال   مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(باغ والے کو اگر چہ چند روز پھولوں کی صحبت درکار ہے تو فراق کے کانٹوں کی تکلیف پر بلبل کا سا صبر بھی چاہیے۔ اے دل اس کی زلفوں کی قید میں پریشانی سے نہ گھبرا۔ اچھا جانور جب قید میں پھنس جاتا ہے اس کو تحمل بھی کرنا چاہیے)

اور اس سے زیادہ فرماتے ہیں ۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

(ہجر ووصل کیا چیز ہوتی ہے بس محبوب کی مرضی تلاش کرو کیونکہ اس سے اس کے سوا کی تمنا کرنا افسوسناک بات ہے)

اب میں پوچھتا ہوں کہ جس کا یہ حال ہو اس کو کیا پریشانی ہوگی وہ تو ہر وقت مسرور ہے۔ ہر وقت خوش ہے حیات طیبہ یہ ہے اور اس کے ماسوا پریشانی ہے۔ اور بے حالی ہے لیکن ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(یہ نیک بختی بازو کے زور سے نہیں ہو سکتی جب تک بخشنے والا خدا ہی نہ بخشے)

حیات طیبہ اور درجہ ولایت حاصل ہونے کا نہایت سہل طریقہ

مگر ہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مرتبہ کس کو حاصل ہو سکتا ہے ہم لوگ تو دنیا دار ہیں۔ سینکڑوں طرح کے اشغال ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں سو یہ خیال شیطانی ہے اور منشاء اس کا یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کاروبار دنیا کے چھوڑ کر حجرے میں بیٹھ کر تسبیح ہلاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہر شخص کے لئے جداگانہ طریق ہے اگر اس مقام پر ہر ایک کی تفصیل بیان کی جاوے تو ایک وقت طویل درکار ہے اور پھر بھی کافی نہیں اس لئے کہ یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میرے لئے کونسا طریق نافع ہے اس لئے میں تم کو ایک مختصر ہی بات بتلاتا ہوں اور جھگڑے کی بات بالکل نہیں بتاتا وہ یہ کہ مرشد کامل[1] کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بے فکر ہو جاؤ اور لم و کیف[2] کو چھوڑ دو۔ اپنے کو اس کے سپرد کر دو اور اپنی رائے کو ہرگز دخل نہ دو۔ جو وہ طریق بتائے اس پر عمل کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہو گے۔

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد   دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

یعنی ایک چیونٹی کو ہوس ہوئی کہ خانہ کعبہ میں پہنچے لیکن اپنے ضعف و عجز کو دیکھ کر مایوس تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کبوتر ان حرم محترم سے بیٹھا ہے۔ وہ چیونٹی اس کے پاؤں کو لپٹ گئی اس نے ایک پرواز کی اور بیت اللہ شریف میں جا پہنچا۔ چیونٹی نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا کہ خانہ کعبہ سامنے ہے تو صاحبو اسی طرح ہم اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اہل اللہ کا دامن اگر پکڑ لیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ محروم نہ رہیں گے۔ اسی واسطے تو فرمایا ہے۔ **کونوا مع الصادقین** (سچوں کے ساتھ ہو جاؤں)

عاقل کا ہر کام یا تو تحصیل[3] منفعت کے لئے ہے یا دفع مضرت[4] کے لئے

قاعدہ عقلیہ ہے کہ آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزوں میں سے ایک شے مقصود

---

[1] صحیح اور کامل پیر [2] کیوں اور کیسے کہنے کو علت و مصلحت پوچھنے کو [3] فائدہ حاصل کرنے کے لئے
[4] تکلیف و نقصان دور کرنے کے لئے

ہوتی ہے یا تو دفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھاتا ہے۔ لذت[1] وتغذی کے لئے یہ طلب منفعت ہے۔ دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا۔ اور مثلاً نوکری کرتا ہے روپیہ کی تحصیل کے لئے۔ تجارت کرتا ہے منفعت و فائدہ کے واسطے۔ رشوت دیتا ہے تا کہ کسی قسم کی سزا نہ ہو جائے یا کسی بلا میں مبتلا ہے اس سے رہا ہو جاوے۔ مکان بناتا ہے سردی و گرمی سے بچنے کے واسطے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلب منفعت کے لئے کرتا ہے یا دفع مضرت کے لئے اس میں کسی عاقل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ منفعت و مضرت کی تعین میں اہل الرائے و اہل ملت میں اختلاف ہے۔ باقی نفس مسئلہ میں اتفاق ہے۔ چنانچہ اول واضح ہو چکا ہے تعین میں البتہ بہت بڑا اختلاف ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منفعت کی تحصیل تو ہر ایک کا مقصود ہے لیکن منفعت کی تعین میں ہر ایک نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے ایک شخص سائی[2] ہے کہ مجھ کو مثلاً تحصیلداری یا تھانہ داری یا ڈپٹی کلکٹری وغیرہا مثلاً علی حسب[3] اختلاف المقاصد مل جاوے کہ اس میں میری عزت و آبرو ہے۔ دوسرا ساعی ہے کہ مجھ کو نہ ملے کہ غریبوں پر ظلم ہوگا چنانچہ بعضوں پر زور دیا جاتا ہے کہ حکومت قبول کرو اور وہ نہیں کرتے۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے سلطنت کے لئے ہزاروں جانیں ضائع کر دیں اور ایک وہ تھے کہ بھاگتے تھے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کوئی اس کو منفعت سمجھا اس کی تحصیل کے لئے سعی کی اور دوسرے نے اس کو مضرت خیال کیا اس لئے اس کے دفع میں کوشش کی اور جس قدر اختلافات عالم میں ہیں سب کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص ایک امر کو منفعت و مستحسن سمجھتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے اس کی تحصیل کے درپے ہوتا ہے۔ دوسرا اسی کو مضرت سمجھتا ہے اس لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اختلاف مذاہب کی یہی وجہ ہے۔

کون سی منفعت قابل تحسین ہے اور کون سی مضرت قابل دفع ہے

اس وقت قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت واقع میں قابل تحصیل کے لئے ہے کون مضرت قابل دفع کے لئے ہے تو بعد تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ

---

[1] مزہ غذا [2] کوشش کرنے والا [3] اپنے اپنے الگ الگ مقصدوں کے موافق

منفعت وہ لائق تحصیل کے لئے ہے۔ جس میں دو صفتیں ہوں۔ ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو۔ دوسرے یہ کہ خالص ہو مشوب[1] بضرر نہ ہو دیکھ لیجئے۔ اگر کوئی منفعت چار سال رہنے والی ہو اور دوسری آٹھ سال تو ہر عاقل دوسری ہی پسند کرے گا اور اسی کو اختیار کرے گا مثلاً دو مکان ہوں ایک بڑا اعالی شان اور خوبصورت ہو اور دوسرا چھوٹا اور بدصورت ہو اور وہ مکان کسی شخص کے سامنے پیش کئے گئے لیکن یہ کہا گیا کہ بڑا مکان چار پانچ روز کے بعد خالی کرالیا جاوے گا اور چھوٹا کبھی خالی نہ کرایا جاوے گا۔ تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چھوٹے ہی مکان کو پسند کرے گا اور اگر یہ کہہ دیا جاوے گا کہ نسلاً بعد نسل تم کو دے دیا جاوے گا تو ضرور ہی پسند کرے گا معلوم ہوا کہ منفعت جس قدر باقی رہنے والی ہوگی اسی قدر زیادہ اعتبار کے قابل[2] ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ مکان عالی شان باوجود اپنی خوبصورتی کے کسی ضرر پر مشتمل ہو مثلاً ہمسایہ اچھا نہ ہو یا اور کوئی مضرت کا احتمال ہو اور اس چھوٹے مکان میں یہ اندیشہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ چھوٹا ہی مکان پسند ہوگا۔ پس یہ قاعدہ ثابت ہوا کہ منفعت وہ قابل تحصیل کے ہے جو مضرت سے خالی ہو۔ اسی طرح مضرت بھی وہ زیادہ قابل اہتمام[3] کے ہوتی ہے جو زیادہ باقی رہنے والی ہو اور نیز من کل الوجوہ[4] مضرت ہی ہو اور کوئی شائبہ اس میں منفعت کا نہ ہو دیکھو اگر اثناء سفر میں آدمی کسی مکان میں ایک دو شب کے لئے قیام کرتا ہے اور وہاں کوئی ناگوار امر پیش آتا ہے تو اس کے دفع میں زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کرتا بخلاف اس کے کہ وطن اصلی میں کوئی امر پیش آجاوے تو اس کے دور کرنے کی فکر ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں ہمیشہ رہنا ہے اور مثلاً اگر کہا جاوے کہ اگر تم چار دن کے لئے دھوپ میں سفر کرلو تو تم کو عمر بھر راحت ملے گی یا اگر چار ماہ راحت سے رہو گے تو عمر بھر جیل خانہ میں رہو گے تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چار روز کے سفر کی مشقت کو گوارا کرلے گا اور دوسری صورت کو پسند نہ کریگا۔ معلوم ہوا کہ مضرت[5] باقیہ و خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے اور مضرت فانیہ زیادہ

۱؎ مضرت سے ملی ہوئی ۲؎ چاہے چھوٹی ہو ۳؎ دور کرنے کے اہتمام کی ۴؎ ہر ہر طریقہ سے
۵؎ مدت تک رہنے والی تکلیف یا نقصان اور خالص کہ نفع و راحت کی کوئی شکل اس میں نہ ہو

قابل التفات نہیں ہے۔ پس منفعت و مضرت دونوں کی دو قسمیں ہوئیں۔ منفعت[1] باقیہ خالصہ منفعت[2] فانیہ غیر خالصہ و مضرت فانیہ[3] باقیہ خالصہ مضرت[4] فانیہ غیر خالصہ اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ دنیا کی منفعت و مضرت تو ہر شخص کے پیش نظر ہے ہم کو اللہ و رسول نے ایک اور منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنے کے بعد واقع ہونے والی ہے۔

اب محل کے اعتبار سے منفعت و مضرت کی دو دو قسمیں اور نکلیں منفعت دنیویہ اور منفعت اخرویہ، مضرت دنیویہ مضرت اخرویہ

نعمائے[5] آخرت اور نعمائے دنیا اور مضرت آخرت اور مضرت دنیا کا باہمی تفاوت

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ چار قسمیں اخیر کی یعنی منفعت دنیویہ و آخرویہ مضرت دنیویہ و اخرویہ پہلی اقسام کی کس قسم میں داخل ہیں یعنی غور کرنا چاہیے کہ منفعت دنیویہ آیا منفعت باقیہ خالصہ ہے یا فانیہ غیر خالصہ۔ اسی طرح مضرت دنیویہ کو بھی دیکھنا چاہیے اور منفعت اخرویہ و مضرت اخرویہ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یعنی یہ کہ کون سی منفعت اور مضرت کس قسم میں داخل ہے۔ سو دیکھ لیجئے کہ دنیا کی منفعت تو فانیہ اور آخرۃ کی باقیہ ہے اور آخرت کی مضرت باقی رہنے والی ہے اور دنیا کی مضرت فنا ہونے والی ہے۔ اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ دنیا کی منفعت کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہو مگر خالص نہیں۔ مثلاً کھانا ہی لے لیجئے اول تو حاصل کس کلفت سے ہوتا ہے کہ اول زمین کو درست کیا جاتا ہے اس کے لئے بیل و آلات زراعت مہیا کرنے ہوتے ہیں اس کے بعد بوتے ہیں پانی دیتے ہیں حفاظت کرتے ہیں۔ کاٹتے ہیں گاہتے ہیں اڑاتے ہیں پیستے ہیں پکاتے ہیں اس قدر کلفتوں کے بعد جب اس سے عین انتفاع کا وقت ہوتا ہے کہ اس وقت بظاہر تمام کلفتیں ختم ہو جاتی ہیں

---

[1] ہمیشہ رہنے والا فائدہ دار اور خالص جسمیں ذرا بھی کلفت و نقصان نہ ہو۔ [2] فنا ہو جانے والا فائدہ جو کلفت و نقصان سے خالی نہ ہو [3] ہمیشہ رہنے والی تکلیف یا نقصان اور خالص جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔
[4] فنا ہو جانے والی تکلیف یا نقصان مگر کچھ فائدہ بھی ہو خالی نہ ہو۔ [5] آخرت کی نعمتیں۔

اور التذاذ[1] ہی کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت بھی اکثر اوقات کوئی نہ کوئی کلفت پیش آ جاتی ہے۔ کہ وہ کلفت التذاذ میں سدراہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً روٹی کا ٹکڑا گلے میں اٹک گیا۔ کھانا کھانے بیٹھے کسی عزیز کے مرنے کی خبر آ گئی یا اور فکر میں ڈالنے والی کوئی بات سن لی کہ سب کھانا پکا پکایا بے لطف ہو گیا یا یہ کہ وہ کھانا ہضم نہیں ہوا قبض ہو گیا۔ یا دست آنے لگے۔ سلاطین وامراء کے عیش سے زیادہ کسی کا عیش نہیں ہے لیکن ان کو سب سے زیادہ پریشانیاں ہیں اولاد کو دیکھ لیجئے کہ بڑی بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ انواع انواع کی تکالیف اٹھا کر ان کی پرورش کرتے ہیں پھر اکثر اولاد خلاف مزاج ہوتی ہے۔ والدین کو سینکڑوں طرح کی ان سے تکالیف پہنچتی ہیں غرض دنیا کی جس منفعت کو دیکھو گے خالص نظر نہ آوے گی اور اپنے مقصد کے موافق نہ ہو گی۔ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں ام للانسان ما تمنی فللہ الاخرۃ والاولیٰ کیا انسان کے لئے جو جو تمنا کرے وہ حاصل ہوتی ہے (یعنی نہیں) پس آخرت اور دنیا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ لیکن اس پر کوئی شبہ نہ کرے کہ للہ الآخرۃ والاولیٰ سے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی طرح آخرت بھی نہیں ہے پھر فرق کیا ہوا بلکہ نہ وہ قابل تحصیل ہوئی نہ یہ ہوئی تو جو اس تقریر سے تمہارا مقصود ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرۃ کی رغبت دلانا وہ حاصل نہ ہوا جواب یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ من کان یرید العاجلة عجلنا له' فیها ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا له' جهنم یصلاها مذموماً مدحوراً و من اراد الاٰخرة و سعیٰ لها سعیها وهو مومن فاولٰئک کان سعیهم مشکوراً یعنی جو شخص صرف دنیا طلب کرے تو دنیا میں جو ہم چاہیں گے جس کو چاہیں گے وہ دیں گے۔ پھر اس کے لئے ہم جہنم تجویز کریں گے۔ اس میں داخل ہو گا اس حالت میں کہ مذموم و مردود ہو گا۔ اور جو شخص آخرت چاہے گا اور اس کے لئے پوری سعی کرے اور وہ مومن بھی ہو۔ پس ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاوے گی۔ دیکھئے دنیا کی نسبت تو یہ فرمایا کہ ہم جس کو چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے دیں گے۔ اور آخرت کی نسبت فرمایا کہ جو اس کے لئے سعی کرے گا اس

---

[1] مزا حاصل کرنے کا

کی سعی کی قدر کی جائے گی یعنی اس کا بدلہ ملے گا۔ دونوں جگہ قضیۂ[1] شرطیہ ہے مگر دوسری جگہ کامیابی کا وعدہ ہے اور پہلی صورت میں نہیں ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ اختیار میں تو خدا ہی کے ہے دنیا بھی آخرت بھی مگر آخرت کی سعی پر آخرت دینے کا وعدہ ہے۔ اس لئے وہ قابل تحصیل ہوئی بخلاف دنیا کے بہرحال آیت **ام للانسان ما تمنیٰ** الخ سے جو شبہ ہوا تھا وہ مرتفع ہو گیا اب ہم لوگوں نے برعکس معاملہ اختیار کیا ہے کہ جس کا (یعنی دنیا) وعدہ نہیں ہے اور اس کو اپنی مشیت[2] پر رکھا ہے اس کی طلب میں تو منہمک ہیں اور نیز اس کے اسباب تحصیل (نوکری تجارت زراعت وغیرہا) کی نسبت تو ایسا معاملہ کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک مسبب[3] ان پر ضرور مرتب ہوگا اور جس کا وعدہ ہے (یعنی آخرت) اس کے اسباب (صلوٰۃ صوم حج زکوٰۃ وغیرہا من المامورات[4]) کی طرف مطلق التفات نہیں۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(دیکھو تو راستہ کا کہاں سے کہاں تک کا فرق ہے)

خلاصہ یہ کہ دنیا کی ہر منفعت کے اندر کدورت ہے۔ بخلاف آخرت کے منفعت کے کہ جس کو حق تعالیٰ اپنی رضامندی کے ساتھ جنت نصیب فرما دے۔ وہاں اس کو کوئی آزار نہیں۔ فرماتے ہیں **وفیھا ما تشتھیہ الانفس** یعنی تمہارے لئے جنت میں وہ شے ملے گی جس کو تمہارا جی چاہے گا دوسری جگہ فرماتے ہیں **لایمسنا فیھا نصب و لا یمسنا فیھا لغوب** یعنی ہم کو جنت میں نہ تعب لگے گا اور نہ اس میں تکان ہوگا۔

اہل جنت میں باوجود تفاوت درجات حسد نہ ہوگا

اگر کوئی کہے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک کے پاس دنیا کا سامان مال اولاد و مکان گھوڑے جوڑے وغیرہ بہت ہوتا ہے تو دوسرا دیکھ کر اس کو حسد کرتا ہے اور حسد کی آگ سے جلتا ہے تو یہ مسلمہ ہے کہ جنت میں سب نعمتیں ہوں گی لیکن اختلاف درجات کی وجہ سے شاید آپس میں حسد ہو تو یہ بھی ایک قسم کی تکلیف اور کدورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں پر

---

[1] شرط و جزا والا جملہ [2] ارادہ [3] یعنی جن کے یہ سبب و ذریعے ہیں وہ باتیں ان سے ضرور ہی حاصل ہو جائیں گی۔ [4] اور حکم کی ہوئی چیزیں

حسد نہ ہوگا۔ ہر شخص اپنے حال اور نعمتوں میں بے حد خوش ہوگا اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھے گا۔ یا نہیں اگر افضل جانے گا تو حسد ہوگا اور اگر نہ جانے گا تو جہل لازم آئے گا جواب یہ ہے کہ ہم اس شق کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ افضل کو اپنے سے افضل جانے گا لیکن وہ ان کے درجات کی تمنا نہ کرے گا۔ اس لئے کہ اپنی استعداد اس کو معلوم ہوگی اور اپنے اعمال اس کو پیش نظر ہوں گے اور تفاوت درجات وہاں تفاوت[1] اعمال سے ہوں گے اس لئے اس کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ درجہ مجھ کو نہیں مل سکتا۔ اس لئے وہ اسی میں خوش ہوگا نہ کسی پر اس کو حسد ہوگا اور نہ زیادہ کا متمنی ہوگا۔ دوسرا جواب اس سے باریک ہے وہ یہ کہ وہاں سب عبد کامل ہوں گے تمام مقامات باطنی حاصل ہوں گے اور مقامات میں سے رضا بھی ہے۔ اس لئے مقام رضا بھی اس کو حاصل ہوگا اور وہ اس میں اس قدر خوش ہوگا کہ درجات فاضلہ کی اس کے قلب میں تمنا نہ ہوگی۔ جیسا کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض طبائع میں قناعت کا مضمون ایسا راسخ ہے کہ ان کے قلب میں ترقی دنیا نہ ہونا کیا معنی بلکہ اس سے نفرت ہے ایک پولیس کے اہلکار دیکھے گئے کہ ان کے افسر کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ترقی کریں مگر وہ منظور نہیں کرتے۔ اور ان کے ہم چشم ان کو ہنستے ہیں۔ بات یہ ہے کہ طبائع کا مذاق مختلف ہے جبکہ دنیا میں اس کا نمونہ موجود ہے۔ آخرت میں تو کیا بعید ہے۔ ہاں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جنتی آپس میں ملیں گے اور ایک جنتی دوسرے کو دیکھ کر تمنا کرے گا کہ جیسا لباس اس کا ہے ایسا ہی میرا بھی ہو چنانچہ فوراً اسی طرح کا اس کا لباس ہو جائے گا اس سے معلوم ہوا کہ تمنا کرے گا جواب یہ ہے کہ یہ تمنا صرف لباس کے بارے میں آئی ہے درجہ کے بارہ میں نہیں ہے اور لباس کے اندر مساواۃ ہونے سے درجہ کی مساواۃ یا فضیلت لازم نہیں۔ کما ہو[2] الظاہر جدا پس جس میں فرق رہنا ضروری ہے یعنی درجہ اس کی تو تمنا نہ ہوگی اور جس کی تمنا ہوگی یعنی لباس اس میں فرق ہونا ضروری نہیں پس حسد کی کوئی گنجائش نہیں۔

---

[1] اور چونکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسرے کو جو کچھ ملا ہے وہ بھی اس کے عملوں کی بدولت ہی ہے تو اگر یہ خیال آ سکے گا تو اپنی کم عملی پر حسرت ہوگی نہ کہ دوسرے پر حسد [2] جیسے کہ یہ خوب ظاہر ہے۔

عود بجانب سرخی سابق یعنی نعمائے آخرت اور نعمائے دنیا اور مضرت آخرت اور مضرت دنیا کا باہمی تفاوت

حاصل یہ کہ جنت کی نعمتیں سب خالص ہوں گی کدورت کا ان میں نام ونشان نہ ہوگا۔ بخلاف نعمائے دنیا کے کہ ان سب میں کچھ نہ کچھ کدورت ضرور ہی ہوتی ہے اب مضرت دنیوی کو دیکھئے کہ مضرت دنیویہ خواہ کیسی ہی اشد ہو لیکن فنا ہونے والی ہے اگر کسی کو کوئی بیماری ہے اول تو دنیا ہی میں صحت ہو جاتی ہے ورنہ مر کر تمام مصائب کا خاتمہ ہو ہی جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی افلاس میں یا کسی اور طرح کے رنج وغم وفکر میں مبتلا ہوتا ہے سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتے ہیں معلوم ہوا کہ مضرت دنیا کو بقا نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ مضرت دنیا خالص مضرت نہیں بلکہ تامل سے دیکھا جاوے تو اس میں سینکڑوں منفعتیں دنیا اور دین کی ہوتی ہیں۔ دنیا کی منفعت تو یہ کہ مثلاً ایک شخص کسی بیماری میں مبتلا رہتا ہے تو اگر یہ تندرست رہتا تو خدا جانے کیا کیا فساد کرتا اس کے سبب سے یہ بے آبرو ہوتا۔ جیل خانہ جاتا اور ظاہر ہے کہ عاقل کے لئے آبرو جان سے زیادہ عزیز ہے اور دین کی منفعت تو بہت ہی ظاہر ہے کہ بیماری ذنوب[۱] کو محو کرتی ہے اور بہت سے منہیات[۲] سے روکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کی مضرت فنا ہونے والی بھی ہے اور من کل الوجوہ[۳] مضرت نہیں ہے بخلاف مضرت اخرویہ کے کہ وہ مضرت ہی مضرت ہے۔ تمام مضرتیں وہاں علی وجہ الکمال[۴] موجود ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ منفعت دنیویہ فانی بھی ہے قلیل بھی ہے اور مشوب[۵] بہ کلفت ہے۔

اور اخروی منفعت باقی بھی ہے کثیر بھی ہے اور خالص بھی ہے۔ اسی طرح مضرت دنیا فانی ہے اور غیر خالص اور اخروی مضرت باقی بھی ہے اور خالص[۶] ہے۔

---

[۱] گناہوں کا کفارہ بن کر ان کو مٹا دیتی ہے [۲] ممنوع باتوں سے [۳] ہر طریقہ سے [۴] پورے طریق پر [۵] کلفت کے ساتھ ملی جلی [۶] بلکہ دنیا کی ہلکی اور وہ بے انتہا شدید بھی تو دنیا کا ہر فائدہ تینوں صفتوں میں کم اور بیحد کم اور آخرت کا تینوں صفتوں میں بہت بڑا ہوا ہے۔ اسی لئے وہی مقصود ہونا عقل کا کام اور دنیا کی ہر تکلیف و نقصان تین وجہ سے ہلکی اور آخرت کی تینوں وجہ سے بہت سخت اس لئے اس سے بچاؤ کی فکر ہی عقل کا کام ہو سکتا ہے۔

آخرت ہی کی منفعت قابل تحصیل اور آخرت ہی کی مضرت قابل اجتناب ہے اور دنیا کی نہ منفعت قابل تحصیل ہے نہ اس کی مضرت قابل اجتناب

اب روز روشن کی طرح فیصلہ ہوگیا آپ خود موازنہ کر سکتے ہیں کہ حاصل کرنے کے قابل کونسی منفعت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان (جو کہ اللہ و رسول کو سچا جانتا ہے۔) اس سوال کا یہی جواب دے گا کہ منفعت اخرویہ تحصیل کے قابل ہے اسی طرح دنیا اور آخرت کی مضرتوں میں موازنہ کر لیجئے کہ کون مضرت زیادہ بچنے کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی مضرت آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں اصلاً[1] قابل التفات نہیں۔ زیادہ اہتمام کے قابل آخرت کی مضرت ہے اس کے بعد یہ سمجھئے کہ آخرت کی منفعت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور آخرت کے ضرر سے کس طریق سے بچ سکتے ہیں۔

آخرت کی منفعت حاصل ہونے اور آخرت کی مضرت سے بچنے کا طریقہ

تو سمجھ لیجئے کہ آخرت کی منفعت جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمال صالحہ ہیں اور آخرۃ کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بداعمالیوں سے بچنا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں ان سے توبہ کی جاوے خلاصہ یہ کہ مقصود دو شے ہیں اصلاح اعمال محوذنوب اور محوذنوب کے معنے یہ ہیں کہ گذشتہ سے توبہ کی جاوے اور آئندہ سے بچنے کا عزم کیا جاوے۔

اعمال صالحہ لوگوں پر بہت گراں ہیں بالخصوص حج اور اس کے متعلق بعض اعتراض اور ان کے جواب

لیکن اعمال صالحہ کی تحصیل اور گناہ سے بچنا اول تو اکثر لوگوں پر ہمیشہ ہی سے گراں اور

---

[1] بالکل بھی یعنی گو بچنے کی چیز تو ہے مگر آخرت کے نقصان کے مقابل مثل نہ ہونے کے ہے۔ سو روپیہ دیکر کوئی پھانسی سے بچتا ہو تو یہ دنیا راحت ہے نہ کہ کلفت۔

ثقیل[۱] ہے۔ پھر خصوصاً اس زمانہ میں تو اعمال صالحہ لوگوں پر بہت ہی بھاری ہیں چنانچہ بڑے ضروری اعمال صلوۃ صوم، حج، زکوۃ ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ سب کے اندر بیحد سستی کی جاتی ہے بلکہ مصیبت سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ نماز نے ترقی کو روک دیا ہے کیونکہ یہ سن کر مسلمان ہو کر پانچ وقت نماز پڑھنی پڑے گی۔ اسلام سے بعضے آدمی رک جاتے ہیں۔ اس لئے اس کو اسلام سے خارج کر دیا جائے نعوذ باللہ ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ جس اسلام میں نماز نہیں وہ اسلام کیا ہوا۔ اس بیہودہ رائے سے معلوم ہوا کہ ان عقل پرستوں پر نماز بہت ہی بھاری ہے۔

حکایت: ہمارے مدرسہ دیوبند میں ایک طالب علم نو وارد آئے تھے۔ منطقیوں کی صحبت میں بہت رہے۔ دین کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ نماز کی پابندی نہ تھی اور یہاں دیوبند میں نماز کا بڑا اہتمام ہے۔ پانچ وقت سب طلبہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو جب نماز کا وقت آتا ان کو بھی زبردستی لے جاتے ایک روز کہنے لگے کہ حضور معراج میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں پھر کم ہوتے ہوتے پانچ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں پوری پچاس کی پچاس ہی باقی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ نماز ان کو سخت مصیبت معلوم ہوتی تھی۔ حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں انها لكبيرة الا على الخاشعين یعنی بے شک نماز بہت بھاری ہے۔ مگر ان لوگوں پر جو خشوع کرنے والے ہیں۔ اسی واسطے میں تو نمازی کو ولی سمجھتا ہوں۔ حق تعالیٰ کا فضل ہی ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا روزہ کو بہت ثقیل سمجھتے ہیں کانپور میں ایک شخص تھے انہوں نے کبھی روزہ ہی نہیں رکھا میں نے ان سے کہا تو کہنے لگے کہ میں کسی طرح متحمل ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ امتحان کے لئے ایک تو رکھو چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا تب معلوم ہوا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا کہ میں متحمل[۲] ہی نہیں۔

بعضے لوگ حج کا نام سن کر وہاں کی بہت مذمت کرتے ہیں کہ وہاں بدو مار ڈالتے ہیں

---

[۱] بھاری اور یہ صرف اسی وقت تک ہے جب تک کرتے نہیں بچہ پر چلنا بڑھنا لکھنا بہت بھاری ہوتا ہے مگر خوب کرتے کرتے بہت ہلکا اور مزیدار بن جاتا ہے۔ [۲] برداشت کر سکنے والا

لوٹ لیتے ہیں اور بعضے تو گئے بھی نہیں مگر اوروں سے سن سن کر وہ بھی مذمت کیا کرتے ہیں۔ یہ سب کم ہمتی کی باتیں ہیں۔ میں[1] ان کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ایسے واقعات نہیں ہوتے بلکہ اگر وہاں کے مجمع پر نظر کی جائے تو حق تو یہ ہے کہ جس قدر واقعات ہونا چاہیے ان سے بہت کم ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر اس کا عشر عشیر[2] بھی مجمع ہو جائے تو بہتیرے واقعات ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بغیر مجمع کے بھی راستوں میں واقعات ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے جیسا بعض کہتے ہیں کہ بدوؤں کو لوٹ مار حلال ہے اس لئے کہ وہ دائی حلیمہ سعدیہ[3] کی اولاد ہیں یہ تو بالکل لغو ہے وہ اگر ایسا کرتے ہیں زیادہ گنہگار ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ تم اس کو یاد رکھو کہ حج کا سفر سفر عشق ہے راہ عشق میں تو سب کچھ پیش آتا ہے بلکہ پیش نہ آنا عجیب ہے۔ دنیا کے محبوب سے ملنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں آتی ہیں مگر سب گوارا کرتے ہیں۔

نسازد عشق را کنج سلامت   خوشا رسوائی کوئی ملامت

(عشق کے واسطے سلامتی کا کونہ مناسب نہیں ہوتا۔ ملامت کے کوچہ کی رسوائی ہی کیسی اچھی چیز ہے)

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہو سکتا ہے اس کے واسطے تو گیند کی طرح لڑھکنا ہی بہتر ہے)

حکایت:۔ ایک بزرگ ایسے باہمت تھے کہ انہوں نے ۳۲ حج کئے تھے ایک شخص مولوی منظور احمد صاحب بنگالی تھے۔ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے مگر ہر سال حج کیا کرتے تھے اور حج کر کے مدینہ طیبہ لوٹ جاتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھ کر ایک بار یہ شعر پڑھا۔

زہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول   گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

(شاباش ہے اس بندہ کی نیک بختی پر جو کبھی خدا کے گھر پہنچے کبھی رسولؐ کے گھر)

اور بعضے ایسے بھی ہیں کہ قریب بیت اللہ شریف کے رہتے ہیں اور ان کو اب تک بھی حاضری نصیب نہیں ہوئی ایک صاحب فرماتے تھے کہ ایک بدوی بیس پچیس برس سے مکہ

---

[1] اور آج کل تو سب سے زیادہ امن وہیں ہے۔ [2] دسواں حصہ [3] ایسے بزرگ خاندان کے لوگوں کے واسطے تو بعض وہ چیزیں بھی حلال نہیں رہتیں جو دوسروں کے لئے حلال ہوتی ہیں بلکہ ان کو گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔

معظمہ آتا تھا اس نے ایک دن پوچھا کہ یہ لوگ اطراف و جوانب سے اس کثرت سے یہاں کیوں آتے ہیں۔ اللہ اکبر اس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں کیوں آتے ہیں۔

علی ہذا زکوٰۃ میں گرانی ہوتی ہے چالیس ہزار میں سے جب ایک ہزار روپیہ نکلتا ہے تو گراں گزرتا ہے حالانکہ چالیسواں حصہ بہت ہی کم ہے۔ امم[1] سابقہ پر چوتھائی حصہ مال کا فرض تھا۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ چالیسواں حصہ ہی فرض کیا گیا یہ بھی لوگوں پر بھاری ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جس قدر احکام شرعیہ ہیں سب کے اندر لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جو احکام کرنے کے ہیں ان میں گرانی ہو تو زیادہ تعجب نہیں ہے۔ جن امور سے منع کیا گیا ہے ان میں بھی گرانی ہوتی ہے حالانکہ ترک فعل[2] سے اسہل ہے فعل میں تو ایک کام کا کرنا ہوتا ہے اور ترک میں کیا مشقت ہے بلکہ سہولت ہونا چاہیے دیکھئے ایک ادنیٰ سی شے غیبت ہے کہ بجز مضرت کے اس میں اور کچھ نہیں اور گناہوں میں تو کچھ حظ و نفع دنیوی بھی مرتکب[3] کے زعم میں ہوتا ہے اور اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن ہم لوگوں سے یہ نہیں چھوٹتی غرض کہ احکام شرعیہ خواہ متعلق فعل کے ہوں یا ترک کے سب میں لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جب ایک ایک فعل اور ایک ایک ترک بھی گراں ہے تو جبکہ پچاس عمل کرنے کے ہوں اور پچاس نہ کرنے کے جیسے احکام کی اب موجودہ حالت ہے تو سو مشقتیں ہوئیں سن کر جی گھبرا جاوے گا کہ میاں یہ تو بڑی مصیبت آپڑی کہ یہ کام کرو وہ نہ کرو۔ سخت الجھن اور دشواری ہے۔ کوئی میاں فلسفی بتلائے تو سہی کہ یہ معما کس طرح حل ہو اور یہ دشوار کس طرح سہل ہو۔ اگر تمام فلاسفہ قدیم و جدید جمع ہو کر سوچیں تو ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہیں نکال سکتے جس سے یہ پیچیدگی اور گل جھڑی کھلے اور اگر کوئی سوچ بچار کر کوئی طریقہ نکالے بھی تو وہ سہل نہ ہوگا۔

زبان کی درستی اور خدا تعالیٰ کے خوف پیدا کر لینے سے پھر کوئی گرانی اعمال صالحہ میں نہیں رہتی

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور اس الجھن کو دفع کرنے کے لئے

---

[1] پہلی امتوں پر [2] ایک چیز کا چھوڑ دینا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ [3] کرنے والے کے گمان میں نہ کہ واقع میں۔

ایک طریقہ نہایت مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے۔ یآیھاالذین امنوا اتقوا اللہ و قولوا قولاً سدیداً یصلح لکم اعمالکم و یغفرلکم ذنوبکم و من یطع اللہ و رسولہ فقد فازا فوزاً عظیما (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے عمل نیک بنا دینگے اور تمہارے گناہ بخش دینگے اور جو بھی اللہ رسول کی فرمانبرداری کر لیتا ہے وہ بڑی ہی کامیابی سے کامیاب ہو جاتا ہے) اس آیت کریمہ میں اسی طریقہ کا بیان ہے یہ حاصل ہے اس تقریر کا اجمالاً اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ دو شے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور محو ذنوب اور ان میں بھی گرانی کی اس سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرمائے ہیں کہ ان کو اختیار کر لو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جاویں گی۔ ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قولو قولاً سدیدا ہے یعنی اللہ سے ڈرو اور بات ٹھیک کہو۔ اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں۔ یصلح لکم اعمالکم و یغفرلکم ذنوبکم یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرما دیں گے اور تمہارے گناہ بخش دیں گے۔ اور ان ہی میں تم کو گرانی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقویٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے۔ خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کر لو باقی سب کام ہم کر دیں گے۔ قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلائی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ہے۔ ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کر لو جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ پچاس گاڑیاں ہیں ان کو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہو کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے۔ پھر اس کو ایک طریق بتلایا جاوے کہ اسی میں انجن[1] لگا دو۔ سب گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گی۔ واللہ ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم کوئی فلسفی کوئی عاقل مثل نہیں لا سکتا اور کیوں نہ ہو یہ ایک مطب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان کے رگ و پٹھوں کے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس لئے اس کی حالت کو دیکھ کر علاج تجویز کیا ہے۔

---

[1] دل انجن ہے جس سے سب اعضا جڑے ہوئے ہیں خدا کا خوف اس کی اسٹیم ہے وہ آنافانا میں کھینچ لے جائیگا۔

زبان کی درستی اور خدا تعالیٰ کے خوف کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں کیا دخل ہے

اب دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں چیزوں کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں دخل ہے یا نہیں تو بعد تامل یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے افعال کی ترتیب یوں ہے کہ اول قلب سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے گویا انجن قلب ہے تو اگر قلب درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ دنیا کا سارا جہاز اور تمام بکھیڑے سب کے سب قلب ہی کے خیال پر چل رہے ہیں۔ یہ پہاڑ کی برابر عمارتیں یہ ہرے بھرے باغ یہ طرح طرح کے سامان سب کا انجن خیال ہی ہے۔ اسی واسطے تو حدیث[۱] میں آیا ہے کہ ان فی الجسد مضغة اذا صلح صلح الجسد کله و اذا فسد فسد الجسد کله یعنی آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے اور یہ مسئلہ طبی قاعدہ سے بھی درست ہے۔ اس لئے کہ امراض قلب تمام امراض میں بہت سخت ہیں۔ اگر قلب صحیح اور قوی ہے تو اور امراض کو طبیعت خود دفع کر دیتی ہے اور اگر قلب میں ضعف اور مرض ہو تو اور جسد کتنا ہی قوی ہو سب بیکار ہے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قلب کی درستی سے تمام اعمال کی درستی ہوتی ہے تو قلب کی درستی کس شے سے ہو؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ قلب کے بھی بہت سے اعمال ہیں تو اگر حق تعالیٰ تمام افعال کا حکم فرما دیتے یا اجمالاً یہ فرما دیتے کہ اپنے قلب کو درست کرو تو اس صورت میں بھی نفس ایک مشقت ہوتی کہ قلب کو کس طرح درست کریں کیا رحمت ہے کہ قلب کے تمام افعال میں صرف ایک مختصر سی بات فرمائی کہ صرف ہمارا خوف اختیار کر لو باقی سب ہم درست کر دیں گے۔ اور وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکم کا اگر ڈر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کی مخالفت پر جرأت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا خوف کسی کے دل پر بیٹھ جائے تو اس سے گناہ نہ ہوں گے اور اعمال کی اصلاح ہو

---

[۱] بخاری

جاوے گی اور گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کے لئے عزم ترک بھی کرے گا۔ یہ محوِ ذنوب ہوا۔ پس معلوم ہو گیا کہ تقویٰ کو اصلاح اعمال اور محوِ ذنوب میں پورا دخل ہے اور تقویٰ اصلاح اعمال کے لئے بمنزلہ علت[1] تامہ کے ہے۔

خوف سے روکنے والی چیزوں کا بیان اور خدا تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا مطلب

اب اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ ہر شے کے لئے کچھ موانع ہوتے ہیں اور کچھ ذرائع اس کی تحصیل کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح خوف کے لئے موانع کو بیان کیا جاتا ہے اور طریقہ تحصیل آخر میں بیان کیا جاوے گا تو سمجھنا چاہیے کہ خوف سے روکنے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ اول تو عدم ایمان دوسرے تسویل[2] شیطانی۔ عدم ایمان تو ظاہر ہے کہ بفضلہ تعالیٰ یہاں نہیں ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تو کچھ کلام کرنا ضروری نہیں البتہ تسویل شیطانی میں ابتلائے عام ہو رہا ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان نے سب کو یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ میاں جو کچھ کرنا ہے کر لو اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔ اخیر میں توبہ کر لیں گے سب بخش دیں گے چنانچہ ارشاد بھی ہے۔ قل[3] یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ الیٰ انہ[4] ھو الغفور الرحیم تو سن لیجئے کہ حق تعالیٰ بے شک غفور رحیم ہے لیکن غفور رحیم کے وہ معنی نہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ غفور رحیم کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ نافرمانیاں کر چکے ہیں اور نادم ہیں لیکن ان کو یہ تردد ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے تو خیر یہ تدبیر ہے کہ گناہ نہ کریں۔ لیکن گذشتہ کرتوت کی اصلاح کیسے ہو تو ان کے لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گذشتہ گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ چنانچہ شان نزول میں اسی خیال کے جواب میں نازل ہونا اس آیت کا مصر[5]حاً مذکور ہے۔ پس یہ آیت گناہان ماضی کے لئے ہے نہ یہ کہ آئندہ کے لئے بھی گناہ کی اجازت دے رہے ہیں اب لوگ مستقبل کے لئے بھی اسی آیت کو اپنا متمسک[6] بناتے ہیں۔ یہ سراسر غلطی ہے۔

---

[1] وہ علت جس سے کام ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ [2] دھوکہ بازی [3] آپ کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی ذاتوں پر زیادتی کر لی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو جاؤ اس جملہ تک بے شک وہ تو بہت بخشنے والے بڑے مہربان ہیں۔ [4] یہاں تک [5] صفائی سے [6] دلیل

توبہ اور گناہوں کی مثال

یاد رکھو کہ توبہ کی مثال مرہم کی سی ہے اور گناہ کی مثال آگ کی سی ہے۔ مرہم تو اس لئے ہے کہ اتفاق سے اگر جل جاوے تو مرہم لگا دیا جاوے۔ اس لئے نہیں ہے کہ اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس مرہم ہے۔ آگ میں جھلسا کریں۔ جس شخص کے پاس نمک سلیمانی ہو اس کو یہ کب روا ہے کہ جان جان کر بہت سا کھایا کرے۔ نمک سلیمانی تو اس واسطے ہے کہ اگر اتفاق سے بہت کھا جاوے تو نمک سلیمانی کھالیا جاوے اس سے ہضم ہو جاوے گا اور جو ایسا کرے گا تو ایک روز جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اسی طرح جو شخص توبہ کے اعتماد پر گناہ کرتا رہے گا ایک دن عجب نہیں وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غرضیکہ توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا بہت حماقت ہے[1]

بہ نسبت اور اعضاء کے زبان کی درستی زیادہ ضروری ہے اور اس کی درستی سے تمام اعضاء کی درستی ہو جاتی ہے

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ طریقہ اصلاح اعمال ومحو ذنوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرلو۔ تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جاویں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً[2] طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے پس بجائے اتقوا اللہ و قولوا قولاً سدیداً (اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہو) کے یوں فرماتے یایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ یسدلکم لسانکم و یصلح لکم الخ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو وہ تمہاری زبان ٹھیک کر دیں گے اور تمہارے عمل نیک بنا دیں گے اور گناہ بخش دیں گے) یوں نہیں فرمایا بلکہ وقولوا قولاً سدیداً کا اتقوا اللہ۔ پر عطف[3] کیا۔ اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت

---

[1] خصوصاً جبکہ موت کا وقت معلوم نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ موت آنے کے وقت اتنی مہلت مل سکے گی یا نہیں جس میں توبہ کرلی جائے اگر ہارٹ فیل فالج یا ایکسیڈنٹ جیسی اچانک بات ہوگئی تو کیا ہوگا اور جیسے غفور رحیم حق تعالیٰ کی صفتیں ہیں جبار و قہار منتقم بھی صفتیں ہیں اگر ان میں سے کسی کا ظہور ہو گیا تو کیا ہوگا اس لئے ہر وقت توبہ ضروری ہے۔
[2] الگ مستقل طور سے [3] جیسے ڈر کو مستقل طریقہ فرمایا ٹھیک بات کو بھی مستقل قرار دیا۔

سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہا سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اوران دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔ایک یہ کہ سوائے لسان کے اورسب جوارح عمل کرنے سے تھک جاتے ہیں۔ پاؤں تھک جاتے ہیں کثرت سے چلنے سے ہاتھ تھک جاتا ہے ان اعمال سے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کروتو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ کثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے سے نفرت ہو جاوے لیکن زبان کو فی نفسہ[1] کوئی تکان نہ ہوگا۔اس سے معلوم ہوا کہ لسانی[2] اعمال سب جوارح کے اعمال سے عدد میں زیادہ ہوں گے۔پس گناہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے ایک تو یہ تفاوت ہوا دوسرے یہ کہ زبان مثل برزخ کے ہے۔درمیان قلب و جوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی۔اور مشابہت خلقی بھی ہے اور باطنی بھی۔خلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی و مستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان ستو من[3] وجہ و مکشوف من وجہ ہے۔چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صائم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں اس کے مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نگلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں مستور ہونے کے اعتبار کیا گویا جوف سے جوف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلی کرنا فرض ہوا یہ مشکوف ہونے کا اعتبار[4] فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جائے اس کے ہاتھ سے ظلم نہ ہوگا۔نہ زیادتی ہوگی نہ کسی سے لڑائی ہوگی نہ تکرار ہوگا اس لئے کہ زبان چلانے ہی سے نوبت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے ان سب سے حدیث کی بھی تنویر[5] ہوگئی۔**اذا اصبح ابن اٰدم فان الاعضاء کلھا تکفر اللسان فتقول اتق اللہ فینا فانا نحن بک فان استقمت استقمنا و ان اعوججت اعوججنا** یعنی جس وقت ابن آدم

---

[1] خود [2] زبان کے کام سب اعضائے ظاہری سے تعداد میں زیادہ ہوں گے۔ [3] ایک طرح
[4] اور وضو میں فرض نہیں فرمایا تو مستور ہونے کا اعتبار فرمایا۔ [5] وضاحت

صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہوگی تو ہم سب راست رہیں گے اور اگر تو کج ہوگی تو ہم سب کج ہو جاویں گے۔ تیسرا تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معبّر[1] ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے پوری حالت قلب کی معلوم ہو جاتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہوگا کہ یہ شخص کیسا ہے۔ زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے۔ قانع ہے یا حریص عاقل ہے یا احمق دشمن ہے یا دوست خیر خواہ ہے یا بدخواہ بخلاف ہاتھ پاؤں کے سب میں شبہ ہوسکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہوسکتا ہے۔ مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ قاتل دشمن ہی تھا ممکن ہے دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرے بھائی کی آنکھ میں ایک چھرہ لگا اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت سے ہوتی ہے کبھی تادیب[2] کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق معین کرنے کے لئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نائب ہے قلب کی چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت محبت عداوت کا ہوگا وہ بدولت زبان کے ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے۔ بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے بتلایا ہے اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن شریف کسی نے ہمیں پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں۔ روزہ کی فرضیت اور اس کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا تمام اعمال صالحہ کو ان کے بتلانے سکھلانے والوں نے بلا تعلق تو بتلایا نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کی گئی تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں دخل ہوا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اس لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں جبکہ دیگر جوارح

---

[1] حالت بیان کرنے والی [2] ادب وتہذیب سکھانا

اور لسان میں اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہوا اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس کو مستقل جزو طریقہ اصلاح کا بنا دیا۔ اگر چہ تقویٰ سے جو درستی ہوگی درستی لسان بھی اس کا فرد عظیم ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گذشتہ گناہ محو ہو جائیں گے۔

اصلاح اعمال میں ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہیے

اور یصلح[1] کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کام عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہیے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ناز مت کرو جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں اور خیر اگر ہمارے اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے کہ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے یصلح کا یعنی یہ کہ جیسے چاہیے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور اس نسبت میں ایک اور لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال تو تم نے کر لئے لیکن ہم اس کی اصلاح کر کے فرشتوں کے معرفت پیش کرا دیں گے جیسے بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شے اٹھالاؤ اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا دیتے ہیں اور اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور اس پر انعام دیتے ہیں ایسے ہی ہمارا نماز روزہ ہے کہ خود توفیق دیتے ہیں خود رکھواتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شے جو اتقوا اللہ الخ (اللہ سے ڈرو) پر مرتب فرمائی وہ **یغفر لکم ذنوبکم** (تمہارے گناہ بخش دیں گے) ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے **یغفر لکم ذنوبکم** کے **یحببکم ذنوبکم** فرماتے یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے۔ یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو **یصلح لکم** میں آ چکا ہے[2] ذنوب[3] ماضیہ باقی تھے۔ ان کی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالیٰ محو فرما دیں گے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ تمہارے عمل نیک و درست کر دیں گے۔ [2] کیونکہ جب نیک نیک عملوں کی توفیق دیں گے آگے گناہ نہ ہوں گے ان سے بھی بچاؤ ہو گیا۔ [3] پہلے کے گناہ

تحصیل خوف کا نہایت عمدہ طریقہ

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک گر ہے۔ اور وہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے۔ **ولتنظر نفس ما قدمت لغد** (اور ہر جان اس پر غور کرے کہ اس نے کل کے لئے کیا عمل آگے کئے ہیں) یعنی فکر آخرت کیا کرو اور فکر آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر لو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلا ناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاد[1] کیا ہے اور مر کر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے۔ مرنے سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو کہ ایک دن وہ آئے گا کہ میرا اس دار فانی سے کوچ ہوگا۔ سب سامان مال و اسباب باغ و نوکر چاکر اولاد بیٹا بیٹی ماں باپ بھائی خویش اقارب دوست دشمن یہیں رہ جاویں گے۔ میں تن تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جا لیٹوں گا اور وہاں دو فرشتے آویں گے اگر میرے دن بھلے ہیں تو اچھی صورت میں ورنہ خدانخواستہ ڈراؤنی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے آ کر سوالات کریں گے۔ پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہ ہوگا۔ تیرے اعمال ہی وہاں کام آویں گے۔ اگر سوالات کے جواب درست ہوں گے تو سبحان اللہ جنت کی طرف کھڑکی کھل جائے گی اور اگر خدانخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر **حفرۃ من النار** (دوزخ کا ایک گڑھا) ہوگی۔ اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا جاوے گا اور نامہ اعمال اڑائے جاویں گے۔ حساب کتاب کے لئے پیش کیا جاوے گا۔ پل صراط پر چلنا ہوگا اے نفس تو کس دھوکے میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے۔ اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے۔ پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اے نفس تو ہی اپنا غم خوار بن اگر تو اپنی غم خواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا۔ اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ چند

---

[1] لوٹنے کی جگہ آخرت

ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہو گیا۔ اور خوف پیدا ہونے کے بعد آپ کو ماضی سے توبہ کی فکر ہو گی اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہو گی۔ اس وقت آپ کو مشاہدہ ہو گا اتقوا اللہ پر کیسے اصلاح اعمال ومحوذنوب مرتب ہو گئے۔

اطاعت کاملہ کا محبت پر موقوف ہونا اور محبت کے پیدا کرنیکا طریقہ

و من یطع اللہ و رسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً یعنی جو شخص اللہ ورسول کی اطاعت کرے وہ بڑی کامیابی کو پہنچا۔ یطع میں اشارہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کہنا مانے اس کے لئے یہ طوع[1] سے مشتق ہے اور خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت اللہ ورسول کے نہیں ہوتا اور اللہ کی محبت حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہے۔ اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر کے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں۔ چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہو گا کہ ہم سر تا سر عنایت اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہو گی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ یطع[2] کا تعلق آپ سے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور نے جو ہمارے لئے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی امت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو۔

جب محبت پیدا ہو گی اطاعت خوشی سے ہو گی ادھر محبت ہو گی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہو گا۔ یہ دونوں شے آپ کے دین دنیا دونوں درست کر دیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے۔

عالم غیب[3] کی وسعت اور اس کے کشف سے اس کا اشتیاق اور عدم کشف کا موجب نقصان نہ ہوگا

عالم غیب میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم اس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا

---

[1] جس کے معنے خوش خوش کہنا ماننے کے ہیں اور ناخوشی سے ماننا کرہا کہلاتا ہے۔ [2] اطاعت کرنے کا تعلق حضور سے بھی ہے آیت میں ان کی فرمانبرداری کو بھی فرمایا ہے اس کو بھی خوشی خوشی ہی کرنا ہے اس کا ذریعہ بھی محبت ہے اور محبت پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ [3] وہ جہان جو اس دنیا کے بعد ہے اور اس وقت نظروں سے غائب ہے آخرت کا جہان

ہوا ایک قطرہ سمندر سے نسبت رکھتا ہے۔ یعنی یہ عالم دنیا کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے۔ اور وہ اس اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔ اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت[1] ہے جو کہ رحم مادر اور عالم دنیا میں ہے۔ بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کے لئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے کہ اگر شاید وہاں سے اس کی رائے لے کر عالم دنیا میں لایا جائے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور مچل جاوے لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لیا جاوے جیسا کہ اسی طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق چہل پہل یہاں کی آبادی اور معمورہ دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل ہیچ اور عدم معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں جنہوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں جب ان سے اس عالم کو چھوڑ دینے اور دوسرے عالم میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں۔ ان کا دل مضطرب ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی گوارا نہیں کر[2]تے۔ ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عیناً[3] یا ذوقاً علم مکاشفہ دیا ہے اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزومند رہتے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ[4] زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں اس واسطے کہ ان کی فضیلت یا تو اشتیاق کی وجہ سے ہوسکتی ہے یا کشف کی وجہ سے۔ سو اشتیاق کی وجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ جب عالم غیب اور اس کے نعم[5] و لذائذ کو دیکھ چکے ہیں پھر اس کی رغبت کرنا اس کا مشتاق ہونا کیا کمال کی بات ہے خوشنما باغیچہ کہ جو شخص دیکھے گا سیر کا متمنی ہوگا اور کشف کی وجہ سے اس لئے صاحب فضیلت ہیں کہ کشف دلیل بزرگی کی نہیں۔ اس کی بناء محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت

---

[1] یعنی قریب قریب کی نسبت یہ ہے بلکہ حقیقت میں یہ بھی نسبت نہیں دونوں نسبتوں قطرہ و سمندر اور رحم و جہان میں یہ بات ہے جہان و سمندر کے سامنے رحم یا قطرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ [2] مگر وہاں پہنچ جائیں گے تو جیسے جہان میں رہ کر رحم میں رہنے کا خیال تک نہیں آتا وہاں جا کر اس جہان کا یہی عالم ہوگا کہ خیال کے قابل بھی نہ رہے گا۔ [3] کشفی آنکھ سے یا دل کے ادراک سے [4] بے کشف والوں کے مقابلہ پر کشف والے۔ [5] نعمتیں اور لذتیں

پر ہے اکثر ہوؤں[1] کو بھی ہونے لگتا ہے۔اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہوگا۔البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق[2] ان کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں۔

کشف نہ ہونیکی صورت میں عمل کا زیادہ موجب کمال ہونا

اور کشف کی حقیقت (یعنی تحقیق) معلوم ہو جانے سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ بعض ناواقف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی[3] ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے۔ چنانچہ خداوند جل وعلا جائے مدح میں فرماتے ہیں الذین یومنون بالغیب (وہ لوگ جو ان دیکھی باتوں پر ایمان لاتے ہیں) اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا ای الخلق اعجبھم ایماناً یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔صحابہ نے عرض کیا الملائکۃ یا رسول اللہ الخ یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے۔آپ نے فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جبکہ ہر وقت کلام واحکام سے مشرف ہوتے ہیں۔صحابہ نے کہا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا آپ نے فرمایا بھلا وہ کیوں ایمان نہ لاتے ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔صحابہ نے کہا کہ پھر ہمارا آپ نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے ہر وقت مجھے دیکھتے ہو مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہ نے عرض کیا کہ حضور پھر کون لوگ۔آپ نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آویں گے جنہوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہوگا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہوگی محض چند لکھے ہوئے[4] کاغذ دیکھ کر ایمان لاویں گے۔ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم کلام ومکاشفہ کی حالت زیادہ تفضیل[5] اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا

---

[1] کیونکہ روح عالم بالا کی چیز ہے اور وہاں ہر چیز کی مثالی صورت موجود ہے اس خاکی جسم کے پردوں سے روح کے انکشافات بند ہیں اب جتنا یہ علاقہ کم ہوگا ادھر کا بڑھ جائے گا وہ مثالی صورتیں منکشف ہونے لگیں گی یہ خاکی جسم سے علاقہ کم کرنا مجاہدہ سے ہوتا ہے خواہ صحیح غرض سے ہو کہ رضائے حق کے راستہ پر ہو یا کسی باطل غرض سے ہو۔ [2] دل کی کیفیت [3] اگر مقصود یعنی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے تو درست ورنہ بیکار بلکہ مضر۔
[4] قرآن وحدیث اور ان کی تشریحات [5] فضیلت اور زیادہ سلامتی والی

چاہیے کہ مطلقاً[1] غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیاء علیہم السلام تو وہ افضل ہوں گے اور اعجب[2] ہونا دوسری بات ہے۔

جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا انہیں عالم دنیا کے چھوڑنے سے قبل موت سے وحشت ہوتی ہے لیکن اگر اہل ایمان ہو تو وہ وحشت بعد انکشاف باقی نہیں رہتی

جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے اور مضطرب ہوتے ہیں۔ جالینوس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سوراخ رہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر[3] مکاشفین اگر اہل ایمان کامل ہیں تو گوان کو طبعاً[4] اس عالم کو چھوڑنا (قبل موت) گراں گزرے اور وہ موت سے گھبرادیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں[5] کلنا یکرہ الموت مگر عین مرنے کے قریب جب[6] مبشر ہوتا ہے اور اسی طرح مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی وسعت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت ہوگی جو کہ رحم مادر سے نکل کر اور عالم دنیا دیکھ کر بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو ہیچ بلکہ لاشئی محض سمجھنے لگتا ہے حکیم سنائیؒ اسی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

آسمانہا ست در ولایت جاں　　کارفرمائے آسمان جہاں

(روح کی مملکت میں بھی کئی آسمان ہیں جو دنیا کے آسمانوں کی طرح کام انجام دیتے ہیں)

درره روح پست و بالا ہست　　کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

(روح کے راستہ میں بھی اونچا نیچا ہے بلند بلند پہاڑ اور جنگل ہیں۔)

---

[1] ہر ایک بے کشف کشف والوں سے [2] ایمان کا زیادہ عجیب ہونا اور بات ہے کہ یہ ذرائع کے زیادہ نہ مشاہدہ ہونے پر ہے اور ایمان قوی ہونا اور بات ہے وہ انہی حضرات کو حاصل ہے۔ [3] غیر اہل کشف [4] طبیعت کو نہ کہ عقل کو [5] ہم میں سے تو ہر ایک موت کو ناگوار سمجھتا ہے یہ طبیعت کی ناگواری ہے۔ [6] بشارت وخوشخبری دیا ہوا

مرید کو متعارف[1] طور پر توجہ دینے میں خرابی اور اس کے ضرر مع چند شبہات اور ان کے جوابات

اکثر محققین صوفیہ نے مریدوں پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرما دیا اس وجہ سے کہ اس طریق توجہ میں مریدین کے اندر کسی کیفیت کے القاء[2] کے لئے اس قدر استغراق[3] کرنا شرط تصرف ہے کہ بجز اس مقید[4] القاء کے کسی طرف التفات نہ ہو اور تمامتر خیالات سے بالکل خالی ہو جاوے حتیٰ کہ واقعی اس وقت حق تعالیٰ کی طرف بھی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ سو اس قدر توجہ مستغرق[5] ہونا خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گزرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہو جاوے۔ ایک اور ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب[6] پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے اور جس شہرت کے اسباب مقدور الترک[7] ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے۔ تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف[8] القویٰ ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر اتکال[9] کر لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی نسبت محض انعکاسی[10] ہوتی ہے۔ اکتسابی[11] نہیں ہوتی اور نسبت انعکاسی کو قیام نہیں ہوتا اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ خود حدیث سے ثابت ہے چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ **غطنی فبلغ منی الجهد** (جبرائیل علیہ السلام نے مجھ کو دبایا تو مجھ کو مشقت تک پہنچا دیا) سو اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ اس غط[12] کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے۔ اس کا حاصل صرف الصاق[13]

---

[1] رواجی کہ پیر مرید کی طرف خوب متوجہ ہو کر دل کو اس کے دل سے ملا دینے اور اپنے دل کی سوز و گداز و عشق و آگ کی کیفیت مرید کے دل میں پیوست کرنے کی کوشش کرنا [2] دل میں ڈالنا [3] ڈوب جانا کہ سب سے ہی الگ ہو کر اس میں لگ جانا اثر کرنے کی شرط ہے [4] صرف دل اس میں ڈال دینے کی توجہ کے سوا [5] ڈوبی ہوئی توجہ کہ دوسری ہر طرف سے ہٹی ہوئی ہو۔ [6] خود بینی کہ میں ایسا ہوں [7] ذرائع چھوڑنے کی قدرت میں ہوں۔ [8] جسمانی کمزوری [9] بھروسہ [10] شیخ کی نسبت مع اللہ کا عکس جسے آئینہ میں صورت کا عکس جو الگ ہونے پر نہیں رہتا [11] خود حاصل کی ہوئی جو ہمیشہ رہتی [12] دبانے کو [13] سینہ کے ساتھ زور سے ملا دینا۔

بالصدر مع شدہ ہے نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کیا جاوے تو ممکن ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بوجہ قوت[1] ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوتی ہو جو توجہ الی الحق کی مانع ہو۔ و ذلک لایضر اگر کہا جاوے کہ ممکن ہے کہ منفعل[2] کے تفاوت استعداد سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو تو جواب یہ ہے کہ فاعل[3] کو تو ہر صورت میں کمال استغراق کی ضرورت ہوگی۔ البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہوگا کہ تام[4] الاستعداد بسہولت اور جلد متاثر ہوگا اور ناقص[5] الاستعداد بدیر متاثر ہوگا۔

فیض رسانی کی وہ صورتیں جن میں کوئی خرابی اور ضرر نہیں مع زیادت تحقیق توجہ متعارف

ہاں دو صورتیں فیض رسانی کی اور ہیں ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکت کے فیوض و برکات سے کہ ان کو اس طرف التفات بھی نہیں عالم مستفیض[6] ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے سے ہر قابل حصہ زمین میں قوت نمو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے یا آفتاب کہ اس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور منور ہوگی۔ دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کے حال کی نگرانی کرنا۔ شفقت سے نصیحت کرنا۔ اس کو بھی توجہ بالمعنی[7] اللغوی کہا جاتا ہے مگر اصطلاحی[8] توجہ بمعنی تصرف نہیں سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ مسنون ہے کیونکہ طریق[9] توجہ کے

۱؎ اور یہ یعنی ملکی قوت کی وجہ سے وہ استغراق جو حق تعالیٰ کی طرف توجہ سے روکتا ہے نہ ہو مضر نہیں ہے۔
۲؎ اثر لینے والے کی طاقت کے کم و بیش ہونے کی وجہ سے ۳؎ توجہ دینے والے کو ۴؎ اثر لینے کی پوری طاقت والا ۵؎ اثر لینے کی کم طاقت والا یعنی اثر لینے والے کی قابلیت کے کم زیادہ ہونے سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ اثر لینے والے کے ہی حق میں ہو سکتا ہے کہ زیادہ قابلیت والا جلد اثر لے لے اور کم والا دیر میں لیکن اثر کرنے والے پیر کو تو دونوں صورتوں میں پوری توجہ اور حق تعالیٰ سے غیر متوجہ ہونا پڑے گا۔ یہی خطرہ کی بات ہے۔
۶؎ فیض لینے والا ۷؎ لغت کے معنی سے کہ توجہ تو ہے مگر رواجی معنی کہ دل کو ہر طرف سے ہٹا کر اس سے دوسرے کے دل میں کیفیت کا ڈالنا ہو نہیں ہے۔ ۸؎ تصرف کے معنی ہیں مرید کے دل میں رد و بدل کر دینا یہ رواجی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی توجہ کا ترک کرنا اور ان سے غائب ہونا نہیں بلکہ ان کی طرف زیادہ توجہ ہے۔
۹؎ رواجی توجہ کے طریقہ

ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق میں ترک[1] التفات الی اللہ نہیں بلکہ زیادہ[2] التفات الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق[3] بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن التوجہ[4] الی الخالق نہیں ہے بلکہ دعا کی تو حقیقت ہی توجہ الی الخالق[5] ہے گو نفع[6] الخلق سہی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق[7] ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلیم وغیرہ میں بھی اعتدال[8] توجہ الی الخلق غیر مانع عن الحق ہے اور وہ بھی باذن[9] لخالق ہے تو ہے انہماک[10] فی الخلق وغیب عن الحق نہیں ہے حاصل یہ ہے کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت[11] ہے دوسرے وہ اس میں احداث[12] التفات الی الخلق ہو پہلی قسم کملاء[13] کے ہاں متروک ہے دوسری قلم مطلوب و محمود ہے البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف[14] کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور رنجیت سنگھ کی کشتی کا جس درجہ میں یہ کشتی محمود و مذموم ہے بالکل اسی درجہ میں یہ توجہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج[15] فی نفسہ کوئی محبوب و مطلوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اس کی غایت[16] محمود ہو تو اس میں بالغرض مطلوبیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ورزش کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت وصولت[17] ہے تو لغو ہے اور اگر اعانت مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے۔ پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب و امت پر فرماتے تھے۔ یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کو کاملین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ[18] ہے خلق کی

۱؎ اللہ کی طرف کی توجہ کو چھوڑ دینا۔ ۲؎ اللہ کی طرف توجہ کی زیادتی ۳؎ مخلوق کی طرف توجہ ۴؎ خالق کی طرف توجہ ہٹانے والی نہیں ۵؎ خالق کی طرف توجہ ۶؎ مخلوق کے فائدہ کے لئے ۷؎ پسند حق ۸؎ متوسط درجہ میں مخلوق کی طرف توجہ حق تعالیٰ سے روکنے والی نہیں۔ ۹؎ حق تعالیٰ کی اجازت سے ہے۔ ۱۰؎ مخلوق میں کھپ جانا تو ہے حق تعالیٰ سے غائب ہو جانا نہیں۔ ۱۱؎ غائب ہونا۔ ۱۲؎ مخلوق کی طرف متوجہ ہونے کو وجود میں لانا۔ ۱۳؎ کامل بزرگوں کے ۱۴؎ مریدوں پر ظاہر کرنا نام و عزت بڑھانا ریا کاری ہو کر برا ہے۔
۱۵؎ رواجی توجہ خود ۱۶؎ جیسے ورزش سے مقصود قوت بڑھا کر کمزوروں کو فائدہ پہنچانا ہے تو تعریف کی چیز ہے ظلم کرنا ہے تو بری خصلت ہے ایسے ہی توجہ کا فائدہ کوئی مطلوب شے ہے تو اس کی وجہ سے یہ بھی مطلوب ہے۔ ۱۷؎ رعب
۱۸؎ خطرہ مخلوق کی طرف پوری توجہ ہے

طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے۔ حتیٰ کہ ابتداء میں مطلق افادہ[1] کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

حکایت: ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر و شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدیل بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہی نیت ہے کہ اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے کہا کہ توبہ کرو یہ شرک[2] ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق مقصود[3] بالنظر ہے۔ جب اس نے اس خیال سے توبہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداء سلوک میں مضر ہوتا ہے۔

شیخ کامل[4] مرید کی اصلاح سے نہ خود مایوس ہوتا ہے نہ اس کو مایوس کرتا ہے

اور اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر و تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا بلکہ اسی کاوش میں رہے حتیٰ کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا وہ طبیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی ادھیڑ بن میں برابر لگا ہی رہتا ہے۔ برخلاف ظاہری اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں۔ اسی پر حافظ شیرازی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

بندہ پیر خراباتم کو لطفش دائم است　　زانکہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

(میں تو میکدہ کے ایسے پیر کا غلام ہوں جس کی توجہ دائمی ہے کیونکہ زاہد اور پیر کی توجہ تو کبھی ہے کبھی نہیں)

---

[1] کچھ بھی فائدہ　[2] شرک خفی ہے یعنی ریا اور غیر اللہ کی نیت سے کرنا ہے　[3] نظر میں مخلوق مقصود ہے نہ کہ خالق　[4] سچا اور ماہر فن پیر۔

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بلکہ اگر کشف سے بھی کسی کی شقاوت[1] ظاہر ہو جائے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدل[2] بالسعادۃ کی کرتے ہیں البتہ اگر کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی[3] الکفر معلوم ہو جاوے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا ہی کے حکم سے ہے۔

ہر شخص منصب[4] ارشاد کی لیاقت نہیں رکھتا

نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ ہر شخص منصب ہدایت کی لیاقت نہیں رکھتا۔ بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے۔ **لایقص الا امیر امورا و مختال** یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کرے گا کہ یا خود امیر المومنین ہے یا امیر المومنین کی طرف سے مامور ہے یا متکبر اور نفس پرور ہے۔ اس لئے کہ جب ہدایت عامہ کا کام امیر المومنین کی ذمہ داری میں ہے تو اس کو وہ خود کرے گا یا خود نہ کرے گا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کرے گا پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ بھی خواہ مخواہ آپ کو پانچوں سواروں میں گنتے ہیں۔

آج کل مخلص واعظوں پر مختال[5] ہونے کا شبہ مع جواب اور اس کی تحقیق کہ وعظ کہنا کس کو جائز ہے

لیکن اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب بغیر امیر یا مامور ہوئے وعظ کہنا مختال ہونے کی علامت ہے تو آج کل کے تمام وعاظ[6] میں سے تو ایک شخص بھی امیر یا مامور نہیں تو کیا یہ سب کے سب حدیث کی تیسری[7] شق میں داخل ہیں جواب یہ ہے کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پرہیز گار اہل الرائے مسلمان کسی ایک شخص کو کوئی منصب دے دیں تو وہ سب مل کر امیر کے قائم مقام سمجھے جاویں گے اور ان کا اعطا[8] امیر ہی کا اعطا ہوگا کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اعطاء مناصب کا اختیار جو امام کو ہے وہ بھی درحقیقت اہل اسلام ہی

---

[1] بدبختی [2] نیک بختی سے بدل جانے کی [3] کفر پر مہر لگ جانا [4] مریدوں کی اصلاح و تربیت
[5] متکبر [6] واعظ کی جمع [7] متکبر [8] منصب دینا

کو ہے اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل ضرور جائز ہوگا۔ جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کر لیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر وقف[1] کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہدہ نظارت[2] وقف دیا جا سکتا ہے پس جب دیندار فہم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب[3] کر لیا ہو خواہ قولاً یا حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے۔

جو لوگ وعظ کہنے کے اہل نہیں ہیں ان کے وعظ سے گمراہی پھیلتی ہے

بدوں اہل دین اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ ضروری مسائل تک کی ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت[4] کر بیٹھتے ہیں۔

حکایت:۔ سہارن پور میں ایک جاہل دیہاتی نے آ کر وعظ کہا انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں اواج[5] تو نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ نہیں پس نماز کے بعد پکار مارا کہ ساہبو (صاحبو) اواج (وعظ) ہوگی۔ سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے اعوذ بسم اللہ غلط سلط پڑھ کر یاسین شروع کی۔ آیتیں الٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ کیا خوبصورت ہوا۔ اے محمد۔ اے محمد۔ اے محمد اگر تجھ کو پیدا نہ کرتا نہ زمین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش و کرسی وغیرہ وغیرہ پھر فرماتے ہیں بھائیو تھکے ماندے ہیں اس لئے آدھی اواج اب ہوئی آدھی پھر ہوگی۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھالیا اور پوچھا کہ آپ کی تسیل (تحصیل[6]) کہاں تک ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہے ہاپڑ (ہماری تحصیل ہاپوڑ) بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں لیکن اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہو جاوے گا کہ یہ لوگ گولغو

---

[1] وقف کا منتظم [2] ناظم وقف [3] اگر کم علم غیر دیندار کو واعظ بنایا تو دونوں گناہ گار ہیں۔ [4] غلط بیان کا گناہ لیتے غلطی و گمراہی میں ڈالتے ہیں۔ [5] وعظ کو بگاڑا ہوا لفظ [6] علم کی تحصیل و فراغت کہاں تک ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں اور اپنی اور دوسروں کی تضییع اوقات کرتے ہیں پھر بھی ان بے چاروں سے اس قدر نقصان نہیں ہوتا اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنے وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب وتاب کی تقریریں مشق کئے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاحات ازبر ہیں۔ حافظ کا دیوان پیش نظر ہے۔ زبان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض ہیچ یہی لوگ ہیں کہ ان[1] سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

کسی نے خوب کہا ہے ؎

حرف درویشاں بدزدو مرد دوں تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(بزرگوں کے لفظوں کو کم حیثیت لوگ چرا لیتے ہیں تا کہ ناواقفوں پر ان کا منتر پڑھ کر گرویدہ بنالیں)

اور یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں[2] او مختال کے لفظ سے فرمایا گیا ہے۔

ابتدا سلوک میں وعظ کہنا ممنوع ہے

غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت ہے لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے صوفیہ نے اسی راز کو سمجھ کر ابتداء سلوک میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا ہے کہ قبل اصلاح نفس اس میں اغراض فاسدہ غالب ہوتے ہیں[3]۔

محقق شیخ کی کیسی شان ہوتی ہے

پس معلوم ہوا کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا۔ سو شیخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ دیکھو محقق شیخ کی وہ شان ہوتی ہے کہ جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض کو مرید کے سمجھ لیا۔ جس کی نیت ذکر و شغل سے بڑا بننا اور خلق مطمع نظر بنانا تھا۔

---

[1] گمراہ اور کفر تک پہنچنے والے فرقے بن کر اسلام کے ٹکڑے کر دیئے قصور ان لوگوں کا زیادہ ہے جو ان کی چرب زبانی اور لطیفوں ہنسانے رلانے کے قصوں کہانیوں گانے اور مٹکنے کے لطف لینے میں اپنے ایمان پر ڈاکہ ڈلواتے ہیں۔ اور نہ ان کو روکتے ہیں نہ خود سننا چھوڑتے ہیں یہی حال مضامین اور تحریروں کا ہے اردو لچھے دار دیکھی اور لٹو ہو کر ایمان بھینٹ چڑھا بیٹھے ہیں اسی سے گمراہی اور کفر پھیل رہا ہے۔ [2] متکبر [3] خود پسندی جاہ طلبی تکبر و غرور اور بعض اوقات گمراہ ہو جانا اور کر دینا۔

محققین کے نزدیک متعارف توجہ اور تصور شیخ کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ اور غیر اللہ سے محبت کی حد

یہ توجہ اگرچہ (بالغیر[1]) طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں کیونکہ اس میں مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی ہے اور ان کی حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے۔

بہ ہرچہ از دوست دامانی چہ کفر آں حرف چہ ایماں

بہ ہرچہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(ہر اس حرف سے کہ تم دوست سے پیچھے رہ جاؤ کفر ہو یا ایمان کا اور ہر اس نقش سے کہ محبوب سے دور ہو جائے ہو برا ہو یا خوبصورت سب سے بچو)

خلاصہ یہ ہے کہ نفس توجہ اگرچہ زیبا[2] ہو لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت[3] ہے۔ اسی طرح تصور شیخ کا شغل[4] بھی محققین نے اکثروں کو بتلانا بالکل ترک کر دیا ہے سبب یہی ہے کہ تصور شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا اور یہ عیب کاملین کے یہاں جرم ہے۔ خوب کہا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاھے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک جھپکنے کو بھی اس شاہ سے غفلت نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ وہ توجہ کرے اور تم غافل رہو)

ممکن ہے کہ جس وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے وہی وقت ادھر کی طرف کی توجہ کے نافع[5] ہونے کا ہو۔ اسی لئے کاملین کی طبیعت اچٹتی ہے اور ان کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اوجھڑی کہ اس کو حلال تو ضرور کہیں گے اگر غلاظت سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے اور صاحبو اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آسکتے ایک نیام میں دو

---

[1] یعنی گو دوسرے کے دل میں عمدہ کیفیت پیدا ہو کر خدا تعالیٰ سے لگاؤ اور نسبت کچھ نہ کچھ ہو سکنے کی وجہ سے اس کے لئے ثواب کا ذریعہ ہو۔ [2] اچھی ہو کہ مرید میں کچھ نہ کچھ بھلائی پیدا کر دے۔ [3] بری
[4] پیر کے تصور کا شغل کہ مرید ہر طرف سے دل و ذہن کو خالی کر کے پیر کا تصور اور اس سے فیض کے دل پر مثل پانی کے نالہ کے آنے کا قوی ترین خیال کیا کرے۔ [5] لہٰذا یہ شغل ناجائز تو نہیں مگر ناپسندیدہ ہے۔

تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیوں کر کہا جاوے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا کا خیال ضعیف اور مخلوق کا خیال غالب ہو پھر اس کو قصداً پیدا کیا جاوے تو وہ مطلوب ہوگی۔

حکایت: حضرت ابراہیم ادھم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جو شیخ محمود کے نام سے مشہور ہیں ملے اور مسرت کا جوش غالب ہوا تو ندا آئی کہ

حب حق ہو دل میں یا حب پسر | جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہو گیا اور ان[1] کا انتقال ہو گیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیٹے سے بالکل محبت ہی نہ کرے۔ جس قدر ان کا حق شرعی ہے وہ جب حق پر غالب نہ ہو عین سنت ہے پس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہیے کہ جو کہ خدا کو بالکل بھلا دے۔ جیسا آج کل جاہل فرقوں میں متعارف ہے اسی طرح بیوی بچوں سے وہ محبت نہ ہو کہ خدا کی طرف توجہ نہ کرے۔ **لاتلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ** (تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں) الطاف خداوندی کے قربان ہو جایئے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کرو کیونکہ جانتے ہیں کہ محبت اولاد طبعی ہے۔ امتثال نہ ہو سکے گا۔ اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ۔

ترک توجہ متعارف پر ایک شبہ اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ توجہ تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض توجہ کی ہے وہ ضروری پس اگر توجہ ترک کریں تو امر ضروری[2] کا ترک لازم آتا ہے۔ اور توجہ اختیار کریں تو امر مذموم[3] کا اختیار لازم ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں کیونکہ اگر اس کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اسی طریق کو اختیار فرماتے جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں[4] ہے بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے۔ یعنی تعلیم وارشاد شفقت و دعا اور یہ طریق ایسا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کچھ اندیشہ۔

---

[1] بیٹے کا [2] مرید کے دل میں کیفیت کو پیوست کرنے کا [3] خدا تعالیٰ سے توجہ کا ہٹانے کا [4] بلکہ اس سے تو عارضی فائدہ ہوتا ہے۔ جیسے آگ کے سامنے ہونے سے گرمی اور تربیت و تعلیم سے دائمی ہوتا ہے جیسے ورزش سے گرم مزاجی

قرآن شریف جمال حق کے لئے آئینہ ہے اور اسکی خوبیاں

قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ۔

چیست قرآں اے کلام حق شناس　　رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

(قرآن شریف اے حق کلام کو پہچاننے والے کیا ہے یہ لوگوں کے رب کا جلوہ لوگوں کو دکھانے والا بن کر آیا ہے)

حرف حرفش راست دربر معینے　　معینے در معینے در معینے

(اس کے ایک ایک حرف کی بغل میں ایک معنے ہیں اور معنیٰ میں معنیٰ، معنی میں معنیٰ)

اور رونما اس واسطے کہا کہ خدا تعالیٰ کو دنیا میں بلاواسطہ تو دیکھ نہیں سکتے۔ پس کلام اللہ کو پڑھنا گویا دیدار خداوندی سے محظوظ[1] ہونا ہے۔ اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہوگی۔ ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع آ گیا۔

ع　در ابلق کسے کم دیدہ ''موجود''

مصرعہ کہہ کر بڑی خوشی ہوئی لیکن دوسرا مصرعہ تیار نہ کر سکے۔ شعراء کو جمع کیا اور مصرعہ لگانے کی فرمائش کی۔ کسی سے مصرعہ نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہمل مضمون آخر سب کو زندان کی دھمکی دی۔ ان لوگوں نے پریشان ہو کر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرعہ کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ چنانچہ شعراء کو وہ مصرعہ دیا گیا لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا۔ شدہ شدہ زیب النساء متخلص بہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی۔ اس نے بھی غور کیا لیکن مصرعہ نہ لگ سکا۔ اتفاقاً ایک روز مسند پر بیٹھی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا اس کی ہئیت کو دیکھ کر فوراً دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں آ گیا۔

ع　''مگر اشک بتان سرمہ آلود''

(سوائے حسینوں کے سرمہ ملے ہوئے آنسو کے)

---

[1] لطف اندوز۔ [2] ابلق یعنی سیاہ و سفید موتی کسی نے کم موجود دیکھا ہوگا۔

چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرعہ سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت زچ پچ ہوا کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی مشکل ہے۔ آخر اس نے زیب النساء سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔ زیب النساء نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ

در سخن مخفی منم چوں بوئی گل در برگ گل　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

(میں کلام کے اندر اس طرح مخفی یعنی پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو اس کی پنکھڑیوں میں جو کوئی مجھے دیکھنا چاہے کلام کے اندر ہی مجھے دیکھ لے)

چنانچہ یہ لکھ کر بھیج دیا گیا معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے۔ پس اسی طرح ہمارا مطلوب حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں بوجہ اس کے کہ ہم اس کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ

در سخن مخفی منم چوں بوئی گل در برگ گل　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اور وہ سخن یہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ[1] معینے در معینے در معینے" جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جاویں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ **لاتنقضی عجائب** (اس کے عجیب عجیب مضامین قیامت تک ختم نہ ہوں گے) اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزا آتا ہے۔ صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد　　برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را

(اس کے حسن کے عالم کی بہار دل اور روح دونوں کو تازہ رکھتی ہے ظاہر والوں کو رنگ سے باطن والوں کو خوشبو سے)

حدیث میں ہے لایخلق من کثرۃ الرد (بہت بہت پڑھنے سے بھی پرانا نہیں ہوتا)

---

[1] معنے کے اندر معنے معنے کے اندر معنے

واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی سنو جی نہیں بھرتا نیا مزا آتا ہے۔

قرآن شریف کی دلچسپی پر ایک شبہ اور اس کا جواب

اگر کہا جاوے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی اس میں وہ مزا کیوں نہیں حاصل ہوتا اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزا آتا ہو تو وہ ابھی قابل خطاب ہی نہیں ہوا۔ اس کو چاہیے کہ صحت ادراک وسلامت حال پیدا کرنے کی کوشش کرے پھر موازنہ کرے۔ صاحبو قرآن تو قرآن ہے کبھی اگر مکہ میں جا کر وہاں کی تکبیر اگر نماز میں سنو جو ایک جزو ہے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے۔ سچ مچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے وقت کی تکبیر دل میں چھری نکلتی جاتی ہے۔

طاعت میں اگر مزہ نہ آوے تو اس کو ترک نہ کرنا چاہیے اور لذت حاصل کرنے کی تدبیر

لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آوے وہ تلاوت ترک نہ کرے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ آنے لگے مگر یہ خیال بالکل ہی لغو ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جاوے کہ تم مقویات کھا پی کر جلدی سے بالغ ہو جاؤ تا کہ تم کو سب بلوغ کے لطف حاصل ہو جائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ صاحب پہلے سن بلوغ کی لذت کو میں دیکھ لوں کیسی ہوتی ہے۔ تب اس کی تدبیر کروں گا۔ فرمایئے کہ اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے۔ اور سوائے اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جائے گا کہ تم جب بالغ ہو جاؤ گے خود تم کو معلوم ہوں گے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں اسی طرح ان نابالغ پیڑوں[1] کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کر کے پڑھنے لگو چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ میں پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہوگی۔ البتہ یہ

---

[1] جو جاہل اور ذکر کی کیفیات سے خالی یعنی فن کے نابالغ ہیں۔ گو عمر میں بوڑھے ہیں۔

ضرور ہے کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوائے نفسانی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً[1] اس ہواء نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعت خدا اور رسول میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہی ہے ؎

خلق اطفالند جز مست خدا　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق نابالغ بچے ہیں سوائے مرد خدا کے اور کوئی بھی بالغ نہیں سوائے اس کے جو خواہشات سے الگ ہو گیا ہو)

اور بعینہ یہی غلطی اکثر اہل سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے۔ جس قدر ذکر زیادہ ہوگا قلب زیادہ[2] معتاد ہوگا۔ دوسرے خیالات کمزور پڑیں گے ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن شاعری میں جو ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرت مشق و ممااست[3] سے ہوتی ہے اور ابتداء میں ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی بلکہ اول تو محض مشقت ہی ہوتی ہے۔ دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں سبق فارسی کا پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ لاتے ہیں۔ اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اس کو زبان دانی و سخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کلام لطیف سن کر کیسا کچھ محظوظ ہوتا ہے پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری شروع کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔

صاحبو کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔ صاحبو جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیت میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ

---

[1] ہر بات میں [2] عادت والا [3] بہت استعمال و برتنے سے

تھیں اور اب ایک وقت وہ ہے کہ علی[1] وجہ الکمال ہیں۔

سالک کا کام محض طلب ہے اگر کیفیات باطنی نہ ہوں تب بھی کام کیے جائے

اسی طرح باطنی کیفیت بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کیے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آوے گا کہ سب حاصل ہو جاویں گے۔ ارشاد ہوتا ہے کذٰلک کنتم من قبل فمن اللہ علیکم (ایسے ہی تھے تم بھی پہلے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے)

اندریں رہ میتراش و میخراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس راستہ میں تو کاٹ چھیل کرتے ہی رہو آخر وقت تک ایک منٹ کو بھی خالی نہ بیٹھو)

تادم آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(آخرت وقت تک کہ ایک آخری سانس ہوتا کہ ان کی غایت تمہاری رازدابن جائے)

اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ یہ پڑھا کرتے تھے۔

یابم اور ایا نیابم جستجوئے میکنم　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں تلاش وطلب کرتا رہتا ہوں وہ حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا ہی رہتا ہوں)

جو کچھ بھی ہو تم کام کیے جاؤ۔ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں وہی ہے۔ ثمرہ کا ملنا نہ ملنا یہ ان کا کام ہے تم اس کے درپے نہ ہو۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　کہ حیف باشد از وغیرہ او تمنائے

(ہجر و وصل کیا ہوتا ہے۔ محبوب کی خوشی طلب کرو کیونکہ اس سے اس کے سوا کچھ طلب کرنا ہی افسوسناک چیز ہے)

ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں۔

ارید وصاله ویرید هجری　　فاترک ما ارید لما یرید

(میں تو اس کا وصل طلب کرتا ہوں اور وہ میرا ہجر تو میں اپنی طلب کو اس کی طلب پر نثار کرتا اور چھوڑ دیتا ہوں)

---

[1] پوری پوری طرح بس ایسے سے ہی ایک وقت وہ ہوگا کہ تلاوت میں کوئی کیفیت اور مزا نہ ہوگا پھر ایک وقت بہت لطیف و کیف آئے گا۔

اور صاحبو اگر یہ نہ کہا جاوے تو کیا خدا سے بدلا لینا ہے اگر وہ ہمارا کام نہیں کرتے تو ہم ان کا کام کیوں کریں۔ غور کرو اگر ایک مردار بازاری عورت سے تعلق ہو جاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گزرتے ہیں۔ کس کس انداز سے وہ امتحان اور آزمائش کرتی ہے۔ کتنا موقع بہ موقع ستاتی ہے لیکن آتش محبت مشتعل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غمزوں سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیں تو کیا ذات باری جل مجدہ کی محبت اور عظمت مسلمان کے دل میں اتنی بھی نہ ہو جتنی ایک بازاری عورت کی حیف ہے ہم پر اور ہمارے اسلام پر ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلے بود گوی گشتن بہراو اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہو سکتا ہے اس کے لئے تو گیند کی طرح لڑھکتے رہنا ہی بہتر ہے)

طالب کیسا ہونا چاہیے

حکایت: ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبادت کرو کچھ قبول نہیں اس کو ان کے ایک مرید نے بھی سنا۔ دوسرا دن ہوا تو وہ بزرگ پھر عبادت کے لئے اٹھے پھر وہی آواز آئی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں ادھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گرے جاتے ہیں۔ جب قبول ہی نہیں تو محنت سے کیا فائدہ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا ؎

توانی ازاں دل بہ پرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(تم اس سے اس وقت دل کو خالی کر سکتے ہو کہ جان لو کہ بے اس کی بھی بن سکتی ہے)

کہا بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس در پر جا پڑوں اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہ دگر نیستت

(قبول ہے گو تمہارے پاس عمدہ چیز نہیں ہے کیونکہ ہمارے سوا تمہارے لئے کوئی پناہ بھی نہیں ہے)

کہ اگرچہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر جب ہمارے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے۔ صاحبو طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ ؎

طلب گار باید صبور و حمول　　　　کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طلب والے کو تو صبر و تحمل والا ہونا ضروری ہے کیونکہ ہم نے کسی کیمیا کے دھنی کو اکتا جانیوالا نہیں سنا)

افسوس ہے کہ طلب خدا طلب کیمیا کی بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال گنوا دے مال و متاع غارت کر دے۔ چین و آرام کو خیر باد کہہ دے اور طلب خدا میں کچھ بھی نہ ہو سکے طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ۔

برنداز برائے دلے بارہا　　　　خورند از برائے گلے خارہا

(ایک دل کیوجہ سے بہت بوجھ اٹھا لیتے ہیں اور ایک پھول کیوجہ سے بہت سے کانٹے کھا لیتے ہیں)

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ۔

خوشا وقت شوریدگان غمش　　　　اگر ریش بیند و گر مرہمش

(کیسا اچھا وقت ہے ان کے غم کے سر مستون کا اگر چہ زخم دیکھیں یا اس کا مرہم دیکھیں)

گدایائے از بادشاہی نفور　　　　بامیدش اندر گدائی صبور

(وہ فقیر لوگ کہ بادشاہ سے نفرت کرنے والے صرف ان کی امید پر ہی فقیری میں صبر کرنے والے)

دمادم شراب الم درکشند　　　　اگر تلخ بیندوم در کشند

(غم کی شراب دمبدم پیتے رہتے ہیں اگر بہت کڑوی دیکھیں گے تو دم کھینچ لیں گے)

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ بیچارے تو بجائے حصول کے امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے بامیدش اندر گدائی صبور ایک طالب کا قول ہے۔

اگر چہ دور افتادم بدیں امید خرسندم　　　　کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگر چہ میں دور پڑا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب اور ایک مرتبہ میرا ہاتھ پکڑ لے)

طالب وہی ہے کہ اگر ہزار مرتبہ اس کو کہا جاوے کہ تو دوزخی ہے یا تو مایوس نہ ہو اور دس ہزار مرتبہ کہا جاوے کہ تو جنتی ہے تو کاہل اور سست نہ بنے اس کی طلب کی یہ حالت رہے۔

اے برادر بے نہایت در گہے است　　　　ہر چہ بردے میرسی بردے مایست

(اے بھائی وہ تو ایسی درگاہ ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ جس جگہ تم پہنچ گئے وہیں نہ کھڑے رہ جاؤ)

طالب کے کیسے کیسے امتحان لئے جاتے ہیں

حکایت: ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا۔ جب ایک مدت تک یہ آواز آئی تو شیخ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے مایوس نہ ہو جانا۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ محبّ کو چھیڑا کرتے ہیں خوب کہا ہے ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تم نے مجھے برا کہا تو میں خوش ہوں اللہ تم کو معاف کرے تم نے ٹھیک ہی کہا کیونکہ سرخ شکر چبانے والے یعنی شیریں لبوں کو کڑوا جواب ہی زیب دیتا ہے)

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے۔

سارے امتحانات اس وقت برداشت ہوتے ہیں جبکہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو

لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو پس اس کی کوشش کرو۔

خدا تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا طریقہ

اور اس طریق کے دو امر ہیں۔ ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت ان کے پاس آنا جانا اس سے تدریجاً ماسوی اللہ سب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہو جائیں گے۔ اور یہ حالت ہوگی۔ ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت   ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق تو وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑک اٹھتا ہے تو سوائے معشوق کے باقی سب کو پھونک دیتا ہے)

تیغ لا در قتل غیر حق براند   درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

(لا (نہیں) کی تلوار حق کے سوا سب کے قتل میں پھیر ڈالی پھر دیکھو آخر لا کے بعد کیا رہ گیا ہے)

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(الا اللہ رہ گیا باقی سب چلتا ہو گیا۔ اے پٹرول کی طرح شرکت کو جلا دینے والے عشق مرحبا مرحبا)

سلوک کی ترتیب

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نکلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈ کر اس کے پاس جا پڑو اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ۔ ثمرات کے طالب نہ ہو۔ خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو۔ طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑو مت کثرت سے ذکر کرو اس میں قرآن بھی داخل ہے۔

تلاوت قرآن کے لئے تصحیح الفاظ[1] بقدر طاقت ضروری ہے اور خلوص قلب اس سے زیادہ ضروری ہے

اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے تو اسی کی کثرت کرو۔ اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو اپنے امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو۔ اگر پوری[2] کامیابی نہ ہو تو دلگیر مت ہو اسی طرح قبول ہے الفاظ پر تو انہیں سے گرفت ہو گی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے ورنہ زیادہ تر دیکھ بھال اور چھان بین دلوں کی ہو گی اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریا یا اظہار کمال ہو۔

حکایت: اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی۔ ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہو جاؤں۔ میں اس پر ناراض ہوا اور سمجھا دیا چند روز کے بعد پھر آیا تو میں اس سے مزاحاً کہنے لگا کہ کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے تو وہ نہایت خلوص اور تازگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا اس کا تیرا یہ کہنا ہزاروں حضور اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا کیونکہ دل سے تھا۔

بعض وقت بہ نسبت نرمی کے سختی سے زیادہ اصلاح ہوتی ہے

جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعضے

---

[1] لفظوں کو صحیح کرنا اور ان کے حرفوں کو صحیح مخرج اور صفتوں کے ساتھ اپنی طاقت کے موافق نکالنا۔
[2] کوشش کرنے پر بھی پوری کامیابی نہ ہو اور اگر کوشش نہ کی گئی تو نہ سیکھنے کا گناہ رہے گا۔

بزرگ درشت مزاج مشہور ہو جاتے ہیں تو خوب سمجھ لو وہ درشت مزاج نہیں بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جاوے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کالنقش علی الحجر[1] ہو جاتی ہے۔

جس کا دل محبت سے بھرا ہوا اس کو اگر صحیح بولنے پر قدرت نہ ہو تو اس کا غلط بولنا بھی پیارا معلوم ہوتا ہے، غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پر قدرت نہیں ہوتی

حکایت: چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راعی[2] کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر بیٹھا ہوا محبت کے جوش میں خدا تعالیٰ کو خطاب کر کے یہ کلمات کہہ رہا تھا۔

تو کجائی تا شوم من چاکرت   چارقت دوزم کنم شانہ سرت

(تو کہاں ہے تا کہ میں تیرا خادم بنوں تیرے کپڑے سیوں تیرے سر میں کنگھا کروں)

و امثال ذالک (اور بھی ایسی ایسی باتیں) اتفاقاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گزرے۔ یہ کلمات سن کر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہو۔ اس نے کہا کہ خدا سے حضرت موسیٰ نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے۔ راعی نے جو سنا تو مارے خوف کے تھرا گیا اور سخت پریشان ہوا اسی وقت حضرت موسیٰ پر وحی آئی کہ اے موسیٰ تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا اسی حکایت کو مولانا روم فرماتے ہیں۔

زیں نمط بیہودہ میگفت آن شباں   گفت موسیٰ باکیستت اے فلاں

(وہ چرواہا ایسی ایسی بیہودہ باتیں کر رہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے فلاں تو کس کے ساتھ بات کر رہا ہے)

گفت باآں کس کہ مارا آفرید   ایں زمین و چرخ ازو آمد پدید

(بولا اس ذات کے ساتھ جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین وآسمان سب اسی سے پیدا ہوئے ہیں)

---

[1] سختی سے سمجھانے سے پتھر پر لکیر کی طرح [2] چرواہے کا

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدی خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

(موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے تو تو بے سرا ہو گیا خود مسلمان ہی نہیں رہا کافر ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کو کپڑے سر کنگھا اور خدمت کا ضرورتمند قرار دے دیا)

گفت اے موسیٰ وہانم دوختی وزپشیمانی تو جانم سوختی!

(عرض کیا اے موسیٰ آپ نے تو میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے میری جان ہی پھونک ڈالی)

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا بندہ مارا چرا کردی جدا

(حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ تم نے ہمارے بندہ کو ہم سے کیوں جدا کر دیا)

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

(تم تو بندوں کو مولیٰ سے ملانے کے لئے آئے ہو جدا کرنے کے لئے نہیں آئے)

حضرت موسیٰؑ نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلدی سے آ کر چرواہے سے معافی چاہی یہاں چرواہے کی عجب حالت تھی۔ موسیٰؑ نے جو معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ اے موسیٰ ایسا تازیانہ لگا ہے کہ میں بڑی دور پہنچ گیا ع

آفریں بردست و بربازوئے تو

(تمہارے ہاتھ اور بازو کو شاباش ہو)

اس جملہ حکایت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے گستاخانہ الفاظ بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہو تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور ہے کہ ان فروگذاشتوں کی معافی انہیں لوگوں کے لئے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے۔ ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گناہگار ہو گا۔

تصحیح الفاظ کے لئے کتابیں پڑھنا کافی نہیں کسی قاری سے مشق کرنا ضروری ہے اور بعض لوگوں کے ایک نامعقول عذر کی تردید

افسوس ہے کہ اس وقت اس امر تصحیح الفاظ کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس

کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف ومخارج پڑھ لئے ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے قرآن کا پڑھنا اس وقت تک نہیں آتا کہ جب تک خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جائے۔ نری درسیات سے کچھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہیے۔ اور ہم کو معذور سمجھنا چاہیے لیکن یہ عذر ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلا لا وہ حافظ جی کو بلا لایا۔ میں نے کہا یہ کیا حماقت ہے۔ کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں تو کہتا ہے جی میں نے مخارج کی مشق نہیں کی تو کیا یہ عذر قبول ہو سکتا ہے۔ تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا تھا اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسے اغلاط سے ان کو بچنا ممکن ہے۔ صاحبو یہ سب بہانے[1] ہیں بات اصلی وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا اگر آج یہ اشتہار دے دیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سنا دے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرات شروع کر دیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہو جائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کے لئے امنگ نہیں پیدا ہوتی یہ تو تفریط[2] تھی متعلمین کی۔

جسے تصحیح الفاظ پر قدرت نہ ہو وہ جس طرح پڑھ سکے جائز ہے

اب افراط[3] سنئے بعض معلمین ومصلحین کا کہ جن سے بالکل نہ ہو سکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدوں اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد ہے۔ اس کو چونکہ کوئی خاص عبارت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا دیکھ روزہ کی نیت یوں کر **بصوم غد نویت** (میں نے کل کے روزہ کی نیت کر لی ہے) اس بیچارے نے کاہے کو بھی اس قسم کے الفاظ سنے تھے۔ فوراً تو یاد کر نہ سکا

---

[1] ان بہانوں سے نہ سیکھنے کا گناہ نہیں ہٹ سکتا [2] کوتاہی پڑھنے والوں کی
[3] زیادتی پڑھانے اور اصلاح کرنے والوں کی

نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا۔ ان ہی بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلا نیت روزہ نہیں ہوتا اور نیت یاد نہیں ہوتی غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں اور جو لوگ اس پر قادر نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہے[1]۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہماری آواز چونکہ اچھی نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے سو ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ تحسین صوت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جاوے۔ تحسین صوت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سن کر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی باعظمت کا رعب[2] چھایا ہوا ہے۔

عشرہ[3] اخیرہ کے فضائل اور ضعفاء اور اقویا کے لئے اس میں عبادت کرنے کا دستور العمل

جب قرآن[4] ایسا مشرف و معظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول دفعی[5] ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرہ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن کی وجہ سے شرف حاصل ہوا تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے۔ دوسرے حصوں کی نسبت اشرف ہوگا اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت[6] آیا ہے۔ پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیرہ بقیہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوا ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے جس کی فضیلت کے لئے خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

---

[1] لیکن صحیح کرنا سیکھتے رہیں ورنہ نہ سیکھنے کا گناہ رہے گا۔ [2] اور ایک حدیث میں یوں بھی ہے جب تم قرآن شریف پڑھو تو روؤ اور اگر نہ روؤ تو روتے بن جاؤ یعنی ایسی آواز نکالو جس سے دل میں درد معلوم ہو۔ [3] بیس رمضان شریف بعد مغرب سے عید کا چاند نظر آنے تک آخری دس دن راتیں۔ [4] جس کا سرخی (قرآن شریف جمال حق کے لئے آئینہ ہے الخ) میں بیان ہوا۔ [5] ایک دم کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک دم لیلۃ القدر میں نزول ہوا ہے اور نیچے تیئس سال میں۔ [6] کیونکہ آیت شهر رمضان الذی انزل فیه القران (رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) بتاتی ہے کہ پورے رمضان کو فضیلت قرآن شریف کے نازل ہونے سے ہوئی ہے۔

وما ادراک ما لیلة القدر لیلة القدر خیر من الف شهر (اور کیا معلوم ہے آپ کو کیا ہے لیلۃ القدر لیلۃ القدر ایک ہزار مہینہ (۸۳ سال ۴ ماہ) سے بہتر ہے)

کیونکہ حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے۔ دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں میں کبھی ہونا مکشوف بھی ہوتا ہے تو قوی اور تندرست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور شبوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفاء کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں صاحبو ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہو جانا گویا تمام چیز سے محروم ہو جانا ہے۔ چنانچہ حدیث ہے من حرم لیلة القدر فقد حرم الخیر کله' (جو لیلۃ القدر سے محروم کر دیا گیا وہ ہر چیز سے محروم کر دیا گیا)

لیلۃ القدر کی فضیلت اکثر حصہ شب میں جاگنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے اور تمام رات جاگنے کی زیادہ فضیلت اور ترغیب

لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جاوے تو تمام شب جاگا جاوے اور اگر تمام شب نہ جاگا جاوے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصہ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا جاوے تو کیا مشکل ہے۔ صاحبو رمضان سال بھر کے بعد آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے۔ ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے۔ اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایک دو رات جاگ ہی لیا تو گیا وقت کی بات ہے۔

اگر تمام رات عبادت کرنے کی ہمت نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس کے لئے اخیر شب تجویز کی جاوے اور اخیر شب کی خوبیاں

لیکن خیر اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ یہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جاوے کیونکہ اول تو اس وقت معدہ کھانے سے پر نہیں ہوتا دعا میں جی لگتا ہے دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب[1] شریک ہے۔

شب قدر کو کیسا شخص پا سکتا ہے

کسی نے خوب کہا ہے **من لم یعرف قدرا للیلۃ لم یعرف لیلۃ القدر** (جو رات کی عزت نہ پہچانے گا وہ لیلۃ القدر کو بھی نہ پہچانے گا) اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر انہیں راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کرے گا وہ لیلۃ القدر بھی پاوے گا جو بے قدری کر کے خواب غفلت میں گزارے گا وہ حسب عادت لیلۃ القدر سے بھی محروم رہے گا اس لئے بعضے بزرگوں نے کہا ہے **من احییٰ السنۃ کلھا ادرک لیلۃ القدر** (جو سارے سال شب بیداری کرے گا لیلۃ القدر کو پا ہی لے گا) کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلۃ القدر میں عبادت ضرور ہو جاوے گی کہ انہیں راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔ بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شاہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جاتیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آ گیا ہے کسی نے اسی کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

اے[2] خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی　　　ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

---

[1] آخر شب میں رحمت خاص اور سکون ہونے میں ہر رات شریک ہے سب میں یہ بات موجود ہے۔

[2] اے بزرگ تم لیلۃ القدر کی نشانی کیا پوچھتے ہو ہر رات شب قدر ہے اگر اس کی قدر پہچان لو یعنی ہر آخر شب کی عبادت کو دوسرے وقتوں پر فضیلت و قدر ہے اگر قدر کرو۔

رمضان کے عشرہ اخیرہ خاص کر ستائیسویں رات میں ضرور بیدار رہنا چاہیے کہ اگر اس میں شب قدر نہ ہوئی تب بھی امید ہے کہ شب قدر کا ثواب ملے گا

لیکن خیر ایسے باہمت لوگ تو اس وقت کہاں ہیں کہ وہ اس گوہر بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرہ اخیرہ میں تو ضرور ہی بیدار رہنا اور عبادت کرنا چاہیے کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اور اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور اور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو ضرور ہی بیدار رہے کہ وہ شب اکثر شب قدر ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی تو تم نے بہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو ان شاء اللہ تعالیٰ تم کو شب قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا۔ اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے حدیث میں اس کی اصل ہے حضور ارشاد فرماتے ہیں **انما الاعمال بالنیات** (تمام عملوں کا ثواب نیتوں سے ہی ہوتا ہے) پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے حضور ارشاد فرماتے ہیں **الصوم یوم تصومون و الفطر یوم تفطرون و الاضحیٰ یوم تضحون** (روزہ اس دن ہے جب تم لوگ روزہ رکھتے ہو اور فطر اسی دن ہے جس دن تم افطار کرتے ہو اور اضحیٰ اس دن ہے جب روز تم اضحیہ کرتے ہو یعنی قربانی کرتے ہو) جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بنا پر روزے رکھنے شروع کر دیئے پھر ختم رمضان پر عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بناء پر عید کر لی اسی طرح عید اضحیٰ میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیے بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عند اللہ باعتبار قبول روزہ کا تھا اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا۔ یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کامل جاوے گا۔ صاحبو اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہو گیا اب

بھی اگر ہمت نہ کی جاوے تو غضب ہے۔ یہ دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیرہ کی۔

رجوع بجانب سرخی (عشرہ اخیرہ کے فضائل الخ)

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع ہے اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف شب قدر ڈھونڈنے کے لئے ہے اور ممکن ہے کہ یہ مستقل فضیلت ہو جبکہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے بھی مشروع کہا جاوے خیر جو کچھ بھی ہو ہم کو اس سے کیا غرض ہم کو کام کرنا چاہیے احکام کے حکم اور مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں کیونکہ یہ علوم فکریہ[1] نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آ جاویں گے یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے۔ اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہو جاوے اس وقت تک کسی ایک کی تعین نہ کرنی چاہیے۔ دونوں احتمال ہیں۔

اعتکاف کے دو درجہ ہیں اور اس کا بیان کہ معتکف کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا رہتا ہے

اور اس اعتکاف میں دو درجہ ہیں ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ ۲۰ تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے اور وہ یہ ہے کہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ کے حاصل کرنے سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس قدر نہ ہو گی تو کچھ تو ضرور ہو جائے گی۔ صاحبو اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے ۹ دن سہی اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن سہی غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے دن بھی ہو سکے چھوڑنا نہ چاہیے۔ اور ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز

---

[1] عقلی علم نہیں کہ عقل سے اس کی حکمتیں اور مصلحتیں معلوم کر لی جائیں۔ یہ تو وحی الٰہی کے حکم ہیں اور حکم پر گردن جھکا دینا ہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر حکمتیں اور مصلحتیں حکمت والے رب کے حکم میں ہیں ضرور یہ یقین ضروری ہے اب الہام والوں پر مصلحتوں کو ظاہر کیا جاتا ہے جیسے اپنے خاص خاص پر اسرار ظاہر کئے جاتے ہیں ہر ایک پر نہیں کئے جاتے۔

میں ملتا ہے۔دلیل اس کی یہ حدیث ہے **لایزال احد کم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ** جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جاوے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ہوتا ہے کہ وقت اداء الصلوٰۃ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوٰۃ کا انتظار ضرور رہے گا اگر یہ سووے گا بھی تو اس نیت سے کہ اُٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ کام ہے غرض اس کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا ہر ہر حرکت صلوٰۃ کے حکم میں لکھی جائے گی۔صاحبو اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی۔

رجوع بجانب سرخی (عشرہ اخیر کے فضائل الخ)

یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ عشرہ اخیرہ میں ایک فضیلت اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اعتکاف میں جو فضیلت آئی ہے وہ عشرہ اخیرہ کی وجہ سے ہے کہ زمانہ افضل میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے لیکن یہ ہم کو کچھ مضر نہیں کیونکہ کبھی زمانہ میں بالذات[1] ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بوجہ اس کے مظروف کے ہوتی ہے پس غرض خواہ اعتکاف میں عشرہ کی وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے دونوں صورتوں میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کرید کی ضرورت نہیں کسی نے خوب کہا ہے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب در بکشم زہے شرف

(اگر قسمت موافقت و مدد کرے تو اس کے دامن کو ہاتھ میں لے لوں پھر اگر وہ کھینچے تو عین مسرت ہے اور میں کھینچ لوں تو کیا ہی عزت ہے)

صاحبو چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال کرنا چاہیے اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اس میں قوت بڑھی یا اس سے اس میں یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے۔ مریض کا کام صرف استعمال ہے۔

کارکن کار بگذر از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

(کام کرو کام باتیں بنانے سے گزر جاؤ کیونکہ اس راستہ میں تو کام چاہیے کام)

---

[1] کبھی تو فضیلت زمانہ میں خود ہوتی ہے پھر اس کی فضیلت سے کام میں فضیلت آ جاتی ہے اور کبھی زمانہ میں تو فضیلت نہیں ہوتی۔اس میں فضیلت والا کام ہونے اور اس کے لئے اس کا زمانہ ہونے سے اس میں فضیلت آ جاتی ہے۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم   کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(طریقت میں تو قدم رکھنا ضروری ہے نہ کہ دم بھرنا کیونکہ دم بھرنا بغیر قدم رکھنے کے کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔)

والدین کی خدمت کی فضیلت اور اس کے ترک پر ملامت خاص کر جبکہ بوڑھے ہوں اور اس کی شکایت کہ آدمی اکثر ان کی تنگ مزاجی سے تنگ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ

حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کے مجمع میں فرمایا رغم انفہ، رغم انفہ، رغم انفہ (مٹی میں مل جاوے اس کی ناک (عزت) تین بار فرمایا) صحابہ یہ الفاظ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ کون شخص آپ نے فرمایا کہ ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ کو پاوے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے۔ حضور نے بوڑھے کی قید اس لئے بڑھادی کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تو اول تو وہ اس کے محتاج نہیں ہوں گے جیسے اس کے ہاتھ پیر چلتے ہیں ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے ہیں دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا۔ اس لئے اگر ان کی کچھ خدمت بھی کر دی تو کچھ بڑی بات نہیں۔ بخلاف بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اس کے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قویٰ بالکل کمزور ہو جاتے ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتے اور اکثر کام مرضی موافق نہیں ہوتے۔ تو تنگ مزاج بہت ہو جاتے ہیں اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا بوجہ ان کی معذوری کے ضروری اور ان کی تنگ مزاجی سے تنگ ہو جانا اور نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ طفولیت وعام احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے ناز اٹھائے ہیں اگر وہ یاد رہیں تو بڑا نفع ہو۔

حکایت: ایک بنئے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ اول تو اس پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی مگر تہذیب سے کام لے کر

بتلا دیا کہ ابا جان کوا ہے بیٹے نے پھر پوچھا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ نے کہا ابھی تو بتلا دیا تھا کہ کوا ہے تیسری بار اس نے پھر پوچھا تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چپکے پڑے رہو۔ اس پر بیٹے نے اپنا بھی کھاتہ منگایا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب دیا تھا۔ تم دو ہی بار میں گھبرا گئے۔

بوڑھے ماں باپ کی تنگ مزاجی سے تنگ ہونے کو جو منع کیا جاتا ہے اس پر شبہ اور اس کا جواب اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک لطیف دلیل

لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تنگ مزاجی سے ناگواری تو امر طبعی ہے اگر اس پر بھی باز پرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبعیہ پر خدا تعالیٰ نے کہیں باز پرس نہیں فرمائی۔ باز پرس امور اختیاریہ میں ہے۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرما رہا ہے۔ پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ ربکم اعلم بما فی نفوسکم ان تکونوا صالحین فانه کان للاوابین غفوراً (تمہارا رب خوب جانتا ہے ان چیزوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں اگر تم واقعی نیک ہو گے تو وہ خدا کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے بہت بخشنے والے ہیں) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجی سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے یہ تو امر طبعی ہے۔ اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جاوے اس میں معذور ہو لیکن خدا تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے صاحبو ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے کے کلام میں اس قدر

رعایت ممکن نہیں اسی طرح کلام مجید کی تمام آیتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں مگر افسوس ہے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود نہ پڑھنے پر ملامت

ایک شخص تو رغم[1] انفہ' کا محل یہ ہوا دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آوے اور وہ درود نہ پڑھے

رمضان میں توبہ اور اعمال صالحہ کرنا موجب مغفرت ہیں اور ان کے ترک پر ملامت اور اس کا بیان کہ مغفرت کا حاصل کرنا ہر شخص کے اختیار میں ہے

تیسرے وہ شخص[2] کہ رمضان شریف آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی۔ یعنی ایسے عمل اور توبہ نہ کر لی جس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ایک دوسری حدیث میں بھی مغفرت سے رمضان کے تعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے[2]۔ هو شهر' اوله رحمة واوسطه' مغفرة وآخره عتق من النيران (وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا شروع رحمت' درمیان بخشش اور آخر دوزخ سے آزادی ہے)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت و مغفرت ہے پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ نیک عمل کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیاری ہی ہے چنانچہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وسارعوا الیٰ مغفرة من ربكم و جنة عرضها السمٰوٰت والارض اعدت للمتقين الذين ينفقون جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے تو جو شخص اس راستہ چلے اور اس مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کرے گا جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہے گا۔ پس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے۔ اگر ہم چاہیں اس کو

---

[1] مٹی میں مل جاوے اس کی ناک یعنی عزت [2] رغم انفہ کا محل ہے ۱۲

خود حاصل کر سکتے ہیں کہ متقی بن جاویں۔

بے علم واعظوں کی غلطی اور اس کا بیان کہ خدائے تعالیٰ کے یہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے

اس موقعہ پر بے علم واعظوں کی ایک غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ وعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات بالکل بے پرواذات ہے وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخش دے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیج دے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں۔ بلکہ یوں ہی اناپ شناپ بے تکے طور پر جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور عبادت ریاضت چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کس نکتہ پر اچانک پکڑ ہو جاوے اور ساری محنت برباد ہو جاوے اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ ہی عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں۔ ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آ جائے کہ اس پر نوازش ہو جاوے گویا کارخانہ خداوندی اندھیر نگر کی سلطنت ہے کہ جہاں سارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔

حکایت: مشہور ہے کہ چیلہ[1] گرو سفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو اندھیر نگر معلوم ہوا جس کے معنی ہیں بے انصافی کا شہر اشیاء کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر ہر چیز سولہ سیر کی ملتی ہے یہ سن کر چیلہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر فربہ ہوں گے مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام کرنا مناسب نہیں یہ تو شہر بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے۔ کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز ہی نہیں مگر چیلہ نے اصرار کیا آخر رہ پڑے۔ چند روز میں سیر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے۔ دیکھا کہ

---

[1] ہندو جوگی گرو اس کا شاگرد چیلہ ہے

ایک مقدمہ راجہ صاحب کے اجلاس میں درپیش ہے اور لوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی چور مدعی ہے۔ مہاجن مدعا علیہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم دونوں چوری کرنے اس کے گھر گئے نقب لگایا میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آ پڑی مر گیا۔ قصاص چاہتا ہوں۔ مدعا علیہ سے باز پرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی تھی۔ اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے وہ بلایا گیا اس نے کہا گارہ دینے والے سے پوچھا جاوے اس کو بلایا گیا اس نے کہا گارہ بنانے والے سے پوچھئے اس کو بلایا اس نے کہا سقہ نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہو گیا اس کو بلایا اس نے کہا سرکار ہاتھی جھپٹتا ہوا آتا تھا۔ خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا۔ فیل بان کو بلایا اس نے کہا ایک عورت پازیب پہنے آتی تھی اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا۔ عورت کو بلایا اس نے کہا سنار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا تھا اس کو بلایا وہ جواب نہ دے سکا حکم ہوا کہ سنار کو پھانسی دے دی جائے۔ پھانسی کے لئے لے چلے اس کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا لوگوں نے آ کر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دے دو۔ غرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلے سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا۔ آخر اسی کو تجویز کیا گیا۔ اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا خدا کے لئے بچاؤ۔ اس نے جواب دیا میں نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں آخر نتیجہ دیکھا آخر گرو نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو اس کو پھانسی نہ دو مجھ کو دے دو۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا اس وقت میں نے جوتش میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جائے گا وہ سیدھا بیکنٹھ (جنت) میں جاوے گا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سنا تو بڑھ کر فرمایا کہ اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دیدو۔ تا کہ جنت ہم ہی حاصل کر لیں۔ چنانچہ راجہ کو پھانسی دے دی گئی[1]۔ خس کم جہاں پاک صادق ہوا۔ تو ان نیم واعظوں کے ایسے بیانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی بھی دوسرا انیاؤ نگر ہے۔ صاحبو یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے ہاں ہر کام کا ایک

[1] کوڑا کم اور جہاں صاف ہو گیا

قانون مقرر ہے ثواب کا بھی ایک قانون ہے عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے۔

مغفرت کا حاصل کرنا امر اختیاری ہے اور اس کا طریقہ

ثواب کا قانون تو یہ ہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ وسارعوا الخ (جنت ومغفرت کی طرف دوڑ پڑو) یعنی تقویٰ حاصل کرلو اور مغفرت و جنت لے لو۔ معلوم ہوا کہ مغفرت و رحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے ورنہ اگر اس کو اختیار میں نہ مانا جاوے تو سارعوا (دوڑ پڑو) کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ کیونکہ تکلیف[1] مالا یطاق محال ہے اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہوا مسارعۃ الی[2] المغفرۃ کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے پس جب رحمۃ اور مغفرۃ کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو۔

توبہ میں تاخیر نہ کرنا چاہیے اگرچہ آئندہ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو کیونکہ توبہ کرنا اس حالت میں بھی مفید ہے اور اس کا ترک مضر ہے

اگر یہ خوف ہو کہ توبہ ٹوٹ جائے گی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو بھی ہمت نہ ہارو کیونکہ پھر توبہ کر لینا۔ دیکھو[3] اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جائے گا بلکہ سی کر پھر کام میں لاتے ہیں۔

بس یہی حالت توبہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک کرنا نہ چاہیے بلکہ اس وقت پھر توبہ کر لینا چاہیے باب توبہ بند نہیں ہوا بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جاوے تو پھر توبہ کرلو۔ مایوس نہ ہو جاؤ خوب کہا ہے ؂

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(باز آ جاؤ باز آ جاؤ جیسے کچھ بھی تم ہو اس سے باز آ جاؤ توبہ کرلو۔ اگر تم کافر ہو آگ پوجنے والے ہو بت پرست ہو تو بھی باز آ جاؤ)

---

[1] طاقت سے باہر کام کا ذمہ دار بنانا۔ [2] بخشش کی طرف دوڑ پڑے گا۔ [3] یا یوں کہیے کہ میلا ہو جاتا ہے تو دھوتے یا دھلواتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ پھر میلا ہو جا ئے گا

ایں درگہ مادرگہ نو میدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(یہ ہماری بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے سو بار بھی توبہ توڑ چکے ہو تو بھی باز آ جاؤ توبہ کرلو) بلکہ اسی ترک توبہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ جرأت ہوگئی ہے کیونکہ جو شخص توبہ کرتا رہے گا اس کے دل میں عظمت خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی۔ یہ بڑا سبب ہے معاصی سے رک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی توبہ نہ کرے گا۔ وہ خدا کو بالکل بھول جائے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہوگی تو جو کچھ بھی اس سے ہو جاوے بعید نہیں۔

عشرہ اخیرہ میں جو منکرات کئے جاتے ہیں ان کی اصلاح

اس عشرہ اخیرہ میں اکثر مساجد میں قرآن شریف ختم ہوتا ہے اور اس میں اکثر لوگ پڑھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں سو یہ[1] لینا چھوڑ دو۔ دوسرے اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرینی تقسیم ہوتی ہے اس میں جو گڑبڑ ہوتی ہے سبھی جانتے ہیں اور ان گڑبڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کیا گیا ہے[2] اس وقت صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس کو بھی چھوڑ دو دیکھو اس کی بدولت بیچارے بعض غرباء پر سخت بار ہو جاتا ہے اس انتظام کے متعلق بعض غریب جولاہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچا لیا۔ معلوم ہوا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہو جاتا ہے۔ بتلایئے یہ کیونکر جائز ہوگا۔ بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو منع کرنے کی ضرورت نہیں حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے نہ چھوڑا تو شرم وحجاب کی وجہ سے غرباء سے چھٹنا بہت مشکل ہے اور اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں۔ بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرینی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً ریاء ونمود کے لئے تقسیم کرنا عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلاوجہ پٹنا۔ غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی

---

[1] قرآن بیچنا اور یہ لینا دینا دونوں بڑا گناہ ہیں [2] حضرت کی کتاب اصلاح الرسوم میں سب کی تفصیل ہے۔

ان کو خود سمجھ سکتا ہے۔ ایک مرتبہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرینی کے لئے کہا میں نے منع کیا لیکن انہوں نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہو جائے چنانچہ میں خاموش ہو رہا۔ شب کو شیرینی تقسیم کی گئی اور انہوں نے اپنے اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی۔ واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنی چاہیے اور اس کا احسان ان کی دانشمندی کی دلیل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بھی اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔

آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع کا پڑھنا بدعت ہے اور گو اس کے اندر مصلحتیں ہوں لیکن جبکہ اس کے اندر مفاسد بھی ہیں اور خود امر ضروری بھی نہیں ہے اس لئے اس کا ترک لازم ہے

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم شھر رمضان ھو شھر اولہ' رحمۃ و اوسطہ مغفرۃ و آخرہ عتق من النیران (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رمضان کا مہینہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا شروع رحمت درمیان مغفرت اور اخیر دوزخ سے آزادی ہے) یہ حدیث شریف ایک بڑی حدیث کا جزو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری جمعہ کے دن خطبہ میں پڑھا تھا۔ اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری جمعہ میں ایک خاص خطبہ پڑھا جو کہ اور جمعوں میں نہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں سے تعجب ہے کہ انہوں نے اس منصوص خطبہ پر تو توجہ نہ کی اور شعبان کے آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کیا۔ جس سے وہ عامل بالسنّت ہوتے اس کے بجائے رمضان کے آخری جمعہ کے لئے ایک خاص خطبہ الوداع اختراع[1] کیا۔ جس کا کہیں حدیث میں پتہ نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسا شغف[2] ہوا کہ بغیر اس خاص خطبہ کے پڑھے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا جمعہ ہی نہیں ہوا۔ اگرچہ بحمداللہ اس وقت لوگوں کو اس

---

[1] ایجاد جو حضور صحابہ تابعین سے بے اصل ہے [2] عشق

کے نہ پڑھنے سے وہ وحشت جو کہ اس کے قبل ہوتی تھی نہیں ہوتی لیکن تاہم اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ اس خاص الوداعی خطبہ کو آخری جمعہ رمضان کا لازمی عمل سمجھتے ہیں اور بڑا تعجب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم کو بھی دھوکہ ہو گیا اور وہ سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے کہتے ہیں کہ اگر چہ آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز کرنا بدعت ہے لیکن چونکہ اس کی وجہ سے لوگ اکثر جمع ہو جاتے ہیں اس لئے اس اجتماع کے لئے معین[1] اور ادائے صلوۃ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے باقی رکھنا چاہیے۔ حالانکہ یہ سخت غلطی اور من وجہ[2] خدا اور رسول پر اعتراض کرنا ہے۔ غلطی تو اس لئے کہ شریعت کا مشہور حکم ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں کچھ مصلحتیں بھی ہوں اور کچھ مفاسد بھی ہوں اور وہ کام بالذات[3] یا بالغیر مطلوب شرعی نہ ہو تو ان مفاسد پر نظر کر کے اس کام کو ترک کر دیں گے اور مفاسد سے بچیں گے۔ مصالح کا اعتبار نہ کریں گے اور یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے جس کو اہل علم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے لیکن عوام کے سمجھانے کے لئے میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص مجلس رقص منعقد کرے اور کہے کہ اگر چہ رقص فی نفسہ ممنوع اور حرام ہے لیکن میری غرض اس مجلس سے لوگوں کو جمع کرنا ہے تاکہ جمع ہو جانے کے بعد میں اپنی وجاہت سے کام لے کر ان کو نماز پڑھنے پر مجبور کروں اور اسی طرح ان کو نماز پڑھنے کی عادت ہو جاوے۔ تو دیکھئے بظاہر اس مجلس کی غایت کس قدر خوبصورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے لیکن چونکہ اس مجلس میں ایک مصلحت کے ساتھ بہت سے مفاسد بھی ہمدوش ہیں اور مجلس رقص بالذات یا بالغیر مطلوب نہیں جیسا کہ ظاہر ہے اس لئے شریعت اس مصلحت مذکورہ کی وجہ[4] سے اس کی اجازت نہ دے گی بلکہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس مجلس کے انعقاد سے باز رکھے گی۔

---

[1] مددگار کہ اس کی وجہ سے بہت لوگ آئیں گے اور اس کو بدعت حسنہ کہتے ہیں مگر یہ غلط ہے یہ شرعی بدعت ہے اور شرعی بدعت کوئی حسنہ نہیں ہوتی سب گمراہی اور شدید گناہ ہیں۔ عربی میں لغوی بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں ان میں جس کی اصل ہو وہ لغوی بدعت حسنہ ہے۔ [2] ایک طرح کہ ان کو خود اس کا یہ درجہ مقرر کرنا تھا۔ [3] خود یا کسی نیک کام کا ذریعہ بننے سے مطلوب نہ ہو۔ [4] جیسے کہ آج کل بعض لوگ سینماؤں کو اخلاقی تہذیبی یا تبلیغی غرض سے جائز بنانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی بدعقلی اور بدعقیدگی اور بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہوتا۔ ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ اس کے نتیجے آوارگی بدمعاشی چوری جعل سازی اور قتل و غارت تک سب کے سامنے ہیں۔

جو امر کہ خود ضروری ہو لیکن اس کے اندر مفاسد بھی شامل ہو گئے ہوں تو اس سے منع نہ کیا جاوے گا بلکہ خود ان مفاسد کا انتظام کیا جاوے گا جیسے نماز عید کے لئے عیدگاہ میں جمع ہونے میں اگر مفاسد پیدا ہو جاویں

ہاں اگر کوئی کام بالذات[1] یا بالغیر مطلوب ہو اور اس میں مصالح کے ساتھ مفاسد بھی ہوں تو اس کام کو ان مفاسد کی وجہ سے ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ اس کو باقی رکھ کر مفاسد کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاوے گی مثلاً عیدگاہ کا اجتماع اداء صلوٰۃ کے لئے شرعاً مطلوب ہے پھر اگر لوگ اس بدتمیزی کی وجہ سے اس میں کچھ خرابیاں آمیز کر لیں جیسا کہ مثلاً آج کل عام طور سے بچوں کو عیدگاہ میں لے جانے کا رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھلا ضرور لئے ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ باوجود ہر سال تکلیف اٹھانے کے پھر بھی لوگوں کو اس کی ذرا حس اور تمیز نہیں ہوتی۔ شاید کوئی سال ایسا ہوتا ہو کہ بچے عیدگاہ میں جا کر عین نماز کے وقت رونا بسورنا نہ شروع کرتے ہوں بلکہ ایک دو تو ان میں سے ہگ موت بھی دیتا ہے۔ خود میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ میرے ایام تعلیم میں ایک میرا عزیز کم عمر میرٹھ کی عیدگاہ میں والد صاحب کے ساتھ گیا اور اس نے نماز کے وقت قضا حاجت کی فرمائش کی۔ اس کی فرمائش سن کر سخت پریشانی ہوئی۔ اول تو عین نماز کا وقت دوسرے میرٹھ کی عیدگاہ جس میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع کہیں قریب ایسا جنگل بھی نہیں جس میں اس کو بٹھلا دیا جاتا پھر نماز کھڑے ہونے کا وقت بالکل قریب آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک حلوائی کو چار آنہ دیئے گئے اس نے اپنے تخت کے نیچے ان کو بٹھلا لیا۔ چاروں طرف سے کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ اوپر رنگ برنگ کی مٹھائی اور اندر یہ تحفہ بھرا ہوا تھا۔ (جملہ معترضہ)

ہمارا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے

یہاں ایک عبرتناک مضمون خیال میں آیا کہ یہی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اس مٹھائی

---

[1] خود مطلوب ہو یا کسی مطلوب عمل کا ذریعہ ہو

کی طرح ہمارا ظاہر تو نئے نئے انداز سے پر رونق اور چکنا چپڑا رہتا ہے لیکن ہمارے باطن کی یہ حالت ہے کہ گو در گو مرغی کا گو۔ ہوائے نفسانی سے لبریز بے ہودہ خیالات سے پر خدا سے دور شیطان سے قریب۔ ایک محقق نے خوب فرمایا ہے ؎

از بروں چوگور کافر پر حلل   واندروں قہر خدائے عزوجل

(کافر کی قبر کی طرح باہر سے حلون والے اور اندر خدا تعالیٰ کا قہر)

از بروں طعنہ زنی بر بایزید   واز در وقت ننگ میدارد یزید

(باہر سے تو حضرت بایزید بسطامی پر طعنہ والے اور اندر سے یزید بھی شرمندہ۔ زبانیں ان کی شکر سے زیادہ میٹھی اور دل ان کے بھیڑیوں سے زیادہ کڑوے جو بھیڑوں کی کھال کا پوستین پہنتے ہیں)

صورت تو ایسی مقطع کہ معلوم ہو کہ اگر وحی منقطع نہ ہو چکی ہوتی تو حضرت جبرئیل انہیں کی خدمت میں آتے اور دل کی یہ حالت کہ شیطان کے بھی شیطان جیسا حدیث میں آیا ہے۔

السنتھم احلیٰ من السکر وقلوبھم امر من الذیاب جلود الضان

رجوع بجانب سرخی (جو امر کہ خود تو ضروری ہو الخ)

غرض عید گاہ کی حاضری میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اگر کوئی عاقل پہلے کلیہ کی بناء پر یہ کہے کہ ان مفاسد کی وجہ سے عید کا اجتماع بھی چھوڑ دینا چاہیے تو اس سے کہا جاوے گا کہ چونکہ عید گاہ کا اجتماع شریعت میں مطلوب ہے اس لئے اس موقعہ پر وہ قاعدہ نہ برتا جاوے گا اور عید کا جانا ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ بجائے اس کے ان مفاسد کی اصلاح کی کوشش کی جاوے گی یعنی مثلاً لوگوں سے کہا جاوے گا کہ بچوں کو عید گاہ میں لے کر نہ آیا کریں۔

نماز عید کے لئے عید گاہ میں جمع ہونا شریعت کو مطلوب ہے اور اس کا راز اور اس کا بیان کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا گو اس سے وساوس آتے ہوں تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے

اور اگر کسی کو اس اجتماع کی مطلوبیت میں کلام ہو جیسا کہ اس وقت بعض نام کے

مشائخ بجائے عیدگاہ کے اپنی مساجد ہی میں بلا ضرورت صرف امتیاز کے لئے عیدین پڑھتے ہیں تو میں اس کا ثبوت حدیث سے دیتا ہوں۔ دیکھئے مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن باوجود اس کثرت ثواب کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس موقع پر عیدگاہ میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوی میں نماز نہیں پڑھی پس معلوم ہوا کہ عیدگاہ کا اجتماع ایک مہتم بالشان مطلوب ہے اور ممکن ہے کہ عیدگاہ کے ثواب میں بجائے کثرت[1] کمی کے کیفاً کثرت ہو جاتی ہو۔ یعنی وہ ایک ثواب ہی ان پچاس ہزار ثواب سے زیادہ ہوتا ہو اور اسی کثرت کیفی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ مسجد کو چھوڑ کر عیدگاہ جاتے ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچے کے سامنے ایک گنی اور دس روپے پیش کئے جاویں تو بچہ دس روپوں کو عدد میں زیادہ دیکھ کر انہیں کو اٹھا لے گا لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے ان دونوں کو پیش کیا جاوے تو وہ روپوں کو چھوڑ دے گا اور گنی اٹھا لے گا کیونکہ گنتی میں گو ایک اور دس کا فرق ہے لیکن کیفاً وہ ایک ان دس سے زیادہ ہے پس اسی طرح ممکن ہے کہ عیدگاہ کے اجتماع میں کیفاً اس قدر ثواب ہو کہ مسجد نبوی کے اجتماع میں وہ نہ ہو۔ اور ہر چند کہ یہ تضاعف[2] ثواب مسجد نبوی کا مخصوص ہے فرائض کے ساتھ اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی کو استدلال مذکور میں خدشہ ہو کہ صلوٰۃ عیدین میں یہ تضاعف مسجد نبوی میں نہ ہوگا پس استدلال تام نہیں۔ سو جواب یہ ہے کہ واجب بھی ملحق ہوتا ہے فرض کے ساتھ پس دونوں کا یکساں حکم ہوگا اور عیدگاہ کے اجتماع میں بالخصوص یہ بھی بھید ہے کہ مسلمان مختلف اطراف سے سمٹے ہوئے ہر ایک میدان میں جمع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا اجتماع ان کے بدخواہوں کے قلب پر موثر ہوتا ہے اور اسلامی شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اعظم مقاصد ملت سے ہے اور اس خاص اجتماع میں مطلق اجتماع جو متحقق ہے وہ خود بھی اسرار[3] مہمہ پر مشتمل ہے چنانچہ ایک ادنیٰ راز یہ ہے کہ سب کی عبادات مجتمع ہو کر جو سرکار میں پیش ہوں گی اگر بعض بھی قابل قبول ہوئیں تو اس کی برکت سے بقیہ بھی مقبول ہوں گی اور انہیں حکمتوں سے شرع میں جماعت کا بہت اہتمام ہے۔ حتیٰ کہ جماعت کی نماز اگر وسوسوں

---

[1] تعداد کی کثرت کے بجائے کیفیت کی کثرت کی زیادتی ہو۔ [2] بہت گونا ہونا ثواب کا [3] اہم رازوں پر

کے ساتھ بھی ہوتب بھی تنہا نماز سے بدرجہ بڑھ کر ہے اس لئے کہ وہ شرعاً مطلوب ہے۔ اور قطع وساوس اس درجہ مطلوب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(جب بادشاہ دین ہی ہم سے لالچ کرنے کو چاہیں تو پھر اسکے بعد قناعت کے سر پر خاک ہو)

افسوس ہے کہ بعض اکابر کو یہ دھوکہ ہو گیا کہ اگر جماعت کی نماز میں وسوسے آویں اور تنہائی میں اجتماع قلب ہو تو تنہا نماز پڑھنا بہتر ہے۔ جماعت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس کو ہم اپنی رائے سے غلط نہیں کہتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تغلیط فرمائی ہے۔ ہم ان بزرگوں پر اعتراض نہیں کرتے ہم صرف ان کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں۔

حاصل سابق نماز عید کے لئے عید گاہ میں اجتماع کا مطلوب ہونا اور بچوں کے وہاں لے جانے کی ممانعت

غرض چونکہ شریعت میں اجتماعی مصالح کی زیادہ رعایت ہے اور ظاہر ہے کہ جو اجتماع عید گاہ میں ہوگا مسجد میں نہ ہوگا لہٰذا گو کماً[1] عید گاہ کا ثواب زیادہ نہ ہو لیکن کیفاً زیادہ ہے اس لئے باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع کا ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں۔ ارشاد ہے جنبوا مساجد کم صبیانکم کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی صاحب عید گاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں۔ اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مساجدکم[2] میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ[3] مراد ہو تب تو عید گاہ اس حکم میں داخل ہونا ظاہر ہی ہے اور اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عید گاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ کے ملوث

---

[1] گو تعداد کے اعتبار سے نہ ہو کیفیت میں تو ہوگا　[2] اپنی مسجدوں　[3] ہر ایک سجدہ گاہ یعنی نماز کی جگہ

ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی۔ اور اس سے نماز میں خلل پڑے گا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عیدگاہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا۔ چنانچہ خود عیدگاہ کے باب میں حضور کا ارشاد ہے **ولیعتزلن الحیض المصلیٰ** (اور الگ رہیں حیض والیاں عیدگاہ سے)

رجوع بجانب سرخی (آخری جمعہ کو خطبہ الوداع پڑھنا بدعت ہے الخ)

پس اس مثال سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ وہ کلیہ[1] اس وقت ہے جبکہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ یہ تو دعویٰ غلطی[2] کی دلیل میں تھا ر ہا دوسرا دعویٰ کہ خطبہ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصالح مطلوب ہوئیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب و سنت کی تعلیم ناتمام ہوئی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فروگذاشت ہوگئی کیا کوئی اس کا قائل ہوسکتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت[3] فرمایا ہے اور بعض بدعت کے حسنہ[4] ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں اور اس قسم کا احتمال خطبہ الوداع میں نہیں ہوسکتا۔

کیونکہ اگر یہ معنی سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جاوے تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہوگیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت جس پر حضور نار کی وعید فرما رہے ہیں اور حضور کا ارشاد عین ارشاد حق ہے تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا اور رسول سے مزاح بھی ہے۔

---

[1] جس کام میں فائدے بھی ہوں اور خرابیاں بھی تو خرابیوں کی وجہ سے اس کام کو روک دیا جائے گا یہ قاعدہ کلی

[2] سات سرخی پہلے جو بتایا تھا کہ یہ سخت غلطی ہے اب یہ اس غلطی کی دلیل کا بیان تھا۔ [3] گمراہی اور ہر گمراہی کو دوزخ میں فرمایا۔ [4] بدعت حسنہ تو وہ ہے جو لغت کے اعتبار سے نئی ہونے کی وجہ سے عربی زبان میں بدعت (نئی بات کہلائے مگر اسلاف میں وہ یا اس کی نظیر ملتی ہو جو ایسی نہ ہو وہ غیر دین کو دین یا مباح و مستحب کو فرض واجب قرار دینے سے بدعت ضلالت ہی ہے جس کا انجام دوزخ ہے اور خدا اور رسول کی گستاخی ہے۔

تربیت اور ارشاد ہر شخص کا کام نہیں ہے

اور جو لوگ اس کے اہل ہیں ان کی پہچان

اہل علم کو ایسی ہی لغزشوں کی وجہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ بعضے لوگ بدعات میں مصالح بیان کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ کہا جاتا ہے کہ تربیت اور ارشاد خصوص حکمت فہمی اور اجتہاد ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے چند اصطلاحات یاد کر کے مسند ارشاد پر متمکن ہو جاوے بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے کہ ظاہری ضروری علم کے ساتھ مدد خداوندی بھی اس کے ساتھ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ علماء امت نے اس کے اقوال کو قبول کر لیا ہو اور علماء کا گروہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ اس قسم کی ایک لغزش یہ ہے کہ بعضے لوگ جمعہ کی نسبت کہتے ہیں کہ دیہات میں گو نہ ہو لیکن اگر پڑھ ہی لیا جاوے تو نہ پڑھنے سے تو بہر صورت پڑھنا اچھا ہے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ بمبئی میں گو حج نہیں ہوتا لیکن اگر پھر بھی کر لیا جاوے تو کیا حرج ہے۔ نہ کرنے سے تو اچھا ہی ہے اس کا کیا جواب ہے آخر یہی کہو گے کہ بمبئی حج کا محل نہیں میں کہوں گا دیہات[1] جمعہ کا محل نہیں۔

مقتدا وہ ہو سکتا ہے جو کامل العقل ہو اور بھولا ہونا کوئی کمال نہیں

غرض فہم دین کے لئے عقل کامل کی ضرورت ہے اس میں ظاہر بینی اور بھولا بھالا ہونے سے کام نہیں چلتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کامل العقل ہوئے ہیں۔ کوئی نبی بھی بھولا نہیں ہوا۔ اکثر لوگ بزرگوں کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ بہت بھولے ہیں لیکن یاد رکھو بھولے ہونے سے اگرچہ بعض اوقات انسان بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے اور اس لئے بھولا ہونا بھی گونہ فضیلت ہے لیکن فی نفسہ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں ہے

---

[1] قرآن مجید کے اشارات اور حدیث کی صراحت سے جمعہ کے لئے شہر یا شہر جیسا ہونا شرط ہے گاؤں اس کا محل نہیں وہاں پڑھنے سے نفل نماز ہوگی نفل کی جماعت کا اور فرض ظہر ترک کرنے کا گناہ ہوگا۔

کیونکہ اس سے آدمی بہت سے فضائل سے محروم رہتا ہے اسی لئے کوئی نبی بھولا نہیں ہوا۔ تمام انبیاء کرام کامل العقل ہوئے ہیں اور واقع میں عقل ہے بھی بڑی نعمت۔

سالک[1] کا مجذوب سے افضل ہونا اور عقل کی فضیلت

حکایت: ایک صوفی سے میرے سامنے ایک شخص نے سوال کیا کہ سالک کا مرتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا۔ انہوں نے اس کا عجیب جواب دیا۔ مجھے وہ جواب بہت ہی پسند آیا۔ فرمانے لگے کہ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ عقل اتنی بڑی نعمت ہے کہ شریعت نے شرب خمر کو حرام کر دیا جس سے وہ زائل ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ سالک کی عقل ٹھکانے رہتی ہے اور مجذوب عقل سے باہر ہوتا ہے۔ اب تم خود سمجھ لو کہ سالک کا رتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا شرح الصدور علامہ سیوطیؒ کی ایک کتاب ہے وہ اس میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی کہ جب تم قبر میں تن تنہا رکھے جاؤ گے۔ اور دو نہایت عجیب الخلقت فرشتے تم سے آ کر توحید و نبوت کے بارے میں سوال کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا اور کس قدر پیارا جواب عرض کیا۔ اور اگر وہ بھی یہ جواب نہ دیتے تو کون دیتا۔ عرض کیا یا رسول اللہ یہ فرمائیے کہ اسوقت ہماری عقل رہے گی یا نہیں۔ حضور نے فرمایا کہ ہاں عقل باقی رہے گی بلکہ عقل میں اور ترقی ہو جاوے گی (کیونکہ ہیولانی[2] حجاب اس وقت باقی نہ رہیں گے) حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر عقل باقی رہے گی تو کوئی خوف کی بات نہیں۔ ان شاء اللہ سب معاملہ درست رہے گا۔ دیکھئے یہ حضرات صحابہ عقل کی کس قدر عزت کرتے تھے اور اس کو کتنی بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ ایک ہم لوگ ہیں کہ ذہاب[3] عقل کو امارات بزرگی سے سمجھتے ہیں ایک قصہ اس مقام پر یاد آیا گو میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور اس لئے ممکن ہے کہ غلط ہو۔ لیکن اس کے غلط ہونے سے ہمارا ضرر نہیں کیونکہ ہم تو

---

[1] شریعت پر عمل کے سہل طریقہ کو طریقت کہتے ہیں اگر ہوش و حواس باقی رہتے ہوئے اس راہ کو طے کیا تو سالک ورنہ مجذوب ہے جبکہ حال کے غالب ہونے سے ہوش باقی نہ رہیں۔ [2] خاکی جسم اور اس صورت مادی سے جو روح پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ نہ رہیں گے۔ [3] عقل جاتے رہنے کی بجائے خامی کے بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں۔

اپنے مضمون کو حدیث سے موئید[1] کر چکے ہیں وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت رابعہ کو جس وقت دفن کیا تو حسب قاعدہ فرشتوں نے آ کر سوال کیا تو حضرت رابعہ نہایت اطمینان سے جواب دیتی ہیں کہ کیا اس خدا کو جس کو عمر بھر یاد رکھا گز بھر زمین کے نیچے آ کر بھول جاؤں گی۔ تم اپنی خبر لو کہ بڑی مسافت طے کر کے آئے ہو تم کو بھی یاد ہے کہ نہیں۔ سبحان اللہ ان حضرات کا یہی اطمینان ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست   گویم آں کس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما

(اگر قبر میں سوال کرنے والا فرشتہ نکیر آئے اور پوچھے تمہارا رب کون ہے تو میں کہہ دوں گا وہی جو ہمارا دل دیوانہ لے گیا ہے)

کیسے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ میں تو یہ جواب دوں گا۔ کہ ''آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما'' تو یہ سارا اطمینان بقاء عقل ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس صوفی نے یہ کہا کہ بھائی سالک کا رتبہ بڑا ہے کیونکہ اس کی عقل باقی رہتی ہے جس کی بدولت اس کو سینکڑوں مصیبتوں سے نجات ہو جاتی ہے۔

سالک سے خلق کو ہدایت ہوتی ہے اور مجذوب محض اپنے کام کا ہوتا ہے

لیکن اب یہ سمجھنا چاہیے کہ انبیاء تو سب کے سب کامل العقل ہوئے اور صوفیہ میں جو کہ انبیاء ہی کے نائب ہیں کچھ سالک یعنی کامل العقل اور کچھ مجذوب یعنی جن کی عقل غلبہ حالات سے مغلوب ہو گئی ان میں یہ دو قسمیں کیوں ہوئیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب ارشاد و تربیت کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ اس لئے ان کا کامل العقل ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر تربیت نہیں کر سکتے تھے اور اولیاء بعضے تو ارشاد خلق کی غرض سے پیدا ہوتے ہیں ان کو تو سلوک کا مرتبہ عطا ہوتا ہے تا کہ بقاء عقل کے ساتھ تربیت کا کام انجام دے سکیں اور یہی لوگ ہیں جن کو ورثۃ الانبیاء کہا جاتا ہے اور بعضے محض

---

[1] تائید کیا ہوا قوت دیا ہوا۔

اپنے ہی کام کے لئے پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق تربیت نہیں ہوتی۔ مجذوبین ان ہی میں ہوتے ہیں گو بعض غیر مجذوبین بھی ایسے ہوتے ہیں ان کی یہ شان ہوتی ہے ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار　　　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تم تو عاشق ہو تم کو پیر بننے سے کیا مطلب بس ان کے دیوانے رہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

بخلاف سالکین کے کہ ان کی حالت ان کی حالت کے بالکل خلاف ہے ان کی یہ حالت ہے کہ ع

خاص کند بندہ مصلحت عام را

(عام لوگوں کی مصلحت کو بندہ خاص طور سے لے لیتا ہے)

مجذوبین کے فیض کا غیر اختیاری ہونا

ہاں مجذوبین سے بھی ایک قسم کا فیض ہوتا ہے جو بلا ان کے اختیار کے محض وجود[1] باوجود کی بدولت ہے۔ سو اس کے لئے بھی عقل کی ضرورت نہیں۔ عقل کی ضرورت اس فیض کے لئے ہے جو با اختیار ہو۔ غیر اختیاری فیض کی مثال آفتاب کا نور ہے کہ گو آفتاب قصد نہ کرے لیکن اس کا نور عالم کو پر نور ضرور کرے گا اسی طرح اللہ کے نیک بندے جہاں کہیں ہوتے ہیں ان کی برکات عالم کو منور ضرور کرتی ہیں۔ اسی برکت کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔ ما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم (نہیں ہیں اللہ تعالیٰ کہ ان لوگوں کو عذاب دیں اس حالت میں کہ آپ ان میں موجود ہوں۔ تو آپ کی برکت سے کافروں سے عذاب ہٹ گیا) جیسا کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے کہ بدکاروں کی بدولت اچھے لوگ تباہ و ہلاک ہو جاتے ہیں۔

اس کا بیان کہ دیندار کو خدا تعالیٰ کی مخالفت پر غیظ و غضب کا ہونا لازم ہے اور یہ حمیت دین ہے نہ کہ تعصب جیسا آج کل سمجھا جاتا ہے

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے پہلا قاعدہ ٹوٹ گیا کیونکہ وہ اچھے لوگ جو کہ ان

---

[1] حق تعالیٰ کے سخاوت والے وجود سے

بدکاروں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے یا تو وہ صورۃ اچھے ہوتے ہیں واقع میں اچھے نہیں ہوتے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں شہر کو الٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ اس شہر میں فلاں شخص رہتا ہے جس نے کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ کیا اس کو بھی سب کے ساتھ الٹ دوں۔ ارشاد ہوا کہ گو ظاہراً اس نے نافرمانی نہیں کی مگر دوسروں کی نافرمانی دیکھ کر اس میں کبھی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ لہٰذا اس کو بھی الٹ دو۔ دیکھئے یہ شخص ظاہری حالت میں ایسا بزرگ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی دھوکہ ہو گیا۔ لیکن واقع میں ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا تھا کہ اس کو خدا تعالیٰ اور اس کے احکام کے ساتھ محبت کا جوش ذرا نہیں تھا ورنہ یہ ممکن نہیں کہ خدا اور رسول کی محبت ہو اور اس کی مخالفت و نافرمانی دیکھ کر یا شریعت کا استخفاف[۱] سن کر اسکے دل میں مخالفین سے غیظ نہ پیدا ہوا یا اس کو ان کی حرکات ناگوار نہ ہوں اگر کسی دیندار کو ایسے امور ناگوار ہوتے ہیں تو اس کو متعصب اور بدمزاج کہا جاتا ہے اور یہ رائے دی جاتی ہے کہ صاحب نرمی سے جواب دینا چاہیے تھا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی شخص سے یہ کہا جاوے کہ ہم نے تمہاری ماں کو بازار میں بیٹھے ہوئے اور بازاری عورتوں کی حرکات میں مبتلا پایا ہے تو کیا یہ شخص اپنی ماں کی نسبت ٹھنڈے دل سے یہ الفاظ سن لے گا اور کہنے والے پر حملہ کرنے کو آمادہ نہ ہو جاوے گا کیا اس کے اس جوش کو تعصب کہا جاوے گا اس کو بھی ایسی رائے دی جاوے گی مگر مولویوں پر الزام ہے کہ یہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور ان کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ یہ بڑے متعصب ہیں لیکن صاحبو ذرا غور کیجئے اور انصاف سے کام لیجئے کوئی مولوی بھی سیدھی بات پر خفا نہیں ہوتا۔ نہ کسی مولوی کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ اگر پوچھنے کی طرح ان سے پوچھا جاوے اور بات کرنے کی طرح ان سے بات کی جاوے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولوی غصہ کریں اور خفا ہوں[۲]۔ ہاں جب ان کے ساتھ استہزا[۳] اور خدا اور رسول کے احکام پر اعتراض بطور عناد[۴] کیا جاتا ہے تو ضرور وہ بیتاب ہو جاتے ہیں اور یہ غصہ یا

---

[۱] ہلکا کرنا حقیر بنانا۔ [۲] مگر دل میں دین کی عظمت نہ ہونے سے بات کرنے والے تو اپنے نزدیک ان باتوں کو بری بات نہیں سمجھتے اور جاننے والے سمجھتے ہیں ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور غیرت و حمیت ابھر آتی ہے۔
[۳] ہنسی اڑانا۔ [۴] دشمنی کے طریقہ پر

بے تابی تعصب نہیں ہے یہ دین کی حمیت ہے۔ صاحبو کیا شریعت کے احکام کی وہ عظمت اور محبت بھی دل میں نہ ہونا چاہیے جو کہ اپنی ماں کی ہے کہ ماں کی نسبت ناگوار کلمات سن کر تو انسان قابو سے باہر ہو جائے اور اپنے آپے میں نہ رہے اور شریعت کی ہتک ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو غصہ بھی نہ آ جاوے[1] اور جن کو غصہ نہیں آتا وہ ناحقیقت شناس ہیں۔ اس لئے ان کو غیرت نہیں آتی کچھ دنوں اس رنگ میں آپ اپنے قلب کو رنگو اور پھر بھی اگر یہ حالت رہے تو جانیں صاحبو محض الفاظ کے سننے سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ یہ کیفیت کیونکر ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ حالت گزری نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست — گفتم کہ چو ما شوی بدانی

(کسی نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہے میں نے کہا ہم جیسے ہو جاؤ جان لو گے)

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تقلیداً[2] ہی کہہ رہا ہوں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جن حضرات کی تقلید اختیار کی ہے ان کو سچا سمجھتا ہوں۔

محبان حق کی کیا حالت ہوتی ہے اور اس کا بیان کہ جو لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں وہ جنت میں آپ کے ساتھ رہیں گے

صاحبو ان حضرات کی غیرت کی یہ حالت تھی کہ خدا اور رسول سے دور کرنے والی چیزوں کو گو وہ چیزیں ان کی کیسی ہی مرغوب و محبوب ہوں۔ طاغوت[3] سمجھتے ہیں۔ حضرت طلحہؓ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک پرند اس میں اڑ کر آ گیا اور چونکہ باغ نہایت گنجان تھا باہر نکل جانے کے لئے اس کو کوئی راستہ نہ ملا۔ پریشان ادھر ادھر اڑتا پھرنے لگا۔ اس پرند کی یہ حالت دیکھ کر حضرت طلحہؓ کے دل میں باغ کے گنجان ہونے پر گونہ مسرت پیدا ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ ماشاء اللہ میرا باغ کس قدر گنجان اور اس کے درخت

---

[1] ایسی بات پر تو ہر مسلمان کو غصہ آنا ضروری ہے جس کو بھی اللہ اور رسول سے محبت ہو مولوی ہو یا معمولی
[2] بزرگوں کے اتباع میں [3] ایک بت یا شیطان سمجھتے ہیں۔

ایک دوسرے سے کیسے پیوستہ ہیں کہ کسی پرندہ کو بھی بآسانی نکل جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ خیال آ تو گیا لیکن چونکہ دل میں عظمت و محبت خداوندی معراج کمال پر تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر برکت سے فیضیاب تھے۔ اس لئے فوراً ہی تنبہ ہوا اور دل میں سوچے کہ اے طلحہ تیرے دل میں مال کی یہ محبت کہ حالت نماز میں تو ادھر متوجہ ہو آخر نماز کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یارسول اللہ میرے باغ نے آج مجھے عین نماز کی حالت میں خدا سے مشغول کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ لہٰذا اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا اور اس شغل عن الحق[1] کے کفارہ میں میں اس کو وقف کرتا ہوں۔ آخر اس کو وقف کر دیا۔ جب دل کو اطمینان ہوا ان حضرات کی یہ شان ہے کہ **اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون** (جب ان کو شیطان کا چکر لگانے والا چھو جاتا ہے وہ اللہ کا ذکر کرنے لگتے ہیں تو اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کہ اگر شیطان کے وسوسہ سے کسی ضعیف سے درجہ میں بھی ان کے قلب کو میلان الی الدنیا ہو جاتا ہے تو فوراً متنبہ[2] ہوتے ہیں اور ایسا قلق ہوتا ہے کہ گویا ہفت اقلیم کی سلطنت ان کے قبضہ سے نکل گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت نکل جانے سے بھی اتنا صدمہ نہیں ہوتا جو ان حضرات کے قلب پر اس میلان سے ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہر چہ از دوست و امانی چہ کفراں حرف چہ ایماں
بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(جس حرف کی وجہ سے دوست سے عاجز رہ جاؤ کیا کفر ہے وہ کیا ایمان جس نقش سے محبوب سے دور ہو جاؤ۔ کیا برا ہے کیا اچھا)

شاید لوگوں کو چہ تعجب ہو کہ ذرا سا خیال آ جانے سے ان کے دل پر ایسا صدمہ کیسے گزرا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان لوگوں کے نزدیک تمام دنیا شغل[3] بحق کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود | گر ز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

---

[1] حق تعالیٰ سے غفلت کے [2] ہوشیار [3] حق تعالیٰ میں مشغول رہنے کے

ایک خلال اتنا قیمتی ہے کہ دنیا تمام اس پر فدا ہے اور دنیا تو ان کو کیا مطلوب ہوتی۔ عالم آخرت کی طرف بھی ان حضرات کی توجہ صرف اس لئے ہے کہ وہ ان کے مطلوب یعنی رضائے حق کا محل ہے ورنہ ان کی یہ شان ہے کہ ؎

باتو دوزخ جنت ست اے جانفزا　　　بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(اے دل فزا تیرے ساتھ میں تو دوزخ بھی جنت ہے اور اے دلربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے)

اور مولانا یہ بھی فرماتے ہیں

گفت معشوقے بعاشق کای فتے　　　تو بغربت دیدہ بس شہر ہا

(ایک معشوق نے عاشق سے کہا کہ اے نوجوان تو نے سفروں میں بہت سے شہر دیکھے ہیں)

پس کدامی شہر از آنہا خوشترست　　　گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

(تو ان میں سے کون سا شہر سب سے اچھا ہے بولا وہی شہر کہ جس میں دلبر ہے)

جنگل میں اگر محبوب کا ساتھ ہو جاوے تو ہزار آبادی سے بڑھ کر ہے۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ اقوال غلبہ حالات و ولولہ محبت کے ہیں کوئی واقعی تحقیق نہیں ہے تو یاد رکھو اس کے بارہ میں نص موجود ہے حدیث میں ایک صحابی حضرت ثوبان کا واقعہ یاد آیا کہ وہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر ہم جنت میں گئے بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہو سکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب ہم اس درجہ میں نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے۔ حضورؐ نے یہ سن کر سکوت فرمایا۔ آخر وحی نازل ہوئی کہ **من يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم الأية** (جو لوگ اللہ و رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں بس یہی لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے حضرات انبیاء صدیقین شہداء صالحین) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

---

[1] اور عارضی طور پر اس لئے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ میں استقراراً و مقاماً کون جا سکتا ہے۔ البتہ زیارت کے لئے رسائی ہوا کرے گی۔ جس طرح دنیا میں مسکن ہر ایک کا جدا ہوتا ہے لیکن ملاقات کے لئے دوسرا بھی آ جاتا ہے۔ ۱۲ منہ

کی تسلی فرمائی یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی[1] طور پر پہنچنے کے لئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو۔ صرف اتباع اور محبت نبی کافی ہے جیسے دربار شاہی میں خدمت گار محض معیت وخدمت شاہ کی وجہ سے دیگر رؤسا سے پہلے پہنچتا ہے اس لئے مع الذین (انعام الٰہی والوں کے ساتھ) فرمایا آگے ذٰلک الفضل (یہ محض فضل وکرم ہے) میں تصریح بھی فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا اثر مت سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ ہمارا ثواب درجات جو کچھ بھی ہے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طفیل ہے چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے جن میں ارشاد ہوتا ہے۔ ذٰلک الفضل من اللہ و کفیٰ باللہ علیماً (یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والے کافی ہیں) اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضل خداوندی ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے بازیابی کی دولت نصیب ہوگی اور یا یہ مطلب ہے ذٰلک الفضل سے بعض مغلوب[1] الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو یہ خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگرچہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے مایوس ہو جاؤ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل ہے۔ جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجب چیز ہے کہ دو متعارض شبھے ایک عجب[2] دوسرا یاس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت راہ بوار باب معنی را

(ان کے حسن کے عالم کی بہار دل اور روح دونوں کو تروتازہ رکھتی ہے۔ صورت پسندوں کو رنگ سے معنے کے طالبوں کی خوشبو سے)

ہر مذاق ہر طبیعت ہر رنگ کا علاج قرآن میں موجود ہے۔ پس روایت ثوبان رضی اللہ

---

[1] جن پر ناامیدی غالب ہو۔ [2] خود بینی دوسرا ناامیدی

عنہ سے بھی یہ بات بالکل صاف معلوم ہوگئی ہے کہ

باتو دوزخ جنت است اے جانفزا　　　بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(اے جانفزا تیرے ساتھ میں تو دوزخ بھی جنت اور اے دلربا بغیر تیرے جنت بھی دوزخ ہے)

کیونکہ ان کے اس خیال پر انکار نہیں فرمایا گیا بلکہ تسلیم کر کے تسلی کی گئی۔ غرض یہ مضمون بالکل سنت کے موافق ہے نرا نکتہ تصوف یا شاعرانہ نہیں سو یہ ہے ان حضرات کی شان کہ دونوں عالم بھی ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کی رضا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لقاء کی برابر نہیں خوب کہا ہے۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ‌ء　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تم نے اپنی قیمت دونوں جہان بتائی ہے تو ابھی سستا پن ہے نرخ اور بلند کرو جو شان کے مطابق ہو)

محبت اور غیرت کی تو خاصیت ہی ہے کہ جب یہ بڑھ جاتی ہے تو سب کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے غیرت ہی میں سلطنت چھوڑ دی تھی اور وجہ اس سب کی یہ ہوتی ہے کہ ایک حالت میں دو طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ ممکن نہیں[1] اس واسطے مجبوراً ایک طرف کی توجہ کو ترک کر دینا پڑے گا۔ اب رہی یہ بات کہ کس جانب کو ترک کیا جاوے تو ظاہر ہے کہ توجہ الی اللہ کی دولت تو قابل ترک نہیں لہٰذا دنیا ہی پر لات مار دیتے ہیں خوب کہا ہے۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　　بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

(دل خالی ہونے کے ساتھ ایک ماہ روکی طرف کچھ دیر نظر کا میسر آنا اس سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ سر پر شاہی چھتر ہو اور سارے دن شور و شغب ہو)

حضرت ابراہیم بن ادھم نے اسی کے تحصیل کے لئے سلطنت پر لات ماردی۔

---

[1] پوری طرح ورنہ اگر ہوگی تو دونوں طرف ناقص ہوگی اور محبت کی غیرت اس کو قبول نہیں کر سکتی کہ ناقص ہو۔

انبیاء جو مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں سو ان کی یہ توجہ بھی بعینہ توجہ الی اللہ ہوتی ہے اور اس کی توضیح ایک مثال سے

لیکن انبیاء علیہم السلام پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب دو طرف کامل توجہ نہیں ہو سکتی اور یہ حضرات علیٰ سبیل[1] الیقین جیسا کہ حکمت بعثت شاہد ہے متوجہ[2] الی الخلائق تھے اور جب[3] متوجہ الی الخلق تھے تو توجہ الی اللہ یقیناً کم ہوگی اور جب یہ کم ہوگی تو نقص ہوگا اور نقص اس لئے منافی نبوت ہے کہ مرتبہ نبوت مراتب کمال کے اعلیٰ پایہ کا نام ہے کہ بشر کو اس سے بڑھ کر مرتبہ عطا ہو ہی نہیں سکتا۔ پس جب ان کو نبی مانا جاوے اور اس کی وجہ سے کامل فرض کیا جاوے تو کیا وجہ کہ ان میں انقطاع عن الخلق[4] جو لازمہ کمال ہے نہیں پایا جاتا۔ وجہ اس شبہ کی گنجائش نہ ہونے کی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی توجہ الی الخلق ہوتی ہے وہ چونکہ بامر خداوندی ہے لہٰذا اس امتثال کی وجہ سے اس توجہ[5] الی الخلق میں خود توجہ الی اللہ موجود ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام امت کی طرف جو متوجہ ہوتے اور ان کو پیغام حق پہنچاتے ہیں سو اسی لئے کہ اس توجہ اور تبلیغ کا ان کو حکم ہے اور اس کا امتثال ان پر واجب ہے۔ حضرات انبیاء کی اس توجہ الی الخلق کے ساتھ توجہ الی اللہ کی مثال یہ ہے کہ اگر تم کسی آئینہ کی طرف اس لئے متوجہ ہو کہ اس میں تمہارے محبوب کا عکس نظر آ رہا ہے جبکہ کسی وجہ سے خود اس کے عین[6] کو نہ دیکھ سکو تو گو ظاہراً تمہاری توجہ آئینہ کی طرف ہے لیکن یہ توجہ عین[7] محبوب کی طرف توجہ ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے لئے تمام خلائق مرائت[8] ہیں جس کی طرف متوجہ ہونے سے مقصود ان کا توجہ الی الحق ہے۔ پس ان کے لئے توجہ الی الحق سے مانع نہیں۔

رجوع بجانب سرخی (محبان حق کی کیا حالت ہوتی ہے)

غرض محبان حق غیر حق کی طرف متوجہ ہونے سے غیرت کرتے ہیں اسی صفت غیرت سے

۱؎ یقیناً جیسے کہ مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجنا اس کی دلیل ہے۔ ۲؎ مخلوق کی طرف ۳؎ جب مخلوق کی طرف متوجہ ہوئے اور دو طرف ایک وقت میں پوری توجہ نہیں ہو سکتی تو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ میں کمی ہوگی۔ ۴؎ مخلوق سے بے تعلقی جو حق تعالیٰ کی طرف توجہ کے کامل ہونے کے لئے ضروری و لازم ہے۔ ۵؎ مخلوق کی طرف توجہ محض تعمیل حکم میں ہے تو تعمیل کی وجہ سے ادھر ہی کی توجہ کا ذریعہ بن کر ادھر ہی کی توجہ ہے غیر کی طرف نہیں۔ ۶؎ ذات ۷؎ بعینہ ۸؎ آئینے

ان میں جوش دین پیدا ہوتا ہے۔ جس کو لوگ تعصب کا غصہ سمجھتے ہیں اور وہ ایسا مطلوب ہے۔ جس کے نہ ہونے سے[1] وہ شخص الٹ دیا گیا۔ پس یہ شخص ظاہر میں نیک تھا اور واقع میں نیک نہ تھا۔ پس وہ قاعدہ نہ ٹوٹا۔ یا اگر وہ[2] واقع میں نیک بھی ہوں تو وہ صورۃً ہلاک ہوتا ہے اور معنی رحمت[3]

رجوع بجانب سرخی (مقتداوہ ہوسکتا ہے جو کامل العقل ہو)

بہر حال یہ بات ثابت رہی کہ نیکیوں کی بعض برکات[4] اضطراری بھی ہوتی ہیں جس میں قصد اور اختیار کی ضرورت نہیں لیکن جو برکت اختیاری ہوگی اس کے لئے عقل کامل وافر کی احتیاج ہے۔ سو ایسے لوگ ہی جو کامل العقل ہیں اہل ارشاد ہوئے ہیں اور بعض اولیاء اللہ جن سے کوئی تربیت عام کا کام متعلق نہیں ہوتا ایسے لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سپرد صرف اپنی ذات کاملہ ہے۔ اور اس میں وہ اسی قدر کے مکلّف ہیں جس قدر ان کو عقل دی گئی ہے۔ کسی دوسرے شخص کی تربیت ان کے متعلق نہیں سو حاصل یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق تربیت عام ہے جیسے انبیاء امت جو مسند ارشاد پر متمکن ہیں ایسے لوگ بھولے بھالے نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بڑے فطین پورے عاقل ہوتے ہیں۔ اور یہی کامل ہیں اور جن لوگوں کے متعلق کسی دوسرے کی تربیت نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے ہی نفس کے لئے پیدا ہوتے ہیں یہ لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں اس لئے بعض نے یہ تقسیم کی ہے کہ انسان چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کو دین کی عقل بھی ہے اور دنیا کی بھی جیسے انبیاء اور ورثۃ الانبیاء یعنی وہ علماء جو مسند ارشاد پر متمکن ہیں دوسرے وہ جن کو دین کی عقل ہے اور دنیا کی نہیں جیسے بھولے بھالے صلحاء اولیاء امت۔ تیسرے وہ جن کو دین کی عقل نہیں ہے اور دنیا کی عقل ہے جیسے عاقل کفار چوتھے وہ جن کو نہ دنیا کی عقل نہ دین کی عقل جیسے بیوقوف کفار۔

---

[1] جس کے متعلق جبرائیل علیہ السلام نے اللہ کو پوچھا تھا۔ [2] اس واقعہ سے الگ اگر کہیں عذاب عام آئے اور وہاں کچھ لوگ ظاہر و باطن ہر طرح سے بالکل نیک ہوں مگر وہ بھی عذاب میں ہلاک کئے جا رہے ہوں تو وہ عذاب ان پر صورت میں عذاب اور حقیقت میں رحمت ہوتا ہے۔ [3] اور یہ شبہ کہ دونوں کے اجتماع میں کس کا اثر ظاہر ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ غالب یا کثیر کا اول جیسا ما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم اور ثانی جیسا حدیث ہے قلنا یا رسول اللہ انھلک و فینا الصالحون قال نعمھم اذا [4] بے اختیاری جن میں ان کے کرنے نہ کرنے کا دخل نہ ہو جیسے حضورؐ کے وجود سے کفار پر سے عذابات کا ٹل جانا۔

انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں گو تجربہ زیادہ نہ ہو

غرض انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں گو تجربہ میں اس لئے کمی ہو کہ وہ دنیاوی۔ امور میں منہمک نہیں ہیں بعض لوگوں نے اس میں عجیب خلط کر دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ ان میں فرق نہیں کرتے اور چونکہ علماء کو تجربہ کار نہیں پاتے اس لئے علماء کو کم عقل اور بے وقوف کہتے ہیں۔ حالانکہ تجربہ دوسری چیز ہے اور عقل دوسری چیز ہے۔ تجربہ تکرار مشاہدہ جزئیات[1] کا نام ہے۔ مثلاً سقمونیا کو دس مرتبہ آزمایا گیا اس نے اسہال کا فائدہ دیا تو اس تکرار مشاہدہ سے کہیں گے کہ سقمونیا مسہل ہے اور عقل ایک قوت ہے جو خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کی ہے جس سے کلیات کا ادراک کرنا ہے۔ مولوی محمد حسین عظیم آبادی سے جو کہ میرے ایک دوست تھے ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ایک کالج کے طالب علم نے سوال کیا کہ آسمان پر کل کس قدر ستارے ہیں انہوں نے فرمایا مرصودہ[2] تو معلوم ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں اس طالب علم نے کہا کہ مولوی صاحب تعجب ہے کہ سائنس کا اتنا ضروری مسئلہ اور آپ کو اس کی اطلاع نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اچھا بتلایئے سمندر میں کس قدر مچھلیاں ہیں۔ اس طالب علم نے کہا مجھے تو علم نہیں تو مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے آپ اس قدر سائنس کے دلدادہ ہیں اور آپ کو زمین کی چیزوں کی بھی اطلاع نہیں پھر جب آپ کو ہنوز زمین کی بھی پوری اطلاع نہیں ہے تو مجھ کو آسمان کے ستاروں کی اطلاع نہ ہونا کیا تعجب ہے۔ یہ جواب سن کر ان طالب علم صاحب کی آنکھ کھلی اور ہوش آیا اس طرح لوگ صناع[3] قوموں کو کہتے ہیں کہ یہ بڑے عاقل ہیں حالانکہ وہ صرف ایک صنعت کے تجربہ کار ہیں۔ لہٰذا ان کو صناع کہنے چاہیے نہ کہ عاقل صناعی دوسری چیز ہے۔ عاقل ہونا دوسری بات ہے اگر ہم ایک بڑے فلاسفی مثلاً افلاطون کو ایک جولاہے کے گھر لے جاویں اور اس کی کارگہ میں بٹھلا دیں اور کہیں کہ ایک مہین[4] تن زیب بنو

---

[1] معین چیزوں کے اثرات کو بار بار دیکھنا [2] جن کو رصد گاہ سے دیکھا گیا ہے۔ [3] صنعت گر کہ چند چیزوں کو ملا کر کوئی شے بنالی یا بنی ہوئی کے اجزا الگ الگ کر لئے اسی کو سائنس کہتے ہیں یعنی ترکیب و تحلیل وہ کوئی علم نہیں بلکہ ادھیڑ بن مرکب کے اجزاء اور اجزا سے مرکب کی بناوٹ ہے۔ جیسے لوہار بڑھئی معمار کا کام وہ ہلکا ہے یہ اونچا ہے۔ [4] باریک کپڑا اور تن زیب ایک قسم کا کپڑا ہے باریک۔

تو یقیناً وہ اس پر قادر نہ ہو گا اور جولاہا عمدہ سے عمدہ بن دے گا۔اس فرق کی وجہ سے یہ کہہ دیں گے کہ یہ جولاہا اس فلسفی سے زیادہ عاقل ہے ہرگز نہیں ہاں یہ کہیں گے کہ یہ فلسفی اس صنعت کو اس قدر نہیں جانتا جس قدر یہ جولاہا جانتا ہے۔ پس علماء محققین خواہ تجربہ کار نہ ہوں مگر کامل العقل ہوتے ہیں اور یہی ورثۃ الانبیاء ہیں۔ان ہی کے متعلق ارشاد وتربیت کا کام ہوتا ہے۔پس ان کے ساتھ احکام[1] وحکم دینیہ میں کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے جیسا کہ اس قاعدہ شرعیہ کو کہ مفسدہ[2] کی وجہ سے مصلحت غیر ضروریہ کو چھوڑ دیتے ہیں نہ سمجھنے سے بعض کو غلطی ہوگئی کہ وہ علماء سے مزاحمت کرنے لگے۔

رجوع بجانب سرخی (آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع پڑھنا بدعت ہے)

غرض جو چیز مطلوب نہ ہو اور اس کے ارتکاب میں مفسدہ بھی ہو تو اس کو ترک کر دیں گے۔ جب یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا تو اب سمجھنا چاہیے کہ الوداع کا خطبہ کسی دلیل سے شرعاً مطلوب نہیں ہے اور اس کے پڑھنے سے بہت سے مفاسد ہیں۔لہٰذا اس کو ضرور ترک کر دیا جاوے گا۔ رہی یہ بات کہ لوگ اس بہانہ سے آ جاتے ہیں اگر یہ نہ ہو گا تو لوگ نماز میں آنا چھوڑ دیں گے۔ سو سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہر حالت میں آویں گے۔ خطبہ وداع پڑھا جاوے یا کوئی دوسرا خطبہ اور جو لوگ محض پابندی رسم کے لئے آتے ہیں وہ اگر اس کے ترک سے آنا چھوڑ بھی دیں تو ان کے اس خیال سے ہم ایک مقدمہ[3] قبائح کے کیوں مرتکب ہوں۔ خواہ وہ آویں یا نہ آویں۔

دین اس سے مستغنی ہے کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کی خواہش کے تابع ہو اور اس کا بیان کہ اسلام کی رو سے امیر اور غریب سب برابر ہیں

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر نکاح بیوگان کا ذکر نہ کرو تو میں وعظ میں آؤں میں

---

[1] مسائل اور دینی حکموں کی وجہیں۔ [2] خرابی کی وجہ سے اس مصلحت کو جو ضروری نہ ہو خود مطلوب نہ ہو کوئی مطلوب اس پر موقوف نہ ہو۔ [3] برائیوں کا ذریعہ

نے کہا کہ آج تو ضرور ہی بیان کروں گا تمہارا جی چاہے آؤ نہ جی چاہے نہ آؤ۔ دین کسی کے آنے کا محتاج نہیں۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است　　　　باب ورنگ وخال وخطہ چہ حاجت روئی زیبارا

(ہمارے ناتمام وناقص عشق سے محبوب کا حسن بے نیاز ہے۔آب وتاب ورنگ تل اور خط کی حسین چہرہ کو کیا حاجت ہے جب فطری حسن ہو پھر بناوٹ کی کیا ضرورت۔)

جس کا حسن ذاتی حسن ہے اس کو تکلفات کی اور کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کیا پرواہ ہے خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے وہ بالکل مستغنی ہے اسی طرح ہم کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ نہ کریں گے اور مشروع کو محض اس مصلحت سے نہ چھوڑیں گے کہ ہمارے اکابر سلف کا اس استغنا مذکور پر پورا عمل تھا۔

حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ خلافت میں جبلہ بن ایہم غسانی جو کہ ملوک غسان میں سے تھا۔ مسلمان ہوا۔ موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ ساتھ طواف کرتا تھا۔ اتفاق سے اس غریب آدمی کے پاؤں کے تلے اس کی ازار کا کنارہ دب گیا جبلہ جب آگے بڑھا تو اس کی لنگی کھل گئی اور برہنہ رہ گیا۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا۔ لہٰذا اس کو بہت غصہ آیا اور اس نے ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ اس بے چارہ کا دانت ٹوٹ گیا۔ وہ شخص اس حالت کو لئے ہوئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ امیر المومنین جبلہ نے میرا دانت توڑ دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جبلہ کو ہمارے پاس بلاؤ۔ صاحبو غور کیجئے یہ امتحان کا مقام ہے کہ ایک بادشاہ کو ایک غریب آدمی کے معاملہ میں پکڑ کر بلایا جاتا ہے۔ چنانچہ جبلہ کو لایا گیا۔ حضرت عمرؓ[1] نے واقعہ دریافت فرما کر اس غریب شخص کو اجازت دی کہ جبلہ سے اپنا

---

(۱) تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ جبلہ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ مجھ کو ایک دن کی مہلت مل سکتی ہے میں کل کو قصاص دینے پر آمادہ ہو جاؤں گا آپ نے فرمایا کہ اگر صاحب حق راضی ہو جاوے تو مہلت ہے۔ چنانچہ وہ غریب مسلمان راضی ہو گیا اور جبلہ قصاص سے بچ کر رات ہی کو مدینہ سے بھاگ گیا اور رومیوں میں جاملا جو کہ نصاریٰ تھے اور مرتد ہو گیا۔ اس کے بعد ایک صحابی سفیر بن کر حضرت عمرؓ کی طرف سے روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس کسی ضرورت سے گئے تو اس نے کہا کہ تم جبلہ سے ملنا چاہتے ہو انہوں نے کہا کہ وہ کہاں ہے میں اس سے ملوں گا اس نے کہا کہ وہ

بدلہ لے لے۔ جبلہ نے جب یہ سنا تو طیش میں آ کر کہا کہ امیر المومنین مجھ کو اور ایک معمولی بازاری غریب آدمی کو کس چیز نے برابر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے اور اس میں امیر غریب سب برابر ہیں تم نے اس کا دانت توڑ دیا تمہارا دانت ضرور توڑا جاوے گا۔

اسلام کی رو سے امراء غرباء سب برابر ہیں اور اس کا بیان کہ اہل اللہ کا برتاؤ اس زمانہ میں بھی اس کے موافق ہے

دیکھئے یہ ہے اخوت اسلامی ایک آج وقت ہے کہ امراء و روٴسا کا عالم ہی اس عالم

بہت عزت کے ساتھ ہمارے پاس ہے چنانچہ وہ اس کے پاس گئے تو وہ بڑی شان کے ساتھ موتیوں سے جڑا ہوا تاج پہنے ہوئے ریشمی لباس اور سونا چاندی کے ساز و سامان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ارد گرد بہت سے غلام اور باندیاں خدمت کو موجود تھیں کیونکہ نصاریٰ کو جبلہ کے مرتد ہونے کی بہت خوشی تھی اس لئے کہ وہ اسلام سے پہلے نصرانی تھا اور صاحب سلطنت تھا اس لئے اس کو بہت عزت سے رکھا جب وہ صحابی اس کے پاس پہنچے تو آپ نے اس طرح سلام کیا سلام علی من اتبع الھدیٰ کہ جو ہدایت کی پیروی کرے اس کو سلام پہنچے۔ جبلہ نے کہا کہ تم نے السلام علیکم مجھے کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس طرح سلام کرنا مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے اور میں تم کو اسلام کے خلاف دیکھتا ہوں اس نے کہا کہ اگر میں دل میں مسلمان ہی ہوں صحابی نے فرمایا کہ میں اس خوشخبری کے سننے کا مشتاق ہوں خدا کرے تم دل سے مسلمان ہی ہو مگر جبلہ نے بات کو ٹال دیا پھر اس نے چاندی یا سونے کی کرسی ان صحابی کے بیٹھنے کے لئے پیش کی انہوں نے کہا کہ ہمارے نبی نے ہم کو اس سے منع فرمایا ہے۔ تو جبلہ نے حضورؐ کا نام سن کر آہستہ سے روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا ان صحابی نے کہا کہ اے جبلہ میں تیرے اندر اسلام کی محبت پاتا ہوں پھر تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا اس نے کہا کہ کیا اب بھی میرا اسلام دوبارہ قبول ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں اسلام میں تنگی نہیں توبہ کر لو پھر اسلام قبول ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ اس شرط سے مسلمان ہوں کہ مجھ سے قصاص نہ لیا جائے دوسرے حضرت عمرؓ اپنی بیٹی سے میرا نکاح کر دیں اور اپنے بعد میرے واسطے خلافت کی وصیت کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ شرطیں میں نہیں کہہ سکتا کہ منظور ہوں یا نہیں، پھر حضورؐ کی مدح اور محبت کی باتیں کرتا رہا پھر اور باتیں ہوئیں اخیر میں وہ رونے لگا اور کہا اے کاش میں اس وقت قصاص دینا منظور کر لیتا اور اس سے انکار نہ کرتا کہ یہ حالت عیش و عشرت کی اگرچہ مجھے اب بہت کچھ نصیب ہو گئی مگر اس سے وہ فقر کی حالت ہی بہتر تھی ان صحابی نے یہ باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آ کر بیان کیں آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کی شرائط منظور کیوں نہ کر لیں قصاص والے کو ہم دیت قبول کرنے پر راضی کر دیتے اور عمر کی بیٹی کیا بڑی چیز تھی اس سے اس کا نکاح بھی ہو جاتا رہا خلافت کا مسئلہ تو اس وقت ہم اس کو منظور کر لیتے پھر مسلمان جس کو چاہتے خلیفہ بناتے اس کے بعد پھر جبلہ کے انتقال کی خبر پہنچی اور بظاہر اس نے اسی حالت کفر پر جان دی باقی دل کا حال خدا کو معلوم ہے۔ ہکذا ذکرہ من تاریخ الطبری۔ یہاں یہ اشکال ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے ایک ذرا سی بات میں اس پر اتنی سختی

سے جدااور نرالا ہے۔غربا کو وہ گویا انسانیت سے ہی خارج سمجھتے ہیں لیکن اس گئے گزرے وقت میں بھی اگر اس کا کچھ اثر باقی ہے تو اللہ والوں میں ہے۔حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک بڑے عہدہ دار کوئی شخص مہمان آئے جب کھانے کا وقت ہوا تو حضرت نے اپنے ساتھ ان کو بٹھلایا کیونکہ وہ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے ان کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر دوسرے غریب طلبہ مہمان پیچھے کو ہٹے حضرت مولانا نے فرمایا کہ صاحبو آپ لوگ کیوں ہٹ گئے کیا اس وجہ سے کہ ایک عہدہ دار میرے ساتھ بیٹھا ہے۔خوب سمجھ لیجئے کہ آپ لوگ میرے عزیز ہیں۔

میں جس قدر آپ کو معزز سمجھتا ہوں اس کے سامنے ان کی کچھ بھی وقعت نہیں چنانچہ سب غریب طلباء کو بھی ساتھ بٹھلا کر کھلایا شاید اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ مولانا نے اپنی شان

کیوں کی کہ وہ اسلام سے پھر گیا قصاص نہ لیتے تو کیا ہو جاتا مگر یہ شبہ وہی کر سکتا ہے جس کی نظر میں اسلام کی وقعت نہیں اگر آپ ایسا کرتے تو اسلام کی بنیاد ست ہو جاتی کیونکہ یہی تو وہ بات ہے جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کر لی تھی کہ جب ان میں سے کسی معزز آدمی نے زنا کیا تو اس کو صرف رسوا کر دیتے اور سنگسار نہ کرتے اور غریب آدمی زنا کرتا تو اس پر حد جاری کرتے یعنی پتھروں سے مار ڈالتے۔حضرت عمرؓ نے اسلامی حکم کی وقعت کے سامنے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی ایک جبلہ کیا اگر ہزار جبلہ جیسے باوجاہت ہوتے جب بھی آپ اسلامی حکم کو نہ بدلتے اور نہ بدلنے کا آپ کو کوئی حق تھا دوسرا یہ کہ اس وقت تو ایک جبلہ ہی مرتد ہوا مگر ہزاروں عقلاء کی نظر میں اسلام کی وقعت قائم ہو گئی کہ اسلام میں مظلوم کی اتنی رعایت ہے کہ اس پر بڑے سے بڑا معزز بھی ظلم کرے تو اس سے بدلہ لیا جاتا ہے۔جس طرح ایک معمولی آدمی سے اور اگر آپ اس کی رعایت کر جاتے تو ممکن تھا کہ جبلہ اسلام پر قائم رہ جاتا مگر ہزاروں عقلاء خلیفہ کے اس فیصلہ کو بری نظر سے دیکھتے اور اسلام سے بدگمان ہو جاتے رہا کسی کا اسلام میں رہنا یا نکل جانا اس کی اسلام میں ذرا پرواہ نہیں جو اسلام لاتا ہے اپنے فائدے کے واسطے کسی پر کیا احسان ہے۔**فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر انا اعتدنا للظلمين ناراً احاط بهم سرادقها و ان يستغيثوا يغاثوا بماء كالمهل يشوى الوجوه بئس الشراب و ساءت مرتفقا** رہا یہ کہ آپ نے اس کی باتیں سن کر فرمایا کہ تم نے شرائط قبول کر لی ہوتیں تو آپ کی شفقت کی دلیل ہے کہ آپ کو اس کے مرتد ہونے سے اس وجہ سے صدمہ ہوا تھا کہ جنت کی طرف آ کر پھر دوزخ کی طرف چلا گیا۔نیز یہ کہ جو شخص اسلام لانا چاہے اس کی کسی قدر تالیف قلب مناسب ہے البتہ جو اسلام لا چکے اس کی تالیف قلب کی ضرورت نہیں اس لئے پہلی بار آپ نے رعایت نہ فرمائی کیونکہ وہ اسلام کا مدعی تھا اور اس وقت رعایت کرنا چاہی کیونکہ اسلام پھر قبول کرنا چاہتا تھا اور اس حدیث میں جو ہے **اقيلوا ذوى الهيئات عثراتهم** یہ ان حقوق میں ہے جن کی معافی کا خود اختیار رکھتا ہو۔مثلاً اس صورت میں وہ صاحب معاملہ معاف کر دیتا یا حقوق اللہ میں جو غیر حدود ہوں حاکم ہی معاف کر دے اور وہ بھی استحباب کے لئے ہے اور لفظ عثرات مشیر ہے کہ اس کا صدور خطاء ہو لجاجاً و استکباراً و ظلماً نہ ہو۔جیسا اس واقعہ میں ہوا تھا۔فقط ظفر احمد عثمانی

جتلانے کو ایسا کہہ دیا ہوگا خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں شان اور بڑائی کا نام بھی نہ تھا۔ جن لوگوں نے مولانا کو دیکھا ہے وہ تو خوب جانتے ہیں مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے ان کے لئے ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ وہاں شان اور بڑائی کتنی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا حدیث شریف کا درس دے رہے تھے ابر ہو رہا تھا کہ اچانک بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں جس قدر طالب علم شریک درس تھے سب نے کتاب کی حفاظت کے لئے کتابیں اٹھائیں بھاگے اور سہ دری میں پناہ لی اور کتابیں رکھ کر جوتے اٹھانے صحن کی طرف جو رخ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ سب کے جوتے سمیٹ کر جمع کر رہے ہیں اس واقعہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہاں کس قدر شان کو جتلایا جاتا تھا شان نہ تھی بلکہ محض محبت دینی تھی کہ غرباء کو امراء سے کچھ کم نہیں سمجھا یہی لوگ ہیں جن کی بدولت دنیا کا کارخانہ قائم اور نظام عالم مسلسل ہے۔ جس دن یہ حضرات نہ رہیں گے قیامت قائم ہو جائے گی۔

دین کے کام سے دنیا کا فائدہ مقصود نہ ہونا چاہیے اور اس کا بیان کہ طالب حق کی کیا حالت ہوتی ہے

غرض یہ تو حضرت عمرؓ کا امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے آگے جبلہ کا امتحان ہے کہ دیکھیں کیا سمجھ کر ایمان لایا ہے آیا کوئی دنیاوی غرض عز و جاہ کی ہے کہ مسلمان ذی عزت ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کے ہم رنگ ہو جاویں گے تو ہم کو بھی عزت نصیب ہوگی یا یہ کہ محض طلب آخرت کے لئے ایمان لایا ہے چنانچہ بعض لوگ بزرگوں سے بھی اس لئے ملتے ہیں کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں ان کو بڑا سمجھتے ہیں اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے ہماری بھی عزت ہوگی اکثر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی بزرگوں سے بیعت ہوتے ہیں کسی جلاہے تیلی کے گو وہ کیسا ہی بزرگ اور نیک ہو مرید نہیں ہوتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ محض مدعی ہیں بس ہم کو نہ طلب صادق ہے نہ محبت واقعی جہاں اپنی دنیاوی غرض پوری ہوتے دیکھتے ہیں چار قدم بڑھا دیتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو یہ بھی نہیں ایسے ہی لوگ ہیں جو کہ امتحان کے وقت ادھورے اترتے ہیں۔ عندالامتحان یکرم الرجل اویھان (امتحان

کے وقت یا تو آدمی کی عزت کی جاتی ہے یا ذلت یعنی کامیابی پر عزت ناکامی پر ذلت)

خوب کہا ہے ؎

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے بسار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی اس وقت تک صاف دل نہیں ہو سکا جب تک شراب عشق کا جام نہ پی لے

بہت سفر ہونا ضروری ہے تاکہ خام پکا بن جاوے۔)

چنانچہ جبلہ کا امتحان ہوا اور وہ اس میں ناکام ثابت ہوا یعنی اس نے کہا کہ اچھا مجھے ایک دن کی مہلت ہو سکتی ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہو سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے صاحب حق سے پوچھا گیا وہ بیچارہ اس قدر نیک دل تھا کہ اس نے اجازت دے دی جبلہ رات کو موقع پا کر اٹھ بھاگا اور رومیوں سے جا ملا اور بدستور سابق نصرانی ہو گیا دیکھئے اس کو طلب صادق اور محبت واقعی دین سے نہ تھی کہ ذرا دھی ذلت کے خوف سے دین چھوڑ دیا جس کا نتیجہ ابدالآباد کی ذلت ہے۔ ادھر حضرت عمرؓ کو دیکھئے کہ ذرا پرواہ نہیں کی کہ یہ امیر ہے دوسرا غریب ادھر اس کو دیکھئے کہ ذرا سی تکلیف نفس پر گوارا نہ کر سکا ایسے بہت لوگ ہیں کہ وہ اتباع شریعت محض نفع دنیاوی کیلئے کرتے ہیں لیکن جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ ان پر کچھ بھی گزر جاوے مگر ان کو حق کے مقابلہ میں سب ہیچ معلوم ہوتا ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا خورند از برائے گلے خارہا

(ایک دل کی وجہ سے بہت سے بوجھ کھینچتے ہیں ایک پھول کے لئے بہت

سے کانٹے کھاتے ہیں۔)

اور پھر چاہے طلب اور جستجو میں عمر بھی ختم ہو جائے مگر گھبراتے اکتاتے نہیں کیونکہ ان کی طلب صادق ہوتی ہے اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اور مطلوب کون ہے وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں ؎

طلب گار باید صبور و حمول کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طلب والے کو تو بہت صبر اور تحمل کرنے والا ہونا چاہیے کیونکہ میں نے کسی

کیمیا والے کو اکتا جانے والا نہیں سنا)

یعنی فن کیمیا کا طالب اکثر ساری عمر طلب میں برباد کر دیتا ہے اور ہمیشہ ایک تاؤ کی کسر میں رہتا ہے لیکن آپ نے کسی طالب کیمیا کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ ناکامی سے گھبرا کر اکتا گیا ہو اور کیمیا کی فکر چھوڑ دی ہو تو کیا خدا کا طالب طالب کیمیا کے برابر بھی نہ ہو۔ خوب سمجھ لو کہ جو اکتا گیا وہ طالب نہیں صورت طلب کو طلب نہیں کہتے جیسے صورت آدمی کو آدمی نہیں کہتے۔ خوب کہا ہے ۔

اینکہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند

(یہ جو تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ حضرت آدمؑ کے خلاف ہیں یہ آدمی نہیں بلکہ آدم کا غلاف ہے)

مصالح کی وجہ سے بدعات کی اجازت نہیں دی جاسکتی

پس جو لوگ الوداع کے خطبہ نہ ہونے سے نہ آویں ان کے نہ آنے کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جاوے گی اور ایسے وہمی مصالح[1] سے اس قسم کی بدعات کی اجازت نہ دی جاوے گی۔

فضائل رمضان کا بیان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ کے برکات و آثار کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں۔ **ھو شھر اولہ رحمة و اوسطہ مغفرة و اٰخرہ عتق من النیران** ترجمہ یہ ہے کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانی حضرت مغفرت ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت ایک لطف ہے چونکہ ابتدا حصہ میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے عمل کرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ بدوں اس توفیق کے کوئی عمل بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے رحمت فرمایا گیا۔

آدمی کو اپنے عمل پر کبھی ناز نہ کرنا چاہیے

اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ بعض لوگوں کو جو اپنے تھوڑے عمل پر ناز ہو جاتا ہے کہ ہم بہت کچھ کرتے ہیں یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے انسان کوئی کام نہیں کرسکتا جب

---

[1] بلکہ اگر وہمی نہ ہوں واقعی بھی کچھ ہوں تو بھی بدعتوں کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

تک کہ ادھر سے امداد و توفیق نہ ہو خوب کہا ہے۔

بے عنایات حق و خاصان حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(حق تعالیٰ اور ان کے خاص بندوں کی عنایت و توجہ کے بغیر اگر فرشتہ جیسا بھی ہو اس کا بھی عمل نامہ سیاہ ہے)

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ　　بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ

(ہم نے یہ سب کچھ کہا ہے لیکن انجام میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی عنایت کے بغیر ہم ہیچ در ہیچ ہی ہیں) کہ گو ہم نے سب کچھ بتلایا لیکن عنایات خداوندی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں پس خدا کی عنایت سے توفیق ہوتی ہے اپنا کوئی کمال نہ سمجھے۔ جب تک کہ دل میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا اور یہ خدا کے اختیار میں ہے۔

من چو کلکم درمیان اصبعین

(میں مثل قلم کے ہوں دو انگلیوں کے بیچ میں)

آخر کیا سبب تھا کہ ابوجہل جو کہ نہایت سمجھدار سمجھا جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ میں چچا ہوتا تھا تیرہ برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دعوت ایمان فرمائی لیکن لیکن اس کو کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو سکا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو حبشہ کے رہنے والے تھے نہ کچھ بڑے زیرک سمجھے جاتے تھے نہ پہلے سے حضور کی صحبت میسر ہوئی تھی کیونکہ مکہ میں آ کر ایک کافر کے پھندے میں پھنس گئے کہ آزادی بھی نصیب نہ تھی۔ جس سے تحقیقات کا ہی موقع ملتا پھر تکالیف کا یہ عالم کہ پتھر تپتا ہوا سینہ پر رکھ دیا جاتا تھا لیکن باوجود اس کے آپ کی زبان سے احداً احد[1] ہی نکلتا تھا۔ بس وجہ یہ تھی کہ ابوجہل کو توفیق نہیں دی گئی اور ان کو توفیق دی گئی۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم　　ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

(حضرت حسن بصرہ سے حضرت بلال حبش سے حضرت صہیب روم سے ہدایت یاب ہو گئے۔ جو مکہ شریف سے دور کے مقامات ہیں اور مکہ کی خاک سے ابوجہل بے ہدایت یہ کیسا عجیب کرشمہ ہے)

---

[1] یکتا یکتا یعنی معبود یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

حقیقت میں جب تک ادھر سے جذب[1] اور مدد نہ ہو کچھ نہیں ہوسکتا تو یہ کہنا کہ انا کذا و انا کذا (میں ایسا ہوں میں ویسا ہوں) محض جہل ہے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے۔ شاہی محل کے نیچے سے گزر ہوا بادشاہ نے ان کو اپنے پاس ملنے کے لئے بلایا۔ انہوں نے کہا کہ کیونکر آؤں کہ دروازہ بڑی دور اور پھر وہاں پہرہ چوکی بادشاہ نے کمند لٹکا دی یہ اس کے سہارے سے اوپر پہنچ گئے۔ جب وہاں پہنچے تو بادشاہ نے ان سے گفتگو شروع کی۔ اثناء گفتگو میں بادشاہ نے پوچھا کہ آپ خدا تعالیٰ تک کیونکر پہنچے۔ انہوں نے کہا جس طرح آپ تک پہنچا یعنی جس طرح تم نے وہ کمند ڈالی اور اس کے ذریعہ سے مجھے کھینچ لیا اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی۔۔۔ جذب کی کمند ڈال کر مجھے کھینچ لیا۔ خوب کہا ہے۔

نگر دو قطع ہرگز جادہ عشق از دو یدنہا　　که میالد بخود ایں راہچوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑیں لگانے سے ہرگز قطع نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ راستہ خود اس طرح بڑھتا ہے جیسے انگور کا درخت کاٹنے سے بڑھتا ہے)

یہ تو اپنے عمل کے بارہ میں ہے اور ایک دوسرے شخص نے جذب کے بارہ میں لکھا ہے لیکن یہ مضمون محبوب مجازی کے باب میں ہے اس لئے الفاظ اچھے نہیں ہیں۔

خود بخود آں بت عیار بہ بری آید　　نہ بزور و نہ بزاری نہ بزری آید

(وہ چالاک محبوب خود بخود تو بغل میں آ سکتا ہے مگر نہ زور سے آ سکتا ہے نہ رونے سے نہ مال سے)

میں نے الفاظ بدل دیے ہیں کہ محبوب حقیقی کے مناسب ہو جاوے۔

خود بخود آں مہ دلدار بہ بری آید

(خود بخود تو وہ دل لینے والا چاند بغل میں آ سکتا ہے)

جب محبوبان مجازی کا یہ عالم ہے تو اس محبوب حقیقی کو کون مجبور کر سکتا ہے وہ تو اس کے شائبہ سے بھی منزہ ہیں[2]۔

دعا کے وقت اس کو مشیت[3] کیساتھ معلق کرنا بے ادبی ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان ہو جایئے فرماتے ہیں لاتقل اللھم ارحمنی ان

---

[1] کشش [2] پاک [3] چاہنے پر موقوف کرنا کہ آپ چاہیں تو ایسا کر دیں۔

شئت فانه لا مکره له کہ یوں دعا نہ مانگو کہ اے خدا اگر آپ چاہیں تو ہم پر رحم فرمایئے اس واسطے کہ خدا تعالیٰ پر کوئی اکراہ و جبر کرنے والا نہیں ہے۔ صاحبو دیکھئے ظاہر نظر میں مشیت پر موقوف کر کے دعا مانگنا[1] ادب معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ میں سخت بے ادبی ہے لیکن کسی کی نظر اس بے ادبی تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ نور نبوت اور وحی کی محتاج ہے اور وجہ اس کے داخل بے ادبی ہونے کی یہ ہے کہ درخواست میں مشیت کی قید لگانے کی ضرورت تو اسی وقت ہوتی جب کہ خدا تعالیٰ میں مجبور ہونے کا احتمال بھی ہوتا اس لئے یہ قید لگاتے کہ اللہ تعالیٰ پر دباؤ نہ پڑے۔ یہاں یہ بات کہاں تم دس ہزار دفعہ مانگو اور دعا کرو وہ چاہیں گے قبول کرلیں گے یا رد کردیں گے۔ پھر کیوں تم قید لگاتے ہو میں سچ کہتا ہوں کہ اگر دنیا بھر کے عقلاء جمع ہو کر غور کرتے تو اس دقیقہ[2] تک نہ پہنچتے جہاں حضور ﷺ پہنچے ہیں۔

رجوع بجانب سرخی (آدمی کو اپنے عمل پر کبھی ناز نہ کرنا چاہیے)

اور جب خدا تعالیٰ مجبوری سے بالکل پاک ہیں تو اگر تم کو توفیق روزہ رکھنے اور تراویح و قرآن پڑھنے کی نہ دیتے تو تم کیا کر سکتے تھے۔ اسی لئے فرمایا کہ اولہ' رحمۃ کیونکہ صوم وغیرہ کی توفیق دینا عبادت کی توفیق دینا بہت بڑی رحمت ہے۔

رجوع بجانب سرخی (فضائل رمضان کا بیان)

اور چونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیئات کہ نیکیوں سے برائیاں معاف ہو جاتی ہیں تو جب اول رمضان میں توفیق ہو جانے کی وجہ سے اعمال نیک شروع ہو گئے تو ان سے گناہ معاف ہونے شروع ہوئے جب ان کی بدولت گناہ معاف ہو گئے تو وسط رمضان مغفرت ہوا اسی کو فرماتے ہیں واوسطہ' مغفرۃ (اور اس کا درمیان بخشش ہے) اور ظاہر ہے کہ گناہوں کا معاف ہو جانا یہی دوزخ سے بچنا ہے۔ تو اس پر متفرع ہو کر یہ ارشاد بھی صحیح ہوا کہ و آخرہ عتق من النیران (اور اس کا آخیر آگ سے آزادی ہے)

---

[1] کہ مرضی پر چھوڑ دیا [2] باریکی۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں نہ تو کسی کو آنے کی ممانعت اور نہ وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ ہے

وہ بارگاہ عجیب بارگاہ ہے یہ حالت ہے کہ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　　گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ

(باز آ جاؤ باز آ جاؤ جو کچھ تم ہو اس سے توبہ کرو باز آ جاؤ اگر کافر آتش پرست بت پرست ہو تو بھی توبہ کرو باز آ جاؤ)

ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست　　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(یہ ہماری بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے سو بار بھی اگر توبہ توڑ چکے ہو تو بھی باز آ جاؤ)

اور جس طرح وہاں ہر وقت باب رحمت کشادہ ہے کہ کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اسی طرح وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ بھی نہیں۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو　　　دارو گیرو حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہتا ہے تو کہہ دو آ جاؤ جو جانا چاہے کہہ دو جاؤ پکڑ دھکڑ چوکیدار دربان اس بارگاہ میں نہیں ہیں)

کہ جس کا جی چاہے جب چاہے چلا آوے اور جس حالت میں چاہے چلا آوے۔

اور ہر کہ خواہد[1] کے عموم سے یہ بات بھی سمجھ آ گئی ہو گی کہ بعضے لوگ جو کسی ہندو یا عیسائی کو مسلمان کرنے کے قبل اول غسل دیا کرتے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہر کہ کے عموم میں بے غسل والا بھی داخل ہے صاحبو اسلام میں آنے کے لئے نہ غسل کی ضرورت ہے نہ وضو کی بلکہ اگر استنجا بھی نہ کیا ہو تو اس کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں پہلے مسلمان کر لو اس کے بعد غسل وغیرہ دو اور ایک یہ بھی تو بات ہے کہ کسی کو کیا خبر ہے کہ چار منٹ[2] کے بعد زندہ رہے گا یا ختم ہو چکے گا۔ بعض لوگ تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ مسلمان کرنے کے بعد مسہل دینے کی تجویز کرتے ہیں۔

---

[1] جو چاہتا ہے کہ مسلم و کافر کو عام ہونے سے [2] اگر مر گیا اور کفر کی وجہ سے عذاب میں گیا تو تمہارے دیر لگانے سے عذاب میں گیا تم سبب بنے

میں کہتا ہوں کہ اگر طہارت حاصل کرنے کے لئے یہی شرط ہے کہ حالت کفر کی کوئی چیز باقی نہ رہے تو فصد بھی لینا چاہیے بلکہ گوشت پوست بھی نیا ہونا چاہیے الحاصل یہ سب لغو قیود ہیں اس دربار میں جس کا جی چاہے جب چاہے اور جس حالت میں بھی ہو چلا آوے۔ صاحبو! کیا آج کوئی بادشاہ ہے کہ وہ ناپاکوں[1] کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی اجازت دے۔ اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو　　دارو گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہتا ہے تو کہہ دو آ جاؤ جو جانا چاہے کہہ دو جاؤ پکڑ دھکڑ چوکیدار اور دربان اس بارگاہ میں نہیں ہیں)

غرض جس طرح یہاں کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اس طرح اگر بگڑ جاوے تو رکھنے کی بھی کوئی تمنا نہیں کرتا۔ کسی کو اس طرح سر نہیں چڑھایا گیا کہ وہ ذرا بھی ناز کر سکے۔

خدا تعالیٰ کی بخشش سے کسی حال میں مایوس نہ ہونا چاہیے گو کتنے ہی گناہ ہوں توبہ کرنے سے سب معاف ہو جاتے ہیں

تم اگر گناہوں کی پوٹ لے کر بھی حاضر ہو گئے تو ادھر کے ایک چھینٹے میں سب دھل جائیں گے اس کی ایسی مثال ہے۔

گر جہاں پر برف گردد سر بسر　　تاب خود بگداز دش از یک نظر

یعنی اگر سارا عالم بھی برف سے پٹ جاوے تو عالمتاب آفتاب کے نکلتے ہی سب پانی ہو کر بہہ جاوے گی۔ اسی طرح اگر سارا عالم بھی گناہ سے بھر جاوے تو ادھر کی ایک نگاہ کافی ہے۔ سبحان اللہ۔ کس پاکیزہ مثال سے کتنے بڑے مسئلے کو آسانی حل کر دیا واقعی بات یہ ہے کہ اہل اللہ پر چونکہ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے زیادہ بہتر کوئی بھی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہی لوگ سچے فلسفی ہیں چنانچہ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے ایک ایک حکیم کا نام لے کر پوچھا کہ یہ کیسے تھے۔ سب کی نسبت یہی کہتا رہا کچھ نہیں پھر اس سے حضرت بایزید حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی نسبت پوچھا

---

[1] گندوں کو

تو اس نے کہا اولٰئک هم الفلاسفة حقاً (حق یہ ہے کہ فلسفہ والے یہی لوگ ہیں)

جب خدا تعالیٰ کی عنایت ہوتی ہے تو ایک لمحہ میں کام بن جاتا ہے مگر چونکہ وہ لمحہ متعین نہیں ہے اس لئے ہمیشہ اس کا متلاشی رہنا چاہیے

حق تعالیٰ کے جیسے الطاف و کرم ہیں ان پر نظر کر کے تو ایک دم کی غفلت بھی جائز نہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک بار آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی اس بادشاہ سے غافل نہ ہو شاید وہ توجہ کرے اور تم کو غفلت میں خبر تک نہ ہو)

بخدا جس کا کام بنا ہے ایک ہی لمحہ میں بن گیا ہے۔ ایک ہی لمحہ کی عنایت کافی ہوگئی ہے مگر بہت دن تک اس لئے لگے رہتے ہیں کہ وہ لمحہ متعین نہیں یعنی یہ خبر نہیں کہ وہ ایک لمحہ کس وقت ہوگا جس میں نگاہ اکسیر اثر پڑ جاوے گی۔ اسی کو مولانا بھی ایک تفسیر پر فرماتے ہیں ۔

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

(نیکوں کی صحبت اگر ذرا سے وقت بھی ہو وہ سینکڑوں سال کے زہد و طاعت سے افضل ہے کہ بعض دفعہ اس سے دل میں ایسی لگن لگ جاتی ہے کہ سب کام درست ہو جاتے ہیں)

یک زمانہ صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(ایک زمانہ تمہارا اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا سو سال کی بے ریا کی عبادت سے بھی افضل ہو جاتا ہے)

بعض نے اس کی یہی توجیہہ کی ہے کہ تمام اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے چنانچہ شاہ بھیک صاحب اور شاہ ابو المعالی صاحب کا قصہ ہے کہ شاہ ابو المعالی صاحب کسی بات پر شاہ بھیک صاحب سے خفا ہو گئے اور علیحدہ کر دیا۔ یہ جنگلوں میں روتے پھرتے

تھے۔ برسات آئی حضرت کا مکان گر پڑا۔ بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ ایک آدمی گنوار سا ان کاموں کے لائق تھا اسی کو آپ نے نکال دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے ہی تو نکالا ہے تم بلالو میں تم کو منع نہیں کرتا۔ بی بی صاحبہ نے بلا بھیجا ان کی عید آئی۔ آ موجود ہوئے۔ بی بی صاحبہ نے مکان کی حالت دکھائی۔ وہ فوراً جنگل پہنچے اور لکڑی جمع کر کے مرمت میں لگ گئے حتیٰ کہ مکان کی تکمیل کر کے چھت پر مٹی کوٹ رہے تھے کہ حضرت گھر میں تشریف لائے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور چھت پر سے مٹی کوٹنے کی آواز سن کر رحمت کا جوش ہوا اور باہر صحن میں تشریف لا کر ان کو ٹکڑا روٹی کا دکھلایا کہ لو وہ وہیں سے کود پڑے۔ حضرت نے لقمہ ان کے منہ میں دیا اور سینہ سے لگایا۔ بس سارا کام ایک لمحہ میں بن گیا۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ایک لمحہ بھی غفلت[1] مت کرو۔

گناہوں کی معافی کے لئے صرف استغفار کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ادائے حقوق بھی ضروری ہے

اگر مغفرت چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور معاف کرانے کے یہ معنی نہیں کہ صرف تسبیح ہاتھ میں لے کر استغفر اللہ[2] استغفر اللہ پڑھتے رہو بلکہ یہ بھی کرو اور اس کے ساتھ اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کرتے رہو۔ اگر کسی شخص کے پاس دوسرے کی زمین دبی ہو یا موروثی[3] ہو۔ اس کو چھوڑ دو۔ کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کو ادا کرو۔ اور سبکدوش ہو جاؤ۔ لوگ اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ موروثی زمین چھوڑنے کی بے ڈھب کہی پھر ہم کھاویں گے کہاں سے لیکن صاحبو غور کرو اگر کسی شخص کے موروثی کھیتوں میں کو ریل نکل جاوے اور اس کے سب کھیت ریل میں آ جاویں اور معاوضہ ملے زمیندار کو تو یہ کیا کرے گا اور کہاں سے کھاوے[4] گا۔

---

[1] جب اولیاء اللہ کی طرف سے یہ کام بن جاتا ہے تو حق تعالیٰ کی طرف سے کیوں نہ ہوگا۔ [2] میں اللہ تعالیٰ سے سب گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں معنے ذہن میں رکھ کر پڑھا جائے تو زیادہ مفید ہے۔ [3] وہ زمین یا مکان جو دوسرے سے کرایہ پر یا بٹائی پر لی ہو وہ چھڑانا چاہیے مگر نہ چھوڑیں یہ موروثی ہے حرام ہے۔ [4] کھانے کو دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں وہ کوئی اور سلسلہ دیں گے اس سے ناامیدی نہ ہو۔

اس کی شکایت کہ آج کل لوگوں کے دلوں میں اسلام کے احکام کی قدر نہیں اور اس کی وجہ

افسوس ہے کہ ظاہری حکومت کے سامنے تو کان نہ ہلایا جائے اور خداوندی حکم کے سامنے چون و چرا کی گنجائش ہو۔اصل یہ ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اس کے احکام کی چونکہ بلا مشقت مل گئے ہیں باوجود سر تا سر نافع ہونے کے کہ بڑا نفع رضائے حق ہے قدر و قیمت نہیں ہے خوب کہا ہے۔

اے گرانجاں خوار دیدستی مرا ۔ زانکہ بس ارزاں خرید ستی مرا

(اے عزت دار تو نے مجھ کو بے عزت دیکھا ہے محض اس وجہ سے کہ تو نے مجھے سستا خرید لیا)

ارشاد خداوندی ہے۔ ماقدروا اللہ حق قدرہ (لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی عزت ان کی قدر کے موافق نہیں کی) سبب یہ ہے کہ اسلام کے ملنے میں کچھ زر تو خرچ نہیں ہوا کہ اس کی قدر ہوتی۔

ہر کہ اوارزاں خردارزاں دہد ۔ گوہر طفلے بقرص ناں دہد[1]

حکام کی خوشنودی تو بڑی بڑی کوششوں سے زر و جواہر خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے بخلاف رضا خداوندی کے لیکن حقیقت میں یہ سخت رذالت ہے کیونکہ جس قدر زیادہ احسان کسی کا ہوتا ہے اسی قدر زیادہ اس کے سامنے پگھلا کرتے ہیں اور شرماتے ہیں نہ کہ الٹی شرارت اور نافرمانی پر کمربستہ ہو جاویں لہٰذا اپنی اس معمولی تکلیف اور مشقت کی کچھ پروانہ کرنی چاہیے۔

ادائے حقوق کی ضرورت اور اس کا موجب[2] آسائش ہونا ایک شبہ کا جواب

اگر کسی کے پاس موروثی زمین ہے تو اس کو چاہیے کہ فوراً اس کو چھوڑ دے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ شخص موروثی زمین چھوڑ دے تو وہ زیادہ آرام و آسائش میں رہے گا کیونکہ ایسا

---

[1] جو شخص سستا خریدتا ہے سستا ہی دے دیتا ہے ایک بچہ موتی کو روٹی کی ٹکیہ کے بدلے میں دے ڈالتا ہے

[2] آرام و راحت کا سبب

کرنے سے وہ ایمان دار اور خوش معاملہ مشہور ہو جائے گا پھر زمیندار کوشش کرے گا کہ اس کی زمین اس کی کاشت میں رہے اگر اب بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آوے اور نہ مانیں تو وہ جانیں۔ دو شخص ضلع سہارنپور کے میرے پاس آئے میں اتفاق سے موضع بھینسانی گیا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس وہیں پہنچے کہ ہم کو مرید کر لو میں نے پوچھا کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہے میں نے کہا اس کو چھوڑ دو کہنے لگے کہ پہلے مرید کر لو پھر چھوڑ دیں گے۔ میں نے کہا کہ پہلے چھوڑ آؤ جب مرید کروں گا یہ سن کر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کر گئے اور آج تک واپس نہیں آئے۔ ایک گاؤں کے لوگ مدت سے مجھے بلا رہے ہیں لیکن اس لئے جانے کی نوبت نہیں آئی کہ وہاں سب کے پاس موروثی زمینیں ہیں بس وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ مجھ کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک درہم حرام اور نو حلال کے ہوں تو اس ایک کے مل جانے سے اس کی سب عبادت غارت ہے اور غضب یہ ہے کہ لوگ حرام کمائی بیوی بچوں کے لئے کماتے ہیں یہ بھی نہیں کہ اپنے لئے ایسا کریں لیکن اسی سے کوئی یہ تجویز نہ کرتے کہ جب ہمارے پاس حلال کی آمدنی نہیں ہے اور حرام کی آمدنی کھانے سے روزہ قبول نہیں ہوتا تو روزہ رکھنے سے کیا فائدہ کیونکہ اب تو صرف ایک گناہ ہے کہ حرام مال سے پیٹ بھرا اور اگر روزہ نہ رکھو گے تو ایک دوسرے اس سے بھی زیادہ سخت گناہ میں ماخوذ ہو گے۔

احکام شرعیہ کے حکم[1] اور اسرار کس طرح معلوم ہو سکتے ہیں

اسرار و حکم میں غور و فکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ جو کچھ فکر سے حاصل ہوگا تمہارے ذہن کا اختراع[2] ہو وگا نہ کہ حکمت کیونکہ فکر[3] وصول الی الحقائق کا طریق بھی نہیں ۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ۔۔۔۔ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(سمجھ اور دل کو تیز کرنے کا یہ راستہ نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کا فضل تو شکستہ کو ہی لیتا ہے)

پس ہم کو بالکل شکستگی اختیار کرنی چاہیے اس سے البتہ ہم پر فیضان ہو سکتا ہے خوب کہا ہے ۔

---

[1] مصلحتیں اور راز [2] ایجاد اور گھڑنا [3] سوچ تو حقیقتوں تک پہنچنے کا طریقہ بھی نہیں حقیقت بنانے والا خود ہی بتائے تو صحیح حقیقتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

ہر کجا پستی است آب آنجارود ہر کجا مشکل جواب آنجارود

(جہاں پستی ہوتی ہے وہاں پانی جاتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے حل کرنے والا جواب بھی وہیں پہنچتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جس جگہ درد ہوتا ہے دوا اسی جگہ لگتی ہے جہاں مرض ہوتا ہے شفا بھی وہیں جاتی ہے)

تو جب تم بالکل اپنے کو سپرد[1] کردو گے تو خدا تعالیٰ خود بخود ان علوم کا القاء تمہارے قلب میں کریں گے اور وہ حالت ہوگی۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر حضرات انبیاء کے سے علوم دیکھ لو گے بغیر کسی کتاب کے بغیر تکراری کے بغیر استاد کے)

مصالح پر احکام کا مدار نہیں اور نہ طالب عمل کو اس کی اجازت ہے کہ مصالح کی تفتیش کرے

حکمت کا رائے سے سمجھنا اور اس پر بناء حکم کرنا یہ کافی نہیں مدار اصلی تشریع[2] ہی پر ہے اگر چہ اس کی حکمت بالکل نہ معلوم ہو البتہ بعد میں تشریع کے بھروسہ کچھ حکمت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے باقی حکمت کے سمجھنے پر حکم ماننا موقوف نہیں ہماری تو وہ حالت ہونی چاہیے۔

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(زبان کو آپ کے اقرار سے تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کاموں کی وجہیں گھڑنا)

اور ہمارا وہ مذہب ہے جیسے حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ ہر درو[3] یشے کو چون و چرا کندو ہر طالب علمے کہ چون و چرا نکند ہر دورا در چراگاہ باید فرستاد طالب علم کو تو چون

[1] کہ ہر وقت ذکر و فکر عبادت میں لگو گے۔ [2] شریعت میں حکم آ جانے پر ہی مدار ہے۔ [3] جو صوفی چون و چرا یعنی یہ کیسے ہے اور کیوں ہے کرے اور جو طالب علم چون و چرا نہ کرے دونوں کو چراگاہ میں بھیج دینا چاہیے کہ وہ آدمی کے درجے سے نکل کر حیوانوں میں مل گئے۔

وچرا کا حق اس لئے ہے کہ وہ طالب فن ہوتا ہے لیکن طالب عمل کو اس کی اجازت ہرگز نہیں۔

مصالح کی تفتیش کا مفسدہ[1] عظیمہ

اور حکمت کی تلاش میں ایک مفسدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام یوں سمجھ جاتے ہیں کہ یہی مصالح بناء حکم ہیں اور جب کسی حکم میں ان کو مصالح نظر نہیں آتے تو اس حکم کے من[2] اللہ ہونے میں ان کو شبہ ہونے لگتا ہے یا اگر کوئی مصلحت اپنے ذہن سے مخترع[3] کی اور اس کو مدار حکمت سمجھا اور وہ مخدوش ہو گئی تو اس کے انہدام[4] سے حکمت کے انہدام کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر مصلحت خود بخود بلا تلاش ذہن میں آ جاوے تو اس کے بیان میں مضائقہ نہیں اور وہ بھی ظناً[5] غرض جب ادھر سے بولنے کا اشارہ پاوے جیسے بلا فکر کوئی وارد قلب میں آ جاوے زبان کھولے ورنہ لب بستہ رہے کہ نطق وسکوت میں اسی کا تابع رہنا چاہیے خوب کہا ہے۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

(پھول کے کان میں آپ نے کیا بات کہہ دی ہے کہ ہنس رہا ہے اور بلبل کو کیا فرما دیا ہے کہ وہ رو رہی ہے)

محفل میلاد کی تحقیق اور اس کا بیان کہ جناب نبوی کے ساتھ دنیا کے بادشاہوں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے

آج کل ہمارے چند اخوان[6] زمان نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو جو اپنے اکابر دین کے ساتھ کرتے ہیں دیکھ کر پیدا ہوا ہے لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بنا پر لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیاوی خوشی نہیں ہے یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے تعین طریق کے

---

[1] بڑی خرابی [2] اللہ کی طرف سے [3] گھڑلی ایجاد کرلی۔ [4] گر جانے سے حکمت کے گر جانے بلکہ نہ ہونے اور حکم کے نہ رہنے کا شبہ ہوتا ہے۔ [5] یقینی نہیں محض گمان کے درجہ میں۔ [6] اس زمانہ کے بھائیوں نے کیونکہ یہ حضور صحابہ تابعین کے زمانہ میں نہ تھا۔

لئے وحی کی اجازت ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سالگرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ایسا کرنے والے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی میں کر رہے ہیں صاحبو کیا حضورؐ کو اس جلال و عظمت میں دنیا کے بادشاہوں پر جن کو حضورؐ سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو جیسا ان سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

(کیا نسبت خاک کو یعنی شاہان دنیا کو عالم پاک یعنی حضورؐ سے غور کیجئے اگر صدر مملکت کی تعظیم اس طرح کی جائے جس طرح پولیس کے سپاہی کی کی جاتی ہے تو یہ صدر کی تعظیم ہوگی یا توہین)

مجھے اس موقع پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آ گئی کہ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ ایک کتیا پال رکھی تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ کتیا نے بچے دیئے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے۔ ان کو نہیں بلایا ان بزرگ نے ازراہ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے۔ اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت کر دی سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا جس روز میرے اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی اس دن آپ کو مدعو کروں گا اور ان کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھوں گا جب اولیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔ اب اس کی دلیل سنیے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے تو یہ سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطہ زمین پر زیادہ سے زیادہ چند فرسخ[1] اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا اثر اسی خطہ زمین تک محدود رہے گا۔ اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضورؐ پرنور کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگان عالم بالا سب کے سب مسرور اور شادماں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کی

---

[1] تین میل کو ایک فرسخ کہتے ہیں

ولادت شریف کفر و ضلالت کی ماحی[1] اور توحید کی حامی تھی جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت قائم ہونے سے فرشتے بھی اکثر فنا ہو جاویں گے۔ پس آپ کا ظہور چونکہ سبب تھا تمام عالم کے بقا کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہو گیا تو اس خوشی کو دنیوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی یعنی اس کے وجود میں[2] بھی اور اس کی کیفیت میں بھی۔ اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم العید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے اگر کوئی قل[3] بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابہ کرام جو کہ حضورؐ کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا بالخصوص جبکہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی علیٰ ہذا تابعین جن میں بڑے بڑے مجتہد ہوئے ہیں ان کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ ہاں جن امور کے متعلق حضورؐ سے اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیے۔ مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا ذلک الیوم الذی ولدت فیہ (یہی وہ دن ہے جس میں میں پیدا کیا گیا ہوں) اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے دوسرے پیر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ[4] وجہ ہوگی اس حکم کی اور اگر منفرداً[5] بھی

1۔ مٹانے والی 2۔ خود عید قرار دینے میں بھی اور اس کے طور طریقہ میں بھی۔ 3۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور رحمت سے بس اسی سے خوشی کرو اور حضورؐ کی ولادت فضل و رحمت ہے تو اول تو یہ غور طلب بات ہے کہ کیا یہ فضل و رحمت سال بھر میں صرف ایک دو دن کے لئے ہے یا ہر دن ہر گھڑی ہر آن پھر کیا ہر فضل و رحمت سے خوشی کا شرعی طریقہ ہے اگر صرف یہی ہے تو کیا جبکہ اور کسی وقت ایسا نہیں کیا جاتا تو اور کسی فضل و رحمت پر خوشی اور اس حکم کی تعمیل نہ ہوگی اور اگر کوئی ایسا طریقہ ہے جو سب میں پایا جا سکے دل زبان اعضاء سے ہر ہر وقت کا ہے تو اس فضل و رحمت کی خوشی کرنے پر پابندی لگا کر کمی کیوں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں اس کی فرحت کا تو یہی طریقہ ہے دوسروں کا دوسرا تو اول تو یہ بے دلیل ہے صحیح نہیں دوسرے اسلاف کی قرآن فہمی کے خلاف ہے۔ اس لئے غلط ہے۔ 4۔ ولادت و پیشی۔ 5۔ ایک ایک صرف ولادت یا صرف پیشی روزہ کی وجہ مانیں مگر یہ ہر پیر کے دن کے لئے ہے۔ سال بھر میں ایک دن کے لئے نہیں کہ سارے سال غفلت میں سوتے رہیں ذرا خیال تو کیجئے کتنی نفسانیت کی بات ہے کہ جن کاموں میں نفس کو مشقت تھی گو وہ ثابت تھے وہ تو کرتے نہیں اور جن میں نفس کو مزہ و تفریح ہے گو وہ ثابت نہیں وہ اس کے بدلہ گھڑ لئے کیا دین ایسا ہوتا ہے۔

مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے۔

بزرگوں کے عرس کا طریقہ محض لغو ہے مع دلیل اور اس کا بیان کہ موت بزرگوں کے لئے وصل محبوب ہے

اور جس طرح یوم ولادت کی خوشی کے اختراعات[1] باطل ہیں اسی طرح کسی کی وفات کی تاریخ کے کہ وہ دن بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اختراعات بھی اور یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختراع کیا ہے یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن[2] ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس کے معنی لغت میں شادی کے ہیں اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محبّ کا محبوب سے وصل ہو پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے اس کی قبر میں آ کر سوال کرتے ہیں تو سوال و جواب کے بعد کہتے ہیں نم کنومة العروس (سو جاؤ دلہن کی طرح کا سونا) تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا۔ اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں

خوشا روزے و خرم روزگارے — کہ یارے برخوردار وصل یارے

(کتنا اچھا ہے وہ دن کیسا مبارک ہے وہ وقت کہ ایک دوست دوسرے دوست کی ملاقات کا پھل کھائے)

وصل دنیوی اور اخروی کا فرق

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں فرق ہے کہ یہاں بے حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب جیسا مولانا نے فرمایا۔

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من — می نہ گنجم با صنم در پیرہن

(بولا وہ کھلا اور بے لباس کہاں ہے کیونکہ میں محبوب کے ساتھ کرتہ میں نہیں سما سکتا)

---

[1] گھڑی ہوئی بے اصل باتیں۔ [2] بے کار اور حد سے نکل جانا

اگر چہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے کہا جاتا ہے اور جیسا حضرت غوث پاک فرماتے ہیں ۔

بے حجابانہ درآ ازدر کاشانہ ما　　　　کہ کسے نیست بجز درد تو درخانہ ما

(بے حجاب ہو کر میرے گھر کے دروازے سے آ جائیے کیونکہ آپ کے درد کے سوا ہمارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے)

یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ۔

دل آرام دربر دل آرام جو　　　　لب از تشنگی خشک بر طرف جو

(دل کو آرام دینے والا تو بغل میں ہے مگر دل آرام ڈھونڈ رہا ہے دریا کے کنارے پیاس سے ہونٹ خشک ہیں)

نگویم کہ برآب قادر نیستند　　　　کہ برساحل نیل مستسقی اند

(میں نہیں کہہ سکتا کہ پانی پر قدرت نہیں رکھتے مگر دریائے نیل کے کنارے استسقا کے سے بیمار ہیں کہ پیتے ہیں اور جی نہیں بھرتا)

اہل اللہ کو مرنے کی بڑی خوشی ہوتی ہے اور وہ اس کی تمنائیں کرتے ہیں

اور چونکہ مر کر ان کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی تمنائیں کرتے ہیں اور شدت شوق میں یوں کہتے ہیں ۔

خرم آں روز کریں منزل ویراں بردم　　　　راحت جاں طلبم درپے جاناں بردم

(میں تو اس دن خوش ہوں گا کہ اس اجڑے گھر سے جاؤں گا روح کا سکون چاہوں گا محبوب کے لئے حاضر ہوں گا)

اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص یہ اشعار ساتھ ساتھ پڑھتا چلے۔

مفلسا نیم آمدہ درکوئے تو شئی للہ از جمال روئے تو

(ہم مفلس ہیں آپ کے کوچہ میں حاضر ہوئے ہیں اپنے روئے مبارک کے جلوہ سے اللہ کے لئے کچھ عطا ہو)

دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست و بربار دئے تو

(ہماری زنبیل (جھولے) کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیجئے آپ کے بازو اور ہاتھ پر آفرین اور شاباش ہو)

کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ سکتی ہے یہ غایت فرحت کا اثر ہے۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی مشہور حکایت ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدت غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے۔

سرو سیمینا بصحرا میروی سخت بے مہری کہ بے ما میروی

(اے چاندی جیسے مرد تم تو جنگل میں جا رہے ہو بڑی بے وفائی ہے کہ ہمارے بغیر جا رہے ہو)

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

(اے وہ ذات کہ سارے عالم کے تماشا و خوشی کی جگہ تو تمہارا چہرہ ہے تم اب تماشا کے لئے کہاں جا رہے ہو)

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہو گیا۔ صاحبو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ۔

پا بدست دگرے دست بدست دگرے

(پیر دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں یعنی بعد فوت)

گیا اس کو وجد ہو سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے ایک دوسرے بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ ومشتاقانہ فرماتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وقت وہ آ گیا کہ میں لباس سے خالی ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر بالکل روح ہی روح ہو جاؤں)

اور یہ حالت کیوں نہ ہو جبکہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردۂ[1] ہائے ہیولانی جو کہ مانع دیدار تھے۔ اٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہوگا۔ صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت کی یا حوروں کی ہوس ہوتی ہے حضرت ابن الفارض" کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا۔

ان کان منزلتی فی الحب عندکم　　ما قدرایت فقد ضیت ایامی

(اگر محبت میں میری عزت آپ کے نزدیک یہی ہے جو میں نے دیکھی ہے تو میں نے تو عمر ہی کھودی)

کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں آخر جنت چھپ گئی اور فوراً تجلی ظاہر ہوئی اور جاں بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہوگئی۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　تا نہ بینم رخ تو روح زمیدن ندہم

(اگر موت کا فرشتہ آوے کہ میری جان نکال لے جائے تو جب تک آپ کا چہرہ نہ دیکھ لوں گا روح کو بھاگنے نہ دوں گا)

اکثر لوگ ان حالات کو سن کر تعجب کریں گے لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم ہیں مگر ایسے لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ۔

تو مشو منکر کہ حق بس قادرست

(تم انکار مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بہت قدرت والے ہیں)

رجوع بجانب سرخی (بزرگوں کے عرس کا طریقہ محض لغو ہے مع دلیل)

غرض بزرگوں کے قول اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم[2] العرس ہے لیکن لوگوں نے ان کے مفہوم و مصداق دونوں کو

---

[1] مادہ وجسم کے پردے　[2] شادی کا دن

بالکل خراب کر دیا ہے۔ مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہوگئی باقی مفہوم کی خرابی یہ ہے کہ اس لفظ کے لغوی معنے لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چڑھاتے ہیں نوبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں۔ غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے۔ تو حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس[1] کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی کا دن ہے۔ اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لاتتخذوا قبری عیداً کہ میری قبر کو عید نہ بنانا۔ عید میں تین چیزیں ضروری ہیں۔ ایک اجتماع دوسرے تعین وقت تیسری فرحت تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع ہو جاوے تو اور بات[2] ہے۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لے جانا اگرچہ آپ کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن[3] ہے۔ اور حضور کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی دن معین نہیں ہوا بحمد اللہ اس مسئلہ کی تحقیق کافی ہوگئی۔

بری نظر اور بری نیت کا مرض آج کل عام ہو رہا ہے

یعلم خائنة الاعین و ما تخفی الصدور ترجمہ آیت شریفہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور جس شے کو سینے چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں۔ یہ ایک آیت ہے جس کے الفاظ تھوڑے ہیں اور معنی بہت ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک امر قبیح پر مطلع فرمایا ہے اور علاوہ اطلاع کے اس میں زجر بھی ہے اس کو اس وقت اس

---

[1] اللہ سے ملنے کی خوشی کا [2] جیسے حج کے زمانہ میں روز روز رہتا ہے۔ [3] جدائی کے رنج کا سبب ہے۔

لئے اختیار کیا ہے کہ جس مرض کا اس میں بیان ہے۔ آج کل اس میں بہت ابتلا ہے اور امراض میں سے وہی مرض متنبہ کرنے کے لئے لیا جاتا ہے جس میں ابتلا ہو۔

معصیت بھی مرض ہے

اور مرض سے یہاں مراد معصیت ہے گو لوگ اس کو مرض نہ سمجھیں کہ تعجب ہوگا کہ اس کو مرض کیوں کہا گیا لیکن بعد بیان حقیقت مرض کے اس کی وجہ سمجھ میں آ جاوے گی۔ مرض کی حقیقت ہے اعتدال سے مزاج کا خارج ہو جانا اور معصیت میں بھی قلب کا مزاج اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے۔

معصیت[1] کا مرض جسمانی سے اشد ہونا اور اس کا بیان کہ موت تمام تکلیفوں سے چھڑا دیتی ہے

بلکہ یہ خروج[2] عن الاعتدال جو قلب کے متعلق ہے زیادہ مضر ہے۔ اس لئے کہ بدنی مرض کا انجام بہت سے بہت یہ ہے کہ مر جاوے گا اور مرنے سے بعض اوقات ہوتا ہے کہ بہت سے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے کیونکہ جس قدر آلام[3] ہیں وہ اس بدن اور روح ہی کے تعلق کی[4] وجہ سے ہیں۔ دیکھئے مرض حذر یعنی سن ہو جانے میں بدن کو اگر کاٹ ڈالیں تو کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور مفلوج کے فالج زدہ حصے میں اگر سوئیاں بھی چبھوئیں تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا کیونکہ روح کا تعلق بدن سے ویسا نہیں رہا باوجود یہ کہ اس حالت میں روح سے تعلق رہتا ہے گو وہ ضعیف سہی اور اس تعلق ہی کا اثر یہ ہے کہ وہ عضو گلتا سڑتا نہیں جیسے مردوں کا بدن گل جاتا ہے اور جب کہ بالکل ہی روحی مفارقت ہو جاوے اور یہ تعلق ضعیف بھی نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ بطریق اولیٰ تکلیف نہ ہوگی۔

یعنی جو مفہوم تکلیف کا ہمارے نزدیک ہے اور جو معنے متبادر[5] الم کے ہیں وہ نہ ہوگی۔

---

[1] گناہوں کے مرض کا جسم کے مرض سے سخت ہونا [2] دل و روح کے مزاج کا درمیانی روش سے خارج ہونا [3] دنیا کی تکلیفیں [4] ایسے تعلق سے جو زندگی میں ہوتا ہے اور بعد میں نہیں رہتا۔ [5] ذہن میں آنیوالے یعنی جیسے عام چوٹ لگنے یا کٹنے سے ہوتی ہے اور قبر کے عذابات تو معنوی و لطیف تعلق سے جو نظر نہیں آ سکتا ہوتے ہیں اور سخت تکلیف والے

روح کو مفارقت جسم کے بعد جسم کو صدمہ دینے سے کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے

ہاں دوسرے دلائل سے معلوم ہوا کہ روح کو بعد مفارقت جسم کچھ تاذی ہوتی ہے[1]۔ جیسا کہ بعض نصوص میں ہے کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فعل سے روح کو الم ہوتا ہے مگر جس قسم کا الم روح کے تعلق مع الجسم[2] کی حالت میں ہڈی توڑنے سے روح کو ہوتا ہے۔ وہ الم نہیں ہوتا اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیے کہ مثلاً زید کے بدن کو اگر مارا جائے تو اس کو تکلیف ہوگی اور اگر زید کی رضائی اتار کر چولھے میں رکھ دی جائے تب بھی تکلیف ہوگی مگر دونوں تکلیفیں جدا جدا ہیں پس روح کے مفارق ہونے کے بعد روح کو ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے رضائی جلانے سے زید کو ہوئی اور اس تکلیف کی وجہ بھی وہی تعلق سابق ہے جو بدن کے ساتھ اس کو تھا وہ تعلق اس کو مستحضر ہوتا ہے اس لئے تکلیف ہوتی ہے[3]۔

موت بڑے آرام کی چیز ہے اور اس پر ایک عجیب حکایت

خلاصہ یہ ہے کہ جب روح مفارق ہو جاتی ہے تو کوئی الم[4] نہیں رہتا اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا ایک طبیب کی تعریف کی گئی کہ یہ بڑے اچھے حکیم ہیں ان کے علاج سے مرض ہی نہیں رہتا یعنی مریض ہی نہیں رہتا جو مرض رہے کیونکہ مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور تندرست ہو جائے یا یہ کہ مریض ہی چل دے جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی آ بیٹھی اس نے اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی جب کئی بار اڑانے سے نہ گئی تو اس نے چھری لے کر ناک کاٹ ڈالی اور کہا وہ اڈا ہی نہیں رہا جس پر اب بیٹھے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب آدمی مر

---

[1] تکلیف ظاہری [2] روح کے جسم سے پورے تعلق کی۔ [3] مگر یہ تکلیفیں بھی سابق قسم کی ظاہری ہیں اور جو قبر کے عذاب کی تکلیف ہے وہ قسم ہی اور ہے وہ اول روح کو اور تابع ہو کر جسم کو ہے اور یہ اول جسم کو پھر تابع ہو کر روح کو تھی اب روح تابع نہیں رہی اس لئے دنیوی تکلیفوں کا حال یہ ہے اس کی تفصیل حضرت کی کتاب المصالح العقلیہ میں ہے [4] دنیا والی کوئی تکلیف نہیں رہتی۔

جاتا ہے نہ زکام رہتا ہے نہ کھانسی نہ بخار نہ فکر نہ رنج سب بلائیں اور آلام دور ہو جاتے ہیں بالکل سکون ہو جاتا ہے سکون کے لفظ پر ایک شرعی لطیفہ یاد آیا اور وہ حکیمانہ لطیفہ ہے اور وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بی بی ام سلیمؓ کا قصہ ہے۔ ان دونوں میاں بی بی کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک بچہ بیمار ہو گیا حضرت ابوطلحہؓ ہمیشہ آ کر بی بی سے اس کا حال پوچھتے۔ ایک روز بچہ انتقال کر گیا۔ حضرت ابوطلحہؓ اس وقت باہر تھے۔ بی بی نے یہ خیال کیا کہ اگر میں اب اطلاع کروں گی تو شب کا وقت ہے نہ کھانا کھائیں گے نہ ان کو نیند آئے گی خواہ مخواہ بے چین ہوں گے اس لئے مناسب ہے کہ اسوقت اطلاع ہی نہ کی جائے۔ حقیقت میں دین عجیب چیز ہے تمام عمر کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت ابوطلحہؓ جب باہر سے تشریف لائے تو حسب عادت دریافت فرمایا کہ بچہ کیسا ہے۔ اب یہ وقت بڑے امتحان کا تھا اگر سچ بولیں تو وہ مصلحت فوت ہوتی ہے اور جھوٹ میں شرعاً گناہ حقیقت میں بڑی کشمکش کا وقت تھا۔ لیکن دین فہم کو تیز کر دیتا ہے چنانچہ من جانب اللہ ایک جواب ان کو القا ہوا فرمایا کہ اب تو اس کو سکون ہے آرام ہے اس لئے کہ موت سے بڑھ کر کوئی سکون اور آرام نہیں ہے اس لئے کہ آرام و راحت میں دو صورتیں ہیں[1] دفع مضرت یا جلب منفعت دونوں حالتوں میں عرفاً آرام سے ہونا کہا جاتا ہے موت میں دونوں چیزیں موجود ہیں۔ دفع مضرت کا بھی ہے (ہو ظاہر[2]) اور جلب منفعت یہ ہے کہ موت سے وصول الی المحبوب الحقیقی[3] ہوتا ہے۔ یہ خاص مسلمانوں کے لئے ہے ایک لطیفہ یاد آیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے باپ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو جیسا کہ ایک اعرابی نے مجھ کو تسلی دی ایسی کسی نے نہیں دی۔ سچ یہ ہے کہ دیندار خواہ گاؤں کا ہو یا شہر کا اس کا فہم چونکہ دین کی وجہ سے درست ہو جاتا ہے اس لئے وہ حقائق امور کو خوب سمجھتا ہے وہ مضمون تسلی کا یہ ہے۔

اصبر نکن بک صابرین فانما   صبر الرعیة بعد صبر الراس

---

[1] تکلیف کا دور ہونا یا نفع حاصل کر لینا۔ [2] اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قسم کی تکلیف ختم ہو جاتی ہے
[3] حقیقی محبوب سے جاملنا

خیر من العباس اجرک بعدہ   والله خیر منک للعباس

مطلب یہ ہے کہ آپ صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے بعد ہوتا ہے اور اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور وہ ثواب تمہارے لئے حضرت عباسؓ سے بہتر ہے اور حضرت عباسؓ کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباسؓ کے لئے تم سے بہتر ہے یعنی تمہارے پاس رہنے سے اللہ کے پاس رہنا بہتر ہے یہ عجیب مضمون ہے حقیقت میں موت ایسے ہی آرام کی چیز ہے حدیث میں آیا ہے کہ موت مومن کا تحفہ ہے اور انسان کی حالت یہ ہے کہ اس سے بھاگتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس عالم کو دیکھا نہیں موت ایک ریل ہے گاڑی کی طرح ہے جیسے گاڑی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے اسی طرح موت اس عالم سے دارالآخرت میں پہنچا دیتی ہے جب گاڑی میں آدمی بیٹھا ہوتا ہے تو اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے لئے وہاں کیا کیا تیار ہو رہا ہے۔ جب ریل سے اسٹیشن پر اترے دیکھا تو وہاں طرح طرح کے سامان ہیں۔ ایک مخلوق استقبال کے لئے کھڑی ہے اقسام اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی موجود ہیں تو اس وقت جانتا ہے کہ اللہ اکبر یہاں تو ہمارے لئے بڑا سامان ہے اور جہاں سے آیا تھا وہ سب اس کی نظر میں ہیچ معلوم ہوتا ہے بلکہ اسکا خیال تک بھی نہیں آتا اسی طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اس وقت یہاں کچھ خبر نہیں لیکن جب یہاں سے رحلت ہوگی تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں دیکھ لیں گے کہ یہاں ہمارے لئے کیا نعمتیں ہیں اور بزرگوں نے بصر[1] سے یا بصیرت سے دیکھا ہے۔ اس لئے ان کی نظر میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ دنیا کا عالم آخرت کے ساتھ وہ نسبت ہے جو ماں کے رحم کو اس دنیا کے ساتھ ہے۔ جیسے بچہ اپنی رضا مندی سے دنیا میں نہیں آتا۔ اسی طرح آدمی وہاں جانا نہیں چاہتا اور جیسے بچہ ماں کے رحم ہی کو سمجھتا ہے کہ تمام جہان یہی ہے اور آگے اس کی نظر ہی نہیں جاتی اور جب ماں کے رحم سے نکلتا ہے تو حقیقت معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہم لوگ جب یہاں سے جاویں گے تو اس دنیا کی حقیقت معلوم ہوگی۔ بہر حال موت ہر طرح سکون[1] اور آرام کی شے ہے۔ اسی واسطے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا

---

[1] آنکھ کی بینائی سے دل کی بینائی سے

اب اس کو سکون ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کھانا کھایا اور پھر ان کو بیوی کے پاس جانے کی رغبت اور بی بی کا حال یہ کہ ظاہر میں تو جو کچھ میاں کہتے تھے ان کی رضامندی کے واسطے سب کچھ کر رہی تھیں مگر اندر جو کچھ تھا وہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا۔ غرض میاں تو فارغ ہو کر سو رہے اور بی بی کو کیا نیند آئی ہوگی۔ صبح کے وقت جب حضرت ابوطلحہؓ نماز پڑھ کر تشریف لائے تو بی بی نے پوچھا کہ بھلا ایک بات تو بتلاؤ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھ دے تو جب وہ اپنی امانت مانگے تو ہنسی خوشی دینا چاہیے یا ناک منہ چڑھانا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں ہنسی خوشی دینا چاہیے کہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت لے لی۔ اب تم صبر کرو میاں ناراض بھی ہوئے کہ رات تم نے خبر نہ کی فرمایا کہ کیا نفع تھا تم پریشان ہوتے مجھے اس پر یہ قصہ یاد آیا تھا کہ انہوں نے موت کا نام سکون رکھا۔

رجوع بجانب سرخی (معصیت کا مرض جسمانی سے اشد ہونا الخ)

حاصل یہ کہ امراض بدنیہ کا انتہائی انجام موت ہے اور موت چونکہ قاطع تمام مصائب کی ہے اس لئے کچھ مضر نہیں مگر پھر بھی امراض بدنیہ کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ بخلاف مرض روحانی کے جس کی حقیقت ہے حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا اور اعتدال سے خارج ہو جانا کہ اس کا انجام وہ ہلاکت ہے جس کی نسبت فرمایا ہے۔ **لا یموت فیھا ولا یحی**" (نہ اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا) جس کا نام جہنم ہے اگر موت آ جاتی تو سب قصے ختم ہو جاتے مگر وہاں موت بھی نہیں پس جس مرض کا انجام صرف ہلاکت بدن ہے اس کو جب قابل اہتمام سمجھتے ہیں تو جس مرض کا نتیجہ ہلاکت ابدی یا مدید[2] و شدید ہے کیا وہ قابل اہتمام نہیں کیا اس کو مرض نہ کہا جاوے گا مگر حالت یہ ہے کہ زکام ہو جاوے تو حکیم جی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور صدہا روحانی امراض میں مبتلا ہیں اور کچھ پرواہ نہیں۔

فکر کون سی معصیت کی زیادہ ہونی چاہیے

اور یوں تو ہر معصیت قابل اہتمام و فکر ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ معصیت زیادہ قابل فکر ہے جس کو خفیف سمجھا جائے کسی نے بقراط سے پوچھا تھا کہ امراض میں کون سا

---

[1] دنیا کی تکلیفوں اور جھگڑوں سے اور عمل نیک اور توبہ صحیح کے بعد تو بالکل ہی سکون در سکون ہے [2] دراز اور سخت

زیادہ شدید ہے کہا کہ جس مرض کو خفیف سمجھا جاوے وہ بہت اشد ہے اسی طرح جس گناہ کو ہلکا سمجھا جاوے وہ بہت شدید ہے۔ اس لئے کہ وہ لا علاج[1] ہے۔

بری نظر اور بری نیت بہت سخت گناہ ہے مگر لوگ اس کو ہلکا سمجھتے ہیں

منجملہ ایسے امراض کے ایک مرض یعنی گناہ وہ ہے جس کا آیت کریمہ میں ذکر ہے اور اسی واسطے اس کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں یعلم خائنة الاعین (اللہ تعالیٰ جانتے ہیں آنکھ کی خیانت کو اور جس کو سینے چھپاتے ہیں (یعنی دل کی باتوں کو) خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو اور یوں تو آنکھوں کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے بدنگاہی۔ اسی طرح دل کے بہت گناہ ہیں لیکن یہاں بقرینہ سباق[2] خاص گناہ کا ذکر ہے یعنی نیت بری ہونا ان دونوں گناہوں کو لوگ گناہ تو سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جس درجہ ان کی مضرت ہے اس قدر نہیں سمجھتے چنانچہ گناہ کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیے کہ دل تو میلا ہو جائے مگر اس گناہ کے بعد دل بھی میلا نہیں ہوتا بہت خفیف سمجھتے ہیں کسی عورت کو دیکھ لیا کسی لڑکے کو گھور لیا اس کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا یا کسی پھول کو دیکھ لیا۔

بری نظر اور برے خیال کا مرض عام ہے اور اس کی وجہ

اور یہ گناہ وہ ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ بدکاری سے تو بہت محفوظ ہیں کیونکہ اس کے لئے بڑے اہتمام کرنے پڑتے ہیں۔ اول تو جس سے ایسا فعل کرے وہ راضی ہو اور روپیہ بھی پاس ہو اور نیز حیا و شرم مانع نہ ہو غرض اس کے لئے شرائط بہت ہیں اسی طرح موانع بھی بہت ہیں چنانچہ کہیں تو یہ امر مانع ہوتا ہے کہ اگر کسی کو اطلاع ہو گئی تو کیا ہوگا کسی کو خیال ہوتا ہے کہ کوئی بیماری نہ لگ جاوے کسی کے پاس روپیہ نہیں ہوتا کسی کو اس کی وضع مانع ہوتی ہے چونکہ موانع زیادہ ہیں اس لئے کوئی شائستہ آدمی خصوصاً جو دیندار سمجھے جاتے ہیں اس میں بہت کم مبتلا ہوتے ہیں۔ بخلاف آنکھوں کے گناہ کے کہ اس

---

[1] اس کے نزدیک لاعلاج ہے نہ مرض سمجھا نہ علاج کی ضرورت [2] پچھلے الفاظ کے معنے سے

میں سامان کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ نہ اس میں ضرورت روپیہ کی اور نہ اس میں بدنامی کیونکہ اس کی خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ کیسی نیت سے کسی کو گھور لیا اور مولوی صاحب مولوی صاحب رہتے ہیں اور قاری صاحب قاری صاحب رہتے ہیں۔ نہ اس فعل سے ان کی مولویت میں فرق آتا ہے اور نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں دھبہ لگتا ہے اور گناہوں کی خبر تو اوروں کو بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی۔ معصیت کرتے ہیں اور نیک نام رہتے ہیں لڑکوں کو گھورتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو بچوں سے بڑی محبت ہے جبکہ آنکھوں کے گناہ میں اطلاع نہیں ہوتی تو دل کے گناہ میں تو کیسے ہو سکتی ہے۔

بزرگوں کی پردہ پوشی اور اس کا بیان کہ بدنگاہی سے آنکھ بے نور ہو جاتی ہے

اور جن کو اطلاع ہوتی ہے وہ حضرات ایسے متحمل اور ظرف والے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور وہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ کر آیا تھا۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطاب خاص سے تو اس کو کچھ نہ فرمایا لیکن یہ فرمایا مابال اقوام یترشح الزنا من اعینهم یعنی لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے تو یہ عنوان ایسا ہے کہ اس میں رسوائی کچھ نہیں لیکن جو کرنے والا ہے وہ سمجھ جائے گا کہ مجھ سے فرما رہے ہیں اہل کشف نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایک ایسی ظلمت ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بصیرت ہو وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے۔ اگر دو شخص ایسے لئے جاویں کہ عمر میں حسن و جمال میں اور ہر امر میں وہ برابر ہوں فرق ان میں صرف اس قدر ہو کہ ایک فاجر ہو دوسرا متقی ہو جب چاہے دیکھ لو متقی کی آنکھ میں رونق اور دل فریبی ہو گی اور فاسق کی آنکھ میں ایک قسم کی ظلمت اور بے رونقی ہو گی۔ لیکن اہل کشف خصوصیت سے کسی کو کہتے نہیں بلکہ عیب پوشی کرتے ہیں۔

حکایت: اس پر مجھے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے ایک مرتبہ حسب معمول حدیث کا درس

ہو رہا تھا کہ ایک طالب علم وقت سے دیر کر کے سبق کے لئے آئے حضرت شاہ کو منکشف ہو گیا کہ یہ جنبی ہے غسل نہیں کیا۔ وہ طالب علم معقولی تھے۔ معقولی ایسے ہی لاپرواہ ہوتے ہیں شاہ صاحب نے مسجد سے باہر ہی روک دیا اور فرمایا کہ آج تو طبیعت سست ہے جمنا پر چل کر نہائیں گے۔ سب لنگیاں لے کر چلو سب لنگیاں لے کر چلے سب نے غسل کیا اور وہاں سے آ کر فرمایا کہ ناغہ مت کرو کچھ پڑھ لو وہ طالب علم ندامت سے پانی پانی ہو گیا اہل اللہ کی یہ شان ہوتی ہے کیسے لطیف انداز سے اس کو امر بالمعروف فرمایا۔

شیخ سے اپنا کوئی عیب نہ چھپانا چاہیے

اور جب بزرگوں کی شان معلوم ہوگئی کہ وہ کسی کو رسوا نہیں کرتے تو اب مستفیدین کو بھی چاہیے کہ ایسے شیوخ سے اپنے عیب کو نہ چھپایا کریں اس لئے کہ عیب ظاہر نہ کرنا دو وجہ سے ہوتا ہے یا تو خوف ہوتا ہے کہ یہ ہم کو حقیر سمجھیں گے سو ان حضرات میں نہ تو یہ بات ہے کہ کسی کو حقیر سمجھیں اس لئے کہ یہ حضرات سوائے اپنے نفس کے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے اور یا یہ خوف ہوتا ہے کہ کسی کو اطلاع کر دیں گے۔ سو نہ ان حضرات میں یہ بات ہے اس لئے ان سے صاف کہہ دینا چاہیے مگر یہ اظہار معالجہ کے لئے ہے نہ کہ بلاضرورت کیونکہ بلاضرورت گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے اور بضرورت ظاہر کرنے کے حق میں حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

چنداں کہ گفتیم غم باطبیباں ۔۔۔ درماں نکردند مسکین غریباں

(بہت بہت بار ہم نے طبیبوں سے اپنا غم کہا مگر وہ غریب مسکین علاج ہی نہ کر سکے)

ما حال دل را بایار گفتیم ۔۔۔ نتواں نہفتن درداز حبیباں

(ہم نے دل کا حال آخر دوست سے کہہ دیا دوستوں سے درد کو چھپایا بھی نہیں جا سکتا)

بدنگاہی کے عام ہونے کے وجوہ اور اس کا بیان کہ گناہوں کی بنیاد کب سے پڑتی ہے

غرض چونکہ وہ لوگ کسی کو فضیحت[1] نہیں کرتے اور جو فضیحت کرنے والے ہیں ان کو

---

[1] بزرگ رسوا نہیں کرتے

اطلاع نہیں ہوتی اس لئے یہ گناہ بدنگاہی کا اکثر چھپا ہی رہتا ہے۔ اس لئے لوگ بے دھڑک اس کو کرتے ہیں پھر زنا و دیگر معاصی مثل سرقہ (چوری) وغیرہ میں تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ قوت و طاقت ہو اس میں اس کی بھی ضرورت نہیں اس لئے بوڑھے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ دیکھئے بوڑھا اگر عاشق ہو جاوے اور قابو بھی چل جاوے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ قوت ہی نہیں ہے مگر آنکھوں کے سینکنے میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں خواہ لب گور ہی ہو جاویں۔ مجھ سے ایک بوڑھے آدمی ملے اور بہت متقی تھے۔ انہوں نے اپنی حالت بیان کی کہ میں لڑکوں کو بری نظر سے دیکھنے میں مبتلا ہوں۔ ایک اور بوڑھے تھے وہ عورتوں کے گھورنے میں مبتلا تھے۔ اور یہ مرض اول جوانی میں پیدا ہو جاتا ہے بلکہ سب گناہوں کی یہی شان ہے کہ اول جوانی میں تقاضے کی وجہ سے کیا جاتا ہے پھر وہ مرض اور روگ لگ جاتا ہے اور لب گور تک کیا جاتا ہے۔ جیسے حقہ کو اول کسی مرض کی وجہ سے پینا شروع کیا تھا مگر پھر یہ مرض لگ جاتا ہے اور شغل ہو جاتا ہے لیکن جوان اور بوڑھے میں فرق یہ ہے کہ جوان آدمی تو معالجہ کے لئے کسی سے کہہ دیتا ہے اور بوڑھا آدمی شرم کی وجہ سے کسی سے کہتا بھی نہیں پس اس کے مخفی رہنے اور خفیف ہونے کی وجہ سے اس میں کثرت سے ابتلا واقع ہے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں۔ **یعلم خائنة الاعین و ما تخفی الصدور** (اللہ تعالیٰ جانتے ہیں آنکھوں کی خیانت کو اور ان چیزوں کو جن کو سینے چھپاتے ہیں یعنی دل کی باتوں کو) **یعلم** (جانتا ہے کا لفظ بتا رہا ہے) کا لفظ دال ہے اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے۔

بعض طبائع کو سزا کا خوف مانع ہوتا ہے جرم سے اور بعض طبائع کو جرم پر اطلاع کا خوف مانع ہوتا ہے بدنگاہی پر ایسی وعید کی گئی ہے جو دونوں مذاق والوں کے لئے زاجر[1] ہے

اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی

[1] ڈانٹنے والی ہے۔

سزا ساتھ ساتھ بیان فرمادی ہے اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں۔ بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جوتوں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جوتیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے ان کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جاوے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے لیکن اس سے وہ گڑ جاتے ہیں کہ فلاں کو خبر ہو جاوے گی بالخصوص جبکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارا یہ جرم معاف بھی ہو جاوے گا تو اور بھی زیادہ عرق عرق[1] ہو جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا

ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے وہ دمبدم عنایت

اسی بناء پر ایک آیت کی تفسیر یاد آ گئی وہ یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس ناکہ پر حضورؐ نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطائے اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے۔

اس کے بارہ میں ارشاد ہے **اذتصعدون ولا تلون علیٰ احدوالرسول یدعوکم فی اخرکم فاثابکم غماً بغم لکیلا تحزنوا علیٰ ما فاتکم ولا ما اصابکم واللہ خبیر بما تعملون** (جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی پر متوجہ نہ ہوتے تھے اور ہمارے رسول تم کو پچھلی جماعتوں میں سے پکار رہے تھے تو تم کو پہنچا غم ایک غم کے بدلہ میں تاکہ تم غمگین نہ ہوا ان غنیمتوں پر جو تم سے فوت ہو گئیں اور ان تکلیفوں پر جو تم کو پہنچیں اور اللہ تعالیٰ خبر رکھتے ہیں اس کی جو تم کرتے ہو) یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا بہ سبب اس کے ہمارے رسول کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا۔ اس لئے غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ حزن ہو نہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لا زاید ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تاکہ تم کو حزن ہو لیکن الحمدللہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لا زاید[2] ماننے کی ضرورت نہیں

---

[1] شرم سے پسینہ پسینہ [2] لکیلا اور ولا میں جو لا ہے جس کے معنی یوں چاہئیں تاکہ تم غمگین نہ ہو تو اب یہ اشکال ہوا اور لا کو زاید کہنے میں یہ معنی ہونگے تاکہ تم غمگین ہو اب وہ اشکال نہیں رہتا۔

ہے۔ اور معنی بے تکلف درست ہیں وہ یہ کہ حضرت صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے۔ جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا ہے کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے۔ اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں۔ اگر سزا نہ ہوتی تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و جاں فرما تھا۔ اس بناء پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دے دی تا کہ تم کو غم نہ ہو غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یعلم میں اشارہ سزا کی طرف بھی ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام[1] پر فیجازیکم به فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے۔

لوگوں کو بدنگاہی سے بچنے کا اہتمام نہ ہونا اور اس کا بیان کہ بدنگاہی کے متعلق کیا کیا دھوکے ہوتے ہیں

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہیے۔ کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اس کو نہایت درجہ خفیف سمجھتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ ضعیف ہو گئی ہے ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت[2] ہی نہیں اس لئے کچھ حرج نہیں ہے۔ سو ان کو مرض کا پتہ بھی نہیں لگتا اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ سو یہ بالکل دھوکہ ہے یاد رکھو کہ رغبت کے مختلف انواع ہیں جیسی

---

[1] کیونکہ خبر رکھنا علم ہونا ہے کیونکہ جب علم ہو گا اس کا نتیجہ سزا بھی ہو گی اس لئے مفسرین کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ تم کو اس کی سزا بھی دیں گے کیونکہ علم اور نتیجہ دونوں مراد ہیں جب جانتے ہیں تو تم کو اس کی سزا بھی دیں گے۔

[2] وہ ضعیف کو نہ ہونا قرار دے دیتے ہیں یہ دھوکہ ہے جس میں نفس نے مبتلا کر دیا ہے

رغبت پھول کی طرف ہے ویسی انسان کی طرف نہیں۔ اچھے کپڑے کو دیکھ کر کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کو گلے لگا لوں چمٹا لوں۔ انسان کی طرف ایسی ہی رغبت[1] ہوتی ہے ایک دھوکہ اور ہوتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ کہتے ہیں جیسے اپنے بیٹے کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لوں اسی طرح دوسرے کے بچہ کو دیکھ کر بھی ہمارا یہی جی چاہتا ہے صاحبو کھلی ہوئی بات ہے اپنے سیانے بچہ اور دوسرے کے سیانے لڑکے میں بڑا فرق ہے۔ اپنے لڑکے کو گلے لگانا چمٹانا اور طرح کا ہے۔ اس میں شہوت کی آمیزش ہرگز نہیں اور دوسرے کے لڑکے کی طرف اور قسم کا میلان ہے۔ کہ اس میں گلے لگانے سے بھی آگے بڑھنے کو بعض کا جی چاہتا ہے محبوب کی جدائی میں اور طرح کا رنج ہوتا ہے اور اپنے لڑکے کی جدائی میں اور قسم کا۔

بدنگاہی کیسی مضر چیز ہے اور اس کا بیان کہ مردوں[2] کی مخالطت عورتوں کی مخالطت سے بھی زیادہ مہلک ہے

اور لڑکوں کی رغبت تو اور بھی سم قاتل ہے۔ نصوص میں تو اس کی حرمت ہے ہمارے بزرگوں نے بھی جو اس کے آثار لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سخت بلا ہے۔ ایک بزرگ مطلق نظر کے لئے فرماتے ہیں۔ النظرة سهم من سهام ابليس یعنی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ حضرت ابوالقاسم قشیری دونوں امر کی نسبت فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے امردوں اور عورتوں کی مخالطت رہزن ہے۔ ایک بزرگ کا خاص امردوں کے حق میں قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی محبت میں مبتلا کر دیتے ہیں غرض یہ نہایت مضرت کی چیز ہے۔

بدنگاہی کا اور گناہوں سے اشد[3] ہونا اور اسکے متعلق ایک بڑا دھوکہ

اور دوسرے معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ صدور کے بعد سب گناہوں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شے ہے کہ جب

---

[1] اس لئے یہ اور قسم کا ہے جس کا نام شہوت ہے۔ شیطان سے دھوکہ نہ کھایئے۔
[2] بے داڑھی والے لڑکوں سے میل جول [3] بہت سخت

صادر ہوتی ہے اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے۔ کہ اور دیکھو۔ آدمی کھانا کھاتا ہے سیر ہو جاتا ہے پانی پیتا ہے پیاس بجھ جاتی ہے مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی ہے اس حیثیت خاص سے یہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے بعضے لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ اس سے خدا کا قرب ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہم خدا کی قدرت دیکھتے ہیں مگر نرا شیطانی دھوکہ ہوتا ہے۔ شیخ شیرازی نے ایسے ہی لوگوں کے جواب میں حکایت تحریر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔

یکے صورتے دید صاحب جمال　　　　بگر دیدش از شورش عشق حال

(ایک شخص نے ایک جمال والی صورت دیکھ لی تو عشق کی سوزش سے اس کا حال دگرگوں ہو گیا)

براند اخت بیچارہ چنداں عرق　　　　کہ شبنم بر آرد بہشتی ورق

(بیچارہ نے اس قدر عرق ریزی کی اور مصیبت اٹھائی ہے کہ شاید یہ شبنم بہشت کے پتے اگا دے نتیجہ بہتر نکل آئے مگر کہیں شبنم سے پھل پیدا ہوتے ہیں)

گزر کرد بقراط بردے سوار　　　　پر سید کیں راچہ افتاد کار

(بقراط سوار ہونے کی حالت میں اس پر کو گزر گیا تو پوچھا اس پر کیا افتاد پڑ گئی)

کسے گفتش ایں عابد پارساست　　　　کہ ہرگز خطائے زدستش نخاست

(کسی نے کہا کہ یہ ایسا نیک بخت عابد ہے کہ کبھی اس کے ہاتھ سے کوئی خطا ہی نہیں ظاہر ہوئی)

ببرداشت خاطر فریبے دلش　　　　فرورفتہ پائے نظر در گلشن!

(کسی دل چھیننے والے نے اسکا دل اٹھا لیا اس کی نظر کے قدم اس کی دلدل میں پھنس گئے)

نہ ایں نقش دل می رباید زدست　　　　دل آں می رباید کہ ایں نقش بست

(مگر خود یہ شکل دل کو اس کے ہاتھ سے نہیں لے جاتی ہے بلکہ دل کو وہ لے جاتا ہے جس نے یہ شکل بنائی ہے اس کا جلوہ نظر آتا ہے یہ اسی کا شیدا ہے)

بقراط جواب دیتا ہے

نگاہ رندہ را خود ہمیں نقش بود　　　　کہ شوریدہ را دل بیغمار بود

(کیا بنانے والے کی بس یہی ایک شکل بنائی ہوئی تھی کہ اس سرپھرے کا دل اس معشوق کے ذریعہ لے لیا)

چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد   کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

(کیوں ایک دن کے بچہ نے اس کے ہوش نہ اڑا دیئے کہ صناعی دیکھنے میں تو سب برابر ہیں بڑا ہو یا چھوٹا بلکہ چھوٹے میں قدرت وصناعی زیادہ معلوم ہوتی ہے اگر دراصل یہی وجہ تھی تو ایک دن کے بچے سے عشق ہوتا اس سے نہ ہوتا یہ تو نفس کی بدمعاشی ہے اور غلط تاویل)

محقق ہماں بیند اندر ابل   کہ درخوبر دیان چین و چگل

(محقق تو وہی بات اونٹ میں دیکھتا ہے جو چین و چگل کے حسینوں میں دیکھتا ہے کیونکہ قدرت کا جلوہ اونٹ میں بھی ایسا ہی ہے)

اگر کوئی دعویٰ کرے کہ مجھ کو اونٹ اور انسان صاحب جمال دونوں برابر ہیں وہ کاذب ہے آدمی اپنی طبیعت کا خود اندازہ کر سکتا ہے اور یہ میلان جس کو عشق کہتے ہیں عشق نہیں ہے یہ شہوت ہے ایک صاحب فرماتے ہیں۔

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود   ایں فساد از خوردن گندم بود

(یہ عشق ہی نہیں جو آدمیوں میں ہوتا ہے یہ تو گندم کھانے کا فساد ہے چند روز کھانے کو نہ ملے تو حقیقت معلوم ہو جائے)

یہ فساد روٹیوں کا ہے ایسے لوگوں کو چار روز تک روٹی نہ ملے اس کے بعد پوچھا جاوے کہ روٹی لاؤں یا لڑکا یہ کہے گا کہ لڑکا اپنی ایسی تیسی میں جائے روٹی لاؤ۔

بزرگوں نے جو عشق مجازی کا حکم فرمایا ہے اس کا کیا مطلب ہے اور اس کا بیان کہ عشق مجازی عشق حقیقی سے کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملا جامی نے تو عشق مجازی کا امر کیا ہے اور حکایت لکھی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب گیا تھا انہوں نے کہا کہ عاشق ہو کر آؤ اور آگے لکھتے ہیں۔

متاب از عشق رد گرچہ مجازی است　　　　کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

(عشق سے منہ نہ پھیرو اگر چہ عشق مجازی ہی ہو کیونکہ وہ عشق حقیقی کا کام بنا دینے والی چیز ہے)

اگر اول الف باتا نخوانی　　　　زقرآں حرف خواندن کے توانی

(اگر شروع میں الف با تا نہیں پڑھو گے تو قرآن مجید کے حروف کب پڑھ سکو گے۔ مجازی نہ ہوگا تو حقیقی تک کیسے پہنچو گے)

اس سے بعض نادانوں نے سمجھا کہ جب تک کسی رنڈی کسی لونڈے کو قبلۂ[۱] توجہ نہ بنایا جاوے اس وقت تک عشق حقیقی میسر نہ ہوگا۔ بڑی غلطی اور سخت کم فہمی ہے میں اس کا مطلب عرض کرتا ہوں بات یہ ہے کہ اصلی مقصود طالب کا تو یہ ہے کہ جملہ تعلقات قطع کر کے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ ہو تو اس کے دو جز ہیں۔ تعلقات مخلوق سے قطع کرنا اس کو تو اصطلاح میں فصل کہتے ہیں اور دوسری طرف تعلق پیدا ہونا اس کو وصل کہتے ہیں۔ اور یہ[۲] تعلقات ہی فاصل و حاجب بن رہے ہیں اگر یہ درمیان سے اٹھ جاویں تو وصل ہی وصل ہے۔ شیخ فرماتے ہیں

تعلق حجاب ست و بے حاصلی　　　　چو پیوند ہا بگسلی و اصلی

(اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں یہ مخلوق کے تعلقات ہی حجاب ہیں اور بے حاصل کام ہے جب ان تعلقات کو توڑ ڈالو گے واصل ہو جاؤ گے)

پس معلوم ہوا کہ مقصود انقطاع[۳] عما سوی اللہ ہے جب یہ ہو جاوے تو قصہ سہل ہے اور اس انقطاع کی تحصیل کے لئے بزرگوں نے مختلف معالجے اور تدبیریں فرمائی ہیں مقصود ایک ہی ہے صرف طریق مختلف ہیں ان میں سے ایک طریق تو یہ ہے کہ جس جس مخلوق سے تعلق ہو اور جو جو مرض ہو اس کو قلب سے ایک ایک کر کے زائل کر دیا جائے چنانچہ متقدمین کا یہی طریق تھا لیکن اس طریق کے اندر سخت مشقت تھی اس لئے کہ مثلاً کسی شخص کو دس چیزوں سے تعلق ہے مکان سے باغ سے اولاد سے اور دس ہی اس کو مرض ہیں کینہ، حسد، تکبر وغیرہ تو سب کا بالتفصیل علیحدہ علیحدہ معالجہ کیا جاوے اس کے لئے عمر نوح چاہیے اور بیخ کنی ان امراض کی نہ ہوگی اس مشقت کو دیکھ کر بالہام حق پچھلے بزرگوں نے ایک طریقہ ایجاد کیا ہے

۱؎ توجہ کا مرکز ۲؎ مخلوق سے تعلقات ۳؎ اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے بے تعلق ہو جانا

جیسے طبیب مشفق کی شان ہوتی ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے ناک منہ چڑھاتا ہے تو وہ اس کو کسی اچھی تدبیر سے کھلا دیتا ہے۔ یا بدل دیتا ہے ایسا ہی انہوں نے دیکھا کہ مثلاً ایک شخص کو ایک ہزار چیزوں سے تعلق ہے تو اگر ایک ایک چیز سے تعلق چھڑا دیا جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی کوئی تدابیر ایسی ہونا چاہیے کہ ایک دم سے سب کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسے کسی مکان میں کوڑا بہت ہو تو اس کی صفائی کا ایک طریق تو یہ ہے کہ ایک ایک تنکا لیا اور پھینک دیا۔ اسی طرح سب تنکے اور کوڑا مکان سے باہر پھینک دیا جاوے۔ اس میں تو بڑا وقت صرف ہوگا۔ اور ایک طریق یہ ہے کہ جھاڑو لے کر تمام تنکوں کو ایک جگہ جمع کر کے پھینک دیا تو ایسے ہی یہاں بھی کوئی جھاڑو ہونا چاہیے کہ سب تعلقات کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیوے پھر اس ایک کا ازالہ کر دیا جاوے۔ چنانچہ ان کی سمجھ میں آیا کہ عشق ایک ایسی شے ہے کہ سب چیزوں کو پھونک کر خود ہی رہ جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی کسی کسی وغیرہ پر عاشق ہو جاتا ہے تو ماں بیوی بچے باغ مکان حتیٰ کہ اپنی جان تک اس کے واسطے ضائع کر دیتا ہے۔ ایک رئیس کو بیلوں کا عشق تھا ہزار ہا روپیہ اس میں ضائع کر دیا۔ ہمارے استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کتابوں کا شوق تھا۔ خود نہ دیکھتے تھے مگر سینکڑوں کتابیں اس قسم کی خرید کر رکھ چھوڑیں غرض عشق وہ شے ہے کہ سوائے معشوق کے سب کو فنا کر دیتا ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

(عشق تو وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑک اٹھتا ہے تو معشوق کے سوا جو کچھ ہوتا ہے سب کو پھونک دیتا ہے)

اس لئے ان بزرگوں نے تجویز کیا کہ طالب کے اندر عشق پیدا کرنا چاہیے خواہ کسی شے کا ہو اس واسطے وہ اول دریافت کرتے تھے کہ کسی پر عاشق بھی ہو پس معلوم ہوا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہی کا عشق ہو بھینس کا عشق بھی اس کے لئے کافی ہے۔ اس لئے کہ مقصود تو یہ ہے کہ تمام اشیاء سے توجہ منصرف ہو کر ایک طرف ہو جاوے تا کہ پھر اس کا امالہ[1] عشق حقیقی کی طرف سہل ہو جاوے۔

---

[1] مائل کر دینا عشق حقیقی سے بدل دینا

بعد ہم کو خبر دو چنانچہ پانچ وقت نماز سے فارغ ہو جاتے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اس بھینس کا تصور کیا کرتے جب چالیس روز پورے ہو گئے تو پیر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ بیٹا باہر آؤ کہتے ہیں کہ حضور باہر کیسے آؤں بھینس کے سینگ اڑتے ہیں پیر نے شاباشی دی کہ مقصود حاصل ہو گیا۔ سب روگ جاتے رہے اب صرف بھینس رہ گئی اس کا نکل جانا سہل ہے۔ پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اسکے لئے کسی عورت یا لڑکے کا عشق ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں سخت خطرہ ہے کہ اس لونڈے یا عورت ہی میں نہ رہ جائے اور مقصود اصلی سے محروم رہے اس لئے قصداً ہرگز اس کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر اضطراراً[1] بلا قصد اس میں ابتلا کسی کو ہو جائے تو وہ بھی وصول کیلئے خاص شرائط کے ساتھ بعض اوقات ذریعہ ہو جاتا ہے۔

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است عاقبت مار ابداں شہ رہبر است

(عاشق ہونا اگر اس خیال سے یا اس خیال سے ہے آخر کار ہم کو اس بادشاہ کی طرف راہ دکھا دیتا ہے)

اس کی چند شرطیں ہیں اول تو یہ ہے کہ اس کے پاس نہ رہے نہ اس کو دیکھے نہ کلام کرے نہ اس کی آواز سنے حتیٰ الوسع دل سے بھی اس کو زائل کرنے کی فکر کرے۔ غرض حتیٰ الامکان اس سے بچے اگرچہ اس طرح کرنا نفس کو بے حد شاق ہو گا لیکن ہمت نہ توڑے اور دل کو مضبوط کر کے اس پر عمل کرے چند روز کے بعد ایسا کرنے سے اس کے قلب میں ایک سوزش پیدا ہو گی اور نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ جاہ مال اولاد سب کی محبت جاتی رہے گی۔ اب اس میں مادہ تو محبت کا پیدا ہو چکا ہے۔ شیخ کامل اس کو مائل الی الحق[2] کر دے گا اس صورت سے عشق مجازی وصولی[3] الی الحقیقۃ کا ذریعہ بن جاوے گا۔ اور اگر اس محبوب سے جدا نہ ہوا بلکہ اس سے اختلاط رکھا ہم نشیں ہوا تو پھر اسی بلا میں پھنسا رہے گا اور کسی دن بھی اس کو اس سے خلاصی نہ ہو گی۔ چنانچہ خود ملا جامی جن کے کلام سے عشق مجازی کی تحصیل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

دلے باید کہ در صورت نہ مانی دریں پل زود خود را بگذرانی

(مگر لازم ہے کہ صورت میں ہی نہ رہ جاؤ۔ اور جلدی سے خود کو اس پل سے گزار دو)

---

[1] بے اختیار [2] حق تعالیٰ کی طرف جھکا دے گا۔ [3] حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ

بعد ہم کو خبر دو چنانچہ پانچ وقت نماز سے فارغ ہو جاتے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اس بھینس کا تصور کیا کرتے جب چالیس روز پورے ہو گئے تو پیر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ بیٹا باہر آؤ کہتے ہیں کہ حضور باہر کیسے آؤں بھینس کے سینگ اڑتے ہیں پیر نے شاباشی دی کہ مقصود حاصل ہو گیا۔ سب روگ جاتے رہے اب صرف بھینس رہ گئی اس کا نکل جانا سہل ہے۔ پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اسکے لئے کسی عورت یا لڑکے کا عشق ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں سخت خطرہ ہے کہ اس لونڈے یا عورت ہی میں نہ رہ جائے اور مقصود اصلی سے محروم رہے اس لئے قصداً ہرگز اس کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر اضطراراً[1] بلا قصد اس میں ابتلا کسی کو ہو جائے تو وہ بھی وصول کیلئے خاص شرائط کے ساتھ بعض اوقات ذریعہ ہو جاتا ہے۔

عاشقی گزریں سر و گزراں سراست　　　　عاقبت مار ابداں شہ رہبراست

(عاشق ہونا اگر اس خیال سے یا اس خیال سے ہے آخر کار ہم کو اس بادشاہ کی طرف راہ دکھا دیتا ہے)

اس کی چند شرطیں ہیں اول تو یہ ہے کہ اس کے پاس نہ رہے نہ اس کو دیکھے نہ کلام کرے نہ اس کی آواز سنے حتیٰ الوسع دل سے بھی اس کو زائل کرنے کی فکر کرے۔ غرض حتیٰ الامکان اس سے بچے اگرچہ اس طرح کرنا نفس کو بے حد شاق ہو گا لیکن ہمت نہ توڑے اور دل کو مضبوط کر کے اس پر عمل کرے چند روز کے بعد ایسا کرنے سے اس کے قلب میں ایک سوزش پیدا ہو گی اور نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ جاہ مال اولاد سب کی محبت جاتی رہے گی۔ اب اس میں مادہ تو محبت کا پیدا ہو چکا ہے۔ شیخ کامل اس کو مائل الی الحق[2] کر دے گا اس صورت سے عشق مجازی وصولی[3] الی الحقیقۃ کا ذریعہ بن جاوے گا۔ اور اگر اس محبوب سے جدا نہ ہوا بلکہ اس سے اختلاط رکھا ہم نشیں ہوا تو پھر اسی بلا میں پھنسا رہے گا اور کسی دن بھی اس کو اس سے خلاصی نہ ہو گی۔ چنانچہ خود ملا جامی جن کے کلام سے عشق مجازی کی تحصیل پر استدلال کیا جاتا ہے آگے چل کر فرماتے ہیں۔

دلے باید کہ در صورت نہ مانی　　　　وزیں پل زود خود را بگذرانی

(مگر لازم ہے کہ صورت میں ہی نہ رہ جاؤ۔ اور جلدی سے خود کو اس پل سے گزار دو)

---

[1] بے اختیار [2] حق تعالیٰ کی طرف جھکا دے گا۔ [3] حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ

مولانا اسی عشق کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

عشق با مردہ نباشد پائدار — عشق راباحی و باقیوم دار

(مرجانے والے کیساتھ عشق کرنا پائیدار نہیں ہوسکتا عشق اسی ذات کے ساتھ رکھو جوزندہ اور سب کی کارپرواز ہے)

عشقہائے کز پئے رنگی بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

(یہ جو عشق رنگ اور روپ کی وجہ سے ہوتے ہیں عشق ہی نہیں ہوتے انجام کار ننگ وعار ثابت ہوتے ہیں)

آگے فرماتے ہیں۔

غرق عشقے شوکہ غرق است اندریں — عشقہائے اولین و آخریں

(ایسے عشق میں غرق ہوجاؤ کہ جس میں سب اول وآخر لوگوں کے عشق غرق ہیں)

پھر یہاں پر شبہ ہوتا ہے کہ ہم جیسوں کو عشق حقیقی تک رسائی کہاں ممکن ہے اس کا جواب دیتے ہیں

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست — باکریماں کارہا دشوار نیست

(تم یوں نہ کہو کہ ہم کو اس کی بارگاہ میں رسائی نہیں کریموں پر کوئی کام دشوار نہیں ہوتا) یعنی ان کو کچھ مشکل نہیں تم کو مشکل نظر آتا ہے تم ذرا اس طرف متوجہ ہوکر تو دیکھو وہ خود تم کو اپنے قریب کرلیں گے۔ وہ دنیا کے محبوبوں کی طرح نہیں ہیں کہ عشاق مرجاتے ہیں وہ نخرے کرتے ہیں غرض اس مسئلہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود نظر بازی کریں مزے اڑائیں اور سمجھیں کہ ہم صوفی ہیں ہم کو سب حلال ہے اور یہ فعل ہمارا قرب کا واسطہ ہے۔ استغفرا اللہ قرب سے اس کو کیا واسطہ یہ تو بہت بعید کردینے والا ہے۔

بدنگاہی بہت سخت گناہ ہے

بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔ انا غیور و اللہ اغیر منی و من غیرتہ حرم الفواحش ماظھر منھا و

ما بطن (میں بہت غیرت والا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرت والے ہیں اپنی غیرت ہی کی وجہ سے فحش باتوں کو حرام فرمادیا ہے کھلی ہوں یا چھپی)

اور یہ سب فواحش ہیں آنکھ سے دیکھنا ہاتھ سے پکڑنا پاؤں سے چلنا کیونکہ ان سب کو شارع نے زنا ٹھہرایا ہے۔ العینان تزنیان و زنا ھما النظر و الاذنان تزنیان و زنا ھما الاستماع و اللسان یزنی و زناہ النطق و الیدان تزنیان و زناھما البطش الحدیث یعنی کہ آنکھیں زنا کرتی ہیں اوران کا زنا دیکھنا ہے اور کان زنا کرتے ہیں اوران کا زنا سننا ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے اوراس کا زنا بولنا ہے۔ (یعنی کسی عورت ولڑکے سے شہوۃ کی راہ سے باتیں کرنا) اور ہاتھ بھی زنا کرتے ہیں اوران کا زنا (غیر محرم کو) پکڑنا ہے اور جب یہ فواحش ہیں اور فواحش پر غیرت حق اوپر معلوم ہوچکی ہے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ افعال نہایت ناپسند ہیں۔

بدنگاہی کے مرض میں بعض پیر بھی مبتلا ہیں اور عورتوں کو پیر سے پردہ کرنے کی ضرورت

اور افسوس ہے کہ بعضے پیر بھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ یہ تو بجائے باپ کے بلکہ باپ سے بھی زیادہ ہیں اور بے حیا محابا[1] سامنے آتی ہیں اور بڑے بے حیا وہ دیوث[2] مرد ہیں جو ایسے پیروں کے سامنے اپنی بیٹیوں بہوؤں کو آنے دیں بعض جگہ تو ایسا سنا گیا ہے کہ مریدنیاں تنہا مکان میں جاتی ہیں اور وہاں مرید ہوتی ہیں نعوذ باللہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا حضور سے عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ ساری امت کی عورتیں آپ کی روحانی بیٹیاں اور حضور خود معصوم کسی قسم کے وسوسہ کا بھی شائبہ نہیں لیکن باوجود اس کے پھر پردہ کا حکم تھا اور ازواج مطہرات تمام امت کے مردوں عورتوں کی مائیں تھیں چنانچہ ارشاد ہے[3]۔

وازواجہ امھاتھم اور کسی کو ان کی نسبت تو یہ تو یہ وسوسہ تک بھی شرکا نہ تھا لیکن باوجود

---

[1] بے لحاظ [2] بہت بے شرم [3] اور نبی کی بیویاں سب مسلمانوں کی مائیں ہیں

اس کے ارشاد ہے۔ وقرن فی بیوتکن یعنی اپنے گھروں میں جمی رہو باہر نہ نکلو اور فرماتے ہیں ولا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض یعنی نرم بات مت کرو کہ جس کے قلب میں روگ ہے وہ طمع کرے گا۔

عورتوں کے لئے اغیار کے ساتھ بدخلقی (یعنی خشک مزاجی) صفت حمیدہ ہے

چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جیسے مردوں کے لئے خوش اخلاقی صفت حمیدہ ہے عورتوں میں بداخلاقی صفت حمیدہ ہے یعنی غیر مردوں سے نرمی اور میٹھی باتیں نہ کریں اور نہ تندمزاجی سے بلکہ ایسے انداز سے بات کریں کہ اس کو مضمون مفہوم ہو جائے اور کسی قسم کی طمع اس کے قلب میں نہ آوے نہایت خشکی وصفائی سے باتیں کریں البتہ اپنے خاوند اور دوسری عورتوں کے ساتھ خوش اخلاقی برتیں۔ اللہ اکبر یہ خاندان نبوت کا انتظام ہے آج کون ہے وہ شخص کہ ان سے زیادہ اپنے کو مقبول کہے بلکہ یہ وقت چونکہ فتنہ کا ہے اس لئے نہایت سخت انتظام کی ضرورت ہے۔

مرد چاہے کیسا ہی بزرگ اور کتنا ہی بوڑھا ہو جاوے عورتوں کو اس سے پردہ واجب ہے

حکایت: ایک بزرگ تھے وہ اس میں احتیاط نہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ بہت بوڑھے تھے۔ غیر اولی الاربہ[1] میں داخل ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کو عورتوں سے زیادہ اجتناب نہ تھا ایک دوسرے بزرگ نے ان کو نصیحت کی انہوں نے نہ مانا ان بے احتیاط بزرگ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا یہ مسئلہ پوچھا فرمایا کہ اگر مرد جنید ہو اور عورت رابعہ بصریہ ہو اور وہ دونوں ایک جگہ تنہا ہوں تو ثالث ان کا شیطان ہوگا۔ اور آدمی خواہ کسی قدر بوڑھا ہو جاوے لیکن مادہ تو اس کے اندر باقی رہتا ہی ہے وہ فرشتہ تو ہے نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ کر سکے لیکن نظر سے تو محفوظ نہیں رہ سکتا اور کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔

---

[1] عورتوں کی حاجت نہ رکھنے والے

مرد کے اندر عورت کی طرف میلان خلقۃً پیدا کیا ہے کوئی اس فطری جوش کو کیسے روک سکتا ہے۔

حکایت: گنج مراد آباد میں ایک بزرگ تھے مولانا فضل الرحمان صاحب تقریباً ایک سو دس برس کی ان کی عمر ہوئی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا صبح اٹھ کر خادم کو آواز دی ارے فلانے مجھ کو شبہ سا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے نہا لوں۔ طبیعت صاف ہو جاوے گی۔ چنانچہ خادم نے پانی رکھ دیا اسی جاڑے میں غسل فرمایا۔ بتلایئے اگر کچھ نہ رہا تھا تو شبہ کیسا۔ ایک مرتبہ کانپور میں ہمارے گھر بہت عورتیں آئیں اس میں اختلاف تھا کہ حضرت مولانا موصوف سے پردہ چاہیے یا نہیں میں نے یہ اختلاف سن کر یہ حکایت ان کو سنائی اور کہا کہ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ پردہ ضروری ہے یا نہیں۔ سب سن کر چپ ہو رہیں۔ حضرت جب سو برس کی عمر میں یہ قصہ ہو سکتا ہے تو پچاس برس کی عمر میں اب کیا مشکل ہے اور بہت سے پیر جوان بھی ہوتے ہیں۔

آج کل بے قید پیروں کے بھی معتقد ہو جاتے ہیں

اور آج کل تو پیر بننا کچھ مشکل بھی نہیں ہے لمبے لمبے بال ہوں موٹے دانوں کی تسبیح ہو رنگا کرتا ہو بس پیر ہو گئے پھر وہ خواہ عورتوں کو گھوریں یا لونڈوں کو تکیں حرام حلال میں کچھ امتیاز نہ کریں ان کی پیروی ایسی مضبوط ہے کہ وہ کہیں سے نہیں جاتی بلکہ جس قدر کوئی خلاف شرع ہوگا اسی قدر زیادہ مقبول ہے اور جس قدر حدود شرعیہ کے اندر ہوگا وہ پیری سے دور ہے وہ تو نرا ملا ہے۔

پردہ کے متعلق عورتوں اور مردوں کی بے احتیاطیاں اور زینت کے متعلق عورتوں کا بے محل برتاؤ

یہ تو مردوں کی حالت تھی اب عورتوں کی کیفیت سنئے۔ بعض عورتیں ایسی بے حیا ہوتی ہیں کہ وہ خود مردوں کو دیکھتی ہیں یا پردہ وغیرہ اٹھا دیتی ہیں کہ دوسرا مرد ان کو دیکھ لیتا ہے اور یہ احتیاط نہیں کرتیں حدیث میں ہے۔ لعن اللّٰہ الناظر و المنظور الیہ اس کے متعلق

جو یوں عورتوں سے کہا جاتا ہے نصیحت کی جاتی ہے تو کہتی ہیں اونہہ ایک دفعہ دیکھ کر پھر کیا دیکھے گا ساری عمر ترسے گا۔ جو بڑی پردہ نشین کہلاتی ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ خاوند کے سامنے تو بھنگن ہی بنی رہیں گی اور اگر کہیں جاویں گی تو تمام زیب وزینت ختم کر کے بیگم بن جاویں گی سخت بے حیائی کی بات ہے کہ خاوند جس کے لئے زیب وزینت کا حکم ہے اس کے سامنے تو زیب وزینت نہ کی جاوے اور دوسروں کے دیکھنے کے لئے کی جاوے چاہیے تو یہ کہ اس کا برعکس ہو بعض عورتیں دولہا دلہن اور بارات کو دیکھتی ہیں ان کے مرد بھی کچھ نہیں کہتے۔ اسی طرح دوسری بے احتیاطی قابل نظر ہے۔ وہ یہ کہ بعض مرد بڑے بے احتیاط ہوتے ہیں کہ گھر میں پکار کر نہیں جاتے ذرا کھنکارا اور فوراً اندر گھس گئے اور اکثر عورتیں بھی ایسی بے احتیاط ہوتی ہیں کہ ڈولی سے اترنے سے پہلے تحقیق نہیں کراتیں کہ کوئی مرد تو اندر نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ بیمار تھا بہت عورتیں ڈولی سے عیادت کے لئے آئیں اور بلا تحقیق اندر آ گئیں میں نے ان کو خوب برا بھلا کہا اور جب عورتیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اس وقت اور زیادہ بے حیائی ہوتی ہے چنانچہ بسا اوقات بے کہے اس گھر کے مرد دروازے میں آ کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اندر کسی نے منہ پھیر لیا کسی نے آنچل سے منہ ڈھک لیا کوئی کسی کے پیچھے ہو گئی اور طرفہ یہ کہ ہر ایک یہ جانتی ہے کہ مجھ کو نہیں دیکھا حالانکہ اس نے سب کو دیکھ لیا۔

بدنگاہی میں عام ابتلا اور اس کا علاج

خلاصہ یہ کہ آنکھوں کا گناہ سخت ہے اور اس میں بہت ابتلاء ہو رہا ہے۔ اس کا بہت انتظام کرنا چاہیے اپنا بھی اور گھر والوں کا بھی اور اس کا علاج سہل یہ ہے کہ راہ میں چلنے کے وقت نیچی نگاہ کر کے چلنا چاہیے ادھر ادھر نہ دیکھے ان شاء اللہ محفوظ رہے گا۔ شیطان جب مردود ہوا اس نے کہا تھا۔ **لاقعدن لهم صراطک المستقیم ثم لآتینهم من بین ایدیهم و من خلفهم وعن ایمانهم و عن شمائلهم** یعنی میں ان کے (گمراہ کرنے

لے اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ناجائز دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے پر دیکھا جانے والا یا والی وہی ہے جو خود کو چھپانے کے وقت اور چھپانے کی جگہ نہ چھپائے ستر کھولنے والے اور بے پردہ عورتیں سب اس میں داخل ہیں سب پر پردہ واجب ہے اور نہ کرنے پر لعنت

کے لئے) تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان کے پاس آؤں گا۔ ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور داہنے سے اور بائیں سے۔ چار سمتیں تو اس نے بتلائیں اور دو سمتیں باقی رہیں اوپر اور نیچے بزرگان دین نے اس میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ اوپر نیچے کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اکثر گناہ چار سمتوں سے ہوتے ہیں۔ بس بچنے کی دو صورتیں رہیں یا تو اوپر دیکھ کر چلو یا نیچے دیکھ کر مگر اوپر دیکھنے میں تو گر جانے اور آنکھ میں کچھ پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے نجات کے لئے یہی شق معین ہوئی کہ نیچے دیکھ کر چلیں۔ **قال اللہ تعالیٰ و عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً** (اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور رحمٰن کے خاص بندے تو زمین پر چلتے ہیں وقار سے)

حکایت: ایک بزرگ تھے وہ بات کرتے وقت مردوں کو بھی نہ دیکھتے تھے ان سے کسی نے وجہ پوچھی فرمایا کہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو میں پہچانتا ہوں اور دوسرے وہ جن کو میں نہیں پہچانتا جن کو پہچانتا ہوں ان کو بلا دیکھے بھی آواز سے پہچان لیتا ہوں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اور جن کو نہیں پہچانتا ان کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ **سبحان اللہ من حسن اسلام المرء ترکہ' مالا یعنیہ** (انسان کے عمدہ اسلام میں سے ہے ترک کر دینا ہر بے فائدہ کا) پر عمل اس کو کہتے ہیں بعض بزرگوں نے اس نظر کے گناہ سے بچنے کے واسطے جنگل میں رہنا اختیار کر لیا ہے شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

بزرگے دیدم اندر کوہسارے — قناعت کردہ از دنیا بغارے

(میں نے ایک بزرگ کو دیکھا پہاڑوں میں دنیا سے صرف ایک غار پر قناعت کئے ہوئے ہیں)

چرا گفتم بشہر اندر نیائی — کہ بارے بندے از دل بر کشائی

(میں نے کہا کیوں آپ شہر کے اندر نہیں آتے کہ کسی وقت تو دل کا بند کھول دیجئے سیر کر لیجئے)

بگفت آنجا پری دیان نغزند — چوگل بسیار شد پیلاں بلغزند

(فرمایا وہاں حسین پری چہرہ ہیں اور جب گارا زیادہ ہو جاتا ہے ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں)

بدنگاہی پر کبھی دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے

حکایت: ایک بزرگ طواف کر رہے تھے اور کہتے جاتے تھے **اللھم انی اعوذبک**

من غضبک (اے اللہ میں آپ کے غضب سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں) کسی نے پوچھا کہ اس قدر کیوں ڈرتے ہو کیا بات ہے کہا میں نے ایک لڑکے کو بری نظر سے دیکھ لیا تھا۔ غیب سے چپت لگا اور آنکھ پھوٹ گئی اس لئے ڈرتا ہوں کہ پھر عود[1] نہ ہو جاوے۔

حکایت: حضرت جنید چلے جا رہے تھے کہ ایک حسین لڑکا نصرانی سامنے سے آ رہا تھا۔ ایک مرید نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ ایسی صورت کو بھی دوزخ میں ڈالیں گے۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ تو نے اس کو نظر استحسان سے دیکھا ہے عنقریب اس کا مزہ تم کو معلوم ہو گا چنانچہ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قرآن بھول گیا۔ نعوذ باللہ

بعض سچے بزرگوں کی حسن پسندی سے عوام کو دھوکہ ہونا اور اہل اللہ اور اہل ہوا کی حسن پسندی میں فرق

بعض سچے بزرگ حسن پسند ہوتے ہیں۔ بعض کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناںؒ حسن پرست تھے تو ہم ایسا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ سبحان اللہ کیا استدلال ہے۔ بات یہ ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(پاک بزرگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک سا ہوتا ہے اسی طرح آدمی آدمی برابر مگر پھر بھی زمین و آسمان کا فرق ہے)

میں ان کی حسن پرستی کی حقیقت بتلاتا ہوں کہ وہ اس معنی کے حسن پرست نہ تھے۔ جیسے کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ان کو ہر حسین شے اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر بری اور بے قاعدہ شے سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کو بدصورت اور بے ڈھنگی شے دیکھنے سے تکلیف ہوتی تھی۔

حکایت: چنانچہ حضرت مرزا صاحبؒ کو جب کہیں جانا ہوتا تھا تو پالکی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور پالکی کی پٹ بند کرا دیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ پٹ کیوں بند کرا دیا کرتے ہیں فرمایا کہ راستے میں بازار وغیرہ ملتے ہیں۔ بعض دکانیں بے قاعدہ بنی

---

[1] دوبارہ نہ ہو جاوے

ہوئی ہوتی ہیں مجھ کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے۔

حکایت: تھانہ بھون کے قاضی صاحب مع اپنے ہمراہی کے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اس ہمراہی کو ناک صاف کرنے کی ضرورت ہوئی تو مرزا صاحب کی نظر پیچھے سے اس کے پائجامے پر پڑ گئی۔ سب چھینٹیں پائجامے کے پیچھے تھیں۔ مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور فرمایا کہ قاضی صاحب اس شخص کے ساتھ آپ کا کیسے گزر ہوتا تھا۔

حکایت: اکبر شاہ ثانی جو کہ بادشاہ وقت تھا۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ کو پیاس لگی کوئی خادم اس وقت موجود نہ تھا۔ خود اٹھ کر پانی پیا اور پانی پی کر کٹورا صراحی پر ٹیڑھا رکھ دیا۔ مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا۔ اور طبیعت پریشان ہو گئی۔ لیکن ضبط فرمایا۔ چلتے وقت بادشاہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے یہاں کوئی آدمی خدمت کے لئے نہیں ہے اگر ارشاد ہو تو کوئی آدمی بھیج دوں۔ اب تو مرزا صاحب سے نہ رہا گیا۔ جھنجھلا کر فرمایا کہ پہلے تو تم آدمی بنو کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا میری طبیعت اب تک پریشان ہے۔

حکایت: ایک شخص نے مرزا صاحب کی خدمت میں انگور بھیجے۔ بہت نفیس اور منتظر داد کے ہوئے، مگر مرزا صاحبؒ ساکت تھے۔ آخر اس نے خود پوچھا کہ حضرت انگور کیسے تھے۔ فرمایا کہ مردوں کی بو آتی تھی۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں انگور بوئے گئے تھے۔ وہ انگور وہاں سے آئے تھے۔ مرزا صاحب کے اندر حسن پرستی تھی تو وہ طبعی تھی طبیعت کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ ہر اچھی شے پسند فرماتے تھے ان کے نفس میں برے خیال کا شائبہ بھی نہ تھا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بچپن میں بھی بدصورت کی گود میں نہ جاتے تھے۔ بھلا اس وقت کیا احتمال ہو سکتا ہے۔

حکایت: خواجہ میر درد کی نسبت لوگوں نے آکر مرزا صاحب سے عرض کیا کہ خواجہ صاحب راگ سنتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی وہ کن رس میں مبتلا ہیں۔ میں آنکھ رس میں یعنی ان کو کانوں کا مرض ہے مجھ کو آنکھوں کا۔ آپ نے اس کو بھی مرض سے تعبیر فرمایا۔

حکایت: ایک بزرگ کی کیفیت یہ تھی کہ حسین لڑکے ان کی خدمت کرتے تھے اور گاہ گاہ ان کو پیار بھی کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ایک مرید نے بھی ایک لڑکے کو پیار کر لیا۔

پیر سمجھ گئے کہ اس نے میرا اتباع کیا۔ ایک روز بازار میں گئے لوہار کی دوکان پر دیکھا کہ لوہا سرخ انگارا سا ہو رہا ہے۔ پیر صاحب نے فوراً جا کر اس کو پیار کر لیا اور اس مرید سے فرمایا کہ آیئے تشریف لایئے اس کو بھی پیار کیجئے۔ پھر تو یہ گھبرائے۔ اس وقت انہوں نے ایک کوڑا اٹھا کہ خبردار ہم پر اپنے کو مت قیاس کرو۔

حکایت: ایک اور بزرگ کو دیکھا کہ حسین لڑکے سے پاؤں دبوا رہے ہیں ایک شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے شیخ ہیں لڑکے سے پاؤں دبواتے ہیں۔ فرمایا کہ آگ کی انگیٹھی اٹھا لاؤ۔ دہکتی آگ میں پاؤں رکھ دیئے اور فرمایا کہ ہم کو کچھ حس نہیں ہمارے نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا برابر ہے۔

بیعت کے قابل وہ حضرات ہیں جن کا ظاہر باطن دونوں درست ہوں

لیکن یاد رکھو ایسے بزرگوں سے جن کا ظاہر خلاف شرع نظر آوے بیعت ہونا جائز نہیں ہے۔ محققین کی یہ شان نہیں ہے جو لوگ مسند ارشاد پر متمکن ہوتے ہیں اور **العلماء ورثة الانبیاء** کے خطاب سے مشرف ہیں وہ بالکل متبع سنت نبویہ کے ہوتے ہیں ان کی ہر وضع سنت کے موافق ہوتی ہے اور تہمت اور بدگمانی کے موقع سے بچنا بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضور کی شان اس باب میں یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضور مسجد میں معتکف تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ ازواج مطہرات میں ہیں وہاں تشریف لائیں۔ واپسی کے وقت حضور ان کے پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ دروازے تک کہ وہ مسجد کی طرف تھا۔ تشریف لائے سامنے دیکھا کہ دو شخص آ رہے ہیں فرمایا کہ **علی رسلکما** یعنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ۔ یہاں پردہ ہے اور اس کے بعد فرمایا **انها صفية** یعنی یہ عورت صفیہ تھی کچھ اجنبیہ نہ تھی۔ **فکبر علیهما ذلک** یعنی یہ بات ان دونوں پر بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ پر ایسا گمان ہو سکتا ہے۔ فرمایا شیطان ابن آدم کے اندر بجائے خون کے دوڑتا ہے مجھے خیال ہوا کہ کبھی وہ تمہارے ایمان کو نہ تباہ کر دے۔ پس جو لوگ ارشاد کی شان لئے ہوئے ہوتے

ہیں وہ تو ایہام سے بھی بچتے ہیں۔ایسے حضرات قابل بیعت ہیں۔باقی جن کا ظاہر شریعت کے موافق نہ ہو ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ مکار ہیں۔باطن بھی ان کا موافق نہیں ہے وہ مردود ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ باطن ان کا بالکل شریعت کے موافق ہوتا ہے لیکن ظاہر ان کا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ان پر اعتراض نہ کرے اور نہ ان کا اتباع کرے۔غرض مرشد ایسے کو بناوے جو ظاہراً اور باطناً پاک صاف ہو۔

بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور دل میں تصور کر کے مزے لینا اس سے بھی زیادہ شدید ہے

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل اور سہارا بدنگاہی کے متعلق نہیں۔بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔آگے فرماتے ہیں۔ **ماتخفی الصدور** یعنی جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔یہ پہلے سے اشد ہے۔یعنی معصیت صرف نگاہ ہی سے نہیں۔بلکہ دل سے بھی ہوتی ہے۔بہت لوگ دل سے سوچا کرتے ہیں اور عورتوں و مردوں کا تصور کرتے ہیں اور خیال سے مزے لیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم متقی ہیں۔خوب سمجھ لو کہ تلبیس ابلیس لعین ہے بلکہ بعض مرتبہ دل کے اندر سوچنے سے اور دل کے اندر باتیں کرنے سے اور زیادہ فتنہ ہوتا ہے۔کیونکہ نگاہ کرنے میں تو بعض مرتبہ قبیح اور بدصورت ثابت ہوتا ہے۔اور دل کے اندر باتیں کرنے میں تو طبیعت کا زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور قلب سے کسی طرح وہ نہیں نکلتی بلکہ محض نگاہ نہ کرنے سے اپنے کو صاحب مجاہدہ سمجھ کر زیادہ مقرب سمجھتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ دل میں متمتع ہو رہا ہوں تو مجاہدہ کہاں رہا۔غرض اس کا انسداد بھی بہت ضروری ہے اور چونکہ قلب کے اندر کانوں کے واسطے بھی باتیں اس قسم کی پہنچتی ہیں اس لئے جس طرح آنکھوں کی حفاظت ضروری ہے کانوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کہ ایسے قصے اور حکایات نہ سنے نہ ایسے مقام پر جاوے جہاں گانا بجانا ہو رہا ہو۔بعض مرتبہ خود قلب ہی سے معصیت صادر ہوتی ہے۔صدور کے وقت آنکھ کان کا واسطہ نہیں ہوتا۔مثلاً

پہلی دیکھی ہوئی صورتیں یاد آتی ہیں۔ اور ان سے التذاذ[1] ہوتا ہے۔ اور معصیت قلب کا معصیت عین سے اشد ہونا ایک اور وجہ سے بھی ہے وہ یہ کہ قلب سے سوچنے اور آنکھوں سے دیکھنے میں ایک فرق بھی ہے۔ یعنی آنکھوں کے گناہ میں تو نفس فعل کو کوئی دیکھ بھی سکتا ہے گو نیت پر مطلع نہ ہو اور دل کے اندر سوچنے کے فعل کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی اطلاع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اس سے وہی بچے گا جس کے قلب میں تقویٰ ہو۔

معصیت قلب کے معالجہ اور ازالہ کے درجات اور اس کا بیان کہ مطلوب کون سا درجہ ہے

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ اس مرض کے ازالہ میں تین درجے ہیں قلب کو باوجود تقاضہ کے روکنا۔ تقاضے کو ضعیف کر دینا۔ اور قلع المقتضے یعنی مادہ ہی کا قلع قمع کر دینا۔ ان میں سے قلب کو روکنا یعنی دل کو خود اس طرف متوجہ ہونے دینا۔ یہ امر تو اختیاری ہے کہ اگر آپ سے آپ جائے تو تم اس کو روکو اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جب قلب کسی حسین عورت کی طرف مائل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کسی کریہہ[2] المنظر بدشکل بدصورت بدہیئت کی طرف دیکھو اگر کوئی موجود نہ ہو کسی ایسے بدصورت کا خیال باندھو کہ ایک شخص ہے کالا رنگ ہے چیچک کے داغ ہیں آنکھوں سے اندھا ہے سر سے گنجا ہے۔ رال بہہ رہی ہے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ ناک سے نکلا ہے۔ ہونٹ بڑے بڑے ہیں اور سنک بہہ رہا ہے۔ اور مکھیاں اس پر بیٹھی ہیں گو ایسا شخص دیکھا نہ ہو مگر قوت متخیلہ سے تراش لو کیونکہ تمہارے دماغ میں ایک قوت متخیلہ ہے آخر اس سے کسی روز کام تو لو گے۔ متخیلہ کا کام تو جوڑ جوڑ کا ہے۔ جب ایسا شخص فرض کیا جا سکتا ہے اس کا مراقبہ کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ فساد جو حسین کے دیکھنے سے قلب میں ہوا ہے وہ جاتا رہے گا۔ اور اگر پھر خیال آوے پھر یہی تصور کرو۔ اور اگر یہ مراقبہ کفایت کے درجہ میں نافع نہ ہو اور بار بار پھر اسی حسین کا تصور ستاوے تو یوں خیال کرو کہ یہ محبوب ایک روز مرے گا اور قبر میں جاوے گا۔ وہاں اس کا نازک بدن سڑ

---

[1] مزہ لینا [2] جو دیکھنے میں بہت برا معلوم ہو

گل جاوے گا۔ کیڑے اس کو کھالیں گے۔ یہ خیال تو فوری علاج ہے اور آئندہ کے لئے تقاضہ پیدا ہونے کا علاج یہ ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرو اور دوسرے یہ کہ عذاب الٰہی کا تصور کرو۔ تیسرے یہ کہ یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس کو مجھ پر پوری قدرت ہے۔ طول مراقبات اور کثرت مجاہدات سے یہ چور دل میں سے نکلے گا۔ جلدی نہ جاوے گا جلدی نہ کرے اس لئے کہ ایسا پرانا مرض ایک دن یا ایک ہفتہ میں نہیں جاتا۔ یہاں مجھ کو شاہ محمود غزنوی کی حکایت یاد آ گئی۔

حکایت: محمود نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک ہمراہی سپاہی نے ایک مندر میں جا کر دیکھا کہ ایک بوڑھا برہمن پوجا پاٹ کر رہا ہے۔ سپاہی نے تلوار دکھائی کہ کلمہ پڑھ اور مسلمان ہو ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ برہمن نے کہا حضور ذرا ٹھہریئے۔ سپاہی نے پھر تقاضا کیا برہمن نے عرض کی حضور نوے برس کا رام تو دل میں سے نکلتے نکلتے ہی نکلے گا۔ ذرا سی دیر میں کیسے نکل جاوے خوب کہا ہے

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

ہمت مت ہارو مجاہدہ کرتے رہو رفتہ رفتہ یہ تقاضا ضعیف ہو جاوے گا اور قابو میں آ جاوے گا کہ اپنے محل پر صرف ہوگا اور غیر محل کے لئے متحرک نہ ہوگا۔ اور یہی مطلوب ہے۔

افعال قبیحہ کے مادہ کا ازالہ مقصود نہیں اور اس کے متعلق نادان اہل سلوک کی ایک بڑی غلطی

تیسرا درجہ یہ کہ مادہ ہی منقطع ہو جاوے۔ یعنی بالکل میلان ہی کبھی پیدا نہ ہو۔ یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس کو نادان سالک مطلوب سمجھتے ہیں۔ اور اس کے حاصل نہ ہونے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب اپنے اندر کسی وقت میلان پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب ذکر و شغل و مجاہدہ بیکار گیا۔ حتیٰ کہ ایسے کلمات پریشانی میں ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ بے ادبی اور گستاخی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم اتنے روز سے طلب حق میں رہے مگر ہم پر رحم نہیں آتا کہ ویسے ہی محروم ہیں۔ یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ مادہ منقطع ہو

جاوے اور اگر مادہ جاتا رہے تو گناہ سے بچنے میں کوئی کمال نہیں۔ اندھا اگر فخر کرے کہ میں دیکھتا نہیں تو کون فخر کی بات ہے۔ دیکھے گا کیا دیکھنے کا آلہ نہیں۔ عنین اگر عفت کا دعویٰ کرے تو کیا کمال ہے۔ لطف اور کمال تو یہ ہے کہ گناہ کر سکو اور اپنے دل کو روکو۔ جس کا میں نے فوری علاج اور تقاضا روکنے کی تدبیر دونوں بیان کر دیئے۔ رہا مادہ زائل کر دینا یہ مطلوب ہی نہیں بلکہ اس کا زائل کرنا جائز ہی نہیں۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوتے ہوئے غیر پر نظر ناممکن ہے

خلاصہ یہ کہ مجھے اس گناہ پر متنبہ کرنا منظور ہے اس لئے کہ اس گناہ کا ابتلا عام تھا۔ حتیٰ کہ جو نیک کہلاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ خدا کے واسطے اس کا انتظام کرنا چاہیے۔ افسوس منہ سے تو خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ اور غیر پر نظر افسوس صد افسوس اس وقت مجھ کو ایک حکایت یاد آ گئی۔

حکایت: ایک عورت جا رہی تھی کوئی ہوا پرست اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا اس عورت نے پوچھا کہ تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں آتے ہو کہا میں تجھ پر عاشق ہو گیا اس لئے آتا ہوں۔ عورت نے جواب دیا کہ پیچھے ایک میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے۔ اس کے دیکھنے کو پیچھے چلا۔ اس عورت نے اس کے ایک دھول دی اور کہا۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　　در بیان دعوئے خود صادقی

(عورت نے کہا اے بیوقوف اگر تو عاشق اور اپنے دعوے کے بیان میں سچا ہے)

پس چرا برغیر افگندی نظر　　　ایں بود دعوائے عشق ای بے خبر

(تو تو نے غیر پر نظر کیوں ڈالی اے بیہودہ کیا یہی ہوتا ہے عشق کا دعویٰ)

صاحبو اگر حق تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر کے اتنا دریافت فرمالیں کہ تو نے ہم کو چھوڑ کر غیر پر کیوں نظر کی تو بتلایئے کیا جواب ہے یہ ہلکی بات نہیں اس کا بہت بڑا اہتمام کرنا چاہیے۔

معصیت کے تقاضہ کا نہایت مفید علاج

ایک اور تدبیر ہے جو مقوی ہے ان تدابیر کی وہ یہ کہ جب قلب میں ایسا خیال پیدا ہوا ایسا کر

وکہ وضو کر کے دو رکعت پڑھو اور توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ جب نگاہ پڑے یا دل میں تقاضا پیدا ہو تو فوراً ایسا ہی کرو۔ ایک دن تو بہت سی رکعتیں پڑھنا پڑیں گی۔ دوسرے دن بہت کم ایسا خیال آوے گا۔ اس طرح بتدریج نکل جاوے گا۔ اس لئے کہ نفس کو نماز بڑی گراں ہے۔ جب دیکھے گا ذرا سا مزہ لینے پر یہ مصیبت ہوتی ہے ہر وقت نماز ہی میں رہتا ہے پھر ایسے وسوسے نہ آویں گے۔

سمع و بصر و قلب و جوارح[1] کی حفاظت کا حکم

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا ً مت اتباع کر اس شے کی جس کی تجھ کو تحقیق نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور قلب ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جاوے گا۔ اس آیت میں چار چیزوں کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے قلب آنکھ کان یہ تین چیزیں تو بالتصریح[2] بیان فرمائیں، چوتھی چیز بقیہ جوارح یعنی ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کی حفاظت ہے وہ بالتصریح اس آیت میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کی حفاظت کو ولا تقف ما لیس لک بہ علم میں دلالۃً[3] ذکر فرمایا ہے چنانچہ ولا تقف ما لیس لک بہ علم کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تمام جوارح کی حفاظت بھی آ گئی ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے بلا تحقیق کسی امر کا اتباع نہ کرنا اب اس کے تحقق[4] کی چند صورتیں ہیں۔ مثلاً کوئی شے گم ہو جاوے بلا تحقیق قرائن موہومہ[5] پر کسی کو چور کہہ دیا۔ چور کہنا زبان کا گناہ ہے۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم اس گناہ سے روکتا ہے۔ دیکھئے ولا تقف ما لیس لک بہ علم پر عمل نہ ہونے سے زبان کا گناہ ہو گیا۔

جب تک کسی کے فعل میں تاویل ہو سکے اس وقت تک اس پر بدگمانی نہ چاہیے

حکایت: ایک عجیب حکایت یاد آئی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو چوری

---

[1] ہاتھ پیر وغیرہ ظاہری اعضاء [2] صاف صاف [3] جو صاف نہیں ہو مگر اس سے نکلتا ہو۔
[4] وجود کی یعنی بے تحقیق بات کی پیروی کا وجود اور اس کی شکل [5] غیر یقینی صرف وہمی نادان نکالنا حاضرات کرانا قرعہ ہونا سب اس میں داخل ہے۔

کرتے ہوئے دیکھا اس سے فرمایا کہ تو چوری کرتا ہے۔ اس نے کہا کلا و اللہ الذی لا الٰہ الا ھو یعنی ہرگز نہیں قسم ہے اس ذات کی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صدقت ربی و کذبت عینی یعنی میں اپنے رب[1] کی تصدیق اور اپنی آنکھ کی تکذیب کرتا ہوں یعنی میری آنکھ نے غلط دیکھا تو سچا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو نہ دین میں غلو ہوتا ہے اور نہ وہ مغلوب الحال ہوتے ہیں

شاید کوئی خشک مغز اس کو غلو فی الدین[2] سمجھے یا کوئی یوں کہے کہ یہ تو استغراق[3] یا غلبہ حال ہے۔ سو یاد رکھو کہ انبیاء علیہم السلام میں نہ غلو فی الدین ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے اور وہ مغلوب الحال بھی نہیں ہوتے بلکہ اپنے حال پر غالب ہوتے ہیں[4]۔ بزرگوں کی دو قسمیں ہیں ابوالحال اور ابن الحال۔ ابوالحال وہ ہیں جو اپنے حال پر غالب ہوتے ہیں۔ مخلوق سے ملے جلے رہتے ہیں۔ اسباب ظاہرہ کو چھوڑتے نہیں ہر امر کو ضابطہ اور قاعدے سے کرتے ہیں۔ مال کو انتظام سے خرچ کرتے ہیں ان امور میں جیسے اور عوام کی حالت ہوتی ہے ایسی ہی ان کی بھی ہوتی ہے اور اہل حال آزاد ہوتے ہیں۔ خلقت سے بھاگتے ہیں کسی امر کی تدبیر نہیں کرتے۔ موجی بندے ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ ہاں خلاف شریعت کچھ نہیں کرتے۔ اس لئے کہ جو خلاف شریعت کرے گا وہ مقبول و بزرگ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا قول و فعل کبھی بظاہر خلاف شرع ہوتا ہے جس کی تاویل[5] ضروری ہے۔

---

[1] اپنے رب کے نام لینے کی [2] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کو دین میں غلو اور زیادتی کرنا سمجھے۔ [3] توجہ الٰہی میں غرق ہونا یا محبت کی حالت کا غالب ہونا ورنہ آنکھوں سے دیکھ لینا تو یقینی تھا۔ اور اس کی قسم کا سچا ہونا ضروری نہ تھا۔ [4] اس لئے یہ فرمانا قانون شریعت ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ آنکھ سے تو کسی چیز کا لینا ہی نظر آ سکتا ہے اس چیز کا اس کی ملک نہ ہونا یا اس کو لینے کی اجازت نہ ہونا یا اس کا کوئی حق اس پر نہ ہونا تو آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ قسم نے دوسری بات ہونے کو بتا دیا ہے اس لئے وہ سچ ہے۔ [5] اگر اس کے عام حالات شریعت کے مطابق ہوں تا کہ اس کا بزرگ ہونا ثابت رہے۔

اہل کمال کی پہچان اور اس کا بیان کہ عارف میں برکت دواماً[1] اور کرامت احیاناً[2] ہوتی ہے تصرف[3] نہیں ہوتا اور اس کا راز

اکثر عوام الناس ایسے لوگوں کو باکمال سمجھتے ہیں اور اہل کمال کو کم پہچانتے ہیں۔ اس لئے میں اہل کمال اور غیر اہل کمال کی شناخت کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ نہایت مفید ہے۔ وہ یہ ہے کہ ولایت نبوت سے مستفاد[4] ہے۔ جس بزرگ کی حالت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوگی وہ زیادہ باکمال ہوگا۔ سو انبیاء نے نہ کبھی نعرے مارے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ خلقت سے بھاگے خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہر امر کا انتظام حضور کے یہاں تھا۔ سلطنت کا انتظام حضور نے ایسا فرمادیا کہ سلاطین دنیا نے آپ سے سیکھا۔ خانہ داری کا انتظام ایسا تھا کہ آج کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اسی طرح ملنے جلنے کھانے پینے حتیٰ کہ بول[5] و براز کے قواعد حضور نے امت کو تعلیم فرمائے۔ اہل کمال کی حالت اسی طرز کی ہوتی ہے اور جس طرح آج کل عوام ایسے اہل کمال کو بزرگ و خدا رسیدہ نہیں جانتے اس وقت بھی عام لوگوں نے انبیاء کو کامل نہیں سمجھا۔ چنانچہ کہا کرتے تھے۔ مالھٰذا الرسول یا کل الطعام و یمشی فی الاسواق لو لا انزل الیہ ملک فیکون معہٗ نذیراً او یلقٰی الیہ کنز او تکون لہ جنۃ یاکل منھا یعنی اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانے کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ان کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ ان کے ساتھ رہ کر لوگوں کو تبلیغ کرتا یا ان کے پاس کوئی خزانہ ہوتا (یہ ہم سے بھی زیادہ غریب مفلس ہیں ہم دو وقت کھانا کھاتے ہیں ان کو ایک وقت بھی کئی کئی دن میں ملتا ہے اچھے اللہ کے پیارے ہیں کوئی اپنے پیارے کو بھوکا بھی مارا کرتا ہے) یا ان کے پاس کوئی باغ ہوتا کہ یہ اس سے کھاتے (غرض کوئی وصف ایسا ہوتا جو ہم میں نہیں یہ کیسے نبی ہیں جو ہم سے ممتاز نہیں ہیں) اسی طرح جو اولیاء اللہ اس شان کے ہوتے ہیں ان پر لوگ

---

[1] ہمیشہ [2] کبھی کبھی [3] مرید کو لوٹ پوٹ کر دینا حالت غیر کر دینا۔ [4] حاصل کی ہوئی۔
[5] پیشاب پاخانہ

اعتراض کرتے ہیں اور جو خلقت سے بھاگتا ہے کھاتا پیتا نہیں ننگا رہتا ہو کسی سے بات نہ کرتا ہو وہ بزرگ ہے اور اگر خلاف عادت کوئی امر اس سے صادر ہو گیا کسی پر کوئی تصرف کر دیا اس کو تو نبی سے بڑھ کر جانتے ہیں حالانکہ تصرف کوئی چیز نہیں یہ تو ریاضت[1] سے ہندو جوگیوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ اہل کمال اس کو اچھا نہیں جانتے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عارف راہمت نباشد یعنی عارف کو ہمت یعنی تصرف نہیں ہے ہمت کے وہ متعارف معنی نہیں کہ کسی کام کی ہمت نہیں بلکہ ہمت کے معنی تصرف وغیرہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عارف کو تصرف نہیں ہوتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جس قدر عرفان بڑھے گا فنا بھی ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنے سے نظر اٹھتی جاتی ہے۔ دیکھئے تحصیلدار اپنے اجلاس میں بیٹھ کر بڑے بڑے احکام صادر کرتا ہے لیکن گورنر جنرل کے سامنے جب آتا ہے تو اس کی وہ حالت ہوتی ہے جو ادنیٰ اردلی کی ہے اسی طرح عارف کو جس قدر معرفت بڑھے گی وہ مٹتا چلا جائے گا۔ فنا سے اس کو فاعلیت[2] مستقلہ من وجہ کے تصور سے غیرت آئے گی اور معرفت سے دوسرے کی طرف توجہ تام[3] کرنے سے غیرت آوے گی اور تصرف میں یہی ہوتا ہے کہ دوسری طرف توجہ تام کرنا پڑتا ہے۔ اور تدبیر مسنون[4] اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس میں فاعلیت و توجہ میں استغراق نہیں ہوتا۔ عارفین میں دو باتیں ہوتی ہیں برکت اور کرامت۔

برکت اور کرامت کی حقیقت اور تصرف اور کرامت میں فرق

برکت یہ ہوتی ہے ان کے وجود باجود سے بارش ہوتی ہے بیماری دور رہوتی ہے آفات اور حوادث ٹل جاتے ہیں لیکن ان کو خبر تک نہیں ہوتی جیسے آفتاب جب نکلتا ہے تو سب کو منور کر دیتا ہے۔ لیکن آفتاب کو کچھ خبر تک نہیں کہ میری ذات سے کس کس شے کو نفع

---

[1] مشقت و محنت سے کیونکہ جو چیز جتنی لطیف ہوتی ہے اتنی ہی طاقت والی ہوتی ہے مٹی سے پتھر پتھر سے لوہا لوہے سے آگ آگ سے پانی پانی سے ہوا اور بجلی طاقتور ہے تو خیال کی قوت اور زیادہ طاقتور ہے۔ مشق سے بڑھ کر مسمریزم اور شعبدہ بازی بن جاتی ہے۔ دوسرے میں ردوبدل یعنی تصرف کرنا اسی مشقی خیالی قوت سے ہو سکتا ہے۔

[2] کسی نہ کسی درجہ میں خود مستقل کرنے والا بننے کے تصور سے [3] پوری توجہ [4] اصلاح تربیت تبلیغ وغیرہ

پہنچ رہا ہے۔ اور دوسری شے کرامت ہے وہ بھی کبھی عارفین میں ہوتی ہے۔ کرامت یہ ہے کہ کسی خارق[1] عادت کا ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونا کرامت میں قصد نہیں ہوتا گو علم ہو اور تصرف میں قصد کرنا اور توجہ اس کی طرف مبذول کرنا ضروری ہے ہاں اگر اذن[2] الٰہی اس تصرف کا ہو تو اور بات ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مشکلات میں دعائیں کی ہیں تصرف سے کہیں کام نہیں لیا۔ الا نادراً[3]

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امور[4] نازلہ میں دعائیں بہت کی ہیں مگر یہ کہیں نہیں آیا کہ آنکھیں بند کر کے اس طرف توجہ و تصرف کیا ہو چنانچہ آیا ہے کہ حضور نے دعا فرمائی۔ **اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب او بعمر بن ھشام** یعنی اے اللہ اسلام کو قوت دے عمر بن خطاب سے یا ابوجہل بن ہشام سے یعنی ان کو مسلمان کر دے۔

یہ نہیں کیا کہ ان کی جانب توجہ فرمائی ہو اور تصرف کیا ہو بلکہ دعا فرمائی اگر تصرف ہوتا تو دو کا نام نہ لیتے کیونکہ تصرف میں یکسوئی لازم ہے ایک کو معین کر کے جب تک اس کی طرف کامل توجہ نہ کی جاوے کچھ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں دعا قبول فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ غرض یہ تو آیا ہے کہ حضور نے ہدایت کی دعائیں فرمائی ہیں چنانچہ احادیث ان دعاؤں سے مملو[5] و مشحون ہیں اور یہ بہت کم منقول ہے کہ تصرف کیا ہو۔ اسی واسطے میں نے اوپر باذن الٰہی کی شرط و قید ذکر کر دی ہے۔ اس لئے کہ تصرف بھی حضور نے گاہ گاہ فرمادیا ہے چنانچہ آیا ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کے سینہ پر ہاتھ مارا۔ ان کا شبہ زائل ہو گیا۔ ایک صحابی گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے۔ آپ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا وہ سوار ہونے لگے سینہ پر ہاتھ مارنا یہ قرینہ اس کا ہے کہ یہ فعل تصرف ہے اور اگر کسی کی سمجھ میں اس کی کوئی اور توجیہ آ جاوے تو پھر استثنا کی حاجت نہیں ہے انبیاء کے تصرف نہ فرمانے

---

[1] معمول و عادت کے خلاف [2] اللہ تعالیٰ کی اجازت [3] سوائے نادر و شاذ کے [4] نازل ہونیوالی مصیبتیں
[5] بھری ہوئی اور پر ہیں

کا حکم اپنے عموم پر رہے گا۔ بہر حال اگر ثابت بھی ہو جاوے تو شاذ ہے اور شاذ پر حکم نہیں ہوا کرتا سنت وہ ہے جس پر حضور نے مواظبت[1] فرمائی ہو مثلاً آپ نے قبا پہنی تھی اس میں سونے کی گھنڈیاں[2] تھیں تو یہاں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سنت ہے۔ بیان جواز کے لئے آپ نے ایسا کیا۔ اسی طرح یہاں بھی کہا جائے گا کہ سنت تو دعا کرنا ہے اور بیان جواز کے لئے شاذ و نادر تصرف بھی فرمایا ہے۔

رجوع بجانب سرخی (انبیا علیہم السلام کو نہ دین کے اندر غلو ہوتا ہے الخ)

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں شبہ مغلوب الحال ہونے کا نہ کیا جاوے جیسا کہ واضح ہو گیا اب رہی یہ بات کہ جب یہ نہ غلو فی الدین ہے اور نہ غلبہ حال ہے تو پھر اس حدیث کی کیا توجیہ ہے کیونکہ ظاہراً تو یہ عقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ صریح چوری کرتے دیکھ رہے ہیں اور پھر اپنے مشاہدہ کی تکذیب کر رہے ہیں اور عقل کے خلاف ہونے سے خود حدیث کی صحت مخدوش ہو گئی۔

عقل و درایت خدا تعالیٰ پر حاکم نہیں

اور مبنیٰ اس شبہ کا یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے انہوں نے کچھ اصول درایۃ[3] کے تراشے ہیں اور احادیث کو ان اصول پر منطبق کرتے ہیں اور عدم انطباق کے وقت حدیث کے معنی میں تحریف کرتے ہیں یا حدیث کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے عقل و درایت کی حکومت کو اس قدر عام مانا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھی اس کو حاکم بنا دیا۔ خوب سمجھ لو کہ اول تو درایت باوجود حاکم ہونے کے خدا تعالیٰ پر حاکم نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں نہ جلنے کو خلاف درایت بتلاتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کو واقع نہیں کیا عجب بات ہے تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کیسے لازم آیا کہ اس کا وقوع بھی نہیں ہوا۔ درایت خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ خدا تو درایت کے قبضہ میں نہیں۔

---

[1] ہمیشگی [2] جوزری کی بنی ہوئی ہوتی ہیں کیونکہ وہ تو کپڑے کا جز ہیں اور بٹن جز نہیں وہ سونے چاندی کے مرد کو جائز نہیں۔ [3] عقل کے مطابق ہونے کے

مولانا روم نے ایسی ہی ایک حکایت لکھی ہے جس میں وجہ درایت کی بھی بتلائی ہے کہ ایک بادشاہ نے بڑی بڑی گھاٹیاں آگ سے بھروا رکھی تھیں جو بت پرستی نہ کرتا تھا اس کو آگ میں پھینک دیتا تھا۔ ایک موحد عورت آئی اس کے پاس ایک بچہ تھا اس عورت کو کہا تو بت کو سجدہ نہ کرے گی تو اس بچہ کو آگ میں پھینک دیں گے اس نے صاف انکار کر دیا چنانچہ اس بچہ کو آگ میں پھینک دیا اس بچہ نے آگ میں سے ماں کو ندا دی۔

اندر آ مادر کہ من ایم جا خوشم　　گر چہ در صورت میاں آتشم

(اماں اندر آ جاؤ کیونکہ میں یہاں خوش خوش ہوں گو صورت میں آگ کے اندر ہوں)

اندر آ ، اسرار ابراہیم بیں　　کو در آتش یافت وردو یاسمیں

(اندر آ جاؤ اور ابراہیم علیہ السلام کے راز دیکھو کہ جنہوں نے آگ کے اندر گلاب وچنبیلی پائی تھی)

آندر آئید اے مسلماناں ہمہ　　غیر عذب دیں عذاب ست آں ہمہ

(اندر آ جاؤ اے سب کے سب مسلمانو کیونکہ دین شیریں کے سوا اور تو سب کچھ عذاب ہی ہے)

چنانچہ ماں بھی آگ کے اندر کود پڑی اور مسلمانوں نے گرنا شروع کیا اور سب صحیح سالم رہے۔ آخر بادشاہ نے جھلا کر آگ کو خطاب کیا کہ اے آگ تجھ کو کیا ہوا تو آگ نہیں رہی۔ آگ نے جواب دیا۔

گفت آتش من ہما نم آتشم　　اندر آ تا تو بہ بینی تابشم

(آگ نے کہا میں تو وہی آگ ہوں تو اندر آ جا تا کہ میرے جلانے کو دیکھ لے)

طبع من دیگر نگشت و عنصرم　　تیغ حقم ہم بدستوری برم

(نہ میری طبیعت دوسری ہوئی نہ میرا خمیر میں تو حق کی تلوار ہوں اجازت سے ہی کاٹ کرتی ہوں)

مولانا اس کا راز فرماتے ہیں جس میں درایت کی وجہ بتلائی ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند　　با من و تو مردہ باحق زندہ اند

(مٹی ہوا پانی آگ سب انہی کے بندے ہیں میرے تمہارے سامنے مردہ مگر حق تعالیٰ کے سامنے زندہ ہیں)

پس آگ بے شک فاعل ہے مگر کب تک جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو معطل نہ فرماویں اور جب معطل فرماویں کسی کام کی نہیں جیسے تحصیلدار حاکم ہے جب تک معطل نہ ہو جب معطل ہو گیا تو جیسے اور ہیں ویسا ہی وہ بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا اس لئے کہ اس کو حکم ہو گیا۔ **یانار کونی برداً و سلاماً علی ابراھیم** (اے آگ تو ٹھنڈا اور سلامتی بن جا ابراہیم علیہ السلام پر) پس گو یہ ظاہراً خلاف درایت ہے لیکن خود یہ حکم درایۃ کا کہ **النار محرقۃ حق تعالیٰ** (آگ جلانے والی ہے) پر تو حجت نہیں۔

ہم لوگوں کی درایۃ ناتمام ہے اس واسطے ہم کو بعض احکام خلاف درایۃ معلوم ہوتے ہیں

دوسرے آپ کی درایت بھی تو ناتمام ہے چنانچہ آپ کی درایت تو صرف اس قدر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو آپ نے خلاف درایۃ سمجھ لیا حالانکہ واقع میں یہ درایت کے بھی خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ سرقہ کی حقیقت یہ ہے **اخذ مال الغیر خفیۃ** اس کی تحقیق کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے اول لینا' دوسرے مال کا لینا' تیسرے غیر کا مال' چوتھے خفیہ لینا' آنکھ نے صرف اس قدر دیکھا جاتا ہے کہ خفیہ مال لینا مگر مال الغیر ہونا۔ یہ آنکھ سے کیسے معلوم ہوا ممکن ہے کہ وہ شے اسی کی ہو یا اس نے اجازت سے لی ہو تو حضرت عیسیٰ نے اول اس ہیئت کو دیکھ کر فرمایا کہ چوری کی ہے پھر اس کی قسم کے بعد دوسرا عقلی احتمال متحضر ہو گیا کہ شاید یہ سرقہ نہ ہو اور یہ سمجھا ہو کہ اس ہیئت میں کوئی عارضی مصلحت ہو گی۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی عقل اس قدر ہے اسی طرح جن جن چیزوں کو آپ خلاف عقل کہتے ہیں میں ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ایک کو عقل پر منطبق کر سکتا ہوں۔

کھانے کمانے کی عقل کوئی عقل نہیں ہے

ہم اور آپ عاقل نہیں ہیں ہاں آکل ہیں۔ یعنی ہم کو کھانے کی عقل ہے مثل بہائم کے چنانچہ بعض جانور اپنے کھانے پینے کی ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ عقلاء بھی نہیں کر سکتے۔ رجواڑوں میں سنا ہے کہ ریت کے اندر تربوز چھپے رہتے ہیں بیلوں کو جب پیاس لگتی ہے تو ریت کو کرید کر تربوز نکال کر کھا لیتے ہیں۔ اور آدمی کو تلاش سے بھی نہیں ملتے اس کھانے پینے کی تدبیروں کو لوگ ترقی کہتے ہیں ترقی یہ ہوئی کہ بیل کے برابر ہو گئے۔ حضرت یہ ترقی نہیں ہے ترقی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تم کو عقل دی ہے اس کو دین کے کاموں میں صرف کرو کھانے پینے کی عقل تو جانوروں کو بھی ہوتی ہے بلکہ تم سے زیادہ ہوتی ہے اس پر تو چاہیے کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہوں اگر یہی ترقی ہے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق ہوگا۔

رجوع بجانب سرخی (سمع بصر قلب جوارح کی حفاظت کا حکم)

یہ قصہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا انہوں نے کس قدر احتیاط فرمائی اور **لا تقف ما لیس لک بہ علم** پر کیسا عمل کیا ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ذرا سے شبہ میں چور کہہ دیتے ہیں۔ محض قرائن سے کسی کو چور کہہ دینا نہایت برا ہے۔

کسی عمل سے چور کا نام معلوم کر کے اس پر چوری کا الزام لگانا جائز نہیں

اس پر ایک اور مضمون یاد آ گیا کہ بعض لوگ چور کے معلوم کرنے کے واسطے ایک عمل لوٹا گھمانے کا کیا کرتے ہیں۔ اس پر سورہ یاسین شریف پڑھتے ہیں۔ جس کے نام پر لوٹا گھوم جائے اس کو یقیناً چور سمجھتے ہیں اور اس عمل میں غلطی کا احتمال ذرا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کا عمل ہے۔ یاد رکھو یہ حرام ہے۔ شریعت میں بلا اپنے دیکھے یا دو عادل کی گواہی بغیر کسی کو چور سمجھنا ممنوع ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کا عمل غلط نہیں ہو سکتا اس میں مغالطہ ہے یہ عمل اگر قرآن کا مدلول ہوتا تو واقعی یقینی ہوتا اور یہی معنی ہیں اس کے کہ قرآن میں

احتمال غلطی کا نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عمل قرآن کا مدلول نہیں خود تمہارا گھڑا ہوا ہے اگر کوئی شخص ایک بڑا سا قرآن لے کر کسی کے سر میں مار دے اور وہ زخمی ہو جاوے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمل جائز ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ سے ہوا ہے۔

رجوع بجانب سرخی (سمع بصر قلب جوارح کی حفاظت کا حکم)

حاصل یہ ہے کہ و لا تقف ما لیس لک به علم میں بطریق مذکور زبان کی حفاظت کا حکم بھی داخل ہو گیا اور ہاتھ کی حفاظت اس طور سے داخل ہوئی کہ بلا تحقیق جرم کسی پر ظلم کرنا حرام ہے اور اس میں مخالفت ہوئی و لا تقف الایه کی اسی طرح پاؤں کی حفاظت بھی داخل ہے۔ کہ بلا تحقیق جواز شرعی کسی ناجائز مجمع میں جانا حرام ہے اسی طرح سب جوارح کی حفاظت اس میں داخل ہوگئی اور سمع و بصر و فواد کی حفاظت تو بالتصریح ہی اس میں مذکور ہے۔ مثلاً کان کو غیر مشروع اصوات و مضامین سے بچانا آنکھ کو غیر محارم کی طرف نظر کرنے سے بچانا قلب کو گمان بد وغیرہ سے بچانا۔

معصیت سے بچا رہنا بڑی کرامت ہے

حکایت: حضرت جنیدؒ کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص آپ کا امتحان کرنے آیا اور دس برس تک آپ کے پاس رہا مگر معتقد نہ ہوا ایک روز کہنے لگا کہ میں نے آپ کی بزرگی کی شہرت سنی تھی لیکن میں دس برس سے آپ کے پاس ہوں اس مدت میں میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے اس مدت میں جنید کو کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ میں مبتلا دیکھا اس نے جواب دیا کہ گناہ تو کوئی نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جنید کی یہ کچھ چھوٹی کرامت ہے کہ دس برس تک اس سے خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

کوئی شخص کیسے ہی درجہ کو کیوں نہ پہنچ جائے احکام شرعی اس سے ساقط نہیں ہوتے

حکایت: علی ہذا ایک دوسرا واقعہ ان کا مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں چند مدعیان

تصوف کا یہ قول آپ کے پاس پہنچا کہ وہ کہتے ہیں نحن و صلنا ولا حاجۃ لنا الی الصیام والصلوٰۃ آپ نے سن کر فرمایا۔ صدقو افی الاصول ولکن الی السقرا اور پھر فرمایا کہ اگر میں ہزار برس زندہ رہوں تو نفل عبادت بھی بدوں عذر شرعی ترک نہ کروں۔

بزرگوں کی خدمت میں اصلاح کی نیت سے جانا چاہیے ان کے پاس جا کر دنیا کے قصے نہ شروع کر دینے چاہیں

بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت ان کی محض وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے اور علت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ان بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں۔

طالب کو ثمرہ کا انتظار اور کسی حالت میں مایوسی نہ چاہیے

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ دو ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے کہ الحائک اذاصلی یومین انتظر الوحی ایسے لوگوں کے جواب میں ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کے نام لینے کی توفیق ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ بھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہیے۔

یابم اورایانیابم جستجوئے می کنم　　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

طالب خدا کی یہ شان ہے کہ سو دفعہ اس کو یہ آواز آئے کہ تو دوزخی ہے تب بھی اس کو مایوسی نہ ہو۔

حکایت: ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ تم عبادت کرتے اتنے دن ہو گئے نہ پیام ہے نہ سلام پھر اس سے کیا نفع وہ معمول چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں حضرت خضر علیہ السلام آئے اور وجہ پوچھی۔ اس نے کہا کہ نہ لبیک ہے نہ پیک ہے پھر کیسے دل بڑھے جواب ارشاد ہوا۔

گفت آن اللہ تو لبیک ماست　　دین نیاز و سوز و دردت پیک ماست

حکایت: ایک بزرگ کی حکایت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے کہ وہ ذکر کرنے بیٹھے تو یہ آواز آئی کہ تم کچھ بھی کرو یہاں کچھ قبول نہیں مگر وہ پھر کام میں لگ گئے۔ ان کے ایک مرید نے کہا کہ جب کچھ نفع ہی مرتب نہیں تو محنت سے کیا فائدہ۔ بزرگ نے جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی دوسرا ایسا ہوتا کہ میں خدا کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اعراض ممکن بھی تھا۔ اب تو یہی ایک در ہے قبول ہو یا نہ ہو۔

توانی ازاں دل پرداختن　　کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

اس جواب پر رحمت خداوندی کو جوش ہوا اور ارشاد ہوا کہ۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت　　کہ جز ما پناہی دگر نیستت

غرض طالب کو ہر حال میں طلب میں مشغول رہنا چاہیے اور یہ حالت ہونی چاہیے

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود!　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

کامل کی پہچان

البتہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ کامل کی کوئی پہچان بتلائی جائے کیونکہ آج کل بہت سے شیطان بھی لباس انسان میں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو۔ کسی[۲] کامل شیخ کی تربیت میں رہا ہو اور اس[۳] سے اجازت تربیت حاصل ہو۔ خود شریعت[۴] پر عامل ہو۔ شریعت[۵] کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہے۔ سنت[۶] کا پورا پابند ہو۔ اپنے متعلقین[۷] پر شفقت کرتا ہوا احتساب میں کمی نہ کرتا ہو جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

مساجد میں دنیا کا ذکر کرنا اس کو شر البقاع بنانا ہے

ایک مرتبہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شر البقاع کیا چیز ہے اور خیر البقاع کون سی جگہ ہے۔ فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربار خداوندی سے دریافت کر کے جواب دوں گا چنانچہ وہ پوچھنے گئے اس وقت ببرکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو اتنا قرب کبھی نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے۔ غرض دربار خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شر البقاع بازار ہے اور خیر البقاع مسجد سو غور کرنا چاہیے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے۔ بجز ذکر اللہ و ذکر الدنیا کے پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع۔ اصلی ذکر اللہ ہے پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع بنانا ہے جو کہ اصل ویرانی ہے۔

جو بات معلوم نہ ہو اس میں ناواقفی کے اقرار سے شرمانا نہ چاہیے

اور اس جگہ پر آپ کے اور جبرائیل علیہ السلام کے لا ادری فرما دینے سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو باوجود نہ معلوم ہونے کے مسائل کا غلط سلط جواب دینے پر مستعد ہو بیٹھتے ہیں۔ نیز وہ لوگ سمجھیں اور متنبہ ہوں جو باوجود کتاب کا مطلب نہ آنے کے طالب علموں کو کچھ نہ کچھ جواب دیئے چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہہ دیتے کہ یہ مقام نہیں آتا جو نہ معلوم ہو کہہ دینا چاہیے کہ یہ نہیں معلوم۔

حکایت: بزرجمہر سے کسی بڑھیا نے کچھ پوچھا اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں بڑھیا نے کہا کہ ہائیں تم بادشاہ کی اتنی تنخواہ کھاتے ہو اور یہ بات تم کو معلوم نہیں۔ بزرجمہر نے جواب دیا تنخواہ تو مجھے معلومات کی ملتی ہے اگر مجہولات کی ملنے لگے تو بادشاہ کا سارا خزانہ بھی کافی نہ ہو۔

دنیا میں حق تعالیٰ کی رویت کسی کو نہیں ہو سکتی اور نہ ان کی کنہ تک رسائی ہو سکتی ہے

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ستر ہزار حجاب کو کمال قرب کہنا قابل غور ہے کہ جو

لوگ دنیا میں تھوڑا اساذکر وشغل کر کے حق تعالیٰ کی رویت کی ہوس میں پڑتے ہیں۔ کتنی بڑی غلطی ہے کیا جبرئیل علیہ السلام سے زیادہ قرب چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑی غلطی ہے اگر رویت سے بڑھ کر ذات کی کنہ کو ادراک کرنا چاہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کی کنہ تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کو ہرگز نہ سوچنا چاہیے البتہ افعال خداوندی میں غور اور تدبیر کرنا چاہیے۔ تفکروا فی الآء الله ولا تفکروا فی ذاته کسی بزرگ کا قول ہے

دور بینان بارگاہ الست	غیر ازیں پے زبردہ اند کہ ہست
آنچہ اندر راہ مے آید بدست	حیرت اندر حیرت اندر حیرت است
اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم	وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر	ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

ہاں البتہ قیامت میں حسب وعدہ رویت ذات بلا حجاب ہوگی اور حدیث میں جو آیا ہے کہ اس دن کوئی اور پردہ نہ ہوگا۔ بجز رداء الکبریا کے اس سے بلا حجاب ہونے پر شبہ نہ ہو کیونکہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ رویت تو بلا حجاب ہوگی مگر عظمت وجلال وکبریائی کی وجہ سے احاطہ نہ ہو سکے گا۔ ردائے کبریا اس کو فرمایا ہے دنیا میں بلا حجاب رویت نہیں ہو سکتی۔ یہی عقیدہ اور مسئلہ شرعی ہے اور حضرت پیران پیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی طرف جو یہ شعر منسوب ہے کہ ؎ بے حجابانہ درآ از درکاشانہ ما

تو یہ مؤول بہ حجاب محجوبین غافلین ہے یا قیامت کے روز کے لئے اشتیاق لقا کا اظہار فرماتے ہیں کیونکہ درآ صیغہ امر ہے اور وہ استقبال کے لئے ہے۔ اور اگر یہ شعر کسی اور شاعر کا ہو تو ہم کو ضرورت تاویل کی نہیں۔

پیر سے اگر کوئی بات خلاف شرع ہو تو اس کو متنبہ کرے مگر ادب سے اور اس کا بیان کہ عاشقوں کی گستاخی عین ادب ہے

حکایت: حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شہید احمد رحمۃ اللہ کے پیر ایک دن صبح کی نماز میں بوجہ نئی شادی ہونے کے ذرا دیر میں پہنچے۔ ان کے مرید مولوی عبدالحئی صاحب

نماز کے بعد وعظ فرمانے بیٹھ گئے۔ اس میں یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ جورو کی بغل میں پڑے رہتے ہیں اور تکبیر اولیٰ قضا ہو جاتی ہے۔ جناب سید صاحب نے نہایت شکریہ ادا کیا اور فرمایا اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس بیان کے بعد فرمایا کہ مولوی عبدالحئی صاحب نے باوجودیکہ ظاہراً یہ عنوان خلاف ادب تھا اس واسطے اس عنوان سے کہنے کی جرأت کی تھی کہ انکو معلوم تھا کہ سید صاحب کے دل میں اس سے میل نہ آئے گا بلکہ خوش ہوں گے۔ اور ان کے خوش کرنے کو بے ادبی اختیار کی۔

گفتگوئے عاشقاں درکار رب — جوشش عشق ست نے ترک ادب

باادب ترنیست زوکس در نہاں — بے ادب ترنیست زوکس در جہاں!

ایسا ہی قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو اس وقت **لا ورب ابراھیم** کہتی ہو اور جس وقت خوش ہوتی ہو تو اس وقت **لا ورب محمد** کہتی ہو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ **لا اھجر الا اسمک** بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی اور کرے بے ادبی میں داخل ہو جائے بلکہ کفر ہو جائے مگر عاشق صادق جوش محبت اور علاقہ محبت سے کرتا ہے اس لئے وہ عفو ہوتی ہیں۔ حاصل یہ کہ ظاہراً باتیں بے ادبوں کی سی ہوتی ہیں اور باطناً ہوتی ہیں باادب ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند درنوشتن شیر و شیر

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے زابدال حق آگاہ شد

گفت اینک مابشر ایشاں بشر — ماوایشاں بستہ خوابیم و خور

ایں ندا نستند ایشاں ازعمیٰ — درمیاں فرقے بود بے منتہا

احمد و بوجہل در بت خانہ رفت — زیں شدن تا آں شدن فرقیست ژرف

مسجد کی حاضری کے وقت کیا حالت ہونی چاہیے اور اس کا بیان کہ اس حالت کے حصول سے مایوس نہ ہونا چاہیے

آداب مسجد کو بلا ارادہ تشبہ ایسا خیال کرنا چاہیے جیسا کہ حاکم دنیوی کی حضوری میں قلب اور جوارح کی حالت ہوتی ہے کہ اس کا مصداق بن جاتا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہ کند آگاہ نباشی

اتنا تو ہونا چاہیے اور ایسی حالت اول تو ہر وقت ہو ورنہ حضوری مساجد کے وقت تو ضروری ہے اور ہر وقت حاصل ہونا اس حالت کا یوں نہ سمجھنا چاہیے کہ بزرگان پیشین پر ختم ہو گیا ہم کو کب ہو سکتا ہے۔

تو مگو ماراباداں شہ بار نیست　　با کریماں کارہا دشوار نیست

دیکھئے صحابہ کی کیفیت ادب مسجد کی یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دو شخصوں کو جو مسجد نبوی میں بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے تنبیہہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر تم باہر کے مسافر نہ ہوتے تو تمہیں سزا دیتا۔ اترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ حکم عدم رفع صوت مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ مساجد سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہیں۔ چنانچہ فلا یقربن مساجدنا میں آپ نے جمیع مساجد کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ ہاں مسجد نبوی کا اور زیادہ ادب ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ تو ہے ہی کہ ان المساجد للہ الخ اور جب اللہ کی ہوئیں تو یہ ادب کو بدرجہ اولیٰ مقتضی ہوگا اور جس طرح مسجد قابل ادب ہے ایسے ہی اہل مسجد کا ادب بھی ضروری ہے وہ یہ کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اہل مسجد کو تاذی ہو۔ مثلاً یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ایسی جگہ نہ کھڑا ہو جہاں اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہو کیونکہ اس میں تکلیف ہے ذاکرین کو علیٰ ہذا ذکر جہر جس وقت کوئی اور شخص نماز پڑھ رہا ہو نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کی نماز میں خلل ہوگا اور اس کو تکلیف ہوگی اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مسجدیں بموجب ارشاد نبوی ریاض الجنۃ ہیں۔ اور جنت میں آزار و تکلیف نہ ہونا چاہیے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد　　کسے را باکسے کارے نباشد

دعا کے آداب اور اس کا بیان کہ دعا میں محض معنیٰ بھی مقصود ہیں بخلاف اور عبادات کے کہ ان کے اندر ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے اور بے دینوں کے ایک شبہ کا جواب

وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی

سیدخلون جهنم داخرین اس آیت کے مضمون ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مقصود بیان تنبیہات متعلقہ دعا ہے اور شاید کسی کو یہ خیال ہو ہم تو دعا کیا کرتے ہیں اور اس کی ضرورت وغیرہ کو بھی جانتے ہیں پھر کیوں تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ تنبیہ تو اس امر میں ضروری ہے جس کو جانتا نہ ہو یا کرتا نہ ہو۔ سو ضرورت تنبیہ کی یوں ہے کہ باوجود جاننے اور کرنے کے بھی جب دعا کے بارہ میں تغافل برتا جاتا ہے یعنی اس کے ضروری آداب وشرائط سے بے پروائی کی جاتی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ جانی ہوئی چیزوں سے بھی بڑھ کر کوئی حجاب قوی ہے کیونکہ مجہولات میں تو صرف جہل حجاب ہے کہ اس کا دافع ہونا سہل ہے اور جانی ہوئی چیز میں جب ایسا معاملہ کیا جائے تو وہ حجاب زیادہ سخت ہوگا۔ اور ہر چند کہ یہ تغافل اور قلب کا حاضر نہ ہونا سب عبادات میں قبیح ہے۔ مگر دعا میں اقبح ہے۔ وجہ یہ کہ عبادات میں گو اصل مقصود معنیٰ ہے مگر تاہم ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے اور وہ نیاز و افتقار و انکسار و خشوع قلب ہے جب یہ بھی نہ ہوا تو وہ دعا کیا ہوئی بیان اس کا یہ ہے کہ مثلاً نماز ہے کہ قرائن سے اس میں علاوہ مقصود معنوی یعنی توجہ الی اللہ کے صورت بھی مراد اور مطلوب ہے کہ اس کے قیود ظاہری سے مفہوم ہوتا ہے مثلاً وضو، جہت قبلہ، وقت، تعین رکعات وغیرہ اب اگر کوئی شخص بغیر حضور قلب کے رکوع و سجود وغیرہ شرائط سے نماز پڑھ لے تو گو مقصود معنوی توجہ الی اللہ اس میں نہیں ہوئی مگر فقیہ عالم یہی حکم دے گا کہ فرض ادا ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ صورت بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے اور اسی کے تحقیق سے صحت صلوٰۃ کا فتویٰ صحیح ہوا۔ اس تقریر سے بے دینوں کا یہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو کہا کرتے ہیں کہ صاحب دل تو حاضر نہیں پھر نماز کیا پڑھیں۔ معلوم ہوا کہ علاوہ حضور قلب کے کہ معنی اور حقیقت ہے نماز کی یہ صورت ظاہری رکوع سجود بھی مقصود۔ دوسری نظیر لیجئے روزہ سے مقصود معنوی قوت بہیمیہ کا توڑنا اور مغلوب کرنا مطلوب ہے مگر بایں ہمہ اگر کوئی شخص سحری کو ایسا پیٹ بھر کھائے کہ افطار تک اس کو بھوک ہی نہ لگے تو اس صورت میں قوت بہیمیہ تو کچھ بھی نہیں ٹوٹی مگر روزہ کی چونکہ ظاہری صورت پوری ہو گئی ہے روزہ صحیح ہوگا۔ تیسری نظیر اور لیجئے زکوٰۃ کہ مقصود

معنوی اس سے اغنا و مساکین ہے مگر بایں ہمہ اس کے لئے ایک خاص مقدار ایک خاص وقت معین ہے جس سے مقصودیت صورت ایک درجہ میں یہاں بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ صرف اغنا تو ان امور پر موقوف نہیں لیکن دعا میں نہ کسی وقت کی شرط نہ زبان عربی کی شرط نہ کسی خاص جہت کی شرط نہ کوئی مقدار معین نہ وضو وغیرہ کی قید اس میں صرف عاجزی نیاز مندی اپنی احتیاج کا اظہار اپنے مولیٰ کے آگے بس یہ کافی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صورت پر بالکل نظر نہیں معنی ہی معنی مقصود ہیں بس اب یہ صرف زبانی دعا کہ آموختہ سا رٹا ہوا پڑھ دیا نہ خشوع نہ خشیت نہ دل میں اپنی عاجزی کا تصور یہ خالی از معنی دعا کیا ہوئی۔

دعا میں حضور قلب کی ضرورت اور بغیر حضور قلب کے دعا کی مثال

اس بے توجہی کی مثال تو ایسی ہوئی جیسا کوئی شخص کسی حاکم کے ہاں عرضی دینا چاہے اور اس طور پر عرضی پیش کرے کہ حاکم کی طرف پیٹھ کرے اور منہ اپنا کسی دوست یار کی طرف کر کے اس عرضی کو پڑھنا شروع کر دے۔ دو جملے پڑھ لئے پھر یار دوست سے ہنسی مذاق کرنے لگے پھر دو جملے پڑھ دیئے اور ادھر مشغول ہو گئے۔ اب سوچ لینا چاہیے کہ حاکم کی نظر میں ایسی عرضی کی کیا قدر ہو سکتی ہے۔ بلکہ الٹا یہ شخص قابل سزا ٹھہرایا جائے گا۔ بس یہی معاملہ ہے دعا کا۔ دعا میں جب تک کہ پورے طور پر قلب کو حاضر نہ کرے گا اور عاجزی اور فروتنی کے آثار اس پر نمایاں نہ ہوں گے وہ دعا دعا نہیں خیال کی جا سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قلب کی حالت کو دیکھتے ہیں۔

ما بروں را ننگریم و قال را   ما دروں را بنگریم و حال را
ناظر قلبیم گر خاشع بود   گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

حدیث شریف میں ہے **ان اللہ لا ینظر الیٰ صورکم و لکن ینظر الیٰ قلوبکم** غرض یہ بات پورے طور پر ثابت ہو گئی کہ دعا میں حضور اور خشوع ہی مقصود ہے اگر بے اس کے بھی کسی کی دعا قبول ہو جائے تو اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ خداوند تعالیٰ کا مجھ پر ابتدائی احسان ہے دعا کا اثر نہیں۔

دعا کے امر میں اہتمام اور حکماء کی ایک بے عقلی!

یہ ایک تمہید تھی مضمون دعا کی اب آیت کا مضمون سنئے اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دعا کا مضمون بیان فرمایا ہے چنانچہ شروع میں یہ تصریح فرمائی کہ وقال ربکم حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لئے ظاہر فرما دیا کہ اس کی تاثیر نفس میں قوی ہو جائے اور مضمون مابعد کی وقعت دلوں میں زیادہ ہو پھر لفظ ربکم ارشاد فرمایا اس میں بوجہ اظہار ربوبیت گویا اشارہ ہے دعا کے قبول کر لینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے ہیں حتیٰ کہ بدوں تمہاری درخواست کے بھی کی ہے تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو نا گفتہ ما مے شنود

آیت اذانشاء کم من الارض و اذ انتم اجنة في بطون امهاتكم الخ میں اس ترتیب بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابل غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت تک نہ ہوا تھا اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھا ہو کر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہر گز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ اسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچے کو دودھ چوسنا سکھایا۔ حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل ہے مگر جب کہ خود وہ طبیعت ہی کو بے شعور مان چکے ہیں تو ایسے پر حکمت کاموں کی اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری نہیں تو اور کیا ہے۔ تیسرا اہتمام ربکم کی اضافت ہے گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں تم ہم سے مانگو اور اسی کی نظیر دوسری آیت میں اضافت ہے۔ ولو یؤاخذ الله الناس الى قوله بعباده بصيراً حالانکہ یہاں عباد ماخوذین کا ذکر ہے۔ مگر ان کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔

آیت ولو یؤاخذ الله الناس کے متعلق ایک عجیب تحقیق

اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیر یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے

مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے۔ **ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً** یعنی تمام چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں خواہ ان کا نفع بلا واسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ در واسطہ پس چونکہ انسان کے لئے ہی سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لئے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں بھی اس لئے ہلاک کی جاتیں کہ جب وہی نہ رہا۔ جس کے لئے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت جب آدمی نہ ہو تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر اسباب سامان کس کام کے البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بروں کو تو ان کے برے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا جاتا۔ سو اس کا جواب یہ ہے اچھے آدمی قدر قلیل ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی اس کو ہرگز پورا نہیں کر سکتے پھر اگر بروں کے بعد نیک زندہ رہتے تو ان کا جینا وبال ہو جاتا۔ ان کے لئے یہ مرنا ہی مصلحت و رحمت ہوتا۔

دعا اگر دنیاوی مباح کے لئے ہو وہ بھی عبادت ہے بخلاف اور عبادات کے اور اس کا راز اور فناء الفنا کی توضیح ایک مثال سے

ایک خصوصیت خاص دعا میں اور عبادات سے زیادہ یہ ہے کہ اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لئے ہوں تو عبادات نہیں رہتیں مگر دعا ایک ایسی چیز ہے کہ یہ اگر دنیا کے لئے ہی ہو تو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے مثلاً مال مانگے' دولت مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا بر خلاف اور عبادات کے کہ اگر ان میں دنیوی حاجت مطلوب ہو تو ثواب نہیں ملتا چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اگر طبیب نے کسی کو رائے دی کہ تم آج دن کا کھانا نہ کھاؤ اگر کھایا تو ضرر دے گا اس نے کہا لاؤ آج روزہ ہی رکھ لیں پس روزہ رکھ لیا تو اس کو خالص روزے کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ اس کو دراصل روزہ رکھنا مقصود نہیں ایسے ہی کوئی شخص مسافرت میں اس نیت سے مسجد کے اندر اعتکاف کرے کہ سرائے کے کرایہ وغیرہ سے بچوں گا تو اس کو خالص ثواب اعتکاف کا نہ ملے گا۔ مگر دعا میں یہ

بات نہیں چاہے کتنی ہی حاجتیں دنیوی مانگو مگر پھر بھی ثواب ملے گا اور دعا میں یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ دعا سراسر نیاز مندی ہے اور عجز وانکسار اور اظہار عبدیت واحتیاج اور یہ دنیا کے مانگنے کے وقت بھی متحقق ہے اور نیاز مندی خود ایک بڑا محبوب عمل ہے کیونکہ جہاں نیاز مندی ہوگی وہاں کبر نہیں رہے گا اور کبر اور خودی بھی بڑا مبغوض اور بڑا حائل ہے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ الکبریاء رداؤ رالعظمة ازاری رداا اور ازار سے مراد یہ کہ دونوں میرے وصف خاص ہیں کہ کوئی دوسرا ان دو وصفوں کا مدعی محق نہیں ہوسکتا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ منام میں جناب باری سے عرض کیا کہ دلنی علیٰ اقرب الطرق الیک جواب ارشاد ہوا دع نفسک و تعال حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو کیا خوب فرمایا ہے فرماتے ہیں ؎

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

تو درد گم شود وصال انیست و بس　　　گم شدن گم کن کمال انیست و بس

حاصل یہ کہ اپنی خودی کو مٹاؤ یہاں تک کہ اس مٹانے پر بھی نظر نہ رہے یعنی اس صفت فنا پر بھی نظر نہ رہے اور اس کا نام اصطلاح میں فناء الفناء ہے اور اس کو شاعرانہ مضمون نہ سمجھا جائے کہ مٹانے کو بھی مٹاؤ اس کے نظائر تو روزمرہ واقع ہوتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ فناء الفناء کی توضیح اس مثال سے اچھی طرح ہوسکتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دلربا معشوق ہو اور عاشق اس کے خیال میں مستغرق ہو اس حالت میں اس عاشق کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں خیال کررہا ہوں کسی کو یاد کیجئے اس یاد کی طرف ذرا بھی ذہن نہیں جاتا۔ آدمی سوتا ہے مگر اس وقت یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں سوتا ہوں اور اگر یہ خبر ہوجائے تو وہ سوتا ہوا نہیں ہے۔

احوال عالیہ کے حصول سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور ان کے حصول کی شرط

اوران احوال عالیہ کو سن کر یہ ناامیدی نہ چاہیے کہ بھلا ہم کو یہ دولت کب میسر ہوسکتی ہے اللہ تعالیٰ کا فضل بڑا واسع ہے اس کو کچھ دشوار نہیں ۔

تو مگو مار ابداں شہ بارنیست　　　　باکریماں کا رہا دشوار نیست

البتہ ایسے احوال کے حصول کے لئے صحبت شیخ کی ضرورت ہے اور صحبت وہ چیز ہے کہ دیکھو انڈا کیا چیز ہے سفیدی اور زردی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا مگر مرغی کے سینے سے اس میں جان آ گئی تو کیا صحبت کاملین کی اس سے بھی گئی گزری۔ اور یہ وسوسہ بھی نہ ہو کہ صحبت تو ایسی چیز ضرور ہے مگر خود وہ لوگ کہاں ہیں جن کی صحبت میں یہ برکت ہو۔ سو یقین کے ساتھ سمجھو کہ اب بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس برکت کے موجود ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است　　　　خم و خمخانہ با مہر ونشاں است

دل سے میدان طلب میں آنا چاہیے نری سوکھی روکھی آرزو سے کام نہیں چلتا۔ صدق طلب ہونی چاہیے اور کوشش۔

گرچہ رخنہ نیست در عالم پدید　　　　خیرہ یوسف وارمے باید و دید

یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو کیسا اپنے مولیٰ پر بھروسہ تھا کہ باوجود دروازے بند ہونے کے دوڑے اور کوشش کی اللہ تعالیٰ نے دروازے بھی کھول دیئے اگر صدق دل سے طلب اور کوشش ہو تو مقصود ملنے کی یقینی امید ہے۔

رجوع بجانب سرخی

(دعا اگر دنیا کے لئے ہو تو وہ بھی عبادت ہے)

غرض حاصل یہ ہے کہ دعا کا خلاصہ نیازمندی ہے اور دعا خواہ کسی قسم کی ہو دینی یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لئے نہ ہو سب عبادت ہے۔ خواہ چھوٹی چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی۔ حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالیٰ سے مانگا کرو۔

اہل اللہ کبھی اظہار عبدیت کے لئے بے صبری کی صورت اختیار کرتے ہیں اور حضرت ایوب علیہ السلام کی شکایت مرض کی ایک لطیف توجیہ

حکایت: ایک بزرگ رو رہے تھے کسی نے پوچھا کیوں روتے ہو فرمایا بھوک لگی ہے اس نے کہا کیا بچے ہو کہ بھوک سے روتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ جب مولیٰ کی یہی مرضی

ہو کہ میں بھوک سے روؤں تو پھر استقلال کیوں اختیار کروں۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں! خاک بر فرق قناعت بعد ازیں
نالم از آن نا خوش آیدش از دو عالم نالہ و غم بایدش

بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ میں مرض کی شکایت کا اظہار کروں تب فرمایا رب انی مسنی الضر الخ ورنہ یہ اظہار بے صبری کی وجہ سے نہ تھا اگر بے صبری ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کی یوں تعریف نہ فرماتے ان وجدناہ صابراً نعم العبد الخ

درنیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

کاملین کا مقصود صرف حق تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے

کیفیات باطنیہ پر ان کی نظر نہیں ہوتی

غرض ان کاملین کی نظر خدا تعالیٰ کی رضا پر ہوتی ہے اپنا حظ ظاہری یا باطنی کچھ مقصود نہیں ہوتا جس میں خدا تعالیٰ راضی ہوں وہی کرنے لگتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق اے فتا تو بغربت دیدہ بس شہرہا
پس کدامی شہر از انہا خوشتر است گفت آں شہرے کہ دروے البر است
ہرکجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنت است او گرچہ باشد قعر چاہ
باتو دوزخ جنت است اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

عاشقوں کی کچھ اور ہی شان ہے۔

ذکر سے اصلی مقصود اور اس سے قصد دنیا کی مذمت خصوص تسخیر کا عدم جواز!

حکایت: حضرت حافظ محمد ضامن شہید علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے فرمایا کرتے کہ ہم تو اس واسطے ذکر کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فاذکرونی اذکرکم یعنی احوال و

کیفیات باطنی پر نظر نہ تھی، دیکھئے محققین کی تو یہاں تک نگاہ ہے کہ خدا کے نام اور احکام میں کیفیات باطنی تک کا قصد نہ کریں اور افسوس آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ وظائف تحصیل دنیا کے لئے پڑھتے ہیں کوئی دست غیب تلاش کرتا پھرتا ہے حالانکہ اس میں جواز تک بھی نہیں۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو کچھ ملتا ہے وہ حرام ہے کیونکہ جن مسخر ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کا مال چرا چرا کر عامل کو دیتے ہیں یا اگر اپنا لائیں تب بھی مجبور ہو کر لاتے ہیں ایسا ہی تسخیر قلوب کا حال ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو مال دیا جاتا ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیا جاتا۔ مغلوب الرائے ومضطر ہو کر دیتا ہے۔

عملیات کی خرابیاں

اور اگر کسی عمل میں جواز بھی ہو تب بھی ایسے اغراض کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام کی بے قدری کرنا اور بھی بے ادبی ہے اور احادیث میں سورہ واقعہ کا پڑھنا وغیرہ آیا ہے وہ دنیا کو معین دین بنانے کی غرض سے ہے جو کہ دین ہی ہے۔ کاش یہ لوگ بجائے ان اعمال کے دعا کیا کرتے اگر مقصود حاصل ہو جاتا تو بھی مطلب کا مطلب اور ثواب کا ثواب اور اگر نہ ہوتا تو بھی دعا کا ثواب کہیں گیا ہی نہ تھا۔ مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ عمل میں ایک اور بھی خرابی ہے کہ دعا سے تو پیدا ہوتی ہے عاجزی اور فروتنی اور عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ دعویٰ عامل جانتا ہے کہ بس ہم نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا۔

حکایت: مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی علیہ الرحمۃ کا لوگ ذکر کرتے ہیں کہ فرماتے تھے اگر صاحب نسبت عمل کرے تو نسبت سلب ہو جاتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ عامل کو خدا پر توکل نہیں رہتا اور عجب پیدا ہو جاتا ہے اور یہ منافی ہے نسبت مع اللہ کے۔

امور اختیاریہ میں بھی دعا کی ضرورت ہے اور اسباب کے موثر ہونے کی حقیقت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے سرد ہو جانے کے قصہ سے رفع تعجب

دعا صرف امور غیر اختیار کے ساتھ خاص نہیں جیسا عام خیال ہے کہ جو امر اپنے

اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے بلکہ امور اختیاریہ میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے اور ہر چند کہ ان کا وجود اور ترتب بظاہر تدبیر اور اسباب پر مبنی ہے لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے خود ان اسباب کا جمع ہو جانا واقع میں غیر اختیاری ہے۔ اور اس کا بجز دعا اور کوئی علاج نہیں۔ مثلاً کھیتی کرنے میں ہل چلانا بیج بونا وغیرہ تو اختیاری ہے مگر کھیتی اگنے کے واسطے جن شرائط اور اسباب کی ضرورت ہے وہ اختیار سے باہر ہیں مثلاً یہ کہ پالا نہ پڑے یا کوئی اور ایسی آفت نہ پڑے جو کھیتی کو اگنے نہ دے۔ اس لئے اللہ جل جلالہ فرماتے ہیں کہ **افرایتم ما تحرثون اانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون** الخ پھر ان سب کو احتیاج ہے تعلق مشیت خداوندی کی اور صاف ظاہر ہے کہ وہ عباد کے اختیار میں نہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ امور اختیاریہ میں بھی تدابیر اور کسب کے ساتھ دعا کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جب کہ اس پر نظر کی جائے کہ ہم جن اسباب کو اسباب سمجھتے ہیں۔ وہ بھی درحقیقت برائے نام ہی اسباب ہیں ورنہ اصل میں ان میں بھی وصف سببیت بمعنی تاثیر محل کلام میں ہے۔ بلکہ احتمال ہے کہ عادت اللہ اس طرح جاری ہو کہ ان کے تلبس واقتران کے بعد حق تعالیٰ اس اثر کو ابتداءً پیدا فرما دیتے ہوں اور جب چاہیں اثر مرتب نہ فرمائیں۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں اثر کو پیدا نہ فرمایا تو جو شخص اس راز کو سمجھ گیا وہ کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے سرد ہونے میں تعجب نہیں کرے گا کیونکہ اگر تعجب ہے تو تاثیر کے مسلوب ہونے میں ہے اور اثر پیدا نہ ہونا چنداں عجب نہیں بالجملہ ان اسباب کے تاثیر کی ایسی مثال معلوم ہوتی ہے کہ جیسے سرخ جھنڈی دکھانے سے ریل رک جاتی ہے اب کوئی نادان یہ سمجھے کہ سرخ جھنڈی میں کوئی تاثیر ہے جس سے ریل رک جاتی ہے تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ سرخ جھنڈی سے تو کیا رکتی وہ تو کسی چلانے والے کے روکنے سے رکی ہے۔ سرخ جھنڈی صرف اصطلاحی علامت قرار دی گئی ہے۔ یہی مثال ہے اسباب اور ترتب اثر کی۔ اصل کام تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے یہ اسباب وعلامات محض عباد کی تسلی ودیگر حکمتوں کے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔

ایں سببہا در نظر ہا پردہا است در حقیقت فاعل ہر شے خدا است

کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

عارفین اس بات کو سمجھے اور حقیقت حال معلوم کر کے یوں گویا ہوئے۔

عشق من پیدا و معشوقم نہاں یار بیروں فتنہ او در جہاں

کہاں میں اور کہاں یہ نگہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آ ہوئے چیں بستہ اند

آب و خاک و باد و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

مثنوی میں اس یہودی بادشاہ کی حکایت ہے جو مسلمانوں کو بتوں کے سجدے پر مجبور کر کے آگ میں ڈلواتا تھا۔ یہاں تک کہ اخیر میں یہ قصہ ہوا کہ وہ آگ میں نہیں جلتے تھے۔ اس پر اس یہودی بادشاہ نے آگ سے مجنونانہ غصہ میں یہ خطاب کیا کہ تجھے کیا ہو گیا تو نہیں جلاتی تو آگ نہیں رہی۔ آگ نے باذن خالقہا جواب دیا۔

گفت آتش من ہمانم آتشم اندر آتا تو بہ بینی تا بشم

پھر اس گستاخی کا یہ انجام ہوا۔

بانگ آمد کار تو ایں جا رسید پائے دار اے سگ کہ قہر ما رسید

دیکھئے وہی آگ تھی ایک کو جلایا ایک کو نہ جلایا۔ اس سے یہ بات بہت وضاحت سے ثابت ہو گئی کہ اسباب بھی بااختیار حق ہیں۔ جب یہ ہے تو اسباب کے اعتماد پر خالق سے قطع نظر واستغناء کرنا بڑی غلطی ہے غرض امور اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ سب میں دعا کی حاجت ثابت ہوئی۔

امور اختیاریہ میں دعا کے ساتھ تدبیر بھی کرنی چاہیے اور مباشرت اسباب کا فائدہ

البتہ امور اختیاریہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تدبیر بھی کی جائے اور دعا بھی۔ یہ نہ ہو کہ بلا تدبیر صرف دعاء پر اکتفا کیا جائے۔ مثلاً کوئی شخص اولاد کی تمنا رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ اول نکاح کرے اور پھر دعا کرے اور بے نکاح کے اگر یونہی چاہے کہ اولاد

ہو جائے تو یہ اس کی نادانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کئے ہیں اور ان میں حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں۔ مطلق اسباب کا اس طور پر معطل چھوڑ نا افراط وغلو ہے اور ایک گونہ تعطیل ہے حکم الٰہیہ کی جو کہ سوئے ادب اور خلاف عبدیت ہے اور مباشرت اسباب میں اظہار عبدیت افتقار الی اللہ بھی ہے جو کہ اعظم مقاصد سے ہے اس لئے ایسے امور میں مباشرت اسباب اور دعا دونوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں اعتدال اور تعدیل ہے۔

دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو بشرط عدم عارض خاص ضرور اثر ہوتا ہے گو اسباب ناتمام ہی ہوں

بعض دفعہ اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنی رحمت وعنایات سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا و زاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں چنانچہ حدیث شریف میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک نیک بی بی نے تنور میں سوختہ جھونک کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اللھم ارزقنا تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا کہ تنور روٹیوں سے پر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں قوت یقینیہ زیادہ تھی' پورا یقین اس کی رزاقی پر تھا۔ چنانچہ اس کا ظہور ملا۔ اسباب ہوا اور یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ تھے۔ ابلیس کے یقین اور توقع اجابت دعا کی کیفیت دیکھئے کہ عین غضب الٰہی اجابت دعا کے لئے مانع نہیں ان رحمتی سبقت غضبی حالانکہ یہ سوال ایسا بعید ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی خلود اور دوام نہیں عنایت کیا گیا۔ ما جعلنا لبشر من قبلک الخلد مگر شیطان نے رحمت کی وسعت کے بھروسہ پر اس کی دعا کر دی اور حکم بھی ہو گیا۔ فانک من المنظرین الیٰ یوم الوقت المعلوم دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو ضرور اثر ہوتا ہے اور یقین ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

حکایت: چنانچہ حضرت علاء بن الحضرمی حضرت صدیق اکبر کی خلافت میں جب غزوہ مرتدین کے لئے بحرین پر گئے اور راستہ میں دریا پڑا تو ساتھیوں نے اس وجہ سے کہ کشتی تیار نہ تھی ٹھہرنے کو کہا فرمانے لگے خلیفہ کا حکم ہے جلدی پہنچنے کا اس لئے میں ٹھہر نہیں

سکتا اور یہ کہہ کر دعا کی کہ اے اللہ جس طرح تو نے اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کیا اسی طرح آج ہم کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے پار اتار دے۔ اور دعا کر کے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا پایاب ہو گیا اور سارا لشکر پار ہو گیا۔ اور مشہور حکایت ہے کہ ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل میں وعظ فرما رہے تھے کہ بسم اللہ پڑھ کر جو کام کریں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ ایک جاہل گنوار نے سنا اور کہا یہ ترکیب تو اچھی ہاتھ آئی۔ ہر روز کشتی کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ پس بسم اللہ پڑھ کر دریا سے پار اتر جایا کریں گے۔ چنانچہ مدتوں وہ اسی طرح سے آتا جاتا رہا۔ اتفاقاً ایک روز مولوی صاحب کی دعوت کی اور گھر لے جانے کے واسطے ان کو ساتھ لیا۔ راستے میں وہی دریا آ ملا۔ مولوی صاحب کشتی کے انتظار میں رکے اس نے کہا مولوی صاحب آیئے کھڑے کیوں رہ گئے مولوی صاحب بولے کہ کیسے آؤں۔ اس نے کہا کہ بسم اللہ پڑھ کر آ جایئے۔ میں تو ہمیشہ بسم اللہ ہی پڑھ کر اتر جاتا ہوں مولوی صاحب کی تو ہمت نہ ہوئی مگر اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اپنے ساتھ ان کو بھی پار اتار دیا۔ یہ قوت یقینیہ ہی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو آسان کر دیا۔ اسی وجہ سے بعض بزرگ تعویذ دیتے وقت کہہ دیتے ہیں کہ اس کو کھولنا مت ورنہ اثر نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کھولنے سے دیکھنے والا وہی معمولی کلمات سمجھ کر ضعیف الیقین ہو جاتا ہے اور اثر نہیں ہوتا۔ ان مثالوں سے ظاہر ہو گیا کہ تھوڑے بہت اسباب جمع کر کے اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس تھوڑے حیلہ میں یقین کی برکت سے سب کچھ دے دیتا ہے اور یہی معنیٰ معلوم ہوتے ہیں **واجملوا فی الطلب و توکلوا علیه** کہ تدبیر اور مباشرت اسباب میں اختصار ہو۔ **اجملوا** اس کی طرف اشارہ ہے اور نظر تقدیر پر ہو **وتوکلوا علیه** میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

روزی کا مدار محض تدبیر پر نہیں ہے اور اسکا ایک نہایت بدیہی ثبوت

اور درحقیقت اگر روزی صرف سعی و تدبیر پر ہی موقوف ہوتی تو اکثر آدمی حکمت و تدبیر سے غنا حاصل کر سکتے تھے۔ مگر غنا اور تمول دیکھا جاتا ہے کہ حکمت اور تدبیر اور سعی پر

موقوف نہیں بلکہ بکثرت دیکھا گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی جو دو آنے تین آنے کی مختصر مزدوری کیا کرتا تھا چند سال میں وہ لکھ پتی ہو گیا اگر غنا تدبیر اور سعی سے بلا تقدیر حاصل ہو سکتا ہے تو ہم ایک دوسرا آدمی منتخب کرتے ہیں جو وقت اور ہمت رائے و تدبیر میں اس سے زیادہ اور مدت بھی اس کے لئے دونی تجویز کرتے ہیں اور اس پہلے کو دو آنہ روزانہ ملتے تھے ہم اس کو چار آنہ یومیہ دیتے ہیں اور اس پہلے شخص کا تمام کارنامہ اس کو دیئے دیتے ہیں پھر ہم دیکھیں گے کہ اس پہلے کے برابر یا اس کے قریب مضاعف مدت میں کما سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ترقی کے اسباب اور تدابیر بہت قومیں جانتی ہیں مگر ترقی وہی قومیں کرتی ہیں کہ جن کی تدبیر اور سعی کے ساتھ تقدیر بھی مساعدت کرتی ہے ورنہ ان سے دگنی محنت کرتے ہیں اور افلاس نہیں جاتا۔

اسباب کے بھروسے دعا سے بے فکر نہ ہو جائے اور نہ توکل کر کے اسباب کو بالکل چھوڑ دے!

اصل یہ ہے کہ نہ تو نرے اسباب پر مدار ہے بلکہ تقدیر اور مشیت کی موافقت شرط ہے اور نہ یہ کہ کارخانہ اسباب بالکل معطل ہے کہ اس کو چھوڑ کر صرف دعا سے ہی کام لیا جائے۔ افراط اور تفریط دونوں کو چھوڑیں اس طرح سے کہ اسباب کو بھی اختیار کریں کیونکہ اس میں بھی اظہار ہے عبدیت اور افتقار الی اللہ کا اور اسباب کے بھروسہ دعا سے بھی غفلت نہ کی جائے۔ ہم میں بعضے جو متوکل ہوئے تو اس میں بھی غلو کرنے لگے ہیں ہماری بھی وہی مثال ہے ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس غلو کی بدولت بعض اوقات توکل نام ہوتا ہے واقعہ میں تعطل و کم ہمتی کا ۔

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی   طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

توکل کے شرائط و آداب

البتہ اگر اسباب معیشت میں اشتغال مضر اس کے دین کو یا مانع خدمت دین کو ہو اور یہ شخص اس کا اہل ہے اور توکل کی ہمت بھی ہے تو توکل بہتر ہے مثلاً اس کے متعلق تعلیم و

تربیت دینی ہوتو اس کوتوکل ودینی خدمت سے بہتر کوئی کام نہیں البتہ یہ ضروری بات ہے کہ توکل صرف اللہ پر ہو۔لوگوں کو ہدایا وتحف کے طرف نفس کا اشراف نہ ہو حدیث میں من غیر اشراف نفس کی قید آئی ہے ورنہ وہ توکل علی اللہ نہیں۔غرض لوگوں کے اموال کی تاک میں نہ بیٹھا رہے۔اس مقام پر ایک نکتہ سننے کے قابل ہے وہ یہ کہ بعض اوقات اہل کشف کو کشف سے آمد معلوم ہوکر مال کی طرف اشراف نفس پیدا ہو جاتا ہے یا بعض اوقات اموال مشتبہ کی حقیقت ظاہر ہوکر مال حلال ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔سو کشف نہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ عمل بالسنہ میں مخل نہیں ہوتا۔

حکایت: اشراف کے متعلق بلگرام کے ایک بزرگ عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان کے خاص شاگرد یا مریدان کے پاس آئے۔شیخ کے اضمحلال اور ناتوانی کو دیکھ کر انہوں نے جانچ لیا کہ آج فاقہ ہے۔اس لئے وہ اٹھے اور کچھ کھانا لے کر حاضر ہوئے اور پیش کیا۔شیخ نے فرمایا کہ گو یہ پہنچا ہے حاجت کے وقت لیکن مجھ کو اس کے قبول کرنے میں ایک عذر ہے اس واسطے کہ جس وقت تم میرے پاس سے اٹھ گئے تھے اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کھانا لائیں گے کیونکہ میرے دل کا تعلق اور اشراف نفس اس کیساتھ ہو گیا اور ایسی حالت میں ہدیہ لینا خلاف سنت ہے۔اس لئے اس کے لینے سے معذور ہوں ماشاءاللہ مرید یا شاگرد تھے سمجھدار کہ ذرا اصرار نہ کیا جیسا کہ بعض کم فہم لوگوں کی عادت ہے کہ بزرگوں سے جھک جھک کیا کرتے ہیں حالانکہ نہایت سوءادب ہے بلکہ فوراً کھانا لے کر اٹھ گئے اور آدھے راستے سے پھر لوٹ آئے اور وہی کھانا پھر پیش کیا اور عرض کیا کہ حضرت لیجئے اب تو میرے واپس چلے جانے سے اشراف نہیں رہا ہوگا۔اب قبول فرمالیجئے۔شیخ نے قبول فرمالیا اور ان کے اس نکتہ رسی اور ذہانت پر آفرین فرمائی۔آپ نے سنا بزرگان دین نے اشراف سے کس قدر تحرز کیا ہے۔غرض توکل کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اشراف نہ ہو اور بدون اس کے اگر توکل ہوتو محمود ہے اور جو توکل کے شرائط نہ ہوں تو تدبیر مسنون ہے۔ بالجملہ افراط وتفریط دونوں سے برکنار رہے اور اعتدال اختیار کرے۔

گر توکل میکنی درکار کن   کسب کن پس تکیہ برجبار کن

گفت پیغمبر بآواز بلند   برتوکل زانوئے اشتر بہ بند

اسباب کا اختیار کرنا توکل فرض کے خلاف نہیں اور اسباب اور توکل کے اجتماع کی توضیح ایک مثال سے

اور جان لینا چاہیے کہ تدبیر و اسباب کا اختیار کرنا بھی توکل فرض کے خلاف نہیں ہے اس کی بعینہ مثال تو وکیل کیسی سمجھ لینا چاہیے۔ مثلاً جب کوئی شخص کسی مقدمہ میں وکیل مقرر کرتا ہے تو کیا وکیل مقرر کرنے کے بعد یہ شخص نکما خالی بیٹھ جاتا ہے ہرگز نہیں بلکہ جتنی کوشش اس سے ہوسکتی ہے خود بھی کرتا ہے اور اس کو خلاف توکیل نہیں سمجھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ وکیل کے کرنے کا جو کام ہے وہ کرے گا جو مجھ سے کچھ ہوسکتا ہے مجھ کو کرنا چاہیے اسی طرح تدبیر کرنا اعتدال کے ساتھ توکل کیخلاف نہیں۔

توکل کے ساتھ ایک درجہ میں اسباب کی رعایت بھی ضروری ہے اور بعض ایسے امور پر تنبیہ جن سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے اور لوگ ان سے بے پروائی کرتے ہیں

بلکہ تدبیر ایسی چیز ہے کہ جو امور محض غیر اختیاری ہیں جن میں تدبیر کو اصلاً دخل نہیں محض دعا ہی پر ان کا مدار ہے سنن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی دعا کے ساتھ کچھ صورت تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک قصہ حدیث سے بیان کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح توکل اور دعا کو جمع فرمایا اور اس حدیث کے ضمن میں اور بھی فوائد ہیں۔ ایک صحابی جن کا نام مقداد ہے جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر مسافرانہ مقیم تھے اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں بتلا دی تھیں کہ ان کا دودھ نکال کر کچھ خود اور رفقاء پی لیا کرو اور کچھ ہمارے لئے رکھ دیا کرو۔ اور ان کا اسی طرح معمول تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور کو آنے میں دیر ہوئی

تو میں سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کہیں دعوت ہوگئی ہوگی یہ خیال کر کے آپ کا حصہ بھی پی گیا مگر اتفاق سے جب پی چکا اس وقت خیال آیا کہ شاید آپ نے کچھ نہ کھایا ہو اور بے چینی کا یہ حال ہوا کہ کروٹیں بدلتا ہوں اور نیند نہیں آتی۔ اس شش و پنج میں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی عادت شریفہ آنے کے وقت یہ تھی کہ جب تشریف لاتے اور دیکھتے کہ گھر والے لیٹے ہیں تو بہت آہستہ سے سلام کرتے اس طرح سے کہ اگر حاضرین جاگتے ہوں تو سن لیتے اور اگر سوتے ہوتے تو آنکھ نہ کھلتی اس طرح نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کا شب برات میں بقیع میں جانے کے لئے آہستہ اٹھنا اور آہستہ سے کواڑ کھولنا سب کام آہستہ سے کرنا تاکہ سونے والے کو تکلیف نہ ہو آیا ہے سو اسی طرح سلام بھی آہستہ سے فرماتے کہ اگر کوئی جاگتا ہو تو سن لے اور سوتا ہو تو اس کی نیند میں خلل نہ آئے اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض لوگ دوسرے آدمیوں کی تکلیف کا اصلاً خیال نہیں کرتے سوتے آدمیوں میں اٹھ کر سب کام بے تکلف زور زور سے کرتے ہیں اور اس سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے اسی طرح یہ امر بھی موجب ایذا ہے کہ مشغول کار آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جس سے اس کے ضروری کام میں حرج بھی ہوتا ہے اور پریشانی بھی۔

آج کل محض لفظ پرستی رہ گئی ہے آداب واخلاق کی حقیقت سے اہل علم بھی بے خبر ہیں

حضرات ہماری سبھی حالتیں بگڑ رہی ہیں ہر چیز میں افراط وتفریط ہو رہی ہے اور عوام کی کیا شکایت کریں انصاف یہ ہے کہ آداب کو بعض اہل علم تک نہیں جانتے محض لفظ پرستی رہ گئی ہے۔

مولوی گشتی و آگاہ نیتی   خود کجا و از کجا و کیستی

اس لفظ پرستی پر ایک مثال یاد آئی ایک شخص کا انتقال ہوا موت کے قریب بیٹے کو نصیحت کی کہ جو کوئی میری تعزیت کو آئے اس کو اونچی جگہ بٹھانا اور نرم اور شیریں باتیں کرنا اور بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا اور قیمتی کھانا کھلانا۔ اب صاحبزادے کی سنئے کہ ایک

صاحب ان کے والد کے دوست تعزیت کو آئے آپ نے فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو مچان پر بٹھا دو وہ آئے اور مجرموں کی طرح سے ان کو زبردستی پکڑ کر مچان پر بٹھا دیا۔ اب وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے نوکر کہتے ہیں کہ آقا کا یہی حکم ہے۔ اب آقا صاحب تشریف لائے تو اس انداز سے کہا کہ جاجم دری قالین میں لپٹے ہوئے ایک عجیب بغلول کیسی شکل بنے ہوئے ہیں آخر مہمان نے کچھ تعزیت میں کہا تو جواب میں فرماتے ہیں گڑ انہوں نے کچھ اور کہا تو جواب ملتا ہے روئی مہمان بیچارہ دنگ ہے غرض کھانے کا وقت آیا۔ گوشت گلا نہ تھا مہمان نے کہیں اس کا شکوہ کیا تو آپ تیز ہو کر کہتے ہیں واہ صاحب میں نے آپ کے لئے پچاس روپے کا کتا کاٹ ڈالا اور آپ کو پسند نہیں آیا۔ اب مہمان اور بھی پریشان ہے۔ آخر تحقیق کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ابا جان نے وصیت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد اگر کوئی شخص تعزیت کے واسطے تمہارے پاس آئے تو اس کو اونچی جگہ بٹھانا اس واسطے میں نے مچان پر بٹھایا کہ سب سے اونچی جگہ یہی تھی اور یہ کہا تھا کہ بھاری کپڑے پہن کر ان سے ملنا تو اس دری قالین سے بھاری کوئی کپڑا نہ تھا۔ تیسرے یہ کہا تھا کہ نرم اور میٹھی باتیں کرنا تو گڑ اور روئی سے زیادہ نرم اور میٹھی چیز مجھ کو نہ معلوم ہوئی اور وصیت کی تھی کہ قیمتی کھانا کھلانا تو اس کتے سے زیادہ کوئی جانور قیمتی ہمارے گھر نہ تھا۔ مہمان لعنت بھیج کر وہاں سے رخصت ہوا پس یہی حالت ہماری ہے کہ الفاظ یاد کر لئے ہیں اور حقیقت آداب واخلاق اعمال کی نہیں سمجھے۔ چنانچہ ہم نے اخلاق نام صرف چاپلوسی اور خوشامد اور میٹھی باتیں کرنے کا رکھ لیا ہے۔ سو حقیقت میں اخلاق کو نفاق سے بدل دیا ہے اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ ہم سے کسی کو کسی قسم کی ایذا ظاہری و باطنی حضور یا غیبت میں نہ پہنچے ہم نے یہ سمجھا کہ اخلاق ظاہرداری کا نام ہے گو اس سے ایذا ہی پہنچے اس کی کچھ پرواہ نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت اور رعایت کہ سلام بھی کرتے ہیں تو اس طرح سے کہ کوئی بے چین نہ ہو۔

رجوع بجانب سرخی (توکل کے ساتھ ایک درجہ میں اسباب کی بھی رعایت ضروری ہے)

غرض آنحضرتؐ عشاء کے بعد تشریف لائے اور حسب معمول سلام کر کے برتنوں کی

طرف چلے اور وہ صحابی جو دودھ پی کر لیٹ گئے تھے یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو اس میں دودھ نہ ملا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھوک لگی ہوئی تھی اور طعام کی حاجت تھی۔ آپ نے حسب معمول کچھ نفلیں پڑھیں اور یوں دعا فرمائی **اللهم اطعم من اطعمنی** دیکھئے یہ امر قابل غور ہے کہ اس دعا میں آپ نے توکل کے ساتھ اسباب کی کس لطیف طور پر رعایت فرمائی کہ یہ ظاہر کر دیا کہ کھانا اکثر اس طرح ملتا ہے کہ کوئی شخص ظاہر میں لے آئے ورنہ یہ بھی تو دعا فرما سکتے تھے کہ اے اللہ آسمان سے مائدہ یا رزق بھیج مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل اور تدبیر کو کس لطیف طریق پر جمع فرمایا جیسا مذکور ہوا۔ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ اس دعا کے سننے کے بعد وہ صحابی اٹھے چونکہ ان کو یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوئی ہوگی اس لئے گو بکریوں کا دودھ دوہ چکے تھے مگر پھر برتن لے کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بکریوں نے اس قدر دودھ دیا کہ برتن بھر گیا۔ اس برتن کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے غرض اس قصہ کے بیان سے یہ تھی کہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت کس طور پر فرمائی۔ پس معلوم ہوا کہ نہ دعا کے بھروسے اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا انہماک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے اعتدال اصل طریقہ نبویہ ہے اور یہ بدوں تحصیل تبحر و علوم دین کے حاصل ہونا مشکل ہے کوئی آسان کام نہیں جو ہر ایک دعویٰ کرنے لگے۔

بر کفے جام شریعت در کفے سندان عشق! ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

آنحضرت کے افعال سے تو یہاں تک اس اعتدال کا پتہ چلتا ہے کہ معجزات میں بھی جو کہ بالکل بطور خرق عادت ظہور میں آتے ہیں۔ ان میں بھی تدبیر اور اسباب کی ضرورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ حضرت جابرؓ کی دعوت کا قصہ جو جنگ احزاب میں خندق کھودنے کے وقت ظہور میں آیا اس کا شاہد ہے آنحضرت نے ان کو فرمایا تھا کہ ہانڈی چولہے سے مت اتارنا پھر اس میں آ کر لعاب دہن ملا دیا اور وہ چند آدمیوں کی خوراک لشکر کے لشکر کو کافی ہو گی۔ اس طرح حدیث میں اور بھی معجزات کے قصے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ خرق عادت میں تھوڑی سی رعایت اسباب کی کی ہے۔ مثلاً چولہے پر ہانڈی اور توے کا رکھا

رہنا اور ڈھک دینا وغیرہ کی صورت اسباب کو حجاب بنایا گیا ورنہ ایسے بھی کھانا بڑھ سکتا تھا۔

اسباب کے اندر منہمک ہونا سبب ہے ترک دعا کا

یہ آداب ہیں توکل اور تدبیر کے سید المرسلین سے ان کو سیکھنا چاہیے ان سے غافل رہنا بعض اوقات سبب ہو جاتا ہے انہماک فی الاسباب کا جو ایک سبب ہے ترک دعا جس کا حاصل ہے اسباب میں انہماک اور مسبب الاسباب پر نظر نہ رکھنا اور عقیدت کی کمزوری۔

یہ خیال کہ ہم دعا کے قابل نہیں ہم کیا دعا کریں درحقیقت شیطانی وسوسہ ہے اور بعض احوال باطنہ کا ایک دوسرے کے ساتھ مشتبہ ہونا اور ہماری عبادت کی حقیقت

اب ایک دوسرا سبب دعا نہ کرنے کا سنئے۔ وہ یہ کہ عقیدہ تو دعا کا ہے مگر خیال یہ ہو جاتا ہے کہ ہم دعا کے قابل نہیں ہم کیا دعا کریں اور درحقیقت یہ بھی شیطان کا ایک وسوسہ ہے۔ جو ان لوگوں کے دلوں میں تواضع کے رنگ میں ڈالا گیا ہے۔

درحقیقت بعض احوال باطنہ کچھ اس قسم کے ظاہراً مشتبہ معلوم ہوا کرتے ہیں کہ ان کو بھلا یا برا قرار دینے میں بڑی فہم و وقت نظر آ گاہی شرع شریف کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ آیت مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لایبغیان میں اہل لطائف اس طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں چنانچہ اس مقام پر دو امر میں التباس ہو جاتا ہے۔ ایک تو تواضع اور حیا اس کی علامت یہ ہے کہ گناہ کرتے ہوئے بھی اس کا خیال رہے اپنی عبدیت اور خدائے تعالیٰ سے شرم کرنا ملحوظ رہے ورنہ اگر صرف دعا کے وقت تواضع کے خیال سے دعا نہ کی جائے اور گناہ کرتے وقت بے باک اور نڈر ہو جائیں تو یہ درحقیقت تواضع نہیں ہے بلکہ کم ہمتی اور سستی ہے شیطان نے برکات دعا سے محروم کرنے کے واسطے ایک حیلہ سکھا دیا ہے لہٰذا اس کا وسوسہ بھی دل میں نہ لانا چاہیے اور دعا بڑے اہتمام سے کرنی چاہیے کہ وہ خالی نہیں جاتی اور کچھ نہ ہو یہ کیا کم ہے کہ آخرت کے لئے اس کا اجر جمع رہے گا۔ اور اہل حال کے جو اقوال ہیں مثلاً

؎ احب مناجات الحبیب باوجه ولکن لسان المذنبین کلیل

سو وہ غلبہ حال کے ہیں جس میں وہ معذور ہیں مگر قابل تقلید نہیں۔ الحاصل حیا و تواضع میں رضائے خداوندی پیش نظر ہوتی ہے اور یہ نہ ہو تو کم ہمتی ہے ان باتوں میں فرق کرنے کے واسطے بڑی ضرورت ہے علم شریعت کی اسی طرح اگر کوئی شخص **لاصلوٰۃ الا بحضور القلب** میں بھی یہی حیلہ جو دعا میں کیا ہے نکال لے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز چھوڑ بیٹھے گا۔ لہٰذا ایسے وساوس ناقابل اعتبار ہیں جو کچھ جیسا ہو سکے کرنا چاہیے بھلا برا جو کچھ بھی ہو خدا کے دروازے پر آنا چاہیے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست　　صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

ایسا شخص ایک غلطی تو یہ کرتا ہے کہ کم ہمتی سے عبادت اور طاعت اور دعا کی طرف نہیں آتا اور دوسری غلطی یہ کرتا ہے کہ اپنی نسبت گمان کرتا ہے کہ میں کسی وقت پاک صاف ہو کر حق عبادت ادا کر سکتا ہوں اور ایسے وقت عبادت کروں گا اور جو عبادت کر رہا ہوں گویا بزبان حال اس کا حق ادا کرنے کا مدعی ہے۔ اور یہ بھاری غلطی ہے کہ انسان کبھی پورا پاک نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ کے قابل بننا اور اس کا حق عبادت ادا کرنا کیا اس سے ممکن ہے ع **وجودک ذنب لا یقاس به ذنب** مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا ست　　کایں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک**
مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ اس معنی میں کہ ہم آپ کی ثنا نہیں کر سکتے فرماتے ہیں۔

خدا در انتظار حمد ما نیست　　محمدؐ چشم بر راہ ثنا نیست

خدا مدح آفریں مصطفٰی بس　　محمدؐ حامد حمد خدا بس

مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد　　بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد

محمدؐ از تو می خواہم خدارا　　الٰہی از تو حب مصطفٰی را

اسی پاک سمجھنے کے بارے میں خداتعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لاتـزکوا انفسکم الخ** ہم اور ہماری عبادت تو ایسی ہے کہ یہی غنیمت ہے کہ اس پر مواخذہ نہ ہو کیونکہ ہماری ثناء ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں۔

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست	ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست
ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ	وز گرانجانی و چالاکی ہمہ
من نگردم پاک از تسبیح شاں	پاک ہم ایشاں شوند درفشاں

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **انی لاستغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ** حالانکہ عصمت انبیاء ایک مسلم مسئلہ ہے۔ پھر یہ استغفار گویا اپنی حالت عبادت کو کمال خداوندی کے مقابلہ میں ناتمام دیکھ کر ہوتا تھا۔ یعنی اپنی عبادت وحمد وثنا کو غیر قابل قرب خداوندی سمجھ کر استغفار کر رہے ہیں یہ حالت ہے اکابر مقبولین کی بایں ہمہ علو مرتبہ بمقابلہ کمال حقوق خداوندی اپنے آپ کو محض ہیچ سمجھ رہے ہیں اور یہ نہیں کہ وہ واقع میں کمال ووصال سے خالی ہیں بلکہ۔

دل آرام در بر دل آرام جو	لب از تشنگی خشک برطرف جو
نگویم کہ برآب قادر نیند	کہ برساحل نیل مستسقی اند
داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار	گلچیں بہار تو نہ داماں گلہ دارد

جب خواص کی یہ کیفیت ہے تو ہم عوام کس شمار میں ہیں۔ ہم پر یہ ان کی عنایت ہے کہ باوجود بداعمال خراب حالی جاننے کے بعد پھر ہم کو اپنی طاعت اور حمد وثناء دعاء والتجا کی رخصت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ کرو اگر وہ باوجود علم کے ہم سے کھوٹے مال اور ناقص عبادت کو قبول کرتے ہیں تو پھر بندہ کو کسی قسم کا عذر پیش کرنا ہوگا۔ گو عذر نا قابلیت ہی کا ہو کس درجہ حماقت ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں	خاک برفرق قناعت بعد ازیں
ایں قبول ذکر تو از رحمت است	چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یہ دوسرا سبب تھا دعا کے نہ کرنے کا یعنی اپنے آپ کو دعاء کے قابل نہ سمجھنا جس کی اصلاح پوری طور سے کر دی گئی۔

اس خیال کی تردید کہ دعا قبول تو ہوتی ہی نہیں پھر دعا کیا کریں!

اب تیسرا سبب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ سمجھ کر دعا نہیں کرتے کہ قبول تو ہوتی ہی نہیں پھر دعا سے کیا فائدہ۔ سو خود یہی سمجھنا غلط ہے کہ خداوند تعالیٰ قبول نہیں کرتے۔ واقع میں موانع قبول دعا خود اپنی ذات میں ہوتے ہیں مثلاً دل سے خشوع و خضوع کے ساتھ جو روح ہے دعا کی دعا نہ کرنا محض زبان سے کہہ دینا حدیث میں ہے ان اللہ لایستجیب الدعاء من قلب لاہ سو یہ قصور اپنا ہے ورنہ وہ ذات تو سب پر مہربان اور اس کا فیض سب پر محیط ہے اپنے میں قابلیت نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہید سب پر　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے۔

توبہ برلب سبحہ برکف دل پراز ذوق گناہ　　معصیت را خندہ مے آید بر استغفار ما

اور مثلاً گناہ کی بات کی دعا کرنا حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے جب تک گناہ اور قطیعہ ''رحم کی دعا نہ ہو'' سو بعض دفعہ اکثر دعائیں گناہ کی ہوتی ہے اب ان کا قبول نہ کرنا ہی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے مثلاً موروثی زمین کے جھگڑے میں مالکانہ قبضہ کی دعا خود گناہ ہے۔ ایسے ہی بعض لوگ بزرگوں سے دعا کراتے ہیں کہ ہمارا لڑکا فلاں امتحان میں پاس ہو جائے اس کو ڈپٹی کلکٹری تحصیلداری مل جائے۔ سو یہ دعا ہی سرے سے ناجائز ہے کیونکہ حکومت کی اکثر ملازمتیں خلاف شرع ہیں۔

مشائخ کے اپنے بعض متعلقین کی ناجائز ملازمتیں نہ چھڑانے کی وجہ

اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بزرگوں کے متعلقین بعض ڈپٹی کلکٹری تحصیلداری وغیرہ حکومت کے عہدوں پر ہوتے ہیں سو اگر یہ نوکری ناجائز ہے تو وہ بزرگ ان کو کیوں نہیں روکتے جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ہیں تو یہ نوکریاں ناجائز مگر جو لوگ اس میں مبتلا ہیں اور ان

کے روزگار کی صورت بجز اس کے اور کچھ ہے نہیں اگر ان کو اس سے علیحدہ کر دیا جائے گا اور وہ نوکری چھوڑ دیں گے تو بوجہ عدم سبیل معاش وہ اس سے زیادہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں گے سو درحقیقت ان کو اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اور بہت سے بڑے بڑے گناہوں سے بچا کر ایک چھوٹے گناہ پر رکھا جاتا ہے۔

مشائخ اور علماء کو چاہیے کہ ناجائز مقدمات اور امور ممنوعہ کے واسطے دعا کرنے میں احتیاط کریں

اور ایسی دعا میں خود مشائخ اور علماء کو احتیاط کرنی چاہیے کہ ایسے ناجائز مقدمات اور امور ممنوعہ کے واسطے دعا نہ کیا کریں کیونکہ گناہ ہوگا اور صاحب حاجت تو صاحب الغرض مجنوں ہوتا ہے اس پر اعتبار اور بھروسہ نہیں چاہیے اور اگر ایسا ہی کسی کی دل شکنی وغیرہ کا خیال ہو تو یوں دعا کریں کہ یا الٰہی جس کا حق ہو اس کو دلوایئے باقی ایسی ناجائز دعا نہ اپنے لئے کرے نہ غیر کے لئے ناجائز امور کی دعا یا دعا کا غافل دل سے کرنا منجملہ ان موانع کے ہے جن کی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوتی۔

بعض مرتبہ حق تعالیٰ بندہ کی آرزو اس لئے پوری نہیں کرتے کہ وہ اس کے لئے بہتر نہیں ہوتی اور اس پر ایک حکایت

اور اگر موانع بھی مرتفع ہو جائیں تو بعض دفعہ اس وجہ سے قبول نہیں ہوتی کہ درحقیقت وہ دعا اس کے لئے بہتر نہیں ہوتی اور خلاف حکمت ہوتی ہے اس لئے ترحماً قبول نہیں فرماتے' اس کی ایسی ہی مثال فرض کیجئے جیسے بچہ انگارے کو اچھا سمجھ کر منہ میں ڈالنے لگے تو شفیق ماں باپ اس کو منع کرتے اور اس کے ہاتھ سے چھین لیتے ہیں۔

آنکس کہ تو نگرت نمے گرداند آں مصلحت تو از تو بہتر داند

حکایت: چنانچہ حکایت ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ دعا کرائی تھی

کہ کل کی بات معلوم ہو جایا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو نصیحت کی کہ اس کو جانے دے۔ اس نے نصیحت نہ مانی اور اصرار کیا۔ انہوں نے دعا کر دی اور وہ قبول ہو گئی اس کو معلوم ہوا کہ کل کو میرا گھوڑا مر جائے گا اس نے فوراً بازار میں جا کر بیچ ڈالا اور خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کل کو میں مر جاؤں گا بہت پریشان ہوا اور موسیٰ علیہ السلام سے جا کر عرض کیا کہ کیا کروں۔ وحی آئی کہ اس سے کہہ دو کہ تجھ کو اس کشف راز سے منع کیا گیا تھا تو نے نہ مانا۔ آخر تو نے دیکھا کہ اصل یہ ہے کہ تیرے گھر پر ایک بلا آنے والی ہے۔ ہم نے چاہا کہ جانور پر پڑ جائے تو نے اس کو جدا کر دیا ہم نے چاہا کہ غلام پر پڑ جائے تو نے اس کو بھی جدا کر دیا۔ اب تو ہی رہ گیا اگر تجھ کو پہلے سے آئندہ کی خبر نہ ہوا کرتی تو گھوڑا اور غلام کیوں بیچا جاتا اور تو معرض ہلاکت میں کیوں پڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی بعض مصلحت انسان نہیں سمجھتا تو اس معلوم ہونے پر اس کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔

ذاکرین کو چاہیے کہ اپنی خواہش سے کسی حالت کی تمنا اور طلب نہ کریں بلکہ جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالیٰ وارد فرمائیں اسی کو بہتر جانیں

یہاں سے ذاکرین شاغلین کے واسطے یہی نصیحت نکلتی ہے کہ جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالیٰ وارد فرمائیں اسی کو اپنے لئے بہتر جانیں اور اپنی خواہش سے کسی پسندیدہ حالت کی تمنا نہ کریں۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش   کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

مجاہدے سے کسی خاص حالت کا قصد ٹھیک نہیں۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری اند

ہر حالت میں جو اس کی طرف سے آئے وہی مناسب ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذوق وشوق وانبساط باعث عجب ہو جاتا ہے تو مربی حقیقی اس کا علاج اس طرح فرماتے ہیں کہ حزن وملال اور انقباض کو اس پر مسلط کر دیتے ہیں جس سے تواضع وانکسار پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اپنے لئے کوئی فکر اپنی خواہش دلپسند پر نہ کرنا چاہیے۔

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　　کفر است دریں مذہب خود بینی وخود رائی

بعض لوگ ذکر وشغل کرتے ہیں اور کسی خاص حالت اور ثمرہ کے حاصل نہ ہونے پر جس کو غلط فہمی سے انہوں نے مقصود سمجھ رکھا ہے۔ غمگین ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں اصل مقصود رضائے حق ہے جس کا طریق ذکر و طاعت ہے۔ جس کو یہ حاصل ہے سب کچھ حاصل ہے تو ان کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کو ذکر اور طاعت کی توفیق تو دی ہے

ع　بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

حقیقت میں طلب اور درد وغم بھی نعمت عظمٰی ہے۔ جس کا شکر کرنا چاہیے۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　دیں نیاز وسوز ودردت پیک ماست

حضرت حاجی صاحب امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب ارشاد

حکایت:　اگر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے کوئی خادم اس امر کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ خدا کا شکر کرو کہ اس نے اپنا نام لینے کی توفیق تو دی ہے اور اس موقعہ پر اکثر یہ شعر فرمایا کرتے ۔

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

اور فرمایا کرتے کہ جس طاعت کے بعد پھر اس طاعت کی توفیق ہو یہ طاعت سابقہ کے قبول کی علامت ہے تو قبول کتنی بڑی نعمت ہے۔

عشاق کی نظر کسی قسم کے قبول پر نہیں ہوتی

غرض قبول اسی میں منحصر نہیں کہ اس کی خواہش کے موافق ہو اور عشاق کی نظر تو کسی قسم کے قبول پر ہی نہیں ہوتی ان کی حالت تو یہ ہے ۔

از دعا نبود مراد عاشقاں　　　جز سخن گفتن بآں شیریں زباں

عاشقان خدا کو عشق میں مجنون سے تو کم نہ ہونا چاہیے کیا اس کے نام کی مشق کچھ کم دولت ہے جو اور چیزوں کی تمنا کی جاتی ہے ۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — دربیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم — می نمودے بہرکس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — مے نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم — خاطر خود را تسلی می دہم

کبھی قبولیت دعا کی اس طرح ہوتی ہے کہ اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے

اور علاوہ اس کے کہ وہ دعا ان کی مصلحت کے مناسب نہ ہو کبھی یہ بھی ہوتا ہے اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ سو تعجب ہے کہ مومن ذخیرہ آخرت پر قناعت نہ کرے متاع دنیا کے حاصل نہ ہونے پر افسوس کرے۔ مومن کامل تو نعمت اخرویہ کے روبرو دنیوی سلطنت تک کو گرد سمجھتے ہیں۔

حکایت: ایک دفعہ سلطان سنجر شاہ ملک نیمروز نے حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں ملک نیمروز آپ کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت نے یہ دو شعر تحریر فرمائے۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد — دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

دعاء رضا بالقضا کے خلاف نہیں

بعض لوگوں کو شاید یہ شبہ ہو کہ دعا رضا بالقضا کے خلاف ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ دعا اور رضا دونوں جمع ہو سکتے ہیں اس طور پر کہ عین دعا کے وقت یہ قصد ہے کہ اگر دعا کے موافق ہو گیا تو یہی قضا ہے اور اس پر راضی ہوں گے اور اگر اس کے خلاف ہوا تو وہی قضا ہے اس پر راضی ہوں گے۔ اور چونکہ دعا بھی مامور بہ ہے اس لئے وہ بھی داخل قضا ہے۔

مغلوب الحال خود معذور ہوتا ہے لیکن دوسرے کو اسکی تقلید جائز نہیں اور حضرت شاہ فخر دہلوی کی حکایت کی ایک عجیب توجیہ

اور اکثر بزرگوں سے غلبہ حال میں اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ جن کی نہ تقلید درست ہے نہ ان کی باتوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر انکار درست ہے وہ معذور ہیں۔

حکایت: چنانچہ شاہ فخر دہلویؒ ایک روز جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے تھے کہ سیڑھیوں پر ایک بڑھیا نے شربت کا پیالہ پیش کیا اور کہا بیٹا اس کو پی لو' شاہ صاحب روزے سے تھے روزے کا کچھ خیال نہ کیا اور شربت پی لیا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ فرمایا کہ روزے کی تلافی قضا سے ہوسکتی ہے مگر دل شکنی کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے میں نے پی لیا۔ ہمارے حاجی صاحب علیہ الرحمۃ نے اس کے متعلق فرمایا کہ شاہ صاحب پر اس وقت غلبہ حال میں قلب کی فضیلت منکشف اور روزے کی فضیلت مستور تھی اس واسطے ایسا کیا اگر کوئی صاحب تمکین اور اپنی حالت پر غالب ہوتا تو وہ یوں کرتا کہ نرمی سے اس کا جواب دے کر اس کو بھی راضی رکھتا اور روزہ بھی نہ توڑتا۔ مغلوب الحال کی تقلید کسی دوسرے کو جائز نہیں اس کے واسطے خود شریعت کے صاف اور کھلے ہوئے احکام موجود ہیں۔ جن میں کوئی کھٹکا نہیں۔ في طلعة الشمس ما يغنيک عن زحل

طریق سلوک عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے اور اس کا بیان کہ مسلمان دنیادار نہیں ہوتا

یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ طریق سلوک خواص کے لئے ہے۔ ہم دنیاداروں کے لئے نہیں' سو بات یہ ہے کہ سرے سے یہ تقسیم ہی صحیح نہیں کہ دنیاداروں کے لئے اور احکام اور دینداروں کے لئے اور احکام کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اور احکام شرعی سب کے ساتھ یکساں متعلق ہیں۔ بلکہ حقیقت میں مسلمان دنیادار ہوتا ہی نہیں کیونکہ دنیاداری حقیقت میں یہ ہے کہ حرام و حلال میں کچھ امتیاز نہ رہے۔

جس طرح سے بنے مال حاصل کرنے کو مقصود سمجھے۔ اگر کہیں دونوں غرضیں دین و دنیا کی جمع ہو جائیں تو دنیوی غرض کو مقدم رکھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ دین سے ہم کو کوئی غرض نہیں، کیونکہ شریعت کے احکام اس قدر دشوار ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کریں تو دنیا کی زندگی مشکل ہے سو ظاہر ہے کہ اسلام کے ساتھ ان خیالات کی گنجائش کہاں ہے کیونکہ اس سے تو باری تعالیٰ کی تکذیب کی نوبت پہنچتی ہے۔

یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر و لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا

شریعت کے اندر تنگی ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ ہم تکذیب نہیں کرتے مگر جب واقعات ہی روزمرہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ احکام شرعیہ پر چلنا بہت مشکل ہے تو ہمارا کیا قصور ہے اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ ایک مشقت تو ہوتی ہے ذات حکم میں مثلاً وہ حکم فی حد ذاتہ سخت اور دشوار ہو یہ اصرار و اغلال کہلاتے ہیں۔ امم سابقہ میں بعضے ایسے احکام تھے مگر اس امت میں اس قسم کے احکام نہیں رکھے گئے اور ایک مشقت یہ ہے کہ دراصل ذات حکم میں تو کوئی دشواری نہیں مگر ہم نے اپنے اغراض فاسدہ کی وجہ سے خود اپنی حالت ایسی بگاڑ لی اور قوم نے متفق ہو کر شریعت کے خلاف عادتیں اختیار کر لیں کہ وہ رسم عام ہو گئی اور ظاہر ہے کہ جب اس رسم عام کے خلاف کوئی حکم شرعی پر چلنا چاہے گا تو ضرور اس کو اس آسان کام اور بے ضرر حکم میں دشواری پیدا ہو گی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو دو پیسے کا نسخہ لکھ دے مگر مریض چونکہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے کہ جہاں کے لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس قسم کی ضروری اور مفید چیزوں کی رغبت نہیں رکھتے۔ وہ چیزیں وہاں نہیں آتیں اور نہیں مل سکتیں اس دو پیسے کے نسخہ کو وہاں نہیں پی سکتا اب فی نفسہ نسخہ گراں نہیں کمیاب نہیں مگر اس گاؤں والوں نے خود اپنا دستور بگاڑ رکھا ہے۔ اس واسطے وہاں نہیں مل سکتا۔ اس صورت میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ علاج بالکل آسان ہے مگر یہ قصور اس جگہ کے رہنے والوں کا ہے کہ ایسی معمولی چیزیں بھی نہیں مل سکتیں۔ ایسا ہی ہمارا حال

ہے کہ مجموعہ قوم نے مل کر ایسی حالت بگاڑ دی ہے کہ اب احکام شرعیہ کے بجا لانے میں دشواری پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً بہانہ کیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے بھلا اگر رشوت نہ لیں تو کام کیسے چلے اگر اپنے اخراجات اندازہ سے رکھے جائیں تو تنخواہ کیوں نہ کفالت کرے یا مثلاً عام طور پر بیر آم کی بیع پھل آنے سے پہلے کی جاتی ہے اور اگر ایک بچنا چاہے تو ضرور کسی قدر دقت پیش آتی ہے لیکن اگر سب اتفاق کر لیں کہ اس طرح سے کوئی خرید و فروخت نہ کرے تو دیکھیں پھر کیا دشواری پیش آتی ہے۔ دشواری حقیقی تو وہ ہے کہ اگر سب مل کر اس مذموم رسم اور طریق کو چھوڑنا چاہیں اور وہ چھوٹ جائے تو یہ دشوار نہیں آسان ہے یہ عارضی دشواری تو صرف اپنا طرز معاشرت بگاڑ دینے اور طریق عمل کو خراب کر دینے سے پیدا ہوگئی ہے سو یہ تنگی خود اپنے اوپر تنگی ڈال لینے سے ہوئی۔ تعجب ہے کہ خود اپنی تنگی کو نہ دیکھیں۔ شریعت پر تنگی کا الزام دیں جیسا کہ اس شیر نے جس کا قصہ مثنوی میں ہے خرگوش کے بہکانے سے اپنا عکس دیکھا اور اس کو دوسرا شیر سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کو کنویں میں کود پڑا۔ دراصل وہ خود اپنے اوپر حملہ کر رہا تھا۔ ایسے ہی ہم اپنے عیب کو آئینہ شریعت میں دیکھ رہے ہیں اور ناسمجھی سے اس کو شریعت کی تنگی بتارہے ہیں۔

سو یہ درحقیقت شریعت پر حملہ نہ ہوا بلکہ خود اپنی ذات پر حملہ کر رہے ہیں ۔

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد　　ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

ہماری تنگی کا یہی قصہ ہے۔

رشوت لینے کا عذر اور اس کا جواب

بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم ناجائز معاملات رشوت ستانی وغیرہ ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ لوگ جس کو ضرورت کہتے ہیں وہ ضرورت ہی نہیں بلکہ محض حظوظ نفسانیہ ہیں۔ جن کا نام ضرورت رکھ دیا ہے۔ مثلاً کسی کی نوکری کے پیسے میں اتنی گنجائش ہے کہ معمولی درمیانی قیمت کا کپڑے پہن سکتا ہے مگر بیش قیمت زرق برق کپڑے بنانے کی گنجائش نہیں۔ اس صورت میں عقلمند آدمی کبھی بھی ایسے گراں قدر کپڑوں کی

ضرورت تسلیم نہیں کر سکتا کہ جس ضرورت کے واسطے رشوت وغیرہ لینا پڑے اور اگر اس پر بھی کچھ تنگی ہو تو آخر صبر کی تعلیم اسی حالت کے لئے ہے اور جو مرتبہ صبر سے گزر جائے تو ایسے لوگوں کی امداد کے واسطے شریعت نے خاص قواعد مقرر کئے ہیں۔ ان سے منتفع ہونا چاہیے۔

ایک مثنوی شعر اہل دنیا کافران مطلق اند کا حل

غرض مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی دنیا کو دین پر ترجیح دینا جائز نہیں، پس اس اعتبار سے مسلمان دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف کفار ہی اہل دنیا ہیں جو دین کے مقابلہ میں نہ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اس شعر کا مطلب اس تقریر پر بالکل صاف ہو گیا۔

اہل دنیا کافران مطلق اند   روز و شب در چق چق و در بق بق اند

یعنی پہلے مصرعہ میں مبتدا موخر اور خبر مقدم ہے یعنی جو شخص کافران مطلق ہیں صرف وہی اہل دنیا ہیں۔ باقی مسلمان کی تو شان ہی اور ہے اللہ ولی الذین اٰمنوا اس میں عام مومنین کے لئے درجہ ولایت کا ثابت کیا گیا ہے۔ گو وہ ولایت عامہ ہی ہو کیونکہ خاصہ میں اتنا اور زیادہ ہے الذین اٰمنوا و کانوا یتقون

عود بجانب سرخی

(طریق سلوک عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے الخ)

اور اگر دنیا داری کے معنی عام لئے جائیں کہ طلب المال ولو علیٰ وجہ الحلال تو یہ منافی دین کے نہیں تا کہ ایسا شخص مخاطب احکام دینیہ کا نہ ہو کیونکہ خود حضرات انبیاء علیہم السلام سے کاروبار دنیوی اکل و شرب و نکاح و صنعت وغیرہ سبھی کچھ ثابت ہے۔ غرض دنیوی کاروبار دین کے منافی نہیں بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے میں ہوں۔

اہل اللہ کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور اسکا راز

راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارا ملک حقیقی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ سب سرکاری چپڑاسی ہیں۔ سرکاری حد سے زیادہ اس

سے کام لینا یا سرکاری اصول کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔اہل اللہ اسی بناء پر کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور عام لوگ کچھ اور سمجھ جاتے ہیں ۔

در نیا بد حال پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

سو وہ حضرات اس حیثیت سے اپنے نفس کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اس نفس کو سرکاری چیز سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہاتھ پاؤں دماغ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے ان کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب مستوجب عذاب بنیں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے کہ ان لنفسک علیک حقاً و ان لزوجک علیک حقاً و...... اگر اپنے دل و دماغ آنکھ کی حفاظت اور خدمت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولا کی سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کی عزت اور حرمت خدمت و حفاظت ہم پر بوجہ عبد و خادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔یہی معنی ہیں انما الاعمال بالنیات کے اور اس مرتبہ میں کہ ان اعضاء کو محبوب سے تعلق ہے کسی نے کہا ہے ۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور بعض کے کلام سے جو ان اشیاء کا اپنی طرف منسوب ہونا اور اس نسبت کے درجہ میں ایسے اقوال صادر ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے کہا گیا ہے ۔

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

تو یہ غلبہ ہے حال کا ورنہ اہل مقام کی تحقیق وہی ہے۔

جس چیز کو محبوب کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ بھی محبوب ہو جاتی ہے مع ایک مثال کے

حکایت: حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا جب آپ کو دولت وصول ہو چکی ہے تو اب کیوں تسبیح رکھتے ہیں آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ میاں جس کی بدولت ہم کو یہ دولت ملی کیا

اب اس رفیق کو چھوڑ دیں۔ ہرگز نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے گھوڑا پالتا ہے اس گھوڑے کا بول و براز بھی ضائع نہیں جاتا بلکہ میزان اعمال میں اس کے اندازہ کے موافق اعمال رکھے جاویں گے اور ایسی خسیس اشیاء کے حسنات میں شمار ہونے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص مصری خریدے تو جو تنکا مصری میں ہوگا وہ بھی مصری کے بھاؤ ملے گا۔

دعا کے اول و آخر درود شریف پڑھنے کا راز

اور دعا کے اول و آخر درود شریف پڑھنے کی بھی یہی حکمت ہے کہ درود شریف کو تو بہر حال اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کریں گے۔ اور یہ ان کے کرم سے بعید ہے کہ اول و آخر کو تو قبول کر لیں اور بیچ والی لپٹی ہوئی چیز کو رد کر دیں۔ اور درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خاص و مقبول و محبوب ہیں۔ آپ پر بے کسی کی درخواست کئے بھی رحمت فرماتے ہیں۔ سو جب کسی نے آپ پر رحمت کرنے کی درخواست کی تو یہ گویا اس شخص کی خیر خواہی ظاہر ہوئی۔ جس سے یہ بھی مقبول ہو گیا۔ اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہر عید پر اپنے لڑکے کو دیکھ کر انعام دیا کرتا ہے تو وہ دے ہی گا اگر کسی شخص نے اس کو انعام دینے کی نسبت کہہ بھی دیا تو وہ شخص اس کہنے کی وجہ سے اس کہنے والے پر بھی مہربان ہو جائے گا۔ اور یہ سمجھے گا کہ اس کو ہمارے لڑکے سے محبت ہے۔ اس لئے درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے اور طفیل میں یہ شخص بھی جب درود شریف قبول ہوگا تو دعا جو اس کے ساتھ ہے وہ بھی ضرور قبول ہوگی۔ ایسی ہی مثال ہے جیسے کھانڈ کے چنے کے اندر چنا ہوتا ہے اور اوپر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے اس مٹھائی کے سبب وہ چنے بھی مٹھائی کے حساب میں بکتے ہیں کیونکہ ان پر کھانڈ لپٹی ہوئی ہے۔ اس واسطے وہ اسی کے حکم میں ہو گئی اس طرح وہ دعا بھی گویا درود شریف کے حکم میں ہو گئی یا جیسے پتے مٹھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر ان کو کوئی واپس نہیں کرتا۔

نماز کے لئے جماعت کے مشروع ہونے کا راز اور اس کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

اور یہی راز و حکمت ہے نماز میں جماعت کی کیونکہ

ع بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں ان کی نماز غالباً قبول ہوگی اور بروں کی نماز بھی چونکہ نیکوں کے ساتھ ہے اس واسطے وہ بھی قبول ہو جائے گی اس کی ایک فقہی نظیر ہے وہ یہ کہ اگر متعدد اشیاء ایک سودے سے خریدی جائیں تو یا سب واپس کی جاتی ہیں یا سب رکھی جاتی ہیں۔ اور جو ہر ایک کا الگ الگ سودا ہوتا ہے تو معیب کو واپس کر سکتے ہیں پس اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے یہی معاملہ کرتے ہیں اس لئے جماعت مشروع فرمائی گئی کیونکہ یہ تو مستبعد ہے کہ سب کی نمازیں واپس فرمائیں۔ تو سب ہی کو قبول فرمالیں گے۔ البتہ اس میں ایک شبہ یہ رہ گیا کہ جماعت تو صرف فرضوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ تو اس جماعت کے ذریعہ سے قبول ہوگئی مگر سنت باقی رہ گئی اس کا جواب یہ ہے کہ تابع ہمیشہ اپنے متبوع کے حکم میں ہوا کرتا ہے سنتیں تابع ہیں فرضوں کی وہ بھی فرضوں کے ساتھ قبول ہو جائیں گی جیسے کوئی شخص گائے بھینس خریدے تو اس کے رسہ وغیرہ بھی گو وہ کیسے ہی بوسیدہ ہوں لے لیتا ہے غرض انضمام واقتران کے یہ فوائد ہیں۔

رجوع بجانب سرخی

(جس چیز کو محبوب کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ بھی محبوب ہو جاتی ہے الخ)

اسی طرح اگر کوئی شخص اعمال دنیویہ میں بھی نیت خیر رکھے گا تو اس کو ضرور ثواب ملے گا۔

حکایت: ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی اپنے مرید کے گھر گئے وہاں ان کے گھر روشندان دیکھا۔ پوچھا یہ کیوں رکھا ہے اس نے جواب دیا۔ روشنی کے واسطے انہوں نے فرمایا کہ روشنی تو بدوں نیت روشنی بھی آتی اگر اس کے رکھنے میں یہ نیت کر لیتا کہ اس میں سے اذان کی آواز آیا کرے گی۔ تو تجھے اس کا ثواب بھی ملتا رہتا۔ اور روشنی تو خود آ ہی جاتی مطلب یہ ہے کہ نیت صالحہ رکھنے سے سب اعمال دنیوی بھی قابل ثواب بن جاتے ہیں۔

رجوع بجانب (طریق سلوک عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے اور اس کا بیان کہ مسلمان دنیا دار نہیں ہوسکتا)

پس ایسی دنیا منافی دین نہیں پس ایسا دنیادار بھی دیندار ہی ہے اور پہلے معنی کہ دنیا دار کوئی

مسلمان نہیں تو سب مسلمان دیندار ہی ہوئے اور دو قسمیں بن کر کوئی فرق نہیں ہوا یہ دیندار دنیادار کا فرق بوجہ جہل بالا حکام کے ہم نے تراش لیا ہے۔ اور جب فرق نہ ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دستور العمل الگ الگ رکھا جائے یہ بات جدا رہی کہ حالت عذر و ضرورت میں کسی کے لئے کچھ تخفیف کردی جائے سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دستور العمل ہر ایک کے واسطے الگ الگ تجویز کیا جائے دستور العمل تو ایک ہی رہے گا مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے۔

یایها المزمل کی تفسیر اور اس کا بیان کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا اور اس کا راز

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **یایها المزمل قم الیل الا قلیلاً نصفه او انقص منه قلیلاً او زدعلیه الآیة** مزمل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چاہتے تھے کہ یہ کمبخت ایمان لے آئیں تا کہ نار جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹی تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیات الٰہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے تھے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ شدت غم و رنج و حزن و ملال کے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے **یایها المزمل** نداو خطاب میں فرمایا گیا تا کہ آنحضرت کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ہجوم اعداء اور ان کے طعن و تشنیع سے پریشان ہو رہا ہو اس وقت اس کا محبوب خاص ایسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اس کا تلبس ہے تو دیکھئے اس شخص کو کتنی تسلی ہوگی اور اس لفظ کی لذت اس کو کتنی معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی **یایها المزمل** کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت کے ہے نداد یکر آنحضرت کو تسکین دی گئی ہے اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض عارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح ارشاد فرمایا ہے کہ

فاصبر علیٰ مایقولون و سبح بحمد ربک اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اوپر کی مثال میں اس شخص کا محبوب اس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو ہم کو دیکھو دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں آؤ تم ہم سے باتیں کرو یہ کام کرو وہ کام کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسا تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا مگر امت میں اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات کے ہوتے ہیں اور اس مقام پر لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سابقاً معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال وحزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی وضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غم بوجہ غایت شفقت اور رحم کے تھا۔ آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہے لعلک باخع نفسک الخ ۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

مگر یہ تو ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال عرفان کے لوازم طبعی سے نہیں نکلتا اور یہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر کسی کو اذیت ومصیبت میں تکلیف جو لازمہ طبعی ہے محسوس نہ ہو تو صبر کیسے متحقق ہوگا کیونکہ صبر تو نام ہے ناگوار چیز پر ضبط نفس کرنے کا اور جب کسی کو کوئی چیز ناگوار ہی نہ معلوم ہو تو ضبط کیا کرے گا۔

غلبہ حال کا کمال نہ ہونا اور ایک مغلوب الحال کی حکایت اور اس کا ناقص ہونا مع دلیل اور مثال

البتہ غلبہ حال میں محسوس نہ ہونا اور بات ہے لیکن غلبہ حال خود کوئی کمال کی چیز نہیں۔ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ بیٹے کے مرنے کی خبر سنی تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور ادھر آنحضرت کا اپنے بیٹے ابراہیم پر آنسو بہانا ثابت ہے اور یہ فرمانا کہ انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون

اب اگر کسی ظاہر میں شخص کے سامنے یہ دونوں قصے بیان کر دیئے جائیں اور یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ یہ قصہ کس کا ہے اور وہ کس کا تو ظاہر بات ہے کہ یہ شخص پہلے بزرگ کو جنہوں نے قہقہہ لگایا زیادہ باکمال سمجھے گا حالانکہ یہ مسئلہ مسلم و بدیہی ہے کہ ولی کسی حال میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ اولیاء کے کمالات انبیاء کے کمالات سے مستفاد ہیں سودراصل ان دونوں قصوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس ولی کی نظر صرف حقوق حق پر تھی حقوق عباد واولاد کی اہمیت اس کے قلب سے مستور تھی اس واسطے حقوق عباد کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ جو ترحم کی وجہ سے غم پیدا ہوتا اور آنحضرت کی نظر دونوں حقوق پر تھی۔ حقوق حق پر بھی اور حقوق عباد پر بھی اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت سے تو صبر کیا اور جزع فزع نہیں کیا اور حقوق عباد یعنی ترحم علی الاولاد کی وجہ سے آنسو جاری ہوئے سخت دلی نہیں کی۔ **انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء** اس کی ایک مثال ہے مثلاً آئینہ کے دیکھنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو ضرورت سے خریداری وغیرہ کی صرف آئینہ کو دیکھتے ہیں اس کی موٹائی چوڑائی شفافیت پر ان کی نظر ہوتی ہے یہ مثال ہے محجوبین غافلین اہل صورت کی اور ایک وہ کہ صرف اس چیز کو دیکھتے ہیں جو کہ آئینہ میں منعکس ہوتی ہے اور آئینہ کو نہیں دیکھتے یہ مثال ہے غیر کاملین مغلوب الحال لوگوں کی یہ غلبہ حال سے مظہر کو نہیں دیکھتے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ایک وہ جو آئینہ اور صورت منعکسہ دونوں کو دیکھتے ہیں اور دونوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں اس کو جمع الجمع کہتے ہیں۔ یہ شان ہے انبیاء علیہم السلام اور عارفین کاملین کی کہ حقوق حق کی رعایت کے ساتھ حقوق عباد کی رعایت بھی ان کے نصب العین رہتی ہے یہ لوگ جامع ہیں۔

بر کفے جام شریعت در کفے سندان عشق   ہر ہوسنا کے ندا ند جام و سنداں باختن

ایسی باریکیوں کے سمجھنے کے واسطے بڑے فہم کی ضرورت ہے ورنہ ظاہر میں تو ناگوار نہ گزرنا زیادہ کمال معلوم ہوتا ہے بہ نسبت ناگوار گزرنے کے۔

بعض حالات کمال سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ان میں نقصان پوشیدہ ہوتا ہے

اسی طرح دوسری کیفیت وجدانیہ کے تفاضل میں اسی قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے کہ

بعض باتیں کمال سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان میں کوئی نقص خفی ہوتا ہے جیسے مبالغہ فی التواضع مفضی ہو جاتا ہے ناشکری کی طرف کیونکہ اس میں ایہام ہو جاتا ہے انکار نعمت کا۔ ایسا ہی بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ذکر وشغل کیا مگر کچھ نہیں ہوا اور سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا انکسار ہے حالانکہ علاوہ ناشکری نعمت ذکر کے اس میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذکر وشغل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کیا جاوے اور اس کے صلہ میں ان کو بڑا رتبہ دیا جاوے اور یہ کبر ہے۔

ذاکر کو ثمرات کا طالب نہ ہونا چاہیے

یہ نفس کے بڑے بڑے مکر ہیں ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ذکر خود ایک مستقل نعمت ہے۔

حکایت: ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے اگر کوئی خادم اس قسم کی شکایت کرتا تو آپ فرماتے کہ خود ذکر کی توفیق ہونا کیا تھوڑی نعمت ہے جو دوسرے ثمرات کی تمنا کرتے ہو اور اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یا بم اور ایا نیا بم جستجوئے مے کنم ۔۔۔ حاصل آید یا نیاید آرزوئے مے کنم

ع بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے الخ

کسی خادم نے حضرت سے بیان کیا تھا کہ میں نے اب کے چلہ کھینچا اور روزانہ سوا لاکھ اسم ذات پڑھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شاید حضرت مجھ سے ناراض ہیں کہ ثمرہ نہیں ملا۔ فرمایا کہ اگر میں ناراض ہوتا تو تمہیں سوا لاکھ پڑھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی اور ثمرات کے طالب ایک اور بہت بڑی غلطی میں ہیں کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ ثمرات اصل مقصود ہیں اور اعمال مقصود بالعرض اور یہ سخت غلطی ہے۔ اعمال خود مقصود بالذات ہیں اور اصل ثمرہ ان کا حصول رضا دخول جنت دیدار خداوندی ہے۔ افسوس کہ طالب ثمرات عشق میں مجنون سے بھی کم ہیں وہ تو لیلیٰ کے نام کی مشق کو بڑا مقصود سمجھ رہا ہے اور یہ لوگ دوسری چیزوں کی تلاش میں ہیں۔ کیا مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد ۔۔۔ در بیابان غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم! — مے نمودے بہرکس نامہ رقم

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر لیست ایں

گفت مشق نام لیلٰی مے کنم — خاطر خود را تسلی میدھم

ہمینم بسکہ داند ماہ ردیم — کہ من نیز از خریدار ان ادیم

کبھی ثمرات کا قصد مت کرو یہ تو ایک قسم کی مزدوری ہوئی جو کہ عشق و محبت کے سراسر خلاف ہے۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

حکایت: ایک عارف کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں ہوئی انہوں نے اس پر بھی عبادت کو نہ چھوڑا۔ بلکہ بدستور اسی طور پر پھر بھی عبادت کرتے رہے کسی نے ان سے کہا کہ جب تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے کیا اچھا جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی اور دروازہ ہوتا تو اس کو چھوڑ کر اس طرف چلے جاتے جب دوسرا دروازہ ہی نہیں پھر اور کہاں جائیں اور کیا چارہ کریں۔

توانی ازاں دل پر داختن — کہ دانی کے بے اوتواں ساختن

پس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا تمہارا اور کوئی نہیں تو خیر جیسی کچھ ہے وہی قبول ہے۔

قبول است گرچہ ہنر نیستت — کہ جز ماپنا ہے دگر نیستت

عبادت میں تو بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا بھی اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین ۔

از خدا غیر خدارا خواستن — ظن افروز نیست کلی کاستن

بدرود صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

میلان طبیعت کا معاصی کی طرف کمال کے منافی نہیں بشرطیکہ اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہو اور کاملین اور غیر کاملین کا فرق

اور اوپر جو بیان ہوا ہے کہ کامل لوازم بشریہ سے نہیں نکلتا اس سے ایک بات یہ بھی

ثابت ہوئی کہ طبیعت کا میلان انسانی خواہشوں کی طرف یہ ایک امر طبعی ہے۔ سو طبیعت کا میلان اگر کسی معصیت کی طرف ہو یہ منافی کمال نہیں۔ بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ میلان کو بھی مقبولیت وتقویٰ کے خلاف سمجھتے ہیں اور پھر جی میں کڑھتے ہیں اور قلب کی ساری توجہ اسی فکر وغم میں مصروف کردیتے ہیں۔ مثلاً پہلے کبھی کسی کے ساتھ تعشق تھا پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق توبہ کی عطا فرمائی اور وہ تعلق نہ رہا۔ اب اگر حصول کمال کے بعد کبھی طبیعت کی رغبت اس طرف معلوم ہونے لگے تو پریشان ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میلان بھی تقویٰ کے خلاف ہے خوب سمجھ لینا چاہیے کہ خود معصیت تو خلاف تقویٰ ہے میلان معصیت اس کیخلاف نہیں۔ میلان معصیت بعض اوقات بعد کمال کے بھی زائل نہیں ہوتا۔ اس کے زوال کی فکر فضول ہے۔ ہاں البتہ کاملیں اور دوسرے میں یہ فرق ہے کہ کاملین کا میلان غیر ثابت اور مغلوب ہوتا ہے تھوڑے سے تذکر سے زائل ہو جاتا ہے۔ جناب باری ارشاد فرماتے ہیں۔ اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون اور اس سے پہلے واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ اور متوسطین اہل سلوک کا میلان ذرا شدید ہوتا ہے دل کو بہت تنگی پیش آتی ہے اور مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے اور مجوبین کا میلان ان پر غالب ہو جاتا ہے اور حقیقت میں اگر میلان نہ رہے تو معاصی سے بچنا کوئی کمال ہی نہیں۔ اور میلان میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے یہی ہے کہ ملائکہ کو ان مدارج میں ترقی نہیں ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی کے متصور ہے اس لئے ان کے مدارج میں لسبیل لاتقف عند حد ترقی ہوتی رہتی ہے۔

معاصی کی طرف میلان کے منافی کمال نہ ہونے اور قرب عہد نبوت کی برکت پر حکایت

حکایت: حکیم ترمذی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ جوانی میں ان پر ایک عورت عاشق ہوگئی تھی اور ہر وقت ان کی تلاش اور جستجو میں رہتی آخرکار ایک دن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور

وہ باغ چاروں طرف سے چاردیواری کی وجہ سے بند تھا وہاں پہنچ کر اس نے اپنے مطلب کی درخواست کی یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے۔ اس قصے کے بعد ایک روز بڑھاپے کے زمانہ میں وسوسے کے طور پر خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب پورا کر دیتا اور پیچھے توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہو جاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　　گر خلالے از بہارش کم شود

اور اس پر قلق ہوا کہ جوانی میں تو میں اس گناہ سے اس کوشش سے بچا اور آج بڑھاپے میں یہ حال ہے اور یہ سمجھے کہ جو کچھ میں نے اعمال اشغال کئے ہیں وہ سب غارت اور اکارت گئے اس پر حکیم موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ اے حکیم کیوں غم کرتے ہو تمہارا درجہ وہی ہے اور جو کچھ تم نے کیا وہ ضائع نہیں ہوا اور اس وسوسہ کی یہ وجہ تھی کہ یہ زمانہ وسوسہ کا میرے زمانہ سے دور ہو گیا تھا اور اس گناہ سے بچنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ زمانہ میرے زمانہ سے بہت قریب تھا اور قرب عہد نبوی میں برکت ہے۔

حکایت: ایک بزرگ اسی وجہ سے باسی روٹی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب ہے اور تازی میں کسی قدر بعد آ گیا ہے۔ سبحان اللہ جب قرب عہد نبوت میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوت پر عمل کرنے میں کیسی برکت ہوگی۔

حکایت: ایک مولوی صاحب کہ طبیب بھی تھے مجھ سے اپنا قصہ بیان فرماتے تھے۔ کہ میں بیمار ہوا بخار تھا۔ ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر کار میں نے اس حدیث کے مطابق جس میں بخار کا علاج غسل سے آیا ہے نہر میں غسل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے اور بیماریاں تو ہوئیں مگر بخار کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند کہ بعض شراح اس علاج غسل کو غیر مادی بخار کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں مگر اہل عقیدت کے لئے سب اقسام کو عام ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسئلہ طبیہ ہے کہ دوا معین ہے فاعل نہیں سو اہل عقیدت کی طبیعت میں اس عمل سے قوت ہوگی اور وہ اپنی قوت سے فعل کرے گی حکیم ترمذی کے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ باوجود میلان کے کہ ان کو میلان معصیت کا ہوا ان کے کمال کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویائے صادقہ میں فرمائی۔

بعض طالبین کا یہ کوشش کرنا کہ ہم میں برے کام کی رغبت ہی پیدا نہ ہو بالکل غلط ہے اور اس کا علاج

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو شیوخ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بتا دیجئے کہ کبھی ہم میں برے کام کی رغبت ہی نہ پیدا ہو یہ بالکل غلطی ہے اور منشاء اس کا ناواقفی ہے انسان جب تک زندہ ہے لوازم بشریہ سے چھوٹ نہیں سکتا کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ یا خیال آ ہی جاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دیکھنے وغیرہ سے اس کی طرف میلان یا وسوسہ معلوم ہو تو اپنے گھر میں بیوی سے رفع حاجت کرے۔ ان الذی معها مثل الذی معها اس علاج سے وہ طبیعت کا میلان دور ہو جائے گا۔ اطباء نے بھی تعشق کا علاج تزوج لکھا ہے۔ اگر خاص معشوقہ سے ہو تو بہت ہی بہتر ہے ورنہ غیر جگہ بھی نکاح کرنے سے دوسرے کے تعشق میں کمی آ جاتی ہے۔ باقی تھوڑا بہت میلان تو تمام عمر رہتا ہے۔ اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہو تو اس کی فکر نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کی طرف توجہ کرنے سے اور اس فکر میں پڑنے سے وہ اور بڑھے گا اور تنگی پیش آوے گی۔ اور سالک اس جھگڑے میں پھنس کر مطالعہ محبوب سے غافل ہو جاوے گا اور انسان صرف مطالعہ محبوب ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو دوسری جانب اتنی توجہ ہی نہ کرنی چاہیے اگر ان باتوں کی طرف طبیعت کو نہ لگایا جائے گا یہ آپ سے آپ دور ہو جاوے گی۔ بالخصوص وسوسہ کا تو علاج یہی ہے کہ اس کی طرف خیال ہی نہ کرے اور اپنی توجہ ذکر کی طرف رکھے اس سے وہ وسوسہ خود بخود جاتا رہتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ کا آنا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے اس کی وجہ سے جو تنگی پیدا ہوتی ہے وہ موجب تصفیہ قلب ہو جاتی ہے اور اس کے دور کرنے میں جو مجاہدہ ہوتا ہے اس سے رفع درجات ہوتا ہے اور وہ جو بیان کیا گیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے اوپر بدگمانی نہ کرے اور ان باتوں کی طرف زیادہ التفات نہ کرے اور زیادہ موشگافی اور باریک بینی سے کرید کرید کر عیوب کو نہ دیکھے یہ خواص اہل طریق کے واسطے ہے کیونکہ وہ اس طرف لگ کر مطالعہ محبوب سے غافل ہو

جائیں گے باقی عوام کو بے فکر ہونا نہ چاہیے کیونکہ اگر وہ اپنے عیوب کی نگہداشت اس مستعدی سے نہ کریں گے تو اور بڑے بڑے گناہوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔

دستور العمل برائے سالک متضمن باصلاح اغلاط کہ سالک را اکثر ابتلاء بداں واقع میشود و تفسیر بعض آیات سورہ مزمل

ارشاد ہوتا ہے **یایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا الایہ** ہر چند کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہے اب ندائے **یایھا المزمل** کے بعد احکام کا بیان شروع ہوتا ہے۔ حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہیں۔ ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ۔ مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے دو قسم کا ہے موافق کے ساتھ اور مخالف کے ساتھ ان ہی تعلقات کے کچھ اعمال و آداب میں سے چند امر بیان ہوتے ہیں اول تعلق خالق کے ساتھ ہے اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ **قم اللیل الا قلیلاً** اس میں ایک تو قیام وطاعت کا ادب تعلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ اقتصاد (میانہ روی) کا ارشاد فرمایا ہے۔ ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر فرمایا گیا جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدہ کی پری کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کی یہی شان ہے کہ نہ بھوک لگے نہ کھانے سے گرانبار ہوں اور نیز رات کے وقت یکسوئی بھی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کے قیام کا حکم نہیں دیا کیونکہ اس میں سخت تعب تھا۔ بلکہ کچھ حصہ سونے کے لئے بھی رکھا گیا اور چونکہ ہر وقت اور ہر حالت اور ہر شخص کے لئے ایک مقدار معین نہیں ہوسکتی اس لئے وتخییر یہ سے نصف اور ثلث اور دو ثلث میں جو مفہوم ہے **او انقص منه قلیلاً اوزد علیه** کا جیسا دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی حدیث میں ہے **وشیء من الدلجة** اس اقتصاد میں ایک یہ بھی حکمت اور مصلحت ہے کہ توسط میں دوام ہوسکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں ہوسکتا۔ اور

پہلے یہ قیام لیل کہ مراد تہجد ہے فرض تھا۔ بعد اس کے فرضیت منسوخ ہو کر مسنونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت موکدہ ہونا ہے تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہو رہی ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف اخیر ہی شب میں ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے اس لئے انہوں نے چھوڑ رکھا ہے یاد رکھو کہ اگر اخیر شب میں نہ اٹھ سکے تو اول شب میں بھی وتر سے پہلے تہجد پڑھنا جائز ہے۔ بعضے یہ سمجھ رہے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہ چاہیے اور سونے سے تہجد جاتا رہتا ہے یہ لوگ اس لئے نہیں اٹھتے یہ بھی غلطی ہے۔ تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے غرض اہل سلوک کے لئے یہ عمل تہجد کا بھی ضروری ہے اور اگر کبھی قضا ہو جائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے۔ تہجد کی قضا دن میں کر لے اس آیت سے یہی مراد ہے۔ وھو الذی جعل اللیل و النھار خلفةً لمن اراد ان یذکر الخ بعض لوگوں کا اگر تہجد قضا ہو جائے تو حد سے زیادہ پریشان ہوتے ہیں اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا یہ کیا ہو گیا یاد رکھو اتنی پریشانی کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بجائے مطالعہ محبوب کے اپنے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو غیر میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔

ع ماضی و مستقبلت پردہ خدا ست

غرض نفس کو پریشانی میں زیادہ نہ مبتلا کیا جاوے اور تجربہ ہے کہ بعض اوقات آسانی رکھنے سے نفس خوشی سے کام دیتا ہے اور تنگی اور بوجھ ڈالنے سے پہلا کام بھی چھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے بہت تنگی نہ کرو کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔ بعض محققین کا قول ہے کہ ذاکر شاغل کو مرغن کھانا کھانا چاہیے۔ ورنہ ضعف ہو جائے گا اور کسی وقت بیکار ہو جائے گا خوب کھاؤ پیو اور اس سے کام لو البتہ یہ یاد رہے کہ کھانے پینے میں ایسی زیادتی نہ ہو کہ کسل ہو جائے یا بیماری ہو جائے اور بیمار ہو کر اور خرابی میں پڑ جائے اسی لئے کلوا واشربوا کے ساتھ و لاتسرفوا بھی فرمایا ہے۔

حکایت: حضرات اہل بیت میں سے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ ان سے کسی نصرانی حکیم نے پوچھا تھا کہ قرآن شریف کو کتاب جامع کہتے ہیں اس میں طب کہ ضروری چیز

ہے۔نہیں ہے فرمایا اصل طب موجود ہے۔ **کلوا واشربوا ولاتسرفوا** وہ دنگ رہ گیا۔

حکایت: بطور جملہ معترضہ کے یاد آ گیا کہ غالب جو کہ آزاد شاعر ہے اس نے اپنے مذاق پر یہ شعر کہا تھا۔

ہم توبہ جب کرینگے شراب و کباب سے — قرآن میں جو آیا **کلوا واشربوا** نہ ہو

کسی نے اس کا خوب جواب دیا۔

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب — جب آ گے **واشربوا** کے **ولاتسرفوا** نہ ہو

ایسا ہی روحانی تنگی قبض حزن وغیرہ سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس میں بھی تزکیہ نفس ہوا کرتا ہے۔ خاص کر وسوسہ کی طرف تو التفات بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ درپے ہونے سے اس میں اور بھی ترقی ہوتی ہے۔ محقق اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتا اور وسوسہ کے پیچھے پڑنے میں اس کے سوا اور بھی بہت خرابیاں ہیں۔ اسی ایک وسوسہ سے اور شاخیں نکلنی شروع ہوتی ہیں اور رہا غم سو وہ الگ ہے اور غم کی وجہ سے اصل ذکر و شغل کا فوت ہونا یہ الگ ہے۔ ایسا ہی استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکر و استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جائے صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرے ہر گناہ کا نام ضروری نہیں۔

حدیث میں ہے **وما انت اعلم به** اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے اس میں سب گناہ آ گئے اگرچہ یاد نہ آئیں کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعہ محبوب سے غافل ہونا ہے۔ البتہ جو خود یاد آ جائے اس سے بالخصوص بھی توبہ کر لے۔

حکایت: ایک شخص کا ذکر ہے کہ رمی جمار کے وقت وہاں جوتیاں مار رہا تھا اور ایک ایک گناہ گن گن کر شیطان کو گالیاں دیتا تھا اور مارتا تھا۔ سو یہ لغو ہے ہر ایک گناہ کا نام لینا اور تلاش اور سوچ میں عمر عزیز کو جو دراصل مطالعہ محبوب کے لئے تھی اس سوچ بچار میں کھونا نہ چاہیے ۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست — ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

اہل سلوک کو بالخصوص اس کا خیال بہت ضروری ہے کہ مطالعہ محبوب سے غفلت نہ ہو واقع میں عارف ہی کی نظر ان امور تک پہنچتی ہے۔

حکایت: حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی خادم نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اب کی بیماری کی وجہ سے مدت تک حرم میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا۔ آپ نے خواص سے فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو اس پر کبھی افسوس نہ کرتا۔ کیونکہ مقصود قرب حق ہے اور اس کے لئے جس طرح نماز حرم ایک طریق ہے اسی طرح اس کے لئے مرض بھی ایک طریق ہے۔ تو بندہ کا کیا منصب ہے کہ اپنے لئے خود ایک طریق معین کرے یہ مربی کے اختیار میں ہے طبیب کی تجویز مریض کی تجویز سے ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے۔

بدردو صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

یہ سب بیان تھا قیام لیل اور اس کے آداب کا اقتصاد کے ساتھ اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے۔ ورتل القرآن ترتیلاً ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا۔

صحابہ کے زمانہ میں تلاوت اور تکثیر نوافل بھی حصول نسبت کے لئے کافی تھے بعد میں ذکر کے اندر قیودات خاصہ تغیر زمانہ کی وجہ سے علاجاً ایجاد کی گئیں

صحابہ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آج کل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کونسا طریقہ آپ کے موافق ہے اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ صحابہؓ کے قلوب بہ برکت صحبت نبوی اس قابل تھے کہ ان کو اور قیود کی جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھی۔ ان کے قلوب میں صحبت نبوی کے فیض سے خلوص پیدا ہو چکا تھا وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے۔ ان کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدون اہتمام کے پیدا نہیں ہوسکتا اس لئے صوفیہ کرام نے کہ اپنے

فن کے مجتہد گزرے ہیں اذکار و اشغال خاصہ اور ان کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بہ تکرار ورد کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ضرب و جہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے تو اس کی تاثیر نفس و قلب میں اوقع واثبت ہوتی ہے اور رقت و سوز پیدا ہو کر موجب محبت ہو جاتا ہے اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ' الدین و امرت ان اعبدالخ الآیات پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے بطور معالجہ تجویز فرمائے ہیں اور اصل مقصود ہی اخلاص ہے۔ پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا ہو سکتا ہو تو صوفیہ کرام ایسے شخص کے لئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے پس اب معلوم ہو گیا کہ یہ تمام قیود اصلاح و تقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں کوئی شرعی امر قربت مقصودہ نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔

رجوع بجانب سرخی (دستور العمل برائے سالک الخ)

الحاصل یہ دوسرا دستور العمل تھا اہل سلوک کے واسطے یعنی تلاوت قرآن اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً اس کو ماقبل سے اس طور پر ربط ہے کہ مراد قولاً ثقیلاً سے وحی ہے جو کہ ثقیل تھی اور نماز اور تلاوت کلام مجید کی مزاولت سے قوت احتمال اثقال وحی کی پیدا ہو گی۔ اس لئے پہلے نماز اور تلاوت کا حکم فرمایا پھر انا سنلقی میں وحی کا وعدہ کیا اب اس کی تحقیق کہ نزول وحی کے وقت ثقل معلوم ہونے کا کیا سبب تھا سو یہ امر عقول متوسط سے خارج ہے باقی روایات سے ثقل ہونا ثابت ہے چنانچہ نزول وحی کے وقت اونٹنی کا بیٹھ جانا اور ایک صحابی کا یہ قول کہ نزول وحی کے وقت (جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران ان کی ران پر تھی) یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری ران بیٹھی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت شدت سرما میں بھی نزول وحی کے وقت پسینہ آجاتا اس ثقل کے آثار روایات میں وارد ہیں۔ اور ان آیات میں کہ الم نشرح لک صدرک ووضعنا

عنک وزرک الذی انقض ظھرک یہ شرح صدر اور وضع وزر جو موجب نقص ظہر تھا میرے نزدیک اسی طرف اشارہ ہے اور آیت لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبل اس معنی میں بھی بہت ہی صاف ہے اور نماز اور تلاوت اور ذکر کی مزاولت اور کثرت سے قوت کا پیدا ہونا اور ثقل وحی کے احتمال کی طاقت پیدا ہو جانا اس طور پر ہے کہ چونکہ ذکر وغیرہ سے واردات اور فیوض غیبیہ عملی و علمی قلب پر فائض ہوتے ہیں ان کے ورود سے قلب میں بتدریج قوت پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے شدت و ثقل کا مقابلہ اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے چنانچہ اہل تلوین کا اضطراب اور اہل تمکین کا استقلال اسی وجہ سے ہے کہ پہلے قلب میں قوت تحمل کی نہ تھی پھر ذکر کی کثرت سے احتمال اثقال کی طاقت آ گئی اور اس شعر میں ان ہی واردات میں سے بعض کا ذکر ہے ۔

بینی اندر خود علوم انبیا ــــــ بے کتاب و بے معید و اوستا

اور یہ حالات واردہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں کبھی ذوق وشوق وسرور وانبساط ہوتا ہے کبھی حزن وانقباض ہوتا ہے۔ بسط کے الگ فائدے ہیں اور قبض کے علیحدہ مصالح اور سب محمود ہیں کیونکہ قبض میں بھی تزکیہ نفس واصلاح عجب ہوتی ہے ۔

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں ــــــ تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبض آید ترا اے راہرو ــــــ آں صلاح تست آئس دل مشو

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ و اقوم قیلاً اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت کیونکہ شور وشغب سے سکون ہوتا ہے اور افعال معاش کا بھی وقت نہیں ہوتا اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اور اس لئے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل کو اس سے بہت تاثیر ہوتی ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا اثر قوی ہوتا ہے تو گویا اس آیت میں ان ناشئۃ اللیل الخ مضمون آیت ماقبل قم اللیل و رتل القرآن الخ کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ ان اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا قیام لیل وترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا۔

حضور قلب کا نہایت آسان طریقہ

اور حضور قلب کے متعلق ایک طریقہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ مبتدی ہر ہر لفظ بر بتکلف مستقل ارادہ کرے اسی طرح الفاظ پر توجہ رہنے سے حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے اور بعد چندے ملکہ ہو جاتا ہے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اور منتہی کو ملاحظہ ذات سے حضور میسر ہو سکتا ہے ابتداء میں یہ مشکل ہے کیونکہ مبتدی کو غائب کا تصور جمتا نہیں اور منتہی ذات کا ملاحظہ رکھ سکتا ہے۔

رجوع بجانب سرخی (دستور العمل برائے سالک)

اس کے بعد فرماتے ہیں ان لک فی النھار سبحاً طویلاً پہلے بطور حکمت کے بیان ہوا کہ تہجد اور قرآن مجید پڑھا جائے کیونکہ اس وقت اس کا اثر زیادہ ہوگا۔ اب اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور کام بھی رہتے ہیں ان کی وجہ سے خاص قسم کی توجہ الی اللہ تام نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ وقت شب کا کہ مصروفیت سے خالی ہے تجویز کیا گیا اور وہ کاروبار یہ ہیں مثلاً تبلیغ دین، تربیت، خلائق، حوائج ضروریہ لازمیہ بشریت ہر چند کہ تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے لہٰذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہو سکتی۔ جیسی خاص خلوت میں ہو سکتی ہے۔

خلق کی طرف مشغولی منافی کمال کے نہیں اور اس کا بیان کہ صاحب کمال کی بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی اور اسکی حکمتیں

یہاں سے بھی اس اوپر والی بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان باوجود کمال کے بھی لوازم بشریہ سے بالکل چھوٹ نہیں سکتا۔ دیکھئے آیت صاف دلالت کر رہی ہے نہار کا سبح طویل یکسوئی سے ایک درجہ میں آپ کو بھی مانع ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ آپ کے تمام احوال کامل

ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خلق کی طرف مشغول ہونا منافی کمال نہیں۔ پس صاحب کمال پر بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی۔

حکایت: حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت حنظلہؓ کا قصہ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہؓ نے اپنے کو اس بناء پر منافق کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے کچھ اور اس پر حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ یہ حالت تو ہماری بھی ہے آخر یہ قصہ حضور میں پہنچا اس پر آنحضرت نے فرمایا ولکن یا حنظلة ساعةً و ساعةً ایک گھڑی کیسی ایک گھڑی کیسی درحقیقت اگر ہر وقت وہی حالت تجلی کی رہے خود جسمانی ترکیب بھی ٹھیک نہ رہے اول تو تعطل ہوگا کیونکہ حالت علیہ میں انتظام تغذیہ وغیرہ کا ممکن نہیں پھر اس سے فنا کی نوبت آ جائے گی۔ ولنعم ما قیل

چو سلطاں عزت علم برکشد　　جہاں سر بجیب عدم درشکد

دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ ذوق ولذت جب ہی آتی ہے کہ اس حالت میں دوام نہ ہو ورنہ دوام سے غیر حادث ہو جائے گی اور لذت جو بہ سبب حدوث کے معلوم ہوتی نہ رہے گی کہ کل جدید لذیذ اس کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ غلبہ استغراق میں قصد نہ رہے گا اور بلا قصد کے اعمال کا اجر نہیں اور بلا اعمال قرب نہیں ملتا اور اعمال ہی دنیا میں مقصود ہیں۔ دنیا میں انہیں اعمال کے واسطے بھیجا گیا ہے ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے روح کو خود ایسی حالتیں حاصل تھیں اور حضور دائم میسر تھا مگر اعمال نہ تھے۔ ان کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا لہٰذا اعمال اور ان کا اجر امر مہتم بالشان ٹھہرا۔ اس لئے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ استغراق میں ترقی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں سے معلوم ہو گیا کہ تجلی میں جیسی حکمتیں ہیں ویسی ہی استتار میں بھی ہیں۔

کامل کو بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیے

اور یہاں ایک فائدہ قابل غور معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ تبلیغ دین و تعلیم احکام متعدی نفع ہے اور وہ نفع لازمی سے بڑھ کر ہے اس لئے منتہی کو اس کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے مگر

بایں ہمہ یہ ارشاد ہے کہ چونکہ آپ کو دن میں بہت کام رہتے ہیں رات کو تہجد اور قرآن پڑھا کیجئے۔ اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ فاذا فرغت فانصب والیٰ ربک فارغب اس سے یہ ثابت ہوا کہ کامل کو اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے اور بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیے ورنہ خود اس کا وہ حال رہے گا نہ دوسروں کو اس سے کامل نفع پہنچے گا کیونکہ بدون خود کئے ہوئے تعلیم میں برکت نہیں ہوتی یہی معنی ہیں قول مشہور من لاورد له لاوارد له کے البتہ یہ غلطی ہے کہ منتہی قطع تعلق کر کے دوام خلوت اختیار کر لے۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ ودلق نیست

سالک بلا اجازت شیخ خود اپنے کو قابل ارشاد نہ سمجھے اور نہ ذکر و شغل اس نیت سے کرے

لیکن خود اپنے کو قابل ارشاد نہ سمجھنے لگے۔ البتہ جب شیخ اجازت دے دے تو امتثالاً اس کام کو بھی شروع کر دے اور پہلے سے اس کی نیت کرنا سخت مضر ہے۔ اور اس نیت کے ساتھ کامیابی مشکل ہے وجہ یہ کہ یہ نیت بڑا بننے کا شعبہ ہے۔

رجوع بجانب سرخی

(خلق کی طرف مشغولی منافی کمال کے نہیں الخ)

اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشتغال بالخلق اس کو یاد حق سے مانع ہوگا سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں کیونکہ منتہی کی بہ سبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یاد حق سے مانع نہیں ہوتا۔ اور نیز خلق کے ساتھ اس کا مشغول ہونا بھی بامر حق ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل وعلا ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اشتغال خود حقوق خالق سے ہے۔

تربیت اور ارشاد کے وقت بھی خدا تعالیٰ سے غفلت نہ ہونی چاہیے

اور اس آیت میں سبحا طویلاً بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے کہ نصح عام تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیے۔ چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے حقوق کے بیان سے پہلے قم اللیل میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے۔ اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی واذکر سم ربک فرمایا گیا ہے تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا اول آخر دونوں جگہ یاد دلایا گیا ہے۔

مبتدی کو ذکر اور تلاوت کے وقت کیا تصور رکھنا چاہیے

اور واذکر سم ربک میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہو گیا اور اختلاف امتی رحمۃ کا ظہور ہو گیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادت اسم کا قول تو موافق حالت منتہی کے ہے اور عدم زیادت کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے کیونکہ مبتدی کو خود مسمی اور مذکور کا تصور کم جمتا ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصور ہو جائے۔ برخلاف منتہی کے اس کو ملاحظہ ذات بلاواسطہ سہل ہے۔ اور حدیث ان تعبداللہ کانک تراہ میں مشہور توجیہ پر منتہی کا طریق اور اس کی حالت کا بیان ہے اور عام لوگوں کے لئے حضور کا ایک سہل اور مفید طریق خدا کے فضل سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کرے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اس کو سنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسر ہو جاتا ہے۔

رجوع بجانب سرخی (دستور العمل برائے سالک الخ) اور غیر اللہ سے قطع تعلق کرنے کے معنی اور قبض کے فوائد

اس کے بعد ارشاد ہے وتبتل الیہ تبتیلاً اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبتل کو صرف

واذکر اسم کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تبتل سے اشارہ ہوگا۔ مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کے ساتھ مراقبہ ہو اور ایک یہ کہ تبتل کو مستقل حکم کہا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور حبی سے مغلوب ہو جائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک وقت میں دو کام متضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے تعلق کا ہے اور دوسرا غیر اللہ کے تعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا پس یہی معنی ہے قطع تعلق کے نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے۔

تعلق حجاب ست و بے حاصلی چو پیوند ہا بگسلی و اصلی!

البتہ اختلاف میں افراط کرنا مضر ہے اس کے آگے فرماتے ہیں کہ رب المشرق والمغرب لاالٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلاً مطلب یہ کہ اللہ پر توکل کرو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سلوک کے لئے توکل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ان کا معمول ہونا چاہیے نکتہ اس توکل کی تعلیم میں یہ ہے کہ اعمال مذکورہ بالا کے اختیار کرنے کے بعد حالت میں تغیر و تبدل قبض و بسط شروع ہوگا اس میں ضرورت توکل کی ہوگی اس لئے فرماتے ہیں کہ آخر وہ مشرق و مغرب کا رب ہے اس لئے اس نے جو حالت تم پر وارد کی ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہو گی۔ اور ثابت ہے کہ اکثر قبض میں تصفیہ و تزکیہ خوب ہوتا ہے اس لئے تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہیے اور خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے اس میں کچھ مصلحت رکھی ہوگی اور مشرق و مغرب کا ذکر قبض و بسط کی حالت کے کس قدر مناسب ہے۔ مشرق تو حالت بسط کے مناسب ہے کہ اس میں ظہور ہوتا ہے واردات کا اور مغرب مناسب ہے حالت قبض کے پس مشرق و مغرب کا نمونہ باطن انسان میں بھی پایا گیا ولنعم ما قیل

آسمانہاست در ولایت جاں کارفرمائے آسماں جہاں
دررہ روح پست و بالا ہاست کوہ ہائے بلند و بالا ہاست

اور جس طرح مغرب میں آفتاب مستور ہوتا ہے معدوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح قبض میں کیفیات سلب نہیں ہوتیں بلکہ مستور ہو جاتی ہیں اور پھر بسط میں گویا طلوع ہو جاتی ہیں۔

حاصل کل کا یہ ہوا اہل سلوک کے لئے یہاں چند ضروری معمول بیان کئے گئے قیام لیل یعنی تہجد تلاوت قرآن، تبلیغ دین ذکر و تبتل توکل اور چونکہ تعلق خلق کی دو قسم ہیں ایک موافقین کے ساتھ اس کا بیان اشارۃً ان لک فی النھار سبحاً طویلاً میں ہوا ہے جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت کا ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط و تفریط ہو جاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں۔ واصبر علیٰ مایقولون واھجر ھم ھجراً جمیلاً مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہئے اچھے طور پر کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے ان کی آتش عناد اور بھڑک اٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب میں تنگی نہ ہو پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس کی تسہیل کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کی تسلی بھی فرمائی جاتی ہے کہ وذرنی والمکذبین اولی النعمۃ و مھلھم قلیلاً یعنی مخالفین کے معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیجئے ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں اس لئے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے۔ کیونکہ جب اپنے سے بالا دست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کی جائے۔ خدا تعالیٰ کی اس سنت کے موافق مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسائی ہو جاتی ہے۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — باوردکشان ہر کہ در افتاد بر افتاد

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد — تا دل صاحبدلے نامد بدرد

اہل تصوف کے لباس خاص اختیار کرنے کی وجہ

اور یایھا المزمل میں دو لطیفے بھی معلوم ہوئے ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن والم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس سے قلب منتشر نہ ہو اور جمعیت کے

ساتھ ذکر میں لگا رہے۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ المــزمل کے معنی عرف عام میں کمبل اوڑھنا بھی ہے تو یایھا المزمل میں اشارہ ہوگا لقب یایھاالصوفی کی طرف کیونکہ لفظ صوفی میں گو اختلاف ہے مگر ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کمبل وغیرہ مراد لیا جائے پس صوفی اور مزمل متقارب المعنی ہوئے اور اہل تصوف نے یہ لباس اس لئے اختیار کیا تھا کہ جلدی پھٹے نہیں۔ جلدی میلا نہ ہو اور بار بار دھونا نہ پڑے۔ اور بعض اہل شفقت اس خاص وجہ سے بھی یہ شعار رکھتے تھے کہ مستور ہونے کی حالت میں بعض لوگ ان کو ایذا پہنچا کر مبتلائے وبال ہو جاتے تھے اس لئے انہوں نے ایک علامت مقرر کی جیسے آیت ذٰلک ادنیٰ ان تعرفن فلا یوذین اس کی نظیر ہے پس یہ حکمتیں تھیں اس لباس میں اور اب تو محض ریا وسمعہ کی غرض سے پہنتے ہیں جو بالکل اس شعر کا مصداق ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد   اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

اس لئے یہ اب قابل ترک ہو گیا۔

معاصی خواہ کبائر ہوں یا صغائر سب ہی سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اصل حقیقت کے اعتبار سے ہر گناہ کبیرہ ہی ہے مع دلیل اور مثال

ہر گناہ گو وہ صغیرہ ہو اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے کیونکہ حقیقت گناہ کی نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی اور ظاہر ہے کہ نافرمانی گو کسی قسم کی ہو زیادہ ہی بری ہے اور گناہوں کے درجات میں جو چھوٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امر اضافی ہے کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے اور دوسرا اس سے چھوٹا ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں۔ کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیے اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آسمان دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے مگر درحقیقت کوئی چھوٹی چیز نہیں دوسری مثال ناپاکی اور پلیدی کی ہے کہ پلیدی چاہے تھوڑی ہو یا بہت مگر حقیقت دونوں کی پلیدی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احسان ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نافرمانی کرنا بری بات ہے اور یہ

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور احسان کے برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان تو اس کی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہوگی۔ پس وہ اپنی اس حقیقت اور مقتضیٰ کے اعتبار سے عظیم ہی ہوگی اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا جاتا مگر پھر جو اس پر جرأت کرتے ہو تو اس جرأت کے چند اسباب ہیں۔ بعضے گناہ کو تو صغیرہ سمجھ کر ارتکاب کرلیا جاتا ہے حالانکہ اسی راز کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ استخفاف گناہ کفر ہے گو چھوٹا ہی ہو۔ گناہ کی مثال تو آگ کیسی ہے ایک چنگاری بھی مکان جلانے کے لئے کافی ہے اور بڑا انگارہ بھی بس صغیرہ چنگاری ہے اور بڑا انگارہ پس عمل کرنے کے لئے یہ پوچھنا کہ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ شبہ میں ڈالنا ہے کہ اگر کبیرہ ہوگا تو بچیں گے اور اگر صغیرہ ہوا تو خیر ہم ایسے شخص سے اجازت لیتے ہیں کہ لاؤ تمہارے چھپر میں چھوٹی سی چنگاری رکھ دیں اگر یہ ناگوار ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیسے گوارا ہے۔ وہ چنگاری گو چھوٹی ہو مگر پھیلتے پھیلتے انگارہ ہی ہو جائے گا اسی طرح آدمی اول صغیرہ کرتا ہے اور وہ چھوٹتا نہیں اس اصرار سے وہ صغیرہ کبیرہ ہو جاتا ہے اور زیادہ مدت تک کرتے رہنے سے اس کو ہلکا ہی سمجھنے لگ جاتا ہے اور وہ اس جہت سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرنا سخت غلطی ہے مع ایک مثال کے

بعضے توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ گناہ کی جب عادت ہو جاتی ہے پھر توبہ بھی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ نئے گناہ سے جن کی ابھی لذت نہیں رچی توبہ کرنا آسان ہے اور عادت والے گناہ سے تو بہت مشکل ہے علاوہ اس کے جب چھوٹے گناہوں سے اجتناب نہیں کیا جاتا تو طبیعت بے باک ہو جاتی ہے اور دل کھل جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ کبیرہ بھی ہونے لگتے ہیں۔ جیسے صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ وغیرہ سے بچایا جاتا ہے اور جب بہت چھینٹیں پڑ جاتی ہیں تو پھر دامن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ کپڑا بالکل خراب ہو جاتا ہے ایسا ہی گناہ کا معاملہ ہے کہ جس گناہ کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے وہ پرانا ہو جاتا ہے اور چھوٹتا نہیں مثلاً زمینداروں کاشتکاروں وغیرہ میں یہ گناہ بمنزلہ عادت ہو گئے غصب ظلم بیع باطل جیسے آم اور بیر کی بیع متعارف اور یتیموں اور نابالغوں کے مال میں تصرف

دیکھ لیجئے یہ گناہ کس طرح سب بے کھٹکے کرتے ہیں۔ اور خیال میں بھی نہیں لاتے۔ البتہ شراب نہیں پئیں گے۔ تو یہ تفاوت اسی عادت ہو جانے سے ہے کہ اصرار و استخفاف بلکہ استحسان کی نوبت آ جاتی ہے اس لئے توبہ مشکل ہو جاتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو زبانی جیسے کسی نے کہا ہے۔

سبحہ درکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ   معصیت راخندہ می آید براستغفار ما

چنانچہ ان امور متذکرہ بالا سے توبہ تو کیسی اور الٹے ان امور کے ترک کو خلاف ریاست اور ذلت سمجھتے ہیں اور گناہ سے دل برا نہیں ہوتا حالانکہ ایمان کی نشانی یہ ہے۔ اذا سرتک حسنتک وساء تک سیتک غرض توبہ ان وجوہ سے مشکل ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے بھروسے گناہ کرنا نہایت حماقت ہے مگر بعض نادان پھر بھی دھوکے میں ہیں اور توبہ کے توقع پر گناہوں پر دلیری کرتے ہیں۔ اس شخص کی ایسی مثال ہے کہ اس کے پاس مرہم ہو اور اس کے بھروسے وہ اپنی انگلیاں آگ میں جلا لیتا ہو کیا یہ شخص پورا احمق نہیں ہوگا کیا کسی عاقل نے کبھی ایسا کیا ہے جب اس آگ پر دلیری نہیں کی جا سکتی۔ تو دوزخ کی آگ تو اس آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے۔ بلکہ مرہم تو پھر بھی من کل الوجوہ اختیاری ہے اور توبہ گو بظاہر اختیاری ہے مگر مرہم کی طرح من کل الوجوہ اختیاری نہیں کیونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ التوبة ندم جس کو یوں بھی تعبیر کیا ہے۔ وھو تحرق الحشاء علی الخطا و تالم القلب علی الاثم پس توبہ اس سوزش اور جلن کو کہتے ہیں یہ معلوم ہے کہ تالم مقولہ انفعال سے ہے اور وہ اختیار سے خارج ہے۔

توبہ کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

البتہ اس پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ جب توبہ امر اختیاری نہیں اور حسب الارشاد ولا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا کے غیر اختیاری کی تکلیف دی نہیں گئی تو پھر توبوا کا امر کیوں کیا گیا اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اختیاری کی دو قسم ہیں ایک وہ جو خود اختیار میں ہو دوسرے وہ کہ اس کے اسباب اختیار میں ہوں سو توبہ بایں معنے اختیاری ہے کہ اس

کے اسباب اختیاری میں یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کا مراقبہ سو اس کے کرنے سے عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ ندامت اور تالم قلب جو حقیقت میں توبہ ہے پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا **توبوا** کا حکم دیا گیا چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ **والذین اذافعلوا فاحشۃً او ظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا الذنوبھم**

مطلب یہ کہ اگر ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں یہاں پر **ذکروا اللہ** میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی **ذکروا عذاب اللہ وعظمۃ اللہ** اور واقعی اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے یاد رکھنے سے نافرمانی نہیں ہو سکتی اور وہ ہے بھی قابل یاد رکھنے کے پس اس کو دل سے بھلا کر اس کی نافرمانی پر کمر باندھ لینا بڑی بے باکی کی بات ہے۔

توبہ میں تاخیر نہ کرنا چاہئے اور فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اس کا بیان کہ جس کو صحت اور ضروری سامان خرچ حاصل ہے اس کو گویا دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہو گئیں

بعضے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام کر کے توبہ اور تدارک کر لیں گے حالانکہ ممکن ہے کہ اس کو موانع کے ہجوم سے اتنی مہلت ہی نہ ملے اس لئے اس وقت کے امکان اور فراغت کو غنیمت سمجھو اور جب یہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کا مراقبہ کرنے سے توبہ نصیب ہوتی ہے تو اب دوسری بات قابل غور ہے کہ اس مراقبہ کے لئے بھی فرصت اور فراغت کی ضرورت ہے بعض لوگ اس فراغت کی بھی قدر نہیں کرتے حالانکہ وہ بہت بڑی غنیمت چیز ہے حدیث شریف میں ہے **اغتنم خمساً قبل خمس** اور ان میں سے ایک یہ ہے **فراغک قبل شغلک** مشغول آدمیوں کی حالت میں غور کرنے سے فراغ کی قدر معلوم ہوتی ہے وہ بیچارے ہر وقت بلا میں مبتلا ہیں ان کو کوئی وقت فرصت کا اور ایسے سوچ کا نہیں ملتا بس یہ حالت ہے کہ

ع چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

فراغ کی قدر کے بارے میں خوب کہا گیا ہے۔

خوشا روزگارے کہ وارد کسی | کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت یا سرے بود | کند کارے ارمرد کارے بود

اور اسی حدیث شریف میں دوسری چیز ہے صحتک قبل سقمک تیسری شبابک قبل ھرمک نیز حدیث شریف میں ہے کہ من اصبح اٰمناً فی سربه معافاً فی جسده و عنده قوت یومه فکانما حیزت له الدنیا بحذا فیرها واقع میں یہی بات ہے کہ کیونکہ اگر زیادہ بھی ہوا تب بھی اس کے کام تو ہر روز ایک ہی روز کا قوت آئے گا پس اس میں یہ اور قلیل والا برابر ہوا۔

گر بریزی بحر را کوزہ | چند گنجد قسمت یک روزہ
چوں ترا نانے وخرقانے بود | ہر بن موئے تو سلطانے بود

حکایت: چنانچہ اسی زمانہ کے ایک متمول کی حکایت ہے کہ وہ ایک روز اپنے خزانے کو دیکھنے گیا جو زیر زمین بڑے مکان میں تھا اور وہ مکان گاہ گاہ کھلتا تھا اتفاق سے اس کو وہاں دیر لگ گئی اور کسی کو خبر تھی نہیں۔ ملازموں نے دروازہ بند کر لیا اور وہ بہت بڑا مکان تھا اور دروازوں کا سلسلہ بڑی دور تک تھا اور یہ اتنی دور تھا کہ وہاں سے آواز باہر نہیں آ سکتی تھی۔ الغرض وہ یہودی وہاں جواہرات کے ڈھیروں میں بھوکا پیاسا مر گیا۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو اس کے نزدیک ایک بسکٹ اور پانی کے گلاس کے سامنے سارا خزانہ ہیچ تھا۔ ایسی ہی حکایت ہے کہ کسی بھوکے کو ایک تھیلی ملی کھول کر دیکھا تو اشرفیاں ہیں پھینک کر زمین پر ماری اور افسوس کیا اور کہا کہ کیا گیہوں کے دانے ہوتے تو کچھ کام آتے الغرض فراغ اور صحت اور ضروری سامان خرچ یہ بہت غنیمت چیزیں ہیں یہ ہر وقت میسر نہیں آتیں اس لئے اس کو غنیمت سمجھے اس وقت کی فرصت کو ہاتھ سے نہ دے اور توبہ جلدی کر لے۔

خدا تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے علم کا مقتضا یہ ہے کہ اس سے متاثر ہو کر زیادہ اطاعت کی جائے نہ یہ کہ اور گستاخی اور نافرمانی کی جائے

بعضے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے ناز پر توبہ نہیں کرتے۔ حالانکہ رحمت اور

مغفرت کی چیزیں اس لئے دی گئی ہیں کہ تائب کو یاس نہ ہو جیسا کہا گیا ہے۔

باز آ بازآ ہر آنچہ ہستی باز آ　　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست　　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

اور جرأت اور دلیری کے واسطے نہیں کہ اور دلیر ہو کر گناہ کرو بلکہ احسان اور رحمت خداوندی کی اطلاع کا مقتضا یہ تھا کہ متاثر ہو کر اور بھی طاعت اور فرمانبرداری کرتے نہ کہ اور جرأت اور گستاخی اور نافرمانی کی جائے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو وہ اور زیادہ محبت و اطاعت کرتا ہے نہ کہ مخالفت و سرکشی۔

گناہ کے اندر کوئی لذت نہیں اور اس کی توضیح مثال سے

رہا یہ اشکال کہ واقعی اس کا مقتضی تو یہی تھا مگر ایک دوسرا مقتضی کہ لذت ہے وہ غالب ہو گیا چنانچہ گناہ میں ظاہر ہے کہ کیا مزا اور لذت ہے اس کو چھوڑنا اس لئے مشکل ہے سو اگر ادراک صحیح ہے تو یہ اشکال بالکل ٹھیک نہیں کیونکہ گناہ میں جو لذت ہے اس کی مثال کھجلی جیسی ہے کہ خود اس میں کوئی لذت نہیں محض مرض کی وجہ سے لذت معلوم ہوتی ہے پھر فوراً ہی سوزش پیدا ہوتی ہے سو یہ دراصل مرض ہے جیسا سانپ کے کٹے ہوئے کو کڑوا بھی میٹھا معلوم ہونے لگتا ہے سو کسی عاقل کو ایسی لذت علاج سے مانع نہیں ہوتی۔

حقیقی لذت طاعت کے اندر ہے دنیا کے تنعّمات تو درحقیقت جان کے لئے عذاب ہیں

البتہ حقیقی لذت طاعت میں ہے چونکہ ان لوگوں نے ابھی اعمال آخرت اور پرہیز گاری اور طاعت کی لذت چکھی نہیں اس لئے گناہ اور نفسانی لذات ان کو مرغوب معلوم ہوتے ہیں۔ آخرت اور پرہیز گاری کی لذت حضرت ابراہیم ادھمؒ سے پوچھئے کہ کس طرح اس کے پیچھے سلطنت کی لذت ترک کر دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس لذت کے پیچھے لباس شاہانہ ترک کر کے غریبانہ کپڑوں پر کفایت کی اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ

اللہ کو سلطان سنجر نے ملک نیمروز دینا چاہا اس کے جواب میں یہ شعر تحریر فرمائے

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم

زانگہ کہ یافتم جتراز ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیمروز بیک جونمی خورم

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ۔۔۔ بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی ۔۔۔ کہ یک دم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

چونکہ یہ لذت و تنعمات درحقیقت جان کے لئے عذاب ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ **ولا تعجبک اموالھم الخ**

اول تو ان سب چیزوں کا مرضی کے موافق حاصل ہونا غیر اختیاری اور اگر حاصل بھی ہو گئیں تو ان سب میں مشغولی اور تعلق کی پریشانی اور بے آرامی یہ دوسرا عتاب۔ حقیقت میں آرام تو صرف اللہ تعالیٰ کیساتھ تعلق پیدا کرنے میں ہے **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب** یہ کلفتیں تو گناہ انفسی ہیں اور بعض کلفتیں آفاقی بھی مرتب ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان نافرمانیوں کی بدولت طرح طرح کی بیماریاں طاعون وغیرہ وبائی امراض آپس کی نااتفاقیاں وغیرہ ظہور میں آتی ہیں۔

بیماری وغیرہ کے ظاہری اسباب گو کچھ امور طبعیہ بھی ہوں مگر اصلی اسباب اس کے گناہ ہیں اور اس کا بیان کہ جو خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اس کی سب اطاعت کرتے ہیں

اور ان بیماریوں کے ظاہری اسباب گو کچھ امور طبعیہ ہوں مگر ذنوب ان کے اسباب حقیقیہ اور اصلیہ ہیں اور دونوں میں تعارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ سزا تو گناہ کی وجہ سے مگر ظہور اس سزا کا اسباب طبعیہ کے ذریعہ سے ہوا ہو اور چونکہ لوگ ذنوب کو ان امراض کا سبب نہیں قرار دیتے اس لئے صرف طبی علاج پر اکتفا کرتے ہیں اور اصلی علاج کہ استغفار ہے وہ نہیں کرتے وہ بھی کرنا چاہیے۔

چند خوانی حکمت یونانیاں ۔۔۔ حکمت ایمانیاں راہم بخواں

صحت ایں حس بجوئید از طبیب ۔۔۔ صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحت ایں حس زمعموری تن   صحت آں حس زتخریب بدن

اور ذنوب سے مصائب کا آنا نصوص سے ثابت ہے

مااصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم

حکایت: ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تھے وہ شوخی کرنے لگا فرمانے لگے ہم سے آج کوئی گناہ ہو گیا ہے اس کی وجہ سے یہ ہماری نافرمانی کرتا ہے

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ   کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید   ترسد از وے جن وانس و ہر کہ دید

حکایت: اس کے مناسب جناب پیر و مرشد حاجی صاحب علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ پیران کلیر سے واپس ہوتے ہوئے سہارنپور تشریف لائے لوگوں نے آپ کو ایک ایسے مکان میں اتروایا کہ وہاں ایک جن نے سخت آزار پہنچا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ مکان بالکل معطل چھوڑ دیا گیا تھا۔ جب حضرت رات کو اٹھے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی آیا اور سلام کیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔ حضرت نے تعجب سے پوچھا تم کون کیونکہ مکان بند تھا اس نے عرض کیا میں ایک جن ہوں اور میری ہی وجہ سے یہ مکان خالی پڑا ہے حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ تم کو خدا کا خوف نہیں کہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔ اس نے عہد کیا کہ میں اب تکلیف نہیں دوں گا اس کے بعد وہ جن اس مکان سے چلا گیا۔ اور وہ مکان آباد ہو گیا تو یہ اثر جن پر حضرت کی طاعت ہی کا تھا۔

حکایت: ایک سیر کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے جب مصر فتح کیا تو ایک بار دریائے نیل خشک ہو گیا لوگوں نے عرض کیا آپ نے فرمایا کہ کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے اور لوگ ایسے وقت کیا کرتے ہیں عرض کیا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب دریائے نیل خشک ہو جاتا ہے تو لوگ ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگھار کر کے اس میں ڈال دیتے ہیں۔ دریائے نیل پھر جوش مار کر جاری ہو جاتا ہے آپ نے فرمایا ایسا کبھی نہ ہوگا اور یہ[1] سب حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں لکھ بھیجا حضرت نے ایک والا

---

[1] یہاں تک یہ حکایت ہم کو الرفیق میں ناتمام ملی اس لئے باقی حکایت کو اپنی یاد سے پورا کر دیا۔ اگر کچھ کم بیشی ہو گئی ہو تو ناظرین اس کی کمی بیشی کو پورا کر لیں۔ ۱۲ جامع

نامہ دریائے نیل کے نام لکھا جس کا حاصل یہ تھا کہ اے دریائے نیل اگر تو اپنی قدرت اور طاعت سے جوش پر آتا ہے تو ہم کو تیری ہرگز پروانہیں ہے اور اگر خدا کی قدرت اور مشیت سے جوش پر آتا ہے تو میں خدا کے سچے نبیؐ کا خلیفہ ہوں اور تجھ کو حکم کرتا ہوں کہ خدا کے حکم سے جاری ہو جا۔ یہ والا نامہ دریائے نیل میں قاصد نے ڈال دیا ہنوز دریا جوش پر رہتا ہے۔ اور برابر اس کے ذریعہ سے زراعت وغیرہ کی آبپاشی ہوتی ہے۔

بحمد اللہ تمام